خُطبات

حکیمُ الاُمّت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبات میلاد النبی

صلی اللہ علیہ وسلم

بسلسلہ خطباتِ حکیم الامت جلد۔ ۵

خطبات
میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا **محمد اشرف علی تھانوی** نور اللہ مرقدہ

عنوانات و ترتیب
منشی عبد الرحمن خان رحمہ اللہ

تصحیح و تزئین
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث
مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240)

خطبات
میلادالنبی ﷺ

تاریخ اشاعت............ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ
ناشر............ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت............ سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں
کسی بھی طریقہ سے اس کی اشاعت غیر قانونی ہے

قانونی مشیر

قیصر احمد خان
(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملتان)

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمد للہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.... چوک فوارہ.... ملتان
ادارہ اسلامیات........ انارکلی........ لاہور
مکتبہ سید احمد شہید..... اردو بازار..... لاہور
مکتبہ رحمانیہ....... اردو بازار .... لاہور
مکتبہ الفاروق.... مصریال روڈ چوہڑ ہڑپال.... راولپنڈی
دار الاشاعت....... اردو بازار......... کراچی
مکتبہ القرآن...... بنوری ٹاؤن.......... کراچی
مکتبہ دار الاخلاص.... قصہ خوانی بازار....... پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-131- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُمَّ
صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

اَللّٰهُمَّ
بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

اجمالی فہرست

وعظ ... الظہور ۱۳

لَعَمْرُکَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَکْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (الحجر:۷۲)

وعظ ... السرور ۴۸

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ (یونس:۵۸)

وعظ ... النور ۹۸

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (مائدہ:۱۰)

وعظ ... نور النور ۱۳۰

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (النصر:۱)

وعظ ... المورد الفرسخی ۱۷۷

وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوْنَ (روم:۱۴)

وعظ ... راس الربیعین ۲۶۱

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا (طلاق:۱۰)

وعظ ... المریع فی الربیع ۲۹۳

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا (الاحزاب:۴۵)

وعظ ... الرفع والوضع ۳۲۳

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (القیامۃ:۳۶)

وعظ ... نقد اللبیب ۳۷۱

فہرست

الظہور

غلو فی الدین ۱۴
حدود مدح ۱۶
غایات قصص القرآن ۱۷
علماء صوفیاء کا فرق ۱۸
ماہ ربیع الاول کی فضیلت ۲۰
ایک شبہ کا ازالہ ۲۱
تمہید اصل مقصود ۲۳
قوم لوط کا قصہ ۲۵
حق تعالیٰ کی غیرت کا اقتضاء ۲۷
علوم عقلیہ کی ضرورت ۲۸
فضیلت کی انواع ۳۰
حیاۃ النبی کی تفصیل ۳۱
مدعیان محبت نبویہ کی غلطی ۳۲
فناء و بقا کے معنی ۳۴
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا مقصد ۳۶
حضور کی قوت فیض ۳۶
جمال احمدی کی یکتائی ۳۸
سلامتی کی صورت ۳۹
اتباع سے عار کا سبب ۴۰
اتباع کی برکات ۴۱
خاتم کمالات ۴۴
حصول فیض کی صورت ۴۵

السرور

رحمۃ للعالمین ۵۰
بہتان عظیم ۵۱
معیار شریعت ۵۲
اہمیت ذکر رسول ۵۳
معیار محبت ۵۴
تائید رسول ۵۵

خصوصیت معصیت	۵۶
ناز و نیاز	۵۸
رحمت بے پایاں	۶۰
درجات رحمت	۶۱
نعمت عظیمہ	۶۳
اہمیت ولادت	۶۴
حظ نفس	۶۵
عادت اللہ	۶۶
حکمت الٰہیہ	۶۸
ہادی راہِ حق	۶۹
فیض رسانی	۷۱
عظمت حضرت بلالؓ	۷۳
فرق بدعت وسنت	۷۵
رسم عید میلاد النبیؐ	۷۸
تردید... عید میلاد (از قرآن وحدیث)	۸۰
تردید از اجماع امت	۸۳
تردید از قیاس	۸۴
تردید از موجدین عید	۸۴
عقلی تردید	۸۸
ضمیمہ وعظ ہذا	۹۰
خلاصہ مقصود وعظ	۹۱

النور

دو نعمتیں	۹۹
ضرورت بیان	۱۰۰
ظہور اسماء جلالیہ وجمالیہ	۱۰۰
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	۱۰۲
دولت محبت	۱۰۳
حقیقت قیاس مجلس	۱۰۵
بے بنیاد اعتقاد	۱۰۸
محبت اہل مولود	۱۰۹
رسمی محبت کے آثار	۱۱۰
طاعون کا روحانی علاج	۱۱۲
مذاق کی خرابی	۱۱۳
نسخہ عشق	۱۱۵
طریق ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم	۱۱۶
بعثت کی غرض	۱۱۸
نعمت معرفت	۱۱۸
فضائل ربیع الاول	۱۱۹
بے حسی کا غلبہ	۱۲۱
بدعت کی حقیقت	۱۲۲

شوکت اسلام	۱۲۴
بدعات کی مصلحتیں	۱۲۵
عجیب وغریب الہام	۱۲۶
تفسیر آیت کریمہ	۱۲۷

نور النور

منت عظیمہ	۱۳۱
مشاہدہ ومجاہدہ	۱۳۳
ایمان کامل	۱۳۴
مجاہدہ کی حقیقت	۱۳۶
مجاہدہ کی صورت	۱۴۰
آداب جلوت وخلوت	۱۴۱
اتباع حکمت	۱۴۳
روح اعمال	۱۴۵
جنت کی نعمتیں	۱۴۶
ترک لذات	۱۴۸
تعظیمی قیام	۱۵۰
فضیلت ربیع الاول	۱۵۲
شریعت کی مزاحمت	۱۵۴
اصلاح اعتقاد	۱۵۵
کمالات نبویؐ	۱۵۶
کمالات عمری	۱۵۸
اقرار مولود	۱۵۹
تجلی خاص	۱۶۲
تبلیغ حضرت شہید	۱۶۴
مقام فکر وطریق فکر	۱۶۶
لوح محفوظ کی نظیر	۱۶۹
مرجع کمالات	۱۷۰
اثر عناد وتکبر	۱۷۱
سراپا نور	۱۷۴

المورد الفرسخی فی المولد البرزخی

مجالس موالید	۱۷۸
مقام علماء وصوفیاء	۱۸۰
عقلی وطبعی قلق	۱۸۲
صورت دوام والتزام	۱۸۴
تمہید بیان	۱۸۷
عوام کی غلطی	۱۸۸
حقیقی کمالات	۱۸۹
لفظی تہذیب	۱۹۱
مہذب کلام	۱۹۲

ضال کے معنی ۱۹۴
فطرت سلیمہ کا تقاضا ۱۹۵
ایمان اور نبوت ۱۹۶
روح اور مادہ ۱۹۷
مبداء و معاد ۱۹۹
اردو عربی محاورہ کا فرق ۲۰۲
محض ترجمہ پڑھنا کافی نہیں ۲۰۳
تہذیب کی رعایت ۲۰۴
ولادت ملکوتیہ ۲۰۶
با مشقت زندگی ۲۰۷
ارواح کی حالت ۲۱۰
راز فنا ۲۱۱
ترکیب اجسام ۲۱۳
عقل اور استعداد ۲۱۴
فطرت اور توحید ۲۱۵
موازنہ موت وحیات ۲۱۷
حیات ناسوتی ۲۱۸
مقصد حیات ۲۲۱
رضا و قرب ۲۲۳
فضیلت فقہاء ۲۲۴
لطف جنت ۲۲۸
مفارقت دائمہ ۲۳۰
سرکار دو جہاں کی پسند ۲۳۴
طبعی تقاضا ۲۳۶
عارفین کی حالت ۲۳۸
رحمۃ للعالمین ۲۴۰
فتح مکہ ۲۴۲
بشارت تکمیل دین ۲۴۵
ارتفاع حجاب ۲۴۶
آغاز اجتہاد ۲۵۰
برکات سفر آخرت ۲۵۱
جان گزاری و دلنوازی ۲۵۳
رفع اشکالات ۲۵۵
نعمت موت ۲۵۸

راس الربیعین

ایک قدیم مرض ۲۶۵
عظمت مشیت اور قدرت ۲۶۸
فضل و رحمت ۲۶۹
برکات نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۲۷۱
بدعت و ضلالت ۲۷۲

درجات حیات برزخیہ ۲۷۳
عرش وفرش ۲۷۶
عذاب فساد عقائد ۲۷۷
تبرکات نبویہ ۲۷۹
احتیاط در بارہ تبرکات ۲۸۲
برکات تبرکات ۲۸۴
احترام تبرکات ۲۸۶
نذریں ماننا ۲۹۰
گیارھویں کا معاملہ ۲۹۱

المربیع فی الربیع

ادائے حق ۲۹۵
حقوق الرسول ۲۹۷
مقبولیت درود شریف ۲۹۸
حق محبت ۲۹۹
کمال عشق ۳۰۱
خاصیت محبت ۳۰۲
خلوص کا فقدان ۳۰۴
شعراء کی بے ادبیاں ۳۰۶
مصلحین پر تہمت ۳۰۸
ایجاد میلاد کی وجوہ ۳۰۹
قیام کی اصل ۳۱۰
حقیقی ذکر ۳۱۱
شرط ایمان ۳۱۳
حقیقی طاعت وعظمت ۳۱۴
حضور کی شان ۳۱۶
واعظین کی گستاخیاں ۳۱۸
ترجمہ وتفسیر آیت ۳۲۰
خلاصہ وعظ ۳۲۲

الرفع والوضع

وجہ بیان ۳۲۵
اکتساب فیض کمالات ۳۲۶
روشن چراغ ۳۲۷
جامع کمالات ۳۳۰
خاتم کمالات ۳۳۴
اولیت علیت ۳۳۶
ذاتی اصطلاحات ۳۳۸
عکس فیض قلب ۳۴۰
برکت صحبت ۳۴۲
غلبہ رحمت ۳۴۴
محرومی ایمان کا اثر ۳۴۵

کرامات اولیاء	۳۴۶
اہمیت اقرار رسالت	۳۴۸
اتباع انبیاء	۳۵۰
حقیقت وصورت معراج	۳۵۱
قرب الٰہی	۳۵۴
حقیقی معراج	۳۵۸
معراج سے پہلا سبق	۳۶۲
معراج سے دوسرا سبق	۳۶۵
خلاصہ بیان	۳۶۹

نقد اللبیب فی عقد الحبیب

خام خیالی	۳۷۲
اتباع ہویٰ	۳۷۵
ایک کفر عملی ایک کفر اعتقادی	۳۷۵
اقسام ضرر	۳۷۶
مصلحین قوم کی حالت	۳۷۸
فرق اعتقاد	۳۷۹
فرق ملکیت وتصرف	۳۸۰
بدعات وخرافات	۳۸۲
عقل اور شریعت	۳۸۴
تخریب رسوم	۳۸۷
اسراف کی حقیقت	۳۹۰
تفاخر کی ممانعت	۳۹۱
غیبت کی صورت	۳۹۳
قلبی معصیت	۳۹۳
صورت اصلاح	۳۹۵
ترجیح مفسدہ	۳۹۸
تقاضائے محبت وہمدردی	۴۰۱
نکاح کی سہل صورت	۴۰۳
مقدار مہر	۴۰۴
حقیقی عزت وعظمت	۴۰۵
رفع اشکالات	۴۰۹
شریعت کا سلوک	۴۱۳
اعتراف گورنر	۴۱۵
تصدیق جناب سید اعجاز علی صاحب	۴۱۸
تصدیق جناب سید صاحب علی صاحب	۴۱۹
تصدیق جناب سید مبارک حسین صاحب	۴۲۰
مختصر کیفیت وعظ ہذا وقوعاً وعرضاً واثراً	۴۲۱

☆.....☆.....☆

الظہور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کے راز کے متعلق یہ وعظ ۳ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا، جو اڑھائی گھنٹہ میں ختم ہوا۔ قریباً ۲۰۰ کا مجمع تھا۔ مولوی عبداللہ صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّابَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

لَعَمْرُکَ اِنَّھُمْ لَفِیْ سَکْرَتِھِمْ یَعْمَھُوْنَ.

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی حیات کی قسم وہ یعنی قوم لوط اپنی مستی اور نشہ میں بھٹک رہے تھے۔

غلو فی الدین

یہ ایک آیت ہے سورہ حجر کی۔ اس سے مجھے اپنا بیان مستنبط کرنے کی حاجت نہیں بلکہ اس مقصود کی اس آیت میں تصریح ہے صرف اس کی تفسیر کرنا مقصود ہے۔ اس مقصود کی اجمالی تعیین اثناء خطبہ جمعہ میں نماز سے قبل کر دی ہے جس کا حاصل جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فضائل کے ساتھ دنیا میں حضور کی تشریف آوری کا راز بیان کرنا ہے۔ اس لئے کہ حضور کی ولادت شریفہ و دیگر حالات کے متعلق حکایات و واقعات تو بیان کئے ہی جاتے ہیں اور ان میں حظ بھی ہے۔ اور نیز اگر منکرات سے خالی ہوں طاعت بھی ہے۔ اس لئے کہ حضور کا ذکر شریف حق تعالیٰ ہی کا ذکر ہے اور میں اگر اس ذکر کے اندر کوئی کوتاہی نہ دیکھتا تو اس پر بھی اختصار و قناعت کرتا۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ اس میں ایک بڑی کوتاہی ہو رہی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ دوسرا ضروری مضمون یعنی اس کا راز بھی بیان کرنا ضروری ہوا تاکہ اس کے جاننے سے اس کوتاہی کی بھی اصلاح ہو۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اول یہ سمجھو کہ شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام

نے ہر شے کی ایک حد مقرر فرمائی ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کو غلو فی الدین کہا جاتا ہے۔ جس کی نسبت ارشاد ہے۔ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (اپنے دین میں غلو نہ کرو) مخاطب اس کے اہل کتاب ہیں۔ وہ جناب عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدح میں بے حد مبالغہ کرتے تھے۔ نبی کریم کی مدح کرنا عین طاعت ہے لیکن اگر حدود نہ ہوتے تو یہ کہا جاتا کہ جس قدر مدح کی جاوے سب طاعت ہے لیکن وہ تو حدود سے تجاوز کر گئے۔ اور اپنی حد سے جو شے بڑھے گی وہ معنی عنہ ہو جائے گی حتیٰ کہ حق تعالیٰ کے کمالات حالانکہ غیر محدود ہیں لیکن غلو اس میں بھی جائز نہیں۔ وہاں بھی غلو کے معنی یہی ہیں کہ حد شرعی سے آگے بڑھے یعنی غیر واقعی امر کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرے۔ اتنا فرق ہے کہ اگر غیر واقعی کمال کو بشر کی طرف منسوب کرے تو وہ کمال گنا جاتا ہے اور اگر اس میں ہوتا تو کمال ہی ہوتا۔ بخلاف حق تعالیٰ کے کہ اگر اس کے لئے کوئی امر غیر واقعی ثابت کرے تو وہ کمال ہی نہیں نقص لازم آ جائے گا۔ مثلاً یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ اتنے بڑے قادر ہیں کہ اپنے شریک پر بھی قادر ہیں تو یہ صفت مدح نہیں۔ اس لئے کہ جب شریک تجویز ہوا تو وہ شریک فی القدرت بھی ہوگا اور جب شریک فی القدرت ہوا تو قدرت کہ جس میں یہ مبالغہ کرتا تھا ناقص ہو گی۔ پس جب اللہ تعالیٰ کے لئے بھی امر غیر واقعی کو ثابت کرنا جائز نہیں تو انبیاء کے لئے کیسے جائز ہوگا۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھیے کتنے بڑے پیغمبر ہوئے ہیں کہ غایت قرب اور بلا واسطہ ظاہرہ کے پیدا ہونے کے سبب آپ کا لقب روح اللہ ہے لیکن وہ ظالم اس روح اللہ کے معنی حد سے تجاوز کر کے جزئیت کے خواہ اعتقاداً یا تقولاً قائل ہو گئے اور تعمیم میں نے اس لئے کی کہ عقلاً تو جزئیت بالمعنی الحقیقی کے قائل ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ محال عقلی ہے۔ گو تقولاً ہوں۔ باقی جو عقل سے معرا ہیں وہ جو چاہیں کہیں۔ پس اہل کتاب کے اس تجاوز عن الحد کے بارہ میں ارشاد ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ

"یعنی اے اہل کتاب تم لوگ اپنے دین میں حد سے مت بڑھو اور اللہ پر بجز حق بات کے مت کہو"

اور وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ میں ایک نکتہ عجیب اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور وہ میرے مقصد کی پوری دلیل ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے تو اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ یہ فرماتے لاتقولوا علی عیسیٰ الا الحق یعنی عیسیٰ پر سوائے حق بات کے مت کہو۔ پھر علی اللہ کیوں فرمایا؟ پس سمجھئے کہ علی اللہ فرمانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ جب مخلوق کی شان میں حد سے تجاوز کرو گے تو یہ ضرور خدا تعالیٰ کی تنقیص ہوگی۔ پس عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا یہ تنقیص ہے باری تعالیٰ کی۔ یہاں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہم لوگ جو بدنام ہیں کہ یہ رسول اللہ کی مدح سے منع کرتے ہیں تو جو مدح حد کے اندر ہو اس کو ہم اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ ہاں ہم خدا تعالیٰ کی تنقیص کو منع کرتے ہیں پس رسول کی اتنی مدح کرنا

کہ جس سے حق تعالیٰ کی شان میں بے ادبی ہو۔ یہ رسول کی تو ظاہراً مدح ہوگی لیکن واقع میں اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہوگی۔ ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کسی کی اتنی مدح کرے کہ اس کے باپ کی اہانت ہو جاوے۔ پس ایسی مدح کو وہ بیٹا بھی پسند نہ کرے گا بلکہ اس سے ناراض ہوگا۔

پس لاتقولوا علی اللہ الا الحق سے صاف ظاہر ہوگیا کہ مدح کے اندر حد شرعی سے بڑھنا یہ خدا تعالیٰ کی تنقیص ہے۔ آگے جو ارشاد ہے اس سے میرا مقصود جو نکتہ کے عنوان سے بیان کیا ہے، بہت صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ لاتقولوا علی اللہ الا الحق بھی اس مدح عیسوی ہی کے متعلق ہے اور وہ ارشاد یہ ہے۔

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللهِ وَكَلِمَتُهُ

''یعنی مسیح عیسیٰ ابن مریم اور کچھ نہیں ہیں صرف اللہ کے رسول ہیں''۔

پس اگر آیت کے یہ معنی نہ ہوں جو میں نے بیان کئے ہیں تو درمیان میں لاتقولوا علی اللہ الا الحق (اور اللہ پر بجز حق بات کے مت کہو) بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اول و آخر میں تو عیسیٰ علیہ السلام کا بیان ہے اور درمیان میں لاتقولوا علی اللہ الا الحق کے کیا معنی ہیں؟ پس صاف ظاہر ہے کہ مدعا یہی ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی جزئیت کے قائل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ پر بہتان ہوگا اور اس سے تنقیص جناب باری تعالیٰ کی لازم آئے گی پس مدح بھی اسی وقت تک جائز ہوگی کہ حد سے نہ گزرے۔

حدود مدح

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی سمجھ لو کہ حضور کی نعت اسی حد تک جائز ہوگی کہ حد شرعی سے متجاوز نہ ہو۔ باقی اس کی کیا حد ہے اس کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے وہ یہ ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے عظیم ہستی جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے)

یعنی خواص ربوبیت کے علاوہ سب کمالات حضور کے لئے امکاناً تو سب ثابت اور وقوعاً جس میں روایت وارد ہو وہ ثابت۔ اور خواص ربوبیت کے علاوہ اگر کوئی ایسا امر ثابت کرو گے جو روایت سے ثابت نہ ہو تو یہ کذب اور گناہ تو ہوگا لیکن اس سے تنقیص حق تعالیٰ کی لازم نہ آوے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدح نبوی کے اندر دو چیزوں کی رعایت رکھو۔

ایک تو یہ کہ حضور کو خدا کے درجہ میں مت پہنچاؤ۔ دوسرے یہ کہ وہ امر ثابت کرو کہ روایات ثابتہ اس کے مساعد ہوں ان دو امروں کی رعایت کے بعد جو چاہو ثابت کرو کوئی منع نہیں کرتا۔ مختصر یہ ہے کہ اس باب میں نسبت الوہیت اور کذب سے احتراز رکھو۔ لیکن چونکہ ابنائے زماں ان دونوں باتوں سے

اجتناب نہیں کرتے حضور کی شان کو ایسا بڑھاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور حکایات وواقعات وہ بیان کرتے ہیں کہ روایات صحیحہ میں ان کا پتہ بھی نہیں۔ اور اس کی اصلاح ضروری ہے۔ اس لئے ہم حکایات اور واقعات سے زیادہ ضروری مضمون بیان کرتے ہیں جس کو میں نے راز ولادت سے تعبیر کیا ہے اور اگر یہ غلو ہم نہ دیکھتے تو ہم بھی صرف واقعات صحیحہ بیان کرتے اس لئے کہ۔

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ هو المسک ما کررته یتوضع

(نعمان کے ذکر کا اعادہ کر اس لئے کہ اس کا ذکر مشک ہے جتنا اس کو مکرر کرو گے مہکے گا)

اور اس لئے کہ محبوب کا ذکر بھی مایۂ تسلی ہے بحوائے حکایت

دید مجنوں را یکے صحرا نورد در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ می کنم خاطر خود را تسلی میدہم

(ترجمہ) کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے کہ ریت پر انگلی سے کسی کو خط لکھ رہا ہے پوچھا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں۔ اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔

پس حقیقت یہ ہے کہ محبوب کا ذکر بھی محبوب ہے لیکن کیا کیا جاوے۔ اسی محبوب کے امر کی وجہ سے یہ بھی اختیار کیا جاتا ہے کہ محبوب کے احکام کا ذکر زیادہ اہتمام سے ہو۔ اس لئے واقعات بیان نہ کروں گا۔ نیز وقت بھی نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔ اس لئے کہ بفضلہ تعالیٰ وہ واقعات جو علماء محققین نے صحیح روایات سے مدون کر دیئے ہیں مشہور اور السنہ پر مذکور ہیں اس لئے میں بجائے حضور کی تشریف آوری کے واقعات کے وہ حکمت اور راز بیان کرنا چاہتا ہوں جو حضور کے تشریف لانے سے مقصود ہے اور نیز حضور کے واقعات اور حکایات کا بھی مقصود اور غایت اصلی وہی ہے۔

غایات قصص القرآن

اور قرآن مجید کے اندر بھی غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جتنے واقعات اور قصص حق تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں مطمح نظر ان سے ان کی غایات ہی ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

(یعنی یہ کتاب ہے ہم نے اس کو آپ کی طرف اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالیں)

اور ارشاد ہے: هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ

(یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا کہ اس دین کو تمام دینوں پر غلبہ دے دیں) اور فرماتے ہیں

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ
لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

(یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے ایک یادداشت یعنی رسول کو کہ وہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتے ہیں کہ وہ آیات (حق کو ظاہر کرنے والی ہیں) تا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عمل نیک کیے ہیں ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالیں۔

آیت موخر الذکر میں اللہ تعالیٰ نے ذکر اور رسول کو مبدل منہ اور بدل واقع کر کے گویا ایک قرار دیا ہے اس سے عقلاء سمجھ سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس سے مقصود ذکر ہے۔ بہر حال قرآن شریف کے اندر جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے وہاں غایت بھی حق تعالیٰ نے بیان فرمائی اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور کی ذات بابرکات سے اور آپ کے واقعات سے وہ غایت ہی مطلوب ہے۔

پس الحمد للہ! میرا یہ بیان اور دعویٰ بے دلیل نہیں رہا۔ پس راز و غایت کو بیان کرنا عین امتثال ہے اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا۔ اور نیز یہ اس حیثیت سے افضل ہو گا صرف واقعات کو بیان کرنے سے۔ یہ تو اجمالی تعیین تھی مقصود کی۔

علماء صوفیاء کا فرق

اس کے بعد سمجھئے کہ میں نے خطبہ جمعہ میں وعدہ بیان کے ساتھ یہ بھی قید لگائی تھی کہ میں آپ کی تشریف آوری کا راز حضرات صوفیہ و اہل اسرار کے طرز پر بیان کروں گا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت کو ان ہی حضرات نے خوب سمجھا ہے اور لوگ تو الفاظ ہی میں ہیں اور یہ لوگ اسرار سمجھتے ہیں ان کی تحقیقات اور علماء ظاہر کے علوم میں ایسا فرق ہے جیسے ایک شخص تو کتاب خوان نعمت سے لڈو پیڑے برفی بالوشاہی کے بنانے کی ترکیب اور طریقے بیان کرتا ہو کہ لڈو بنانے کی یہ ترکیب ہے اور بالوشاہی اس طرح بنتی ہے۔ تو اس سے بنانے کی ترکیب تو معلوم ہوئی لیکن حقیقت معلوم نہ ہوئی کہ وہ کیا ہیں؟ اور دوسرے شخص نے بالوشاہی اور لڈو منہ میں رکھ دیئے گو اس کو بنانے کی ترکیب بھی معلوم نہ ہو۔

حضرت قبلہ حاجی صاحب قدس سرہ کے یہاں ایک مولوی صاحب جو پہلے بھی کسی شیخ سے مثنوی پڑھ چکے تھے حضرت حاجی صاحب سے مولانا رومیؒ کی مثنوی شریف پڑھتے تھے۔ حاجی مرتضیٰ صاحب لکھنوی اس وقت وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ان مولوی صاحب سے پوچھا کہ تم تو خود عالم ہو پھر مثنوی بھی پڑھ چکے ہو پھر تم حضرت حاجی صاحب سے کیوں پڑھتے ہو انہوں نے فرمایا کہ آپ کچھ علوم پڑھے ہوئے بھی ہیں۔ حاجی مرتضیٰ صاحب نے کہا کہ میں نے علوم میں سے تو کچھ نہیں پڑھا۔ مولوی صاحب

نے فرمایا کہ اگر آپ عالم ہوتے تو علماء کے طرز پر آپ کو سمجھا دیتا۔ اب میں ایک موٹی سی مثال بیان کرتا ہوں اس سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے پہلے پڑھنے پڑھانے میں اور حضرت کے پڑھانے میں کیا تفاوت ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک مکان عالی شان ہے۔ ایک شخص نے اس کے دروازہ پر ایک شخص کو کھڑا کر کے کہا کہ اس مکان کے اندر اتنے کمرے ہیں اتنا سامان ہے فلاں جگہ گھنٹہ لگ رہا ہے اور فلاں جگہ یہ ہے اور فلاں جگہ وہ ہے غرض اس کے اندر جو کچھ ہے اس کی تمام فہرست بے کم و کاست ایسی بیان کر دی کہ کوئی امر متروک نہ رہا مگر صرف فہرست ہی بتلائی باقی دکھلائی کوئی شے نہیں۔ پھر دوسرا شخص آیا اس نے فہرست کا تو ایک حرف نہ بتایا مگر یہ کیا کہ ہاتھ پکڑ کر اس مکان کے اندر لے جا کر کھڑا کر دیا کہ اس کے سب سامان اور زینت آنکھوں کے سامنے ہو گئے۔ پس حضرت کا پڑھانا تو ایسا ہے جیسے مکان کے اندر کھڑا کر دیا ہو اور پہلی تعلیم ایسی ہے کہ فہرست بتا دی ہو۔ پس ان حضرات کے علوم واقع میں عین الیقین ہوتے ہیں پس اہل اسرار یہ لوگ ہیں ان کے طرز پر میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

مگر اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ وہ مضمون اہل اسرار کا مخترع ہوگا اور ثابت بالکتاب والسنۃ نہ ہوگا۔ یاد رکھو کہ وہ حضرات جو کچھ سمجھے ہیں وہ کتاب و سنت ہی سے سمجھے ہیں۔ کوئی شے خارج اس سے زائد ان کے پاس نہیں ہے اور اگر کتاب و سنت سے خارج کوئی شے ہوگی تو وہ خود مردود ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ صوفیوں کے پاس کچھ علوم و احکام شریعت سے علیحدہ بھی ہیں سو یہ بالکل غلط ہے ان کا علم قرآن و حدیث سے ہی ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ اور لوگ سمجھتے نہیں اور وہ حضرات سمجھتے ہیں اور یہ خیال لوگوں کا بہت پرانا ہے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ علوم و احکام ایسے پہنچے ہیں کہ کسی دوسرے کو نہیں بتائے گئے لیکن اس کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار خود حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا قول کافی ہے مگر ان سے پوچھے کون! سو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ کسی باہمت نے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھ بھی لیا۔ چنانچہ بخاری کی جو کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا۔

هل خصكم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشئى دون الناس

یعنی کیا تم کو حضور نے ایسی خاص بات بتائی ہے جو اوروں کو نہیں بتائی۔

قال لا الا فهما اوتيه الرجل فى القران.

فرمایا ہرگز نہیں مگر ہاں ایک سمجھ جو آدمی کو قرآن یعنی دین کے اندر عطا ہوتی ہے۔

پس حضرات صوفیہ و اہل اسرار کو حق تعالیٰ نے قرآن و حدیث کی سمجھ ایسی عطا فرمائی ہے کہ وہ اس سمجھ سے کام لے کر جب کسی کو سمجھاتے ہیں تو بعد ان کے بتانے کے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ قرآن و حدیث ہی

ہے اور لوگوں کو بدوں ان کے بتائے سمجھ میں نہیں آتا اور یہی معیار ہے۔ ان تحقیقات کے صحیح اور ثابت ہونے کا کہ اگر بعد سمجھانے کے یہ روز روشن کی طرح معلوم ہونے لگے کہ یہ تحقیقات قرآن وحدیث کے خلاف نہیں تو وہ صحیح ہیں اور اگر بعد سمجھانے کے بھی مخالف معلوم ہوں تو غلط اور تصنیف یاراں ہے۔ اور اس کا وہی درجہ ہے جیسا ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس نے وَالضُّحٰیۙ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی (قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب وہ قرار پکڑے) کے معنی بیان کیے تھے کہ اے نفس! تیری یہی سجا (سزا) ہے۔

ایک بانوا فقیر نے کسی سے پوچھا کہ بتا محمد کا رتبہ بڑا ہے یا رزق کا۔ اس نے کہا کہ حضور کا رتبہ بڑا ہے کہنے لگا کہ بے پیرا ہی رہا۔ دیکھ سوٹے کو سر پر گھما کر کہا **اشہد ان محمد رسول اللہ**۔ دیکھ ان پہلے آیا ہے محمد پیچھے آئے ان ہندی میں کہتے ہیں رزق کو۔ پس رزق کا مرتبہ بڑا ہے۔

یہ فقیری ہے کہ روٹیوں کا مرتبہ رسول سے بڑھا دیا۔ تو کیا ان خرافات کو تفسیر کہا جائے گا غرض میری مراد راز سے یہ ہے کہ سمجھانے کے بعد سمجھ میں آجاوے کہ یہ مدلول قرآن وحدیث ہی کا ہے۔ وہ راز مراد نہیں جو مخترع و من گھڑت ہو۔ ایک بات تو یہ تھی جو قبل مقصود بیان کرنی تھی۔

ماہ ربیع الاول کی فضیلت

دوسری بات اور ہے جو اس سے اہم ہے اور وہ راجع ہے سنت وبدعت کی طرف۔ وہ یہ ہے کہ ماہ ربیع الاول شریف کو شریف اس لئے کہا کہ حضور کی اس ماہ میں ولادت ہوئی ہے اور جس زمانہ میں آپ کی ولادت ہوئی وہ ماہ ایسا نہیں ہے کہ حضور کی ولادت سے اس میں شرف نہ آئے جیسے کہ ولادت شریف کا مکان اسی وجہ سے معظم ہے کہ حضور کی جائے ولادت ہے۔ چنانچہ وہ موضع شریف محفوظ ہے اور لوگ اس کی زیارت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ زمان بھی شریف ہوگا جس زمانہ میں حضور کی ولادت ہوئی خوب کہا ہے۔

در منزلے کہ جاناں روزے رسیدہ باشد باخاک آستانش داریم مرحبائے
(جس منزل میں محبوب کسی روز پہنچے ہوں ہم اس کی چوکھٹ کی خاک کو مرحبا کہتے ہیں)

ایک اور عاشق صاحب حال کہتا ہے۔

بمقامیکہ نشان کف پائے تو بود سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود
(جس مقام پر آپ کے پاؤں مبارک کے قدموں کا نشان ہے ہم صاحب نظر اس قدم شریف کے نشان پر مدتوں سجدے کریں گے)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس مقام کو سجدہ کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ حضور کے قدم شریف کے موقع پر اس کے متبرک ہونے کے سبب ہم سجدے کیا کریں۔ یہ شعر تو مکان کے شرف میں ہے اور اگر وہ زمان ہے تو اس میں بھی ضرور شرف آوے گا۔ اور وہ ماہ ربیع الاول شریف ہے جس کی نسبت کوئی قائل کہتا ہے۔

لهذا لشهر فى الاسلام فضل　　　و منقبته تفوق على الشهور

(یعنی اس ماہ کے لئے اسلام میں ایک فضیلت ہے اور ایسی منقبت و افضلیت ہے جو بعض حیثیتوں سے تمام مہینوں کی منقبت پر بڑھی ہوئی ہے) اور بعض حیثیتوں سے میں نے اس لئے کہا کہ رمضان المبارک کی فضیلت تو حق تعالیٰ نے بیان بھی فرمائی ہے۔ اور ماہ ربیع الاول کی فضیلت صرف بتائی ہے۔ پس رمضان المبارک کی فضیلت تو بتائی بھی اور بتلائی بھی اور ربیع الاول کی صرف بتائی ہے بتلائی نہیں۔ تو جس کی فضیلت بتائی بھی اور بتائی بھی وہ افضل ہے اس ماہ سے جس کی فضیلت صرف بتائی اور بتائی نہ ہو اس لئے میں نے من وجہ کہا اور وہ وجہ حیثیت یہی ہے کہ اس ماہ میں حضور کی ولادت ہوئی۔ پس اس حیثیت خاص سے اس کو رمضان پر بھی فضیلت ہے اور اگر نظر کو زیادہ وسیع کیا جاوے تو رمضان المبارک کو اس حیثیت سے بھی ربیع الاول پر معنی فضیلت ہو سکتی ہے اس لئے کہ ربیع الاول میں یہ شرف کہاں سے آیا۔ آپ کی ولادت شریفہ کا ظرف ہونے سے اور رمضان المبارک میں شرف کیوں ہے آپ کی عبادت شریفہ کا ظرف ہونے سے۔ پس ربیع الاول شریف تو ولادت شریفہ کا ظرف ہے اور رمضان المبارک عبادت مبارک کا ظرف ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ حضور کی عبادت آپ کی ولادت سے افضل ہے اس لئے کہ مقصود اور غایت ولادت سے عبادت ہی ہے پس عبادت شریفہ کا ظرف ولادت شریفہ کے ظرف سے افضل ہے لیکن تاہم ربیع الاول کو اس خاص حیثیت سے کہ حضور کی اس میں ولادت باسعادت ہوئی ہے صورتاً رمضان المبارک پر فضیلت ہے۔ آگے شاعر کہتا ہے۔

ربیع فی ربیع فی ربیع　　　و نور فوق نور فوق نور

یعنی حضور کا وجود باوجود خود بہار پھر ولادت شریف کا ماہ بھی ربیع کا جس کے معنی بہار کے ہیں اور وہ موسم بھی بہار کا تھا اور حضور خود نور جو سب انوار سے فائق ہے یہ وجہ تھی میرے شریف کہنے کی۔

ایک شبہ کا ازالہ

اب میں اس مضمون اہم کی طرف راجع ہوتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ ماہ ربیع الاول شریف کا اور اسی میں میں یہ مضمون بیان کر رہا ہوں۔ تو شاید پڑھے لکھے لوگوں کو شبہ ہو کہ ہم میں اور اہل بدعت میں کیا فرق رہا۔ وہ بھی بیان کے لئے اس ماہ کی تخصیص کرتے ہیں اور تم نے بھی کی۔

تو بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں کوئی تخصیص نہیں۔ تخصیص کیسے؟ یہاں تو کوئی وعظ اور کوئی بیان اس سے خالی نہیں جاتا کہ آپ کی تشریف آوری کی حکمتیں اور غایات اور اسرار و مقاصد کہ محصل ان کا اتباع کامل ہے اس میں بیان نہ ہوں۔ لیکن اب بھی شاید کسی کو شبہ ہو کہ اور زمانوں میں تو اس خاص اہتمام کے ساتھ بیان نہیں ہوا۔ اس طرح خاص اسی ماہ میں کیوں کیا گیا تو اس لئے عرض ہے کہ ہم نے اس ماہ کو اس ذکر کے لئے من حیث انه زمان الولادت مخصوص نہیں کیا۔ بل من حیث انه

یذکر فیه اهل البدعت ذکر الولادت ولا یحترزون عن البدعات (یعنی اس وجہ سے تخصیص اس ماہ کی نہیں کی گئی کہ اس میں ولادت شریفہ ہوئی ہے اس لئے شریعت میں تو اس کا پتہ نہیں بلکہ اس وجہ سے یہ تخصیص کی ہے کہ اہل بدعت اس ماہ میں ذکر ولادت شریف کی مجالس کیا کرتے ہیں اور ان میں بدعات سے نہیں بچتے ۱۲) جیسے حکیم صاحب اسی وقت دوا دیں گے جب درد ہو اور جب درد جاتا رہا گو دوا دینا اس وقت بھی اس حیثیت سے کارآمد ہے کہ جب کبھی درد ہوگا استعمال کریں گے لیکن درد کے وقت کو تو اس وقت پر ترجیح ہو ہی گی بالفعل تو وہ کارآمد نہیں۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود　　ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

جہاں پستی ہوتی ہے وہیں پانی جاتا ہے .... جہاں اشکال ہوتا ہے وہیں جواب دیا جاتا ہے .... جہاں مرض ہوتا ہے وہاں دوا استعمال کی جاتی ہے .... جہاں رنج ہوتا ہے وہیں شفا پہنچتی ہے۔

گو اس شعر میں رنج اور شفا سے مراد اور ہے یعنی طلب و عشق و وصول لیکن اگر الفاظ کے عموم سے امور منکرہ اور ان کی اصلاح کو بھی شامل ہو تو کیا حرج ہے۔ پس درد اور مرض جب دیکھا جاتا ہے جب ہی دوا دی جاتی ہے اور وہ مرض اسی ماہ میں شروع ہوتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا معالجہ اور اصلاح کی جاوے۔ بخلاف اس کے کہ چار ماہ پہلے یا پیچھے یہ مضمون بیان کیا جاتا کہ گو مفید ہوتا لیکن اس مدت کے اندر لوگ اس کو بھول بھال جاتے اور اتنی ہم نے ان کی مخالفت بھی کر لی کہ وہ لوگ تو بارہویں کا انتظار کرتے ہیں ہم کو اتنا صبر کہاں تھا کہ بارہویں کا انتظار کرتے۔ یہاں تو اس ماہ کے شروع ہوتے ہی اضطراب شروع ہوا کہ بیان کرو۔ اس لئے ہم نے سب سے اول کے جمعہ ہی کو شروع کر دیا۔ اس مخالفت کرنے سے اب ہم پر بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔

ایک دوست بیان کرتے تھے کہ ہم کو ایک مرتبہ ایک اسلامی یعنی مسلمانوں کے ہوٹل میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ ہوٹل میں میز کرسی پر کھانا کھاتے ہیں۔ چنانچہ میز پر کھانا چن دیا گیا۔ ہم نے عمر بھر میں اس طرح کھانا نہ کھایا تھا اس لئے کہ تشبہ ہے نصاری کے ساتھ۔ ہم نے دو طرح سے اس تشبہ کو توڑا۔ ایک تو یہ کیا کہ اپنے ہاتھ میں برتن کھانے کا لے لیا۔ وہ لوگ ہاتھ میں لے کر نہیں کھاتے بلکہ میز پر رکھا ہوا کھاتے ہیں دوسرے مخالفت یہ کی کہ سب نے مل کر ایک برتن میں کھایا اور وہ مل کر نہیں کھاتے۔ اپنے اپنے سامنے سے کھاتے ہیں۔

مجھے ایک بار حیدر آباد جانے کا بطریق سیاحت اتفاق ہوا۔ پھرتے پھراتے کھانے کا وقت آ گیا۔ کھانے کے لئے مغل کے ہوٹل میں گئے وہاں کھانے رکھنے کے لئے میز اور بیٹھنے کے لئے تپائیاں تھیں۔ ہم نے کہا کہ ہم لوگ تو اس پر کھانا نہ کھاویں گے۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہاں تو اسی طرح کھانا کھایا جاتا

ہے ہم نے کہا کہ ہم لوگ طالب علم ہیں کچھ تصنیف کر لیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان سب تپائیوں کو جوڑ دو۔ چنانچہ وہ جوڑی گئیں تو وہ ایک تخت سا ہو گیا۔ پھر سب نے بیٹھ کر اس پر شستہ آدمیوں کی طرح کھانا کھایا۔ پس ہم نے یہاں بھی اہل بدعت کی اتنی مخالفت کر لی۔

تمہید اصل مقصود

یہ دو مضمون تو قبل مقصود بطور تنبیہ کے تھے ان کو تمہید نہیں کہہ سکتے۔ اب قبل مقصود عرض کرنے کے ایک مضمون بطور تمہید کے بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ میں نے کہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا راز بطرز اہل اسرار و صوفیہ کے بیان کروں گا۔ تو جاننا چاہئے کہ صوفیہ و اہل اسرار بکثرت گزرے ہیں اور عجب نہیں کہ انہوں نے مختلف طور سے اس مضمون کو بیان فرمایا ہو مگر اس سے تو جی گھبراتا ہے کہ کتابیں ٹٹولی جاویں اور سب میں تلاش کیا جاوے اور بزرگوں کے ملفوظات دیکھے جاویں۔ کام کی بات اگر ایک معتمد جگہ سے بھی مل جاتی ہے تو قناعت ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اس کی کوشش مت کرو کہ بزرگوں کے ملفوظات ازبر کر لو بلکہ اس کی سعی کرو کہ تم خود ایسے بن جاؤ کہ تمہارے منہ سے بھی وہی نکلنے لگے جو ان ملفوظات والوں کے منہ سے نکلا ہے مگر ہم سے سوال ایسے تو کہاں ہونے تھے لیکن اتنی بات تو ضرور ہے کہ زیادہ کاوش سے جی گھبراتا ہے اگر مقنع مضمون ایک مقام سے مل جاتا ہے تو بس اسی پر کفایت کی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پہلے سے کچھ بیان کا قصد تھا بھی نہیں نہ کوئی مضمون ذہن میں حاضر تھا دفعۃً ہی دل میں آیا کہ اس کے متعلق بیان کیا جاوے اور اتفاق سے میں آج کل مثنوی شریف کے دفتر ششم کی شرح لکھ رہا ہوں۔ اس میں ایک مقام آ گیا بلکہ چند مقامات کہ ان میں اس کے متعلق مضمون ہے اور مضمون بھی کافی پس میں نے اس پر قناعت کی۔ اس لئے کہ مضمون کافی اور کہنے والے یعنی مولانا روم کا صوفی و عارف و محقق ہونا مسلم الثبوت۔ تو پھر کفایت کیوں نہ ہو اور پھر مثنوی شریف ایک ایسی عجیب اور مقبول کتاب کہ اس کی مقبولیت بھی عام۔ ہاں جو شخص ظاہر پرست اور خشک ہیں وہ اس کی خوبی کو کیا جانیں۔ جیسا کہ جب مجنوں کے عشق کی بہت شہرت ہوئی تو خلیفہ وقت کو خیال ہوا کہ لیلیٰ کو بلا کر دیکھنا چاہئے کہ کیسی ہے جس کی وجہ سے مجنوں مجنوں ہو گیا بلا کر دیکھا تو ایک سانولی سی عورت ہے۔ خلیفہ تعجب سے کہتا ہے جو اس شعر میں مذکور ہے۔

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی   کز تو مجنوں شد پریشان و غوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی   گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی
دیدہ مجنوں اگر بودے ترا   ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

(خلیفہ نے لیلیٰ سے پوچھا تو ہی ہے وہ جس کی وجہ سے مجنوں پریشان اور بے راہ ہو رہا ہے۔

دوسرے حسینوں سے تو کسی بات میں تو زیادہ تو ہے نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اگر تو مجنوں نہیں تو خاموش رہ اگر تجھ کو مجنوں کی آنکھ میسر ہوتی تو اس وقت دونوں عالم تجھے بےقدر معلوم ہوتے۔)

(یعنی تو دوسرے خوبصورتوں سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ لیلیٰ نے کہا کہ تو چونکہ مجنوں نہیں ہے اس لئے تو خاموش رہ۔ اگر مجنوں کی آنکھ تجھ کو ہوتی تو دونوں جہان تیرے نزدیک بےقدر ہو جاتے)

پس مثنوی شریف کی طرف نظر کرنا بھی سوائے اس کے مجنوں کے کسی اور کو روا نہیں اگر مجنوں کے سوا کوئی اور دیکھے گا تو دو قسم کے ضرر ہوں گے۔ اس لئے کہ دیکھنے والے دو قسم کے ہیں یا تو وہ لوگ ہیں جو متشدد ہیں جنہوں نے مولانا پر کفر کا فتویٰ دیا ہے۔ مولانا ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔

بدگہر را علم و فن آموختن — دادن تیغ ست دست راہزن

(بدفطرت شخص کو علم و فن سکھانا راہزن کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے۔)

یہ تو عام طور سے ایسے متشددین کے بارہ میں ہے اور ایک مقام پر دفتر سوم میں خاص مثنوی شریف پر طعن اور اعتراض کرنے والے کو کہتے ہیں گو وہ اعتراض دوسری نوع کا تھا۔

خربطے ناگاہ از خر خانہ — سر بروں آورد چوں طعانہ
کایں سخن پست است یعنی مثنوی — قصہ پیغمبر است و پیروی

(گدھوں کے طویلے سے ایک احمق نے اچانک طعنہ باز کی طرح سر ابھارا۔ یہ بات یعنی مثنوی گھٹیا بات ہے۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی پیروی کا قصہ ہے۔)

کسی شخص نے مثنوی شریف پر اعتراض کیا تھا اس کے متعلق یہ اشعار ہیں آگے چل کر بہت لتاڑا ہے اور طاعن مثنوی کو طاعن قرآن سے تشبیہ دے کر فرمایا ہے۔

اے سگ طاعن تو عوعو می کنی — طعن قرآں را برو نشومی کنی

(اے طعنہ دینے والے کتے تو بھوں بھوں کرتا ہے قرآن پر طعنہ کیلئے راستہ بناتا ہے۔)

غرض متشددین کو تو مثنوی شریف کے دیکھنے سے یہ ضرر ہو گا کہ بزرگوں پر اور اہل اللہ پر اعتراض کریں گے اور اعتراض اور طعن اہل اللہ پر کرنا بہت سخت بات ہے اس کا ادنیٰ نقصان تو جو کہ فی نفسہ وہ بھی بڑا نقصان ہے یہ ہے کہ یہ شخص ان کی برکات سے محروم رہتا ہے اور اشد نقصان یہ کہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ ایسے شخص کے سوء خاتمہ کا خوف ہے اور یا دوسری قسم کے دیکھنے والے جاہل معتقد ہوں گے۔ ان کو ضرر پہلے ضرر سے زیادہ ہو گا کہ وہ مضامین سمجھیں گے اور ایسے معانی پر محمول کریں گے کہ ان کا اعتقاد رکھنا کفر ہے تو اپنا ایمان اسی وقت خراب کریں گے حالانکہ مولانا کا وہ مطلب بھی نہ ہو گا۔ مولانا کی تمام مثنوی کا خلاصہ تو وہ ہے جو انہوں نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے۔

مثنوی من دوکان وحدت است — ہرچہ بینی غیر وحدت آں بت است

(میری مثنوی وحدت (اللہ کو ایک ماننا' ایک دیکھنا' ایک یقین کرنا کی دکان ہے اس کے علاوہ غیر وحدت جو دیکھتا ہے وہ بت ہے)

یعنی توحید مگر وہ خود ایسا دقیق مضمون ہے کہ اس میں بھی جہل سے غلط فہمی غالب ہے۔ ایسے مضامین کے متعلق بھی مولانا علیہ الرحمۃ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

نکتہا چوں تیغ پولاداست تیز   چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ را نبود حیا

(یعنی جب تمہارے پاس تیغ و ڈھال نہیں ہے یعنی ایسے مضامین کے لائق فہم نہیں جس سے تم اپنے ایمان کو بچا سکو تو ایسے مضامین کے پاس مت آؤ)

اور جو لوگ باوجود کم فہم اور کورے ہونے کے تصوف کے نکات اور تحقیقات دوسروں کے سامنے بیان کر کے اپنے کو صوفی کہلوانا چاہتے ہیں ان کے متعلق بھی مولانا لکھتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند   در سخن ہا عالمے را سوختند

(وہ قوم ظالم ہے جس نے آنکھیں بند کر لیں اور ناروا باتوں سے ایک عالم کو جلا دیا۔)

ان اشعار سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ مولانا بڑے اعتدال سے چلتے ہیں مگر اسی کے لئے ہے جو سمجھے اور جو نہ سمجھے اس کے لئے تو فتویٰ ہے شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا کہ یحرم النظر فی کتبنا (یعنی ہماری کتابوں کا دیکھنا نا اہل کو حرام ہے) مگر اس سے ان کتب کا مذموم ہونا لازم نہیں آتا جیسے حسین لڑکے اور حسین عورت کی طرف بدنظر سے دیکھنا حرام ہے سو اس کے حسین ہونے میں کلام نہیں۔ بے شک وہ حسین ہے اور حسین ہی کی وجہ سے دیکھنا حرام بھی ہے مگر خاوند کو اور باپ بھائی کو دیکھنا جائز ہے اس لئے کہ وہ اہل ہے اسی طرح تصوف کی کتابیں دیکھنا اس کے اہل اور اس کے محرم کو جائز ہے اور نا اہل کو جو اس سے اجنبی ہو اس کو حرام ہے پس جب مثنوی شریف ایسی خوبیوں اور اعتدال کو لئے ہوئے ہے تو اس سے اس مضمون کو نقل کر دینا میرے نزدیک کافی وافی ہے۔

قوم لوط کا قصہ

بعد ان تنبیہات و تمہید کے اب میں بعونہ تعالیٰ مقصود کو بیان کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کی قسم وہ لوگ نشہ اور مستی میں بھٹک رہے تھے۔

یہ آیت قوم لوط کے بارہ میں ہے اوپر سے ان کا قصہ چلا آتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ قوم لوط کی بدکاری تو مشہور ہی ہے ان کے ہلاک کرنے کے لئے فرشتے حسین لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کی

خدمت میں آئے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو پہچانا نہیں سمجھے کہ مہمان ہیں۔ دیکھ کر پریشان ہوئے کہ اب لوگ ان کو دق کریں گے۔ چنانچہ قوم کو خبر ہوئی کہ لوط علیہ السلام کے یہاں بڑے حسین حسین لڑکے آئے ہیں یہ سن کر بہت سے بدمعاش آئے' لوط علیہ السلام بہت گھبرائے اور فرمایا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں مجھ کو میرے مہمانوں کے روبرو رسوانہ کرو۔ قوم میں لڑکیاں موجود ہیں ان سے شادی کرلو۔ قوم نے کہا کہ ہم کو عورتوں کی ضرورت نہیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت لوط علیہ السلام اور بھی زیادہ پریشان ہوئے۔ جب فرشتوں نے دیکھا کہ لوط علیہ السلام کو بہت پریشانی ہے تو فرشتوں نے کہا یا لوط انا رسل ربک. یعنی تم پریشان مت ہو۔ ہم تو تمہارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ لوط علیہ السلام مطمئن ہو گئے جب قوم نے ان لڑکوں پر ہاتھ ڈالنا چاہا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنا بازو ان کی آنکھوں پر پھیر دیا۔ سب کے سب اندھے چوپٹ ہو گئے۔ اسی کی نسبت ارشاد ہے فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ کوئی تعجب نہ کرے کہ بازو پھیرنے سے کیسے اندھے ہو گئے۔ فرشتوں کو تو اللہ تعالیٰ نے بڑی قدرت عطا فرمائی ہے۔ انسانوں میں بعضے بندوں کو عجیب عجیب تصرفات عطا فرمائے ہیں۔

حضرت مولانا فخر نظامی کا قصہ ہے کہ یہ حسین بہت تھے اور ابتداء عمر ہی سے اللہ تعالیٰ نے صاحب نسبت فرمایا تھا جب دہلی پہنچے تو بدمعاشوں میں شہرت ہوئی کہ ایک لڑکا بڑا حسین آیا ہے چلو گھوریں۔ چنانچہ سب دیکھنے اور چھیڑنے کے لئے آئے حضرت مولانا اس وقت جامع مسجد میں تھے جامع مسجد کے دروازے پر ایک حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ جب مولانا نماز پڑھ کر اترے تو دق کرنا چاہا۔ مولانا نے ایک نظر اٹھا کر دیکھا تو سب گر گئے اور فرمایا کہ آؤ گھورو۔ گھورتے کیوں نہیں۔

بس اس قصہ کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی حیات اور جان کی قسم ہے وہ یعنی قوم لوط اپنی مستی اور نشہ میں بھٹک رہے تھے۔ مضمون تو صرف اتنا ہے اب میں اس سے اپنا مقصود عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس قسم سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات شریفہ کی عظمت شان بیان فرمادی اور سبحان اللہ۔ بیان بھی فرمائی ایسے طرز سے کہ سننے والوں کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصود قوم لوط کی حالت کو بیان کرنا ہے مگر اس کے ضمن میں حضور کی محبوبیت کو عجیب انداز سے بیان فرما گئے۔

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

(ایسے اسراروں کی دوسروں کی حکایات وتمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے۔)

کہ جو طالب اور محب اور جن کے دل میں کھٹک ہے ان کی نظر تو فوراً پڑ جائے گی۔ اس لئے کہ پانی کو اگر اسباب میں چھپا کر بھی لے چلیں تو پیاسے کو تو اس کی جھلک ہی بتلا دے گی گو کوئی نہ کہے۔ طالب کی تو یہ شان ہوتی ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من از رفتار پایت می شناسم

(جس رنگ کا چاہو لباس پہن لو میں تمہاری پاؤں کی رفتار کو ہی پہچانتا ہوں۔)

اور ایک نسخہ میں ہے

من انداز قدت را می شناسم

(میں تمہارے قد کو پہچانتا ہوں)

اگر کوئی محبوب صورت بدل کر آوے اور عاشق یہ کہے کہ کون ہے تو وہ عاشق نہیں ہے عاشق وہ ہے کہ محبوب خواہ کسی حال میں ہو ہر حالت میں وہ اس کے دل میں نقش کالحجر ہو۔ پس طالب کے لئے تو انداز بیان کا کافی ہو گیا اور محبوبیت حضور کی اس کو عیاں ہو گئی اور جو ناقد اور غیر طالب ہے اس کو التفات بھی نہ ہوگا کہ کیا بات کہہ دی اور کتنی دور کی اور کس قدر گہری فرمائی اور ایسے انداز سے فرمایا۔ ایسے ہی ناقدروں اور ظاہر پرستوں سے چھپانے کے لئے ہے۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(ظاہر پرستوں کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو بلکہ ان کو رنج خود بینی میں مرنے دو)

پس ایسوں سے چھپا رہنا ہی بہتر ہے۔

حق تعالیٰ کی غیرت کا اقتضاء

حق تعالیٰ کی غیرت کا اقتضاء ہوتا ہے کہ بعض اوقات میں شیون کے اعتبار سے اپنے خاص بندوں کی شان کو مخفی رکھیں۔ فرماتے ہیں۔

اولیائی تحت قبائی لایعرفهم سوائی (لم اجد هذا الحديث فی "الموسوعة اطراف الحديث")

چنانچہ بعض اولیاء اللہ کا بالکل اخفا کیا گیا ہے کہ کسی کو ان کے مقرب ہونے کی اطلاع بھی نہیں اور وہ خود بھی اپنے کو مخفی رکھتے ہیں اور اگر کوئی ان سے کہتا بھی ہے کہ اپنے کو ظاہر کیجئے لوگوں کو فیض ہو گا سلسلہ چلے گا تو وہ بزبان حال جواب دیتے ہیں۔

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار   دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمدؔ تو عاشق ہے مشیخت سے تیرا کیا کام۔ اللہ کا دیوانہ عاشق بن جا سلسلہ باقی رہے نہ رہے۔)

اور انبیاء کے شیون نبوت کا تو اس لئے اخفا نہیں کیا جاتا کہ مخفی رکھیں تو فیوض کس طرح ہوں ہاں ان کی بعض شیون کو بعض احوال میں بعض موقع پر بعض اوقات تک بعض وجوہ دلالت کے اعتبار سے مخفی رکھا جا سکتا ہے چنانچہ حضور کا یہ کمال یعنی محبوبیت کا خاصہ جو قسم سے مفہوم ہو جاوے۔ اس مقام پر اس حیثیت سے مخفی کی گئی ہے کہ یہ آیت کے لئے دال بعبارت النص نہیں ہے گو دال باشارۃ النص ہے۔

اس لئے کہ اس مقام پر کہ مقام ذکر قوم لوط کا ہے ضرورت اس کے اظہار کی نہ تھی اور اہل نظر کے نزدیک بعض وجوہ سے اظہار صریح سے بھی زیادہ ہو گیا۔ کیونکہ اس طور پر بیان فرمانا بہ نسبت قصداً بیان کرنے کے اس لئے زیادہ ابلغ ہوتا ہے کہ اس انداز سے اس کو مثل مسلمات اور معروف کے کر دیا گیا ہے کہ اس کو قصداً بیان کرنے کی گویا ضرورت ہی نہیں مخاطب کو بھی ہے اس لئے اس کو مقسم بہ قرار دے دیا۔ ہاں اس کو دعویٰ بنا کر اس پر احتجاج کرنے کے موقع پر اس کو تصریحاً و قصداً بیان کیا جاوے گا۔

علوم عقلیہ کی ضرورت

رہا یہ کہ محبوبیت اس لئے کیسے سمجھی گئی اور وجہ استدلال کیا ہے تو وہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شے کی قسم کھاویں تو وہ بہت بڑی شے ہو گی اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہمارے عرف میں کہتے ہیں کہ تمہارے سر کی قسم سو ایسی قسم جب ہی کھائی جاتی ہے جبکہ قسم کھانے والے کو مقسم بہ سے غایت تعلق ہو۔

یہاں پڑھے لکھے حضرات کو شبہ ہو سکتا ہے کہ قسم کھانا تو دلیل عظمت کی نہیں ہے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں کی قسم کھائی ہے انجیر کی قسم اور فجر اور چاشت اور رات کی قسمیں قرآن مجید میں موجود ہیں اگر یہی دلیل عظمت کی ہے تو یہ سب چیزیں عظیم الشان ہوں گی؟

اس شبہ کے جواب میں اول ایک مقدمہ عقلی سمجھ لیجئے۔ اسی واسطے قرآن مجید کے فہم کے لئے علوم عقلیہ کی بھی ضرورت ہے خواہ تحصیل سے ہو یا فطرت سلیمہ سے۔

کیونکہ اگر فطرت صحیح ہے تو پھر تحصیل کی ضرورت نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے معقول کہیں نہیں پڑھی مگر حق تعالیٰ نے فطرت ہی سلیم پیدا کی تھی ان حضرات کے طبائع ایسے سلیم تھے کہ عقلیات ان کے سامنے دست بستہ کھڑی رہتی تھیں جیسے کسی صرفی نحوی کا قول مشہور ہے کہ کہا کرتا تھا کہ ہمارے تو حجرہ کا چوہا چوہا صرفی نحوی ہے۔

حضرت شاہ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جن کے ہمراہ مولانا اسماعیل صاحب شہید بھی تھے جب پشاور پہنچے تو وہاں کے علماء مولانا شہید کی شہرت سن کر امتحان کی غرض سے آئے۔ مولانا اس وقت ایک خستہ سا تہبند باندھے ہوئے گھوڑے کو کھرا کر رہے تھے ان سے پوچھا کہ مولانا کہاں ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ کیا کام ہے انہوں نے کہا تجھ کو اس سے کیا مطلب۔ مولانا کا پتہ بتلاؤ۔ مولانا نے فرمایا کہ تم بتلاؤ تو سہی کیا غرض ہے کہنے لگے کہ ہم کو کچھ پوچھنا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھ سے ہی پوچھ لو۔ ان کو معلوم ہو گیا کہ یہی ہیں پھر جو کچھ جس فن میں پوچھا گھوڑے کو کھرا کرتے ہوئے حل کر دیا۔ سب متعجب ہوئے کہ ہم باوجود اس کے کہ کم علم ہیں ایسے عبا و قبا و عمامے باندھے ہوئے ہیں اور مولانا اتنے بڑے عالم اور اس حالت میں رہتے ہیں مولانا نے فرمایا تعجب نہ کرو۔ تم مجھ کو اپنے سب کی برابر سمجھتے ہو اگر میں تم سب کی برابر کپڑے پہنوں تو اتنے بار کا کیسے متحمل ہوں۔

یہاں سے تو وہ عالم چلے گئے اور سمجھے کہ مولانا چونکہ عالم ہیں ان سے تو ہم جیت نہ سکے۔ چلو سید صاحب کو دق کریں گے وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ کیونکہ سید صاحب کافیہ تک پڑھے ہوئے تھے حضرت شاہ عبدالعزیز کے یہاں پڑھنے کے لئے آئے تھے ایک روز مطالعہ کر رہے تھے کہ کتاب کے حروف نظر نہ آئے اور سب چیزیں تو نظر آویں لیکن کتاب کے حروف نظر نہ آویں۔ شاہ صاحب نے اس پر مطلع ہو کر پڑھنا چھڑا دیا کہ تم پڑھنا چھوڑ دو۔ تم اور کام کے لئے پیدا ہوئے چنانچہ پڑھنا چھڑا کر ان کو ذکر و شغل کی تعلیم کی۔

الحاصل یہ علماء سید صاحب کی خدمت میں آئے ادھر علماء اکثر یک فنی ہوئے۔ کوئی معقول میں یکتا ہے کوئی صرف جانتا ہے کوئی نحوی ہے غرض جمع ہو کر آئے اور مختلف سوالات شروع کئے۔ اگر دینیات کے متعلق کوئی سوال کرتے تو سید صاحب داہنی طرف رخ کر کے جواب دیتے تھے اور جو غیر دینیات کا ہوتا تھا معقول وغیرہ کا تو بائیں طرف رخ کر کے جواب دیتے تھے اور جواب بھی کیسا اہل علم کے طرز پر مریدین کو سخت حیرت ہوئی کہ سید صاحب کی زبان سے وہ الفاظ نکل رہے ہیں کہ کبھی عمر بھر بھی نہ سنے تھے جب وہ مجلس ختم ہوئی تو بعض لوگوں نے پوچھا فرمایا کہ جب یہ لوگ آئے تو میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اللہ مجھ کو رسوا نہ کیجئے۔ حق تعالیٰ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ بوعلی علیہ الرحمۃ کی روح کو حکم دیا کہ جواب میں اعانت کرو۔ چنانچہ امام صاحب کی روح میرے داہنی طرف تھی اور شیخ کی بائیں طرف۔ جو وہ کہتے تھے میں کہہ دیتا تھا پس ایسے حضرات تو مستثنیٰ ہیں لیکن ہم کو علوم ضروریہ نقلیہ و عقلیہ کی تحصیل ہی کرنا چاہئے۔

مگر ایسی تحصیل نہیں جیسے سہارنپور میں ایک مسجد میں کوئی واعظ آئے۔ اس مسجد میں ایک نابینا عالم بھی رہتے تھے۔ واعظ صاحب نے کسی سے پوچھا کہ یہاں اواج (وعظ) بھی ہوا کرے۔ لوگوں نے کہا کہ آج تو کوئی بیان کرنے والا نہیں ہے۔ پکار کر کہا کہ بھائیو! اواج ہوگی۔ چنانچہ بعد نماز کے منبر پر جا بیٹھے اور کچھ واہی تباہی بک کر کہا کہ بھائیو! تھکے ماندے ہیں اتنی آج کہی اور باقی پھر کہیں گے۔ ان نابینا مولوی صاحب نے فرمایا کہ ان واعظ صاحب کو ذرا میرے پاس لاؤ آئے۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ آپ کی تحصیل کہاں تک ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ تسیل (تحصیل) پچھے مہاری اندھے تسیل (یعنی اے اندھے ہماری تحصیل پوچھتے ہو؟) تسیل مہاری ہاپڑ کی۔ تو جناب تحصیل سے ایسی تحصیل مراد نہیں ہے بلکہ علماء کی تحصیل مراد ہے کہ برسوں چٹائیاں گھستے ہیں اور دھواں دماغوں میں لیتے ہیں جب کچھ حاصل ہوتا ہے۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے۔ پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے۔)

ایک درویش سے کسی نے پوچھا تھا کہ یہ کیا بات ہے کہ علماء اگر تھوڑا سا بھی مجاہدہ کرتے ہیں تو ان کو بہت جلدی دولت باطنی حاصل ہو جاتی ہے ان درویش نے بہت اچھا جواب دیا۔ مجھ کو پسند آیا۔ انہوں نے فرمایا کہ علماء تھوڑا مجاہدہ نہیں کرتے بلکہ سب سے زیادہ کرتے ہیں۔ جب سے وہ الف بے تے پڑھتے ہیں

اور تحصیل علوم تک مجاہدہ ہی تو ہے قابلیت اور استعداد تو اس سے پیدا ہو جاتی ہے اس کے بعد تھوڑا سا کام کرنا ان کا کام بنا دیتا ہے۔ تاؤ تو پہلے ہی سے آ جاتا ہے صرف پڑیا ڈالنے کی کسر رہ جاتی ہے تو وہ شیخ کے یہاں آ کر ہو جاتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے تمام علوم کی ضرورت ہے۔

فضیلت کی انواع

بعض لوگ لکھے پڑھے تو ہوتے نہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم قرآن کو سمجھ لیں اور چونکہ موقوف ہے دوسرے علوم پر اس لئے شبہات پیدا ہوتے ہیں پھر ان شبہات کو لے کر علماء سے الجھتے ہیں چنانچہ یہ شبہ بھی کہ جب قرآن میں انجیر وغیرہ کی بھی قسم ہے تو اللہ تعالیٰ کا قسم کھانا دلیل عظمت و رفعت شان مقسم بہ کی نہیں اس کم علمی ہی سے پیدا ہوا ہے۔

اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ عقلی سمجھئے۔ وہ یہ ہے کہ ہر شے کا شرف اس کی نوع کے اعتبار سے ہوتا ہے تو مقسم بہ ہونا بے شک دلیل ہے شرف کی لیکن نہ مطلقاً بلکہ فی نوعہ یعنی یہ سمجھا جاوے گا کہ یہ شے اپنی نوع میں سب افراد سے افضل ہے اس کو میں اور واضح کرتا ہوں۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ کھانا افضل ہے یا پانی تو وہ مجنوں ہے یہ سوال ہی غلط ہے کہ افضلی اور مفضولیت ایک نوع کے افراد میں ہوتی ہے مثلاً یہ سوال صحیح ہے کہ پلاؤ افضل ہے یا بریانی یا پانی افضل ہے یا دودھ ہاں اگر انواع ہی میں گفتگو ہو تو وہ دوسری بات ہے لیکن اگر افراد میں ہو تو اس میں یہ رعایت ضرور ہوگی کہ ایک نوع کے تحت میں داخل ہوں۔ مثلاً یوں نہ کہیں گے کہ مسجد افضل یا فلاں کتاب۔ ہاں یوں کہیں گے یہ مسجد افضل ہے یا فلاں مسجد یا فلاں گھر۔

جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا تو اب جواب سمجھئے کہ مقسم بہ ہونا بے شک دلیل اس کے شرف کی ہے مگر یہ نہیں کہ وہ سب اشیاء سے افضل ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی نوع میں افضل ہے پس انجیر بے شک افضل ہے لیکن ثمرات میں اور فجر بلاشبہ اشرف ہے مگر اوقات میں۔ پس اس بناء پر آپ کی حیات کے مقسم بہ ہونے سے حضور کی جو فضیلت و عظمت ثابت ہوئی وہ اپنے اخوان یعنی انبیاء میں ثابت ہوئی۔ پس اس سے تمام پیغمبروں سے افضل ہونا ثابت ہوا اور انبیاء سب انسانوں سے افضل ہیں۔ پس حضور کا سید ولد آدم ہونا معلوم ہوا۔

اب رہی یہ بات کہ فضیلت مطلقہ کیسے ثابت ہوئی۔ تو وہ بدیں طور ہے کہ باتفاق عقلاء انسان اشرف المخلوقات ہے اور نیز حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **ولقد کرمنا بنی آدم**۔ پس جب کہ نوع انسان تمام انواع سے افضل ہے اور انواع انسان میں انبیاء افضل ہیں اور حضور افضل المرسلین و سید الانبیاء ہیں۔ پس حضور افضل الخلق ہوئے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی دو قسمیں فرمائی ہیں عرب و عجم۔ ان میں عرب کو فضیلت عطا فرمائی۔ پھر عرب میں قریش کو افضل بنایا اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب فرمایا۔ پھر ان میں مجھ کو پیدا کیا۔ پس میں افضل ہوں نسباً بھی۔ پس اب وہ شبہ دفع ہو گیا اور لعمرک سے فضیلت و محبوبیت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثابت ہو گئی۔

حیاۃ النبی کی تفصیل

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اول معلوم ہو چکا ہے قسم معمولی شے کی نہیں کھائی جاتی۔ مقسم بہ کوئی عجیب اور ذی شرف شے ہونا چاہئے۔ اب دیکھنا چاہئے مقسم بہ یہاں کیا ہے تو مقسم بہ یہاں حضور کی حیات ہے اس لئے کہ عمر بفتح وضم نام ہے حیات اور بقاء کا اور حیات کہتے ہیں ذی حیات کی اس حالت کو جو تولد سے لے کر وفات تک ہے اور اگر نظر کو اور وسیع کیا جاوے تو حضور کے لئے بعد وفات کے بھی حیات برزخی ثابت ہے اور وہ حیات شہداء کی حیات برزخی سے بھی بڑھ کر ہے اور اتنی قوی ہے کہ حیات ناسوتی کے قریب قریب ہے چنانچہ بہت سے احکام ناسوت کے اس پر متفرع بھی ہیں۔ دیکھئے زندہ مرد کی بیوی سے نکاح جائز نہیں ہے حضور کی ازواج مطہرات سے بھی نکاح جائز نہیں اور زندہ کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، حضور کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی اور حدیثوں میں صلوٰۃ وسلام کا سماع وارد ہوا ہے۔ سو یہ تحقیقات ہیں اہل اسرار کی۔ اس سے اصلی راز ان احکام یعنی **لاتنکحوا ازواجہ من بعدہ** اور **لانورث ماترکناہ صدقۃ** کا معلوم ہو گیا پھر حیات برزخی کے بعد حیات اخروی ہے۔ وہ تو سب کو شامل ہے تو انبیاء کو بطریق اولیٰ حاصل ہو گی پس حیات کا مصداق حضور کی ولادت شریف سے لے کر جنت کے دخول و خلود تک ہے یہ کلام تو منتہیٰ کی جانب میں ہے اور اگر ابتداء کی جانب نظر کو وسعت دی جاوے تو آپ کی نوریت کی جو حالت عالم ارواح سے بھی پہلے تھی اس کو بھی حیات کہہ سکتے ہیں جس کی نسبت ارشاد ہے **کنت نبیا وآدم بین الروح والجسد**

میں اس وقت بھی نبی تھا جب حضرت آدم علیہ السلام روح اور جسم کے مابین تھے۔ اور عالم ارواح میں جب الست کا عہد لیا گیا اور پوچھا گیا **الست بربکم**' تو سب نے حضور کی طرف دیکھا کہ دیکھیں آپ کیا جواب دیتے ہیں تو سب سے اول حضور نے جواب دیا **بلٰی انت ربنا**۔ اس کے بعد اوروں نے بلیٰ کہا اوروں کی علم و معرفت کے مربی بھی حضور ہوئے اور تربیت فی العلوم حیات پر موقوف ہے پس جب سے نور مخلوق ہوا ہے اس وقت سے حیات لی جا سکتی ہے پس اس تقریر پر حضور کی حیات کی چار حالتیں ہوں گی۔

ایک تو نور شریف کے پیدا ہونے سے ولادت شریف تک۔

دوسرے ولادت شریفہ سے وفات تک۔

تیسرے وفات شریفہ سے حشر و نشر تک۔

چوتھے اس سے خلود جنت تک۔

پس اگر لَعَمْرُکَ سے یہ حیات جس کے چار حصے ہیں مراد لی جاوے تو مجھ کو ہر حصہ کے متعلق مفصل بیان کرنا پڑے گا اور وقت اتنا وسیع نہیں۔ اس لئے میں وہی حصہ حیات کا لیتا ہوں جس کو اہل عرف حیات کہتے ہیں یعنی ولادت شریف سے لے کر وفات تک۔ پس معنی لَعَمْرُکَ کے یہ ہوئے کہ آپ کی اس حصہ عمر کی قسم ہے۔

مدعیان محبت نبویہ کی غلطی

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا یہ حصہ عمر اتنا رفیع الشان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقسم بہ بنا اور اس حصہ عمر و حیات کا ایک جزو ولادت شریفہ بھی ہے تو اس کا بھی عظیم القدر و رفیع الشان ہونا ثابت ہوا۔ اسی طرح اس کا دوسرا حصہ قوت استعداد و حصول کمالات کا ہے۔ تیسرا حصہ تبلیغ و دعوت کا ہے۔ چوتھا حصہ تکمیل امت کا ہے اور یہ تیسرا اور چوتھا حصہ بعض احوال میں متعانق بھی ہے۔ پھر تکمیل کی دو حیثیتیں ہیں ایک تکمیل حاضر کی خود اس کی اصلاح کے لئے۔ دوسری تکمیل حاضر کی اصلاح غایت کے لئے۔ پس ان سب حصص کی رفعت و عظمت ثابت ہوئی اور عظمت و رفعت شے کی جس طرح باعتبار اس کی ذات کے ہوتی ہے اسی طرح باعتبار اس کی غایت کے بھی ہوتی ہے۔ بلکہ زیادہ مقصودیت شے کی اس کی غایت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

پس حضور کی تشریف آوری عالم ناسوت بجمیع الحصص کی بھی کوئی غایت ضرور ہوگی اور وہ غایت ایسی ہے کہ اس کو سن کر مدعیان محبت کی بھی اصلاح ہوگی۔ اس لئے کہ انہوں نے مزے دار مضمون تو یاد کر لئے کہ حضور یوں پیدا ہوئے اور ایسے معجزات ظاہر ہوئے لیکن اس تشریف آوری کی غایت کو انہوں نے سمجھا ہی نہیں۔ اس لئے کہ اس کے سمجھنے میں تو نفس کو تعب ہوتی ہے اور جان نکلتی ہے۔

ان لوگوں کی بلا تشبیہ ایسی مثال ہے کہ مثلاً ہندوستان میں ایک حاکم نائب السلطنت ہو کر آیا۔ اس کے آنے کی خوشی میں بڑے لوگوں نے بڑے بڑے جلسے کئے اور مٹھائی تقسیم کی اور بڑے بڑے لیکچر اور اشعار مدحیہ کہے اور ان ہی بزرگوں کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا جب وہ حاکم اس جلسہ سے چلا گیا تو اخبار میں بغاوت انگیز مضمون لکھنے شروع کئے۔ کیا ان لوگوں کو محب حاکم کہا جاوے گا؟

یہی حالت ان لوگوں کی ہے کہ محبت رسول کا دم بھرتے ہیں اور ان کی ہی نافرمانی کرتے ہیں۔

چنانچہ جن لوگوں نے عید میلاد النبی تراشی ہے جس کے متعلق میں نے پار سال بیان کیا تھا اور وہ بیان ''النور'' کے نام سے طبع بھی ہو چکا ہے اور اتفاقی بات ہے کہ جن صاحب نے اس کو طبع کرایا تھا۔ انہوں نے ہی آج کے بیان کی بھی طبع کرنے کی درخواست کی ہے اور میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اتحاد مضمون اور اتحاد شائع کنندہ پر نظر کر کے نام بھی اس کا اس کے مناسب ''الظہور'' رکھ دیا جاوے۔ اس لئے کہ اس میں حضور کی تشریف آوری کی غایت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

انہوں نے (یعنی موجدان عید میلاد النبی نے) بیان ولادت شریف میں یہاں تک بے ادبی کی ہے کہ صبح صادق کے وقت وہ بیان ہوا اس لئے کہ حضور کی ولادت شریفہ اسی وقت ہوئی ہے اور ایک گہوارہ لٹکایا گیا۔ غرض پوری نقل کی گئی۔ نعوذ باللہ من غضب اللہ و غضب رسولہ علی ھذہ المخترعات.

(ہم ان مخترعات سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ سے پناہ چاہتے ہیں)

اگر یہی نقل ہے تو خدا خیر کرے ایک عورت کو بھی لادیں گے اور اس کو کہہ دیں گے چلایا کرے۔

صاحبو! جب کوئی شے حد سے بڑھتی ہے تو صراط مستقیم سے بہت دور جا پڑتی ہے۔ حق و باطل کی مثال ایسی ہے جیسے مثلث کی دو ساقین اور ان کی ملتقی پر مثلاً ایک چیونٹی بیٹھی ہو تو اس وقت تو خط حق سے دور نہیں لیکن دوسری ساق پر جو باطل کی مثال ہے اگر وہ چلے گی تو اول اول اس کو حق سے بعد نہ ہوگا مگر جس قدر چلتی جائے گی دوسری ساق سے دور ہوتی جائے گی اس لئے مثلث کی ساقین جس قدر بڑھتی جاویں گی ان میں بعد بھی بڑھے گا حتیٰ کہ بعد بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھے گا کہ پھر وہ چیونٹی اگر لاکھ تدبیریں اور سعی کرے کہ میں دوسری ساق پر پہنچوں لیکن ہرگز نہیں پہنچ سکے گی۔

اسی طرح صراط مستقیم اور کج راستہ ہے کہ بے راہ چلنے سے رفتہ رفتہ قبول حق کی استعداد اتنی فاسد ہو جاتی ہے کہ بری بات بھی بھلی معلوم ہونے لگتی ہے اور اس کی برائی بالکل ذہن میں نہیں آتی اور اہل حق سے اعراض پیدا ہو جاتا ہے پس یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ حضور کی تشریف آوری کی غایت انہوں نے نہیں سمجھی۔

پس اسی غایت کی تقریر مولانا کے کلام سے معلوم ہوئی جس کی شرح عنقریب آتی ہے یہ ہے کہ غایت وہ شے ہے جس کا عنوان صوفیا کی اصطلاح میں فنا اور بقا ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اس واسطے ہوئی کہ آپ سے فیض فنا اور بقا کا ہو۔ یہ خلاصہ ہے اس غایت کا اور یہ مضمون باعتبار مذکورہ بالا کے مرکب ہے چند اجزا سے۔

اول اس کمال فنا و بقا اور اس کے افاضہ میں بدو فطرت سے آپ کا کامل الاستعداد ہونا۔

دوسرے اس کے درجہ فعلیت میں بھی آپ کا کامل ہونا جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ محض واسطہ فی الاثبات ہی نہیں واسطہ فی الثبوت ہیں۔

تیسرے دوسروں کی تکمیل کی طرف آپ کا متوجہ ہونا پھر ان کا استفاضہ کے لئے ان کی استعداد کا شرط ہونا' فساد استعداد کا مانع ہونا اور اس فساد استعداد کا سبب خود فساد عمل ہونا۔

چوتھے ان میں سے جو اہل استعداد ہیں حضورؐ کا ان کی کامل تکمیل فرمانا اور اس تکمیل میں آپ کی بے نظیری ثابت ہونا۔ اس استعداد کی تکمیل کا سبب آپؐ کے اتباع طریق میں منحصر ہونا۔

اور پانچواں جزو جو حالت موجودہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ فیض پہنچانے کے لئے چونکہ اس کی ضرورت ہے کہ مفیض موجود ہو اور اس وقت حضورؐ بظاہر اس عالم میں تشریف رکھتے نہیں اب اگر فیض پہنچے تو اس کی کیا صورت ہے۔

یہ مختصر فہرست ہے ان مضامین کی جو مولانا کے کلام سے اقتباس کی گئی ہے مقتضاء ترتیب کا یہ تھا کہ مولانا کے کلام میں یہ مضامین اسی ترتیب سے ہوتے یعنی اشعار متقدمہ میں پہلے اجزا ہوتے اور اشعار متاخرہ میں پچھلے اجزاء مگر اتفاقی بات ہے کہ بالکل اس کا عکس نکلا۔ اجزا متقدمہ پر جو اشعار دلالت کرتے ہیں وہ متاخر ہیں اور مضمون متاخر جن اشعار سے مفہوم ہوتا ہے وہ متقدم ہیں اور نکتہ اس تعاکس میں بطور لطیفہ کے یہ ہوسکتا ہے کہ ہر جزو سابق اجزاء خمسہ میں سے جزو لاحق کا توطیہ و تمہید ہے۔ پس اجزائے سابقہ سے اجزاء لاحقہ ہی مقصود ہیں چنانچہ آپ کی استعداد فعلیت کے لئے ہے اور فضیلت کمالات شرط تکمیل ہے۔ یعنی آپ کا خود صاحب فناء و بقاء ہونا دوسروں کو فیض پہنچانے کے لئے بھی ہے پھر اس افاضہ کی یہ بھی ایک غایت ہے کہ یہ فیض بعد وفات بھی باقی رہے پس مولانا کے اشعار وقوع مدلول کی ترتیب کے اعتبار سے تو عکس ہیں لیکن مقصودیت کے لحاظ سے مرتب ہیں تو گویا مولانا نے مقصودیت ہی کا اعتبار کیا ہے۔

چنانچہ قرآن شریف کی ترتیب بھی اکثر اسی مقصودیت کے اعتبار سے ہے دیکھو سورہ بقرہ مدنی ہے اور سورہ اقراء مکی ہے لیکن ترتیب میں سورہ بقرہ پہلے ہے اس لئے کہ مقصود اعظم ہیں احکام خواہ اعتقادی ہوں خواہ عملی اور وہ سورہ بقرہ میں زیادہ ہیں۔ پس اس تعاکس میں کچھ حرج نہیں بلکہ کلام مجید کے اتباع کے سبب سے یہ صورت اولی ہوگئی مگر بیان میں وہ اشعار وقوع ہی کی ترتیب سے عرض کئے جاویں گے۔ مثنوی شریف کی ترتیب کی رعایت نہ کی جاوے گی۔

فناء و بقا کے معنی

لیکن قبل اس کے کہ وہ اشعار اور ان کی شرح بیان کی جاوے اول یہ سمجھ لیجئے کہ فنا اور بقاء ہے کیا چیز؟ شاید فناء اور بقا کے سامعین یہ معنی سمجھے ہوں گے کہ فنا تو یہ ہے کہ مر رہے اور بقا یہ ہے کہ جی اٹھے۔ پھر اشکال پیدا ہوگا کہ مرنا تو اختیاری ہے کہ ایک تولہ سنکھیا کھالے لیکن پھر زندہ ہونا تو اختیاری نہیں تو یاد رکھو کہ یہاں مراد فناء و بقاء لغوی نہیں ہے بلکہ یہ اصطلاح تصوف کی ہے پس فنا و بقاء سے مراد سالک کی ذات کا فناء و بقاء مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مضاف الیہ ایک خاص شے ہے۔ یعنی علوم و اخلاق۔ پس فنا کا حاصل کیا ہوا یعنی فنائے اخلاق و علوم۔ سو فنائے اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ اخلاق رذیلہ کو دور کرے۔ مثلاً ریا، کبر، حسد، غضب، حب مال، حب جاہ کو دور کرے اور فنائے علوم یہ ہے کہ جو ہمارے قلب میں غیر اللہ جمع ہو رہے ہیں کہیں جائیداد کہیں دکان، کسی تجارت کے دھندے، کسی کو زراعت کے افکار، کسی کو نوکری کے خرخشے کسی کو مقدمات کی پریشانیاں اور ان کے متعلق خیالات اور توہمات اور دوست اور دشمن ان سب کو دور کردے دشمن

اور دوست اور یہ سب افکار ہمارے وقت کو ضائع و تباہ کر رہے ہیں بلکہ دشمن اتنا وقت ضائع نہیں کرتے جس قدر دوست کرتے ہیں غرض ادھر ادھر کی باتیں اور تعلقات کہیں قلب میں بیوی کی محبت کہیں بیٹے کی محبت ہے اس کا قلع قمع کر دے لیکن یہ یاد رکھو کہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تجارت اور نوکری اور زراعت کو چھوڑ دو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے متعلق جو خیالات خدا کی یاد سے روکنے والے ہیں ان کو نکال دو۔ اسی طرح بیٹے بیوی کی محبت سے مراد اس درجہ کی محبت ہے جو خدا کی یاد سے غافل کر دے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ
وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ
اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

(سورۃ التوبہ)

”یعنی فرما دیجئے اے محمد صلی اللہ علیہ وعلیہ وسلم اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیبیاں اور کنبہ اور وہ اموال جن کو تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کی نکاسی نہ ہونے سے ڈرتے ہو اور وہ مکان جن کو تم پسند کرتے ہو اگر یہ سب چیزیں) تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب لاوے“۔

پس اس آیت کو دیکھ لیجئے کہ وعید احبیت پر ہے نفس حب پر وعید نہیں۔ اس لئے کہ وہ تو خلقی اور طبعی ہے اس کو آدمی کیسے زائل کر سکتا ہے مثلاً بیٹے کی محبت طبعی ہے انسان کے قبضہ میں نہیں ہے کہ اس کو زائل کر سکے بعض جاہل پیر اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں مرید سے اس کے بیٹے بیوی کو چھڑا دیا۔ چنانچہ ان مرید صاحب نے مسجد کا ایک کونہ سنبھال لیا ہے اور بیٹے بیوی بھوکے مر رہے ہیں پس فنائے علم سے یہ مراد نہیں ہے کہ بالکل ان کا خیال ہی نہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے قلب میں خدا تعالیٰ سے زیادہ کسی کی محبت نہ ہو۔ پس حکم یہ ہے کہ احبیت کے درجہ کو دور کر دے۔

پس فنائے اخلاق وعلوم کا خلاصہ یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت میں اتنا سرگرم ہو کہ غیر اللہ کی محبت اور غیر اللہ کا ذکر مغلوب اور اخلاق ذمیمہ زائل ہو جائیں اور طریق اس کا علم دین اور شیخ کامل کی صحبت و اطاعت ہے۔ پس جو چیزیں زائل کرنے کی ہیں ان کے زائل کرنے کو اور جو مغلوب کرنے کی ہیں ان کے مغلوب کرنے کو فنا کہتے ہیں۔

اب بقاء کو سمجھئے کہ زائل شدہ اشیاء کی اضداد کے پیدا کرنے اور مغلوب کی ضد کو غالب کرنے کو بقاء کہتے ہیں مثلاً ریا کو زائل کرے اور اس کے مقابلہ میں اخلاص پیدا کرے اور کبر کو فنا کرے اور اس کی جگہ تواضع کو پیدا کرے حب غیر اللہ کو مغلوب کرے اور اللہ کی حب کو غالب کرے۔ غیر کے ذکر کو مغلوب کرے اور ذکر اللہ کو غالب کرے یہ ہے بقاء۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا مقصد

اور یہی غایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی کہ اپنے فیضان علمی و عملی و حالی سے اس میں امت کی تکمیل فرماویں۔ جو حاصل ہے اتباع کامل کا پس حاصل غایت تشریف آوری کا یہ ہوا کہ امت اتباع کامل اختیار کرے۔

اب میں وہ اشعار مع شرح بیان کرتا ہوں۔ چونکہ وہ اشعار زیادہ تھے۔ (کیونکہ تیس ہیں) اس لئے یاد نہیں رہ سکتے اس لئے میں نے ان کو ایک پرچہ پر نقل کر لیا ہے اور چونکہ اشعار زیادہ ہیں اور وقت کم ہے۔ اس لئے ہر شعر کے متعلق ضروری اور مختصر شرح بیان کر کے ختم کر دوں گا۔ مولانا کے کلام میں اوپر سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ آ رہا ہے کہ انہوں نے حضورؐ سے فنا اور بقا کا فیض لیا۔ اس کے بعد حضورؐ کے فنا و بقا کا اور پھر اس کے فطری ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔

حضور کی قوت فیض

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں قال مولانا الرومی رحمۃ اللہ علیہ

پس محمد صد قیامت بود نقد
زانکہ حل شد در فنائش حل و عقد

پس حرف تفریع اس لئے لائے ہیں کہ اول سے ذکر تھا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فنا اور بقا کا۔ اور جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اندر یہ کمال تھا تو اس پر تفریع کرتے ہیں حضورؐ کے فنا و بقاء کو اس لئے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اندر یہ کمال حضورؐ ہی سے آیا پس مطلب یہ ہے کہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صاحب فناء و بقاء تھے۔ پس اس سے برہان انی کے طور پر ثابت ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ و اصحابہ وسلم صد قیامت تھے۔ یہ حمل مثل زید اسد کے ہے اور قیامت اس لئے کہا کہ قیامت کا خاصہ عالم کا فنا اور بقا ہے چنانچہ نفخہ اول سے تو فناء حسی اور نفخہ ثانیہ سے بقاء حسی ہوگا۔ پس آپ کی شان بھی واسطہ فنا و بقا ہونے میں مثل قیامت کے ہے اور صد اس لئے کہا کہ قیامت سے تو فنا و بقاء حسی ہوگا اور حضورؐ فنا و بقاء روحی کے واسطہ ہیں اور فنا و بقاء روحی بقاء حسی سے افضل ہیں اور نقد اس لئے کہ قیامت تو آجل ہے اور حضورؐ عاجل اس وقت فنا و بقاء کا فیض پہنچا رہے ہیں۔ فنائش میں فنا بمعنی پیش خانہ ہے۔ حل بمعنی کشادن مراد فناء اس لئے کہ فناء میں بھی اجزاء کی تحلیل ہوتی ہے اور عقد بمعنی بستن مراد بقاء اس لئے کہ بقاء میں اجزاء مربوط رہتے ہیں۔ حضورؐ کی قوت فیض کو بیان کرتے ہیں اور یہ ماقبل کے لئے دلیل ہے یعنی آپ صد قیامت کس دلیل سے تھے اس لئے کہ حضورؐ کے آستانہ مبارک پر فناء و بقاء کے عقدے حل ہوتے ہیں اور حضورؐ کی تو بڑی شان ہے آپ کے خدام میں قوت فیضان کے اندر بڑے بڑے حضرات گزرے ہیں۔ حضرت سلطان الاولیاء سلطان نظام الدین قدس سرہ اپنے معاصر حضرت سید شاہ گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد
واللہ! خلاف نیست کہ او عشق باز شد

(جو شخص حضرت سید گیسودراز کا مرید ہوگیا۔ واللہ خلاف نہیں کہ وہ عشق باز ہوگیا۔)

آدمی اپنے معاصر کی مدح کم کیا کرتا ہے مگر یہ ان حضرات کی حقانیت ہے کہ اپنے معاصرین کی بھی مدح کرتے ہیں ہمارے زمانہ میں اس شان کے حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ تھے کہ جس نے حضرت کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا ہے وہ محروم نہیں رہا۔

اگر کوئی کہے کہ حضور کی تشریف دنیا کا اس میں کہاں ذکر ہے؟ حالانکہ وعدہ اسی بیان کا تھا جواب یہ ہے کہ یہ تو تمہید ہے اس مضمون کی۔ وہ مضمون اگلے ہی شعر میں آتا ہے اور اس وقت اس مقام کے شعروں میں زیادہ مقصود میرا اسی شعر کا لانا تھا کہ اسی میں ولادت شریفہ کا راز مذکور ہے جو کہ اجزاء خمسہ مذکورہ سے اول ہے لیکن ربط کے لئے اس سے اوپر کا شعر بھی لایا گیا اس شعر سے اتنا ثابت ہوا کہ حضور فناء و بقاء کے لئے واسطہ فی الاثبات ہیں اور اس میں کامل و مکمل ہیں آگے آپ کا خود بھی موصوف اس فناء و بقاء سے ہونا اور اس کی کامل استعداد پر آپ کا مولود ہونا فرماتے ہیں۔ قال مولانا الرومی۔

زادہ ثانی ست احمدؐ در جہاں
صد قیامت بود او اندر عیاں

زادہ ثانی، صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے، حقیقت اس کی یہ ہے کہ ایک تو ولادت اولی ہے وہ تو یہی عرفی ولغوی ولادت ہے جس کا حاصل **الخروج من الرحم** اور دوسری ولادت اصطلاحیہ ہے۔ وہ کیا ہے۔ **الخروج من احکام الطبعیة الی اضدادھا۔** اس کو صوفیہ ولادت ثانیہ کہتے ہیں جیسے بلوغ کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک لغوی و عرفی بمعنی منی نکلنا دوسرے اصطلاحی معنی یعنی منی نکلنا تعریف اول کے اندر منی عربی لفظ اور دوسرے کے اندر فارسی بمعنی من شدن خودی و کبر نکلنا ہے اسی واسطے مولانا فرماتے ہیں۔

خلق اطفال اند جز مست خدا
نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

سوائے عارف باللہ کے کوئی بالغ نہیں ہے جو خواہشات نفسانی میں محبوس ہے وہ ابھی نابالغ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بجائے ولادت اولی کے ولادت ثانیہ کو دیکھو جو کہ مقصود ہے خود ولادت اولی ہے۔

پس فرماتے ہیں کہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم مولود ثانی ہیں یعنی فانی اور باقی ہیں پس ان دو شعروں میں حضورؐ کا فناء و بقاء میں فطرتاً کامل ہونا جس پر آپ کا واسطہ فی الثبوت ہونا متفرع ہے اور یہ پہلا جزو ہے اجزاء خمسہ فہرست میں سے ثابت ہوگیا اور زادہ ثانی میں تشریف آوری دنیا کا مع غایت مذکور ہوگیا جو موعود تھا در جہاں اس طرف اشارہ ہے کہ عالم میں آتے ہی اللہ تعالیٰ نے حضور کو یہ صفت عطا فرمائی تھی۔ فطرت کے ساتھ ہی فناء و بقاء کے ساتھ موصوف تھے۔ بخلاف اور لوگوں کے کہ مجاہدہ اور محنت سے ان کو یہ صفت حاصل ہوتی ہے رہا یہ کہ آپ میں اور دوسرے انبیاء میں کیا فرق ہوا اور انبیاء بھی شروع ہی سے فانی اور باقی ہوتے ہیں؟

وہ فرق یہ ہے کہ حضور میں یہ صفت بدرجہ اکمل میں تھی۔ فنا و بقا آپ میں صد قیامت تھے وجہ تشبیہ اول گزر چکی ہے اندر عیاں یعنی آپ کا فنا و بقاء کے ساتھ موصوف ہونا مخفی نہ تھا بلکہ کھلم کھلا آپ میں دونوں شانیں جلوہ گر تھیں۔ اس سے رد کر دیا ہے مدعیوں کے دعوے کو۔ یعنی اگر کوئی شخص ایسے فیض مخفی کا دعویٰ کرے جیسے بعضے لوگ کہا کرتے ہیں کہ بزرگوں کے یہاں کوئی ایسی مخفی شے اور راز ہے جو سینہ بسینہ چلا آتا ہے اور وہ شریعت ظاہرہ سے الگ ہے وہ کاذب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وہ فیض نہایت صاف اور روشن ہے۔ پس لامحالہ وہ مدلول نصوص ظاہرہ واضحہ ہی کا ہوگا اصلاً مخفی نہیں۔ ہاں اس کے ادراک کے لئے استعداد کی ضرورت ہے۔ فساد استعداد کی وجہ سے کسی کو ادراک نہ ہو یہ دوسری بات ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور آپ کے اس ولادت شریفہ کی غایت یعنی استعداد کامل فنا و بقاء کے ساتھ بدو فطرت سے موصوف ہونے اور دوسروں کو موصوف کرنے کا بیان تھا۔ اول پر زادہ ثانی اور ثانی پر صد قیامت دال ہے۔

جمال احمدی کی یکتائی

اب دوسرے اشعار میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ درجہ فعلیت فناء و بقاء کے اندر کیسے کامل ہیں اور یہ جز ثانی ہے اجزاء خمسہ فہرست میں ہے قالؒ

چوں جمال احمدی در ہر دو کون — کے بدست اے فریزدانیش عون

(یعنی جمال احمدیؐ کے برابر دونوں جہان میں کہاں ہے یعنی آپ اس اجمال میں یکتا ہیں۔ آگے اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ وجہ اس یکتائی کی یہ ہے کہ شان یزدانی آپ کی معین ہے یعنی آپؐ شان یزدانی کے مظہر اکمل ہیں۔) قال

ناز ہائے ہر دو کون اورا رسد — غیرت آں خورشید صد تو را رسد

(یعنی دونوں عالم کے اسباب ناز (بتقدیر مضاف) آپ کو پہنچتے ہیں۔ یعنی آپ کے اندر ہر جہت سے ناز کے اسباب موجود ہیں۔)

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری — آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حسن یوسف (علیہ السلام) دم عیسیٰ (علیہ السلام) اور ید بیضاء رکھتے ہیں جو تمام اوصاف حضرات انبیاء علیہم السلام رکھتے ہیں وہ سب اوصاف تنہا آپ میں ہیں۔)

اور غیرت کا حق حضور کو جو کہ آفتاب صد تو کے مشابہ ہے پہنچتا ہے۔ غیرت یہ کہ گویا شان غیرت کے اقتضا سے آپ بزبان حال فرماتے ہیں کہ میرے سامنے گرد ہو جاؤ۔ میرے جمال و کمال کے سامنے اپنے کمال کا دم مت بھرو اور میرے ہوتے ہوئے کسی کی طرف نظر مت کرو۔ میرے فنا و بقاء کا فیض لو اور اپنا دعویٰ اور ننگ چھوڑ دو۔ میرے اتباع سے عار نہ کرو جیسے آج کل لوگوں کو اتباع شریعت سے عار آتی ہے اور عزت موہوم اور آبرو مزعوم کی حفاظت کے واسطے شریعت نبویہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور

رسوم کا اتباع کرتے ہیں کوئی نکاح ثانی کو معیوب سمجھتا ہے۔ کوئی برادری کی رسوم کے ترک کو ننگ جانتا ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان غیرت کو جوش آتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

ولو كان موسٰى حيا لما وسعه الا اتباعي (الأسرار المرفوعة على القاري: ۸۳، ۲۹۲، المسند للإمام أحمد بن حنبل ۳: ۳۳۸.)

"اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی بجز میری اتباع کی کوئی گنجائش نہ تھی" چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ دنیا میں تشریف لاویں گے تو آپ ہی کی شریعت کا اتباع کریں گے۔

حدیث میں آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حضور کی امت دکھلائی گئی۔ حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! ان کو میری امت کر دیجئے۔ ارشاد ہوا کہ یہ امت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ پھر عرض کیا کہ اے اللہ! مجھے اس امت ہی سے کر دیجئے۔ ارشاد ہوا کہ نہیں، تم خود نبی مستقل ہو۔ آگے شان غیرت کے اقتضا کو بیان فرماتے ہیں قال۔

کاندر افگندم بکیواں گوئے را　　　در کشید اے اختراں ہے روئے را

پس شان غیرت سے آپ فرما رہے ہیں کہ میں نے اپنے کمالات کی گیند زحل تک مراد یہ کہ ساتویں آسمان تک پہنچائی ہے۔ اے ستارو! اپنے منہ کو چھپالو۔ یعنی میرے کمالات کے سامنے دعویٰ کمال چھوڑ دو۔ اس لئے کہ دعویٰ و ناز کے لئے بھی منہ ناز کا ہونا چاہئے۔ دوسرے مقام پر مولانا فرماتے ہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
زشت باشد روئے نازیبا و ناز　　　عیب باشد چشم نابینا و باز
چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش　　　ہمچو او باگریہ آشوب باش
پیش یوسف نازش و خوبی مکن　　　جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

ناز کرنے کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس نہ جاؤ۔ بدصورت کا ناز و نخرہ کرنا نازیبا ہے نابینا آنکھ کا کھلا ہونا عیب ہے اگر تم یوسف علیہ السلام نہیں ہو تو یعقوب علیہ السلام بن جاؤ یعنی ان کی طرح گریہ و نالہ کرتے رہو یوسف علیہ السلام یعنی کامل کے سامنے ناز و اپنی خوبی ظاہر نہ کرو اس کے سامنے سوائے آہ یعقوبی کے اور کچھ نہ کرو۔

یہاں سے رد ہو گیا ان لوگوں کا بھی جو احکام شرعیہ کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنی رائے کے متبع ہیں۔

سلامتی کی صورت

قال مولانا الرومی رحمۃ اللہ علیہ

در شعاع بے نظیرم لاشوید　　　ورنہ پیش نور من رسوا شوید

میری شعاع بے نظیر کے سامنے فنا ہو جاؤ۔ یعنی میرے ہی تابع ہو کر رہو ورنہ میرے نور کے سامنے رسوا

ہو جاؤ گے جیسے آفتاب کے سامنے چاند اور ستارے بے نور ہو جاتے ہیں۔ باقی رات کو جو کہ تفرد کا وقت ہے قمر اور کواکب میں جو نور رہتا ہے تو نور قمر کا جو کہ معتد بہ نور ہے اس وقت بھی شمس ہی سے مستفاد ہوتا ہے اور کواکب کا نور خود معتد بہ نہیں اور دن کو چونکہ آفتاب کے ہوتے ہوئے وہ سب بزبان حال دعویٰ نور کا کرتے ہیں کیسے جھوٹے پڑ جاتے ہیں پس دعویٰ سے ہمیشہ رسوائی ہوتی ہے اور اتباع سے ہر طرح سلامتی ہے۔ دنیا کے اندر بھی بھی دیکھا جاتا ہے کہ مساوات اکابر میں خطرہ ہے اور تذلیل میں سلامتی۔

چنانچہ ایک مہاجن کی لڑکی کو ایک جن لپٹ گیا۔ بڑے بڑے عامل تنگ آ گئے ایک مکان کے اندر اس لڑکی کو مقفل کر دیا تھا جو کوئی جاتا تھا شیر کی طرح غرا کر وہ اس پر حملہ کرتی تھی اس لئے سب معالج ڈرتے تھے ایک میاں جی قوم کے جولاہے تھے کسی نے ان کا نام بھی بتلا دیا کہ یہ بھی عامل ہیں حالانکہ بچارے بالکل ناواقف تھے چنانچہ ان کو لے گئے وہ بیچارے گھبرائے مگر اپنے نزدیک سمجھ لیا کہ میں بڈھا تو ہو ہی گیا ہوں مرنے کے قریب ہوں۔ مرنے پر آمادہ ہو کر کہا کہ اچھا اگر یہ لڑکی اچھی ہو گئی تو پانسو روپیہ لوں گا۔ اس مہاجن نے منظور کر لیا اور پانسو روپے کسی کے پاس جمع کرا دیئے۔ میاں جی ہمت کر کے اس مکان کے اندر گئے اور نہ کوئی گنڈا نہ تعویز۔ جب پہنچے تو وہ حسب عادت للکار کر اس کے پیچھے دوڑی۔ میاں جی کو اس وقت یہ سوجھی کہ دوڑ کر اس کے پاؤں پر گر پڑے اور کہنے لگے کہ میں تو تمہاری رعیت کا غریب جولاہا ہوں۔ تنگ دستی اور افلاس نے ستا رکھا ہے آپ تھوڑی دیر کے لئے اگر تشریف لے جاویں گے تو مجھے پانسو روپے مل جاویں گے اور آپ کا کچھ حرج نہ ہو گا یہ سن کر وہ جن قہقہہ مار کر ہنسا اور نرم ہوا اور کہا اچھا! تیری خاطر سے ہم ہمیشہ کے لئے جاتے ہیں وہ لڑکی اچھی خاصی ہو گئی اور پانسو روپے اس کو مل گئے اور تمام نواح میں شہرت ہو گئی پس یہ مٹ جانا ایسی چیز ہے کہ ہر جگہ کام آتا ہے اگر وہ دعویٰ کرتا تو خود ہی اس کا مزہ چکھتا۔ واللہ! اتباع سلامتی کا سبب ہے۔

اتباع سے عار کا سبب

یہ اتباع کا مضمون ایک تفریع تھی باقی اصل مضمون جو مقصود مقام ہے آپ کا درجہ فعلیت میں کامل ہونا ہے۔ اب تیسرے مقام کا اشعار میں اس فنا و بقاء میں آپ کی شان تکمیل اور اس سے مستفید ہونے کے لئے استعداد کا شرط ہونا اور استعداد کا سبب فساد عمل ہونا جو کہ اجزائے خمسہ فہرست میں سے تیسرا مضمون ہے مذکور ہے کہ دیکھو! ابو طالب حضورؐ کے چچا تھے مگر چونکہ اتباع سے ان کو عار آیا اس سے استعداد ان کی فاسد ہو گئی اس لئے محروم رہے۔ قال

خود یکے ابو طالب آں عم رسول   می نمودش شنعت عریاں مہول

(یعنی وہ جو ابو طالب حضور کے چچا تھے ان کو اسلام لانے پر عرب کا تشنیع ہولناک نظر آتا تھا قال۔

کہ چہ گویندم عرب کر طفل خود   او بگردانید دین معتمد
منصب اجداد و آبار ایماند   در پئے احمد چنیں بے راہ براند

کہ بیانیہ شنعت کا بیان ہے یعنی اگر اسلام لے آؤں گا تو عرب کے لوگ مجھ کو کیا کہیں گے کہ اپنے لڑکے کے سبب سے اس نے اپنے پرانے دین کو بدل دیا اور احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے ایسا بے راہ چلا کہ باپ دادا کے منصب کو چھوڑ دیا۔ طریق مذہبی کو منصب سے اس لئے تعبیر کیا کہ بنی ہاشم میں ریاست و امارت تھی اور وہ ظاہر ہے کہ اسی حالت میں قائم رہ سکتی تھی کہ یہ اپنی قوم کے مذہبی طریقہ پر قائم رہیں جیسے اس زمانہ میں بہت سے اہل بدعت پیرزادگان کو حق واضح ہو گیا ہے لیکن اپنے بدعت کے طریقوں کو صرف اس لئے نہیں چھوڑتے کہ منصب پیرزادگی اور خانقاہ کے اوقاف اسی شرط سے مشروط ہیں کہ وہ بدعت کے طریق کو نہ چھوڑیں۔ پس یہ عار اور ننگ ایسی شے ہے کہ حق سے دور کر دیتی ہے۔ قال

آں رسول پاک باز مجتبےٰ　　　از پے آں تا رہاند مردرا
گفتش اے عم یک شہادت تو بگو　　　تا کنم باحق شفاعت بہر تو

یعنی محض ابو طالب کی خلاصی کے واسطے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے فرمایا کہ اے چچا! ایک مرتبہ تم کلمہ شہادت میرے سامنے کہہ لو تا کہ حق تعالیٰ کے سامنے تمہارے لئے شفاعت کروں۔ جو جواب انہوں نے دیا وہ آگے مذکور ہے قال

گفت لیکن فاش گردد از سماع　　　کل سر جاوز الاثنین شاع

ابو طالب نے جواب دیا کہ کہتا تو ضرور لیکن جب آپ سنیں گے تو ظاہر ہو جاوے گا اور پھر مخفی رہنا مشکل ہے اس لئے جو راز دو سے گزرا وہ پھیل جاتا ہے دو سے مراد یا تو دو شخص ہیں اگر دو شخص مراد ہوں تب تو یہ حکم ظاہر ہے کیونکہ جب دو شخصوں سے آگے بات چلے گی یعنی تیسرے کو بھی خبر ہو جاوے تو وہ پھر عام میں ضرور ظاہر ہو جاتی ہے اور یا مراد دو سے دو لب ہیں اس صورت میں یہ حکم ذرا مخفی ہے کیونکہ اس صورت میں تیسرے کا سننا تو فرض نہیں کیا گیا تو مطلب یہ ہوگا کہ عادت یہی ہے کہ جب دو شخصوں میں بات ہوتی ہے اس کی خبر تیسرے کو بھی ہو جاتی ہے قال

من بمانم در زبان ایں عرب　　　پیش ایشاں خوار گردم زیں سبب

”یعنی میں عرب کی زبان میں رسوا ہوں گا اور ان کے نزدیک اس سبب سے ذلیل ہو جاؤں گا قال

لیک اگر بودیش لطف ما سبق　　　کے بدے ایں بددلی با جذب حق

”یعنی اگر ابو طالب پر لطف ازلی ہوتا تو جذب حق کے ہوتے ہوئے راہ حق سے یہ بددلی کیسے ہوتی“ غرض اس حکایت سے معلوم ہوا کہ فساد استعداد اتباع سے عار اور ننگ کا سبب ہو جاتا ہے۔

اتباع کی برکات

آگے چوتھے مقام کے اشعار میں چوتھا اور پانچواں جزو اجزائے خمسہ مذکورہ میں سے مذکور

ہے چنانچہ اول اس فیض فناء و بقاء میں اہل استعداد کی تکمیل کرنے میں آپ کا بے نظیر ہونا اور اس استعداد کی تکمیل کا سبب آپ کے اتباع طریق میں منحصر ہونا فرماتے ہیں اور یہ تکمیل استعداد عام ہے۔ اصلاح استعداد فاسد کو بھی اور رفع نقصان استعداد ناقص کو بھی قال

معنی نختم علی افواہہم ایں شناس ایں است راہرو را ہم
تاز راہ خاتم پیغمبراں بوکہ برخیزد زلب ختم گراں

فرماتے ہیں کہ قرآن شریف میں جو نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ (ان کے مونہوں پر مہر لگادیں گے) آیا ہے اس کے معنی فساد استعداد کے ہیں اس کو پہچانو کہ یہ راہرو یعنی سالک کے لئے ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم اس کے منہ پر تکلم سے مہر لگادیں گے فساد استعداد تو اس کے معنی نہیں ہیں پس تحقیق اس کی یہ ہے کہ ایک تو تفسیر ہے اور ایک تعبیر۔ تفسیر تو یہ ہے کہ مدلول قرآنی کو بیان کیا جاوے اور تعبیر یہ ہے کہ مدلول حقیقی سے بوجہ تشابہ کے بطور تمثیل کے دوسرے مقام کی طرف ذہن کو عبور کرنا اور منتقل ہونا۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ قرآن شریف میں یہ مراد ہے بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس پر دوسری حالت کو جو اس کے مشابہ ہے قیاس کرو۔ پس نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ کی تفسیر تو یہی ہے کہ ہم تکلم سے ان کے منہ پر مہر کردیں گے مگر مولانا فرماتے ہیں کہ اس مہر سے ذہن منتقل کرو۔ دوسری مہر کی طرف جو کہ اس مہر کا سبب اصلی ہوئی ہے۔ وہ کیا ہے؟ فساد استعداد کی مہر۔ پس اس کی نسبت کہتے ہیں کہ اس کو پہچانو کہ مہر کا سبب فساد استعداد ہے تا کہ لب سے یہ مضبوط مہر خاتم پیغمبران کی راہ کا اتباع کرنے سے ٹوٹے۔ اور اس لب کھلنے اور مہر کے ٹوٹنے سے مراد یہ نہیں کہ بولنے کے لئے کھل جاویں بلکہ مطلب یہ ہے کہ باطنی لب و دہان کھلنے سے غذائے روحانی فیوض کی پہنچنے لگے۔ آگے آپ کی مہر اٹھانے کی شان بیان فرماتے ہیں۔ قال

ختمہائے کانبیا بگذاشتند آں بدین احمدی برداشتند

"یعنی وہ مہریں نقصان استعداد کی جو انبیاء چھوڑ گئے تھے آپ کا دین ایسا کامل ہے کہ اس کی برکت نے وہ سب نقصان اٹھادیئے" اور یہاں مہر سے یہی نقصان مراد ہے نہ کہ فساد کیونکہ فساد استعداد تو ہر نبی کے اتباع سے مرتفع ہوتا رہا ہے البتہ جس درجہ کا کمال استعداد آپ کی برکت سے نصیب ہوا وہ آپ کے ساتھ خاص اس خاص کمال کے مقابل استعداد سابقہ کو ناقص کہا جاسکتا ہے۔ قال

قفلہائے ناکشادہ ماندہ بود از کف انا فتحنا برکشود

"یعنی استعداد کے بہت سے قفل بے کھلے رہ گئے تھے۔ انا فتحنا یعنی صاحب انا فتحنا کے ہاتھ مبارک سے کھلے اور آپ کو بالخصوص صاحب انا فتحنا کہنے میں ایک نکتہ ہے۔ ورنہ یوں تو آپ کو صاحب ق ص صاحب الم بھی کہہ سکتے ہیں اور وہ نقطہ یہ ہے کہ یہاں قفلوں کے کھولنے کا چونکہ بیان ہے اس لئے صاحب انا فتحنا کہنا مناسب ہوا اور نیز آپ کا لقب بھی فاتح ہے۔ یہ تو لفظی وجہ ہوئی اور

معنوی نکتہ یہ ہے کہ انا فتحنا کو عام لیا جاوے فتح مکہ ہی کے ساتھ خاص نہ کیا جاوے خواہ فتح مکہ ہو یا فتح باطنی ہو اور آگے جو مضمون ہے۔

لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ
عَلَیْكَ وَیَهْدِیَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا

تاکہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف فرمائے اور آپ پر احسانات کی تکمیل کر دے اور آپ کو سیدھے راستے پر لے چلے۔

وہ واقع میں بھی فتح باطنی ہے۔

یہاں پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوا کرتا ہے اس کا حل کر دینا بھی جملہ معترضہ کے طور پر ضرور ہے۔ وہ یہ ہے کہ انا فتحنا پر لیغفر لک اللہ الخ کیسے مرتب ہوا۔ کہاں فتح مکہ اور کہاں مغفرت وغیرہ۔ فتح کو مغفرت وغیرہ میں کیا دخل؟ مفسرین نے مختلف اور بعید از بعید توجیہیں اس مقام کی لکھی ہیں مگر الحمد للہ! میری سمجھ میں جو آیا ہے وہ بے تکلف اور دلپذیر بات ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام عرب کے لوگ اس کے منتظر تھے کہ فتح مکہ ہو تو ہم مسلمان ہوں چنانچہ فتح مکہ پر جوق در جوق اسلام لانے لگے اور لوگوں کے اسلام لانے سے حضورؐ کے مراتب قرب بڑھتے ہیں نفس تبلیغ سے تو اور طرح کا ثواب ہوتا ہے اور اس تبلیغ سے اسلام لانے کا ثواب اور نوع کا ہے۔ ورنہ تبلیغ تو تمام انبیاء نے کی ہے۔ نفس تبلیغ میں سب انبیاء برابر ہیں۔ حضورؐ جو فخر فرمادیں گے وہ کثرت امت پر ہو گا فتح مکہ سبب ہے اسلام لانے کا اور اسلام لانا لوگوں کا سبب ہے۔ آپ کی زیادت قرب کا اور زیادت قرب سبب ہے لیغفر لک اللہ (الی) ینصرک اللہ کا۔ اور سبب کا سبب یا سبب السبب کا سبب اس مسبب کا بھی سبب ہوتا ہے پس فتح مکہ کو مغفرت وغیرہ میں اس طرح دخل ہوا اور ترتب بے تکلف درست ہو گیا۔

دیکھئے یہاں بھی قرآن کے فہم کے لئے علوم عقلیہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے خلاصہ یہ ہوا کہ جن علوم کے قفل بے کھلے رہ گئے تھے۔ اگر آپ کا اتباع کرو گے تو وہ علوم کے قفل تم پر کھل جائیں گے۔ دوسرے مقام پر مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

بنی اندر خود علوم انبیاء　　بے کتاب و بے معید و اوستا
او شفیع ایں جہاں و آں جہاں　　ایں جہاں در دین آنجا در جناں

"یعنی حضورؐ ہماری سفارش کرنے والے ہیں اس جہان کے بھی اور اس جہان کے بھی۔ اس جہان کے تو دین کے باب میں چنانچہ حضورؐ ہمارے لئے دعائیں فرماتے تھے ان کی برکت سے ہم کو دین کی توفیق ہوئی اور اس جہان میں جنت کے داخل ہونے کے باب میں سفارش کریں گے۔ قال

ایں جہاں گوید کہ تو رہ شاں نما　　وآں جہاں گوید کہ تو مہ شاں نما

"یعنی یہ جہاں بزبان حال حضورؐ کی خدمت میں عرض کر رہا ہے کہ آپ ان کو راستہ دین کا دکھلایئے اور وہ جہان یہ کہے گا کہ آپ ان کو چاند یعنی دیدار باری تعالیٰ شانہ دکھلایئے"۔ یہ اشارہ اور اقتباس ہے اس حدیث سے ستروں ربکم کما ترون القمر لیلة البدر۔ یعنی حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم عنقریب اپنے رب کو دیکھو گے جیسے لیلۃ البدر میں چاند کو دیکھتے ہو۔ قال

پیشہ اش اندر ظہور و در کمون　　　اہد قومی انہم لا یعلمون

یہ مضمون بطور ترقی کے ہے یعنی مسلمانوں کی شفاعت تو حضورؐ کیوں نہ فرماتے جبکہ حضور اعداء کی شفاعت فرماتے ہیں چنانچہ ظاہر اور باطن میں آپ کا یہ شیوہ ہے کہ آپ دعا فرماتے تھے۔ اہد قومی الخ "یعنی اے اللہ! میری قوم کو ہدایت کر۔ یہ جاہل ہیں پس اس توجیہ پر اہد قومی میں مسلمان بھی مراد نہ ہوں گے اور کلام بھی مرحبط ہو گیا۔

خاتم کمالات

قال مولانا الرومی رحمۃ اللہ علیہ

باز گشتہ از دم او ہر دو باب　　　ہر دو عالم دعوت او مستجاب

"آپ کے دم یعنی کلام سے دونوں دروازے کھل گئے یعنی دنیا میں تو علوم کے دروازے جن کا بیان قفلہائے نا کشادہ الخ میں آ چکا ہے اور آخرت میں لقائے حق اور دخول جنت کا دروازہ جس کا بیان مقدمہ میں آ چکا ہے۔ پس دونوں جہاں میں آپ کی دعا مستجاب ہے۔ آگے آپؐ کے اس فیض کا اکمل ہونا بیان فرماتے ہیں۔ قال

بہر ایں خاتم شد است او کہ بجود　　　مثل او نے بود و نے خواہند بود

آپؐ اس سبب سے خاتم ہوئے ہیں کہ فیوض و علوم کے جود و عطا میں آپ کا مثل نہ ہوا اور نہ ہو گا۔ کمالات کے تمام مراتب آپؐ پر ختم ہو گئے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خاتم زمانی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپؐ خاتم مطلق ہیں زماناً بھی اور کمالاً بھی اور خاتمیت کے یہ معنی جو اس شعر میں مع شعر مابعد کے مذکور ہیں وہ ہیں جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحذیر الناس میں بیان فرمائے ہیں جس پر مبتدعین نے مولانا پر بے حد شور مچایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو یہ اشعار ملے نہیں ورنہ سہولت کے ساتھ فرما دیتے کہ خاتمیت کے یہ معنی بیان کرنے میں میں تنہا نہیں ہوں۔ مولانا روم نے بھی اس کو لیا ہے قال

چونکہ در صنعت برد استا دوست　　　نے تو گوئی ختم صنعت بر توست

تمثیل کے طور پر فرماتے ہیں کہ دیکھو جب کسی صنعت میں استاد سبقت لے جاتا ہے تو تم اس کو کہتے نہیں۔ یعنی یہ کہتے ہو کہ یہ صنعت تجھ پر ختم ہے اسی طرح حضور خاتم کمالات ہیں یعنی آپؐ کا مثل کمالات میں کوئی نہیں۔ پس یہ معنی ہیں خاتمیت کے یعنی ختم زمانہ کے ساتھ آپ اس طرح بھی خاتم ہیں۔ قال

در کشاہ و ختمہا تو خاتمی در جہان روح بخشاں خاتمی

اول تو قوت فیضان کے اندر آپ کا خاتم ہونا بیان فرمایا تھا۔ اس شعر میں تقصان استعداد کی مہروں کے فاتح ہونے کے اعتبار سے آپ کا خاتم ہونا ظاہر فرماتے ہیں کہ آپ مہروں کو کھولنے میں خاتم ہیں اور روح بخش حضرات یعنی انبیاء کے عالم میں آپ بمنزلہ خاتم کے ہیں اور اس تقریر میں عجیب لطیفہ ہے یعنی آپ فاتح ہونے میں بھی خاتم ہیں وجہ لطافت کی یہ ہے کہ فاتح اور خاتم کے معنی میں ظاہر اتقابل ہے اور یہاں بجائے تقابل کے ایک دوسرے کا مکمل ہے۔ قال

ہست اشارات محمد المراد کل کشاد اندر کشاد اندر کشاد

یعنی آپ کی تصریحات تو علوم کا خزانہ ہیں ہی حضورؐ کے تو اشارات سے علوم کے دریا کھلتے ہیں المراد کے معنی ہیں الحاصل۔ یعنی حاصل یہ ہے کہ حضورؐ کے اشارات سے اتنا بڑا دریا علوم کا کھلتا ہے کہ فتوح در فتوح ہوتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ احادیث کے چھوٹے چھوٹے اشاروں سے بڑے بڑے علوم کھلتے ہیں اور وہ مثال ہو جاتی ہے کہ

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

یہ ہے غایت حضورؐ کے تولد شریف کی اور نبوت شریف کی اے مدعیان محبت تم لوگوں نے اس غایت پر بھی نظر کی ہے یا خالی زبانی محبت ہی ہے۔ یاد رکھو! زبانی محبت بلا اس غایت کی تحصیل کے کار آمد نہیں ہے۔ آپ لوگ تو صرف ایک چیز یعنی ذکر ولادت کا اہتمام کرتے ہو اور ہم اس ذکر کے ساتھ اس فکر کو بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ غایت اس کی کیا ہے۔

حصول فیض کی صورت

اجزاء فہرست میں سے اب صرف جزو خامس رہ گیا ہے کہ اب حضور کا فیض فنا و بقاء ہم کس طرح حاصل کریں۔ اس کا جواب دیتے ہیں۔

قال صد ہزاراں آفریں بر جان او بر قدوم و دور فرزان او

یعنی لاکھوں آفریں آپ کی جان پاک پر ہوں اور آپ کے فرزندان یعنی جانشین اہل کمال کے قدوم یعنی آنے اور دور یعنی دورہ کرنے والے پر ہوں۔ حکام کا ایک وقت تو حاکم ہو کر آنے کا ہوتا ہے اور ایک وقت دورہ کا ہوتا ہے۔ اسی طرح علماء امت اور جانشینان حضورؐ کا ایک وقت تو کمالات کو لے کر آنے کا ہوتا ہے اور ایک وقت دورہ کا یعنی افاضہ کا ہوتا ہے پس دورہ کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گھومتے پھرتے ہیں اگرچہ اس اعتبار سے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات مخلوق کے اضافہ کے لئے جگہ جگہ جاتے ہیں۔ پس حاصل یہ ہے کہ گو حضورؐ تشریف لے گئے ہیں لیکن حضورؐ کے جانشین تو موجود ہیں، فیض ان سے لو۔

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ چارہ نبود بر مقامش از چراغ

اکثر اہل مولد وفات شریف کے ذکر کو ولادت شریفہ کے ذکر کے ساتھ ناگوار سمجھتے ہیں لیکن ہم چونکہ غایت ولادت شریفہ کو بیان کر رہے ہیں تو اس غایت کے متعلق یہ سوال ضرور ہوگا کہ اب اس غایت کو کیسے حاصل کریں۔ اس لئے ذکر وفات شریف کا ضرور آوے گا چنانچہ اسی غایت ولادت کے بتلانے کے لئے ہم نے اس رسم سے قطع نظر کر کے وفات کے متعلق مضمون مولانا کے کلام سے بیان کیا کہ آپ کے بعد آپ کے جانشینوں سے وہ فیض حاصل کرو اور فرزندان اس لئے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں ہے وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھٰتُھُمْ. یعنی نبی کی ازواج مطہراتؓ مومنین کی مائیں ہیں تو آپؐ ظاہر ہے کہ باپ ہوئے اور یہ ظاہر ہے کہ سچا جانشین وہی ہوتا ہے جو باپ کے قدم بقدم ہو ورنہ اس کو فرزند ہی نہیں کہتے۔ پس سچے جانشین اولیاء اور علماء امت ہوئے۔

یہاں پر ایک سوال ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف میں تو حضورؐ کے ابوۃ کی نفی فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ جواب یہ ہے کہ اس آیت سے ابوۃ حضور کی معلوم ہوتی ہے اور وہ بہت لطیف بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے

وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ* اور اہل علوم کو معلوم ہے کہ لکن استدراک یعنی تو ہم ناشی من الکلام السابق کے دفاع کرنے کے لئے ہوتا ہے اور یہاں بظاہر کوئی شبہ معلوم نہیں ہوتا جس کا لکن سے دفعیہ مقصود ہو۔ بجز اس کے کہ تقریر آیت کی یہ ہو کہ جب ارشاد ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں تو شبہ ہوا کہ کیا نسبی باپ نہیں تو اور کسی قسم کے بھی باپ نہیں، جو علی الاطلاق ابوۃ کی نفی کی گئی۔ تو اس شبہ کا دفع ہے کہ ہاں، لیکن روحانی باپ ہیں یعنی رسول ہیں۔ اس لئے کہ روحانی تربیت کرتے ہیں۔ قال

آں خلیفہ زادگان مقبلش زادہ انداز عنصر جان و دلش

یعنی آپ کے شاہزادے بلند اقبال آپ کے عنصر خاکی سے نہیں ہیں یعنی نسبی اولاد مراد نہیں ہے بلکہ آپ کے روح و دل کے مبارک عنصر سے ہیں یعنی روحانی اولاد ہیں۔ قال

گرز بغداد و ہرے یا ازری اند بے مزاج آب و گل نسل ویند

یعنی نسبی اولاد کی طرح یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک مقام کے ہوں بلکہ وہ خواہ بغداد کے ہوں یا ہرات کی خاک سے ہوں یا رے کے، بغیر آب و گل کے میل کے آپ کی نسل ہیں۔ یعنی روحانی اولاد ہیں۔ آگے اس کی وجہ نظیر کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں۔ قال

شاخ گل ہر جا کہ روید ہم گل ست خم مل ہر جا کہ جوشد ہم مل ست

یعنی ان کے اختلاف مقامات سے تعجب نہ کرو اس لئے کہ شاخ گل شجرہ گل سے کاٹ کر جہاں کہیں لگا دی جائے اور وہ وہاں جمے، گل ہی ہے اور شراب کا مٹکا جہاں جوش مارے شراب ہی ہے۔

اسی طرح خواہ وہ کہیں کے ہوں مگر آپؐ سے منتسب ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر حضورؐ تشریف نہیں رکھتے ہیں تو آپؐ کے خلفاء و ورثاء موجود ہیں۔

چوں گل رفت و گلستان شد خراب　　　بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

(یعنی جب پھول کا موسم جاتا رہے اور گلاب کی بو سونگھنا چاہو تو گلاب سے حاصل ہو سکتی ہے) چنانچہ ارشاد ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ یہ وارثین بھی اولی الامر میں داخل ہیں۔

الحمدللہ! مضمون مقصود تمام ہوا۔ بس یہ راز ہے حضور کی تشریف آوری کا ولادت شریفہ سے وفات شریفہ تک کا خلاصہ یہ ہوا کہ اتباع کامل حضورؐ کا کرو تا کہ غایت حضور کی تشریف آوری کا فیض نبوی تم کو حاصل ہو۔ یہی حاصل ہے فناء و بقاء کا۔ جس نے یہ راز سمجھ لیا اور اس کو عمل میں لایا وہ ہے سچا محبّ اور وہ ہے واقعی صاحب دولت اور جس نے اس کو نہ سمجھا اور محض زبانی تذکرے پر رہا اس نے حقیقت میں کچھ نہیں پایا۔ یہ تھا بیان حضور کی تشریف آوری کے راز کا اہل اسرار کے طرز پر۔

اب میں اس کو ختم کرتا ہوں اور اس کا لقب ”سر المولد النبوی من المثنوی المعنوی“ رکھتا ہوں۔ فقط

اللھم وفقنا لاتباع سنة نبیا واحشرنا فی زمرته
وصلی اللہ تعالیٰ علیه و علی اله واصحابه وسلم

السرور

عید میلاد النبی کے متعلق یہ وعظ بروز جمعہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا جو تین گھنٹہ میں ختم ہوا حاضری ۱۵۰ کے قریب تھی مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی نے قلم بند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لاَّ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لاَشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلاَنَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّابَعۡدُ: اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَبِرَحۡمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ھُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ۔

ترجمہ: ۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ صرف اللہ کے فضل و رحمت ہی کے ساتھ چاہئے کہ خوش ہوں اس لئے وہ بہتر ہے اس شئی سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

تمہید

قبل اس کے کہ اس آیت کے متعلق بیان کروں۔ اول بطور تمہید یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ چند سال سے میرا معمول ہے کہ ماہ ربیع الاول کے شروع میں ایک وعظ اس ماہ میں افراط و تفریط کرنے والوں کی اصلاح کے متعلق کہا کرتا ہوں اور اس میں تبعاً و استطراداً اور فوائد علمیہ و نکات و حقائق کا بیان بھی آ جاتا ہے۔ امسال بھی ایسا ہی خیال تھا کہ ابتداء ربیع الاول میں ایسا وعظ ہو جائے لیکن وجہ التوا یہ ہوئی کہ ہمارے مدرسے کے متعلق ایک مکان طلبہ کے لئے بنتا ہے۔ خیال یہ ہوا کہ اس مکان میں اس کے افتتاح کے ساتھ یہ وعظ ہو تا کہ اس مکان میں برکت ہو لیکن اس کے افتتاح میں بعض امور کا انتظار تھا۔ اتفاق سے وہ جملہ امور دوشنبہ کے روز ختم ہوئے۔ چنانچہ اس روز ارادہ بیان کا ہوا۔ لیکن بعض احباب کی رائے ہوئی کہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں یہ بیان ہو تاکہ اور لوگ بھی منتفع ہوں اس وجہ سے اس بیان میں دیر ہوئی اور عجیب اتفاق ہے کہ آج ۱۲ ربیع الاول ہے۔ اسی تاریخ میں لوگ افراط و تفریط کرتے ہیں اس تاریخ کا بالتخصیص ارادہ نہیں کیا گیا اور نہ نعوذ باللہ اس تاریخ سے ضد ہے بلکہ الحمد للہ! ہم اس میں برکت کے قائل ہیں مگر یہ اتفاقی بات ہے

کہ اس بیان کا اس تاریخ سے اقتران ہو گیا اور یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ متبع سنت کو اللہ تعالیٰ بلا قصد وہ برکات عنایت فرما دیتے ہیں کہ جن کا متبع رسوم و بدعات وارتکاب بدعات کے ساتھ قصد کرتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جو شے دائر بین السنۃ والبدعۃ ہو تو اس سنت کو ترک کر دینا چاہئے۔ پس یہ تاریخ اگرچہ بابرکت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اس میں مزید باعث برکت ہے لیکن چونکہ تخصیص اس کی اور اس میں اس ذکر کا التزام کرنا بدعت ہے اس لئے اس تاریخ کی تخصیص کو ترک کر دیں گے۔ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس تخصیص کے مفسدہ سے بھی محفوظ رکھا۔ اور اس تاریخ کی برکات سے بھی محروم نہیں رکھا اور عجیب بات ہے کہ اگر دوشنبہ کے روز بیان ہوتا تو ہم کو اس دن بھی یہی برکت حاصل ہوتی اس لئے کہ حضور کی ولادت شریف اس یوم میں ہوئی ہے اور نیز بعض محققین اس طرف گئے ہیں کہ ولادت شریف ۸ ربیع الاول کو ہوئی ہے اور دوشنبہ کو آٹھویں ہی تاریخ تھی۔ پس اس قول کے موافق ہم کو یوم البرکت اور تاریخ البرکت دونوں سے حصہ مل جاتا اور جمہور کے قول کے موافق ۱۲ ربیع الاول تاریخ ولادت شریفہ ہے۔ اس لئے اب بھی اس تاریخ کی برکت سے محرومی نہ رہی بلکہ اب دو برکتیں حاصل ہو گئیں۔ یوم کی بھی اور تاریخ کی بھی۔ اس لئے کہ دوشنبہ کے روز نیت بیان کی تھی اور مومن کی نیت پر بھی ثواب کا وعدہ ہے۔ یوم کی برکت یوں حاصل ہو گئی اور آج کہ ۱۲ تاریخ ہے اس کا وقوع ہو گیا۔ تاریخ کی برکت اس طرح حاصل ہو گئی یہ برکت ہے اتباع سنت کی۔

ہر چند کہ اس یوم میں افراط و تفریط کے متعلق بیان کرنا زائد معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جو افراط تفریط کرنا تھا آج ان لوگوں نے کر لیا ہو گا پس اب اس بیان سے کیا فائدہ؟ مگر یہ ایام چونکہ پھر بھی انشاء اللہ تعالیٰ آنے والے ہیں اور نیز علاوہ ربیع الاول کے اور دنوں میں بھی لوگ ایسی مجالس منعقد کرتے ہیں اور اس میں حدود شرعیہ سے متجاوز ہوتے ہیں اس لئے اس کے متعلق بیان کر دینا خالی از نفع نہیں۔ یہ مضمون تو بطور تمہید کے تھا۔

رحمۃ للعالمین

اب آیت شریفہ کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ جاننا چاہئے کہ اس میں کسی مسلمان کو شک و شبہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کی ہر نعمت قابل شکر ہے خاص کر جو بڑی نعمت ہو۔ پھر ان میں بھی خصوص دینی نعمت اور دینی نعمتوں میں بھی خاص جو بڑی نعمت ہو۔ پھر ان میں بھی وہ نعمت جو اصل ہے تمام دینی و دنیوی نعمتوں کی۔ اور وہ نعمت کیا ہے؟ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کہ حضور سے دینی نعمتوں کے تو فیوض دنیا میں فائض ہوئے ہی ہیں دنیوی نعمتوں کے سرچشمہ بھی آپ ہی ہیں اور صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کے لئے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی نہیں بھیجا ہم نے آپ کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر جہانوں کی

رحمت کے واسطے" دیکھئے عالمین میں کوئی تخصیص انسان یا غیر انسان یا مسلمان یا غیر مسلمان کی نہیں ہے پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود ہر شے کے لئے بارحمت ہے۔ خواہ وہ جنس بشر سے ہو یا غیر جنس بشر سے اور خواہ حضور سے زمانہ متاخر ہو یا متقدم۔

متاخرین کے لئے رحمت ہونا تو بعید نہیں لیکن پہلوں پر رحمت ہونے کے لئے بھی حضور کا ایک وجود سب سے پہلے پیدا فرمایا۔ اور وہ وجود نور کا ہے کہ حضور اپنے وجود نوری سے سب سے پہلے مخلوق ہوئے ہیں اور عالم ارواح میں اس نور کی تکمیل و تربیت ہوتی رہی آخر زمانہ میں اس امت کی خوش قسمتی سے اس نور نے جسد عنصری میں جلوہ گر و تاباں ہو کر تمام عالم کو منور فرمایا۔ پس حضور اولاً و آخراً تمام عالم کے لئے باعث رحمت ہیں۔ پس حضور کا وجود تمام نعمتوں کی اصل ہونا عقلاً و نقلاً ثابت ہوا تو ایسا کون مسلمان ہوگا کہ جو حضور کے وجود باجود پر خوش نہ ہو یا شکر نہ کرے۔

بہتان عظیم

پس ہم پر یہ خالص تہمت اور محض افتراء اور نرا بہتان ہے کہ توبہ توبہ نعوذ باللہ کہ ہم لوگ حضور کے ذکر شریف یا اس پر خوش ہونے سے روکتے ہیں۔

حاشا وکلا! حضور کا ذکر تو ہمارا جزو ایمان ہے۔ ہاں جو شے خلاف ان قوانین کے ہوگی جن کی پابندی کا ہم کو خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم فرمایا ہے اس سے البتہ ہم روکیں گے اگرچہ فی نفسہ وہ شے مستحسن ہو اور شریعت میں اس کے نظائر بکثرت موجود ہیں۔

دیکھو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ قبلہ سے منہ پھیر کر نماز پڑھنا ممنوع ہے اور یہ بھی سب کے نزدیک مسلم ہے کہ یوم النحر اور یوم الفطر میں روزہ رکھنا حرام ہے اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ایام تشریق میں افطار ضروری ہے اور یہ بھی تمام امت کا مسئلہ مسلمہ ہے کہ ماہ محرم میں حج نہیں ہو سکتا۔ اور نیز محل حج مکہ ہی ہے بمبئی میں حج ممکن نہیں۔ دیکھئے نماز روزہ حج فرض ہے لیکن خلاف قاعدہ اور قانون شریعت چونکہ کئے اس لئے وہ بھی منہی عنہا ہو گئے اور ان کے ممنوع ہونے کو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں پس اگر کوئی ایسے نماز روزہ حج کو منع کرے تو اس کو کوئی عاقل یوں نہ کہے گا اور یہ تہمت اس پر نہ لگائے گا کہ یہ شخص نماز روزہ حج سے روکتا ہے۔ اگر نماز روزہ سے روکتا تو خود ہی ان پر کیوں عامل ہوتا۔

اسی طرح مسئلہ متنازعہ فیہا کے اندر سمجھو کہ ہمارے حضرات کی نسبت یہ کہنا کہ یہ لوگ حضور کی ولادت شریفہ کے ذکر یا اس پر خوش ہونے کو منع کرتے ہیں۔ وہ نری تہمت اور افتراء ہے۔ سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ "اے اللہ! تو ہر عیب سے پاک ہے یہ بہت بڑا بہتان ہے"۔

حاشا اللہ ہم ہرگز منع نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک شے کا ایک طریق ہوتا ہے جب وہ شے اس طریق سے کی جاوے تو وہ پسندیدہ ہے ورنہ ناپسند اور قابل منع کرنے کے ہے۔

دیکھئے! تجارت ہے۔ اس کے لئے گورنمنٹ نے خاص خاص قوانین مقرر کر دیئے ہیں اگر کوئی شخص ان قوانین کے خلاف تجارت کرے گا تو وہ ضرور قوانین کی خلاف ورزی میں ماخوذ ہوگا چھرا بارود کی تجارت وہی کر سکتا ہے جس نے لائسنس حاصل کر لیا ہو۔ اسی طرح شریعت میں بھی ہر شے کا قاعدہ اور قانون ہے۔ جب اس کے خلاف کیا جاوے گا تو وہ ناپسند اور منہی عنہ ہو جائے گا۔

پس حضور کی ولادت باسعادت کا ذکر مبارک عبادت ہے لیکن دیکھنا چاہئے کہ قانون دان حضرات یعنی خود حضور اور صحابہ رضی اللہ عنہم جن کے اقتداء کا ہم کو حکم ہے انہوں نے اس عبادت کو کس طرز اور کس طریقہ سے کیا ہے اگر آپ لوگ اسی طریق سے کریں تو سبحان اللہ کون اس سے روکتا ہے اور اگر اس طریق سے نہ کیا جاوے تو بے شک وشبہ وہ قابل روکنے کے ہے۔ اب فرمایئے کہ کیا ہم لوگ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روکنے والے ہیں؟ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی چھرا بارود کی تجارت کو لائسنس نہ ہونے کی وجہ سے منع کرے اور اس کو یہ کہا جاوے کہ یہ تو تجارت کو منع کرتے ہیں۔

پس نفس فرح وسرور علی ذکر الرسول سے کوئی منع نہیں کرتا کہ وہ تو عبادت ہے ہاں جب اس کے ساتھ اقتران منہی عنہ کا ہوگا تو بے شک قابل ممانعت ہے۔

معیار شریعت

فرح اور سرور ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس کی نسبت قرآن میں ایک مقام پر تو ہے لَا تَفْرَحْ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے فَلْيَفْرَحُوا جیسا اس آیت میں ہے معلوم ہوا کہ بعض فرح کے افراد ماذون فیہ ہیں اور بعض منہی عنہا اور ظاہر ہے کہ اعمال اخرویہ میں ہمارے لئے معیار شریعت ہے پس شریعت کے قواعد سے جو فرحت جائز ہے اس کی تو اجازت ہے اور جو ناجائز ہے وہ ممنوع ہے۔ چنانچہ جس جگہ لاتفرح ہے وہاں دنیوی فرحت مراد ہے مگر وہی فرحت جو حدود سے متجاوز ہو ورنہ نفس فرح نعمت دنیویہ پر بھی لوازم شکر سے ہے جہاں امر کا صیغہ ہے وہاں نعمت دینی پر فرحت مقصود ہے لیکن وہی فرح جس میں قواعد شریعت سے تجاوز نہ ہو۔ مثلاً اگر کوئی نماز پر کہ وہ نعمت دینی ہے خوش ہو اور خوشی میں آ کر یہ کرے کہ بجائے چار رکعت کے پانچ رکعت پڑھنے لگے تو بجائے اس کے کہ ثواب ہو الٹا گناہ ہوگا اس لئے کہ اس نے شریعت کے قواعد سے تجاوز کیا۔ خود ذکر رسول کہ جس میں اختلاف ہے اسی کو لے لیجئے کہ مسئلہ متفق علیہا ہے کہ جو شخص چار رکعت والی نماز میں قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد اللھم صلی علی محمد پڑھ دے تو نماز ناقص ہوگی حتیٰ کہ سجدہ سہو سے وہ نقصان منجبر ہوگا اگر سہواً ایسا کیا۔ دیکھئے درود شریف کی نسبت ارشاد ہے۔

من صلی علی مرۃ صلی اللہ علیہ عشرا او کما قال
"یعنی جو شخص درود بھیجے مجھ پر ایک مرتبہ اس پر اللہ تعالیٰ دس مرتبہ رحمت فرمادیں گے" اور پھر موقع کونسا؟ نماز۔ لیکن حکم شرعی یہ کہ نماز میں نقصان آجائے گا تو اس کی آخر کیا وجہ ہے۔

بزہد و ورع کوش صدق و صفا   ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ
خلاف پیمبر کسے راہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
میندار سعدی کہ راہ صفا   تواں رفت جز بر پے مصطفےٰ

(زہد و ورع اور صدق و صفا میں کوشش کرو لیکن حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو جس شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف دوسرا راستہ اختیار کیا وہ ہرگز منزل مقصود کو نہ پہنچے گا سعدیؒ یہ گمان نہ کرو کہ بجز پیروی مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی سیدھا راستہ ہے اس راستہ کے سوا تو صراط مستقیم پر نہیں چل سکتا۔)

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو موقع درود شریف کا نماز میں مقرر فرمادیا ہے چونکہ اس سے تجاوز ہوا ہے اس لئے نماز میں نقصان آیا۔ اگرچہ درود شریف فی نفسہ عبادت ہے اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر اہل بدعات کا بھی اتفاق ہے اس لئے کہ وہ بھی حنفی ہیں۔ پس ان کو چاہئے کہ امام صاحب پر اعتراض کریں اور ان پر بھی یہ تہمت لگائیں کہ وہ نعوذ باللہ ذکر رسول سے منع کرتے ہیں اور وہ بھی وہابی تھے۔

پس اے حضرات خدا سے ڈریئے اور اس مادہ فاسدہ کو اپنے دماغ سے نکالیے ورنہ اس کا اثر دور دور تک سرایت کرے گا اور احکام میں نظر انصاف اور حق طلبی سے غور فرمایئے۔ پھر اگر شبہات رہیں تو شائستگی اور تہذیب سے ان کو رفع فرمایئے اور خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جب قرآن مجید میں خود حضور کے وجود باجود کی نسبت (**کما سیجی فی تفسیر الایۃ مفصلا**) صیغہ امر **فلیفرحوا** موجود ہے تو اس فرحت کو کون منع کرتا ہے غرض حضور کی ولادت شریفہ پر فرحت اور سرور کو کوئی منع نہیں کرسکتا۔ اور یہ امر بالکل ظاہر تھا لیکن میں نے اس میں اس لئے تطویل کی کہ ہم پر یہ افترا ہے کہ یہ لوگ حضور کے ذکر کو منع کرتے ہیں۔

اہمیت ذکر رسول

صاحبو! حضور کا ذکر مبارک تو وہ شے ہے کہ اگر اس پر اجر کا بھی وعدہ نہ ہوتا تو حضور کی محبت بمقتضائے **من احب شیئا اکثر ذکرہ** اس کو مقتضی ہے کہ آپ کا ہر وقت ذکر کیا کرتے اور چونکہ حضور کا ذکر عین عبادت ہے اسی واسطے حق تعالیٰ نے خود اس قدر مواقع آپ کے ذکر کے مقرر فرمائے ہیں کہ مسلمان سے لامحالہ ذکر ہو ہی جاتا ہے دیکھئے نماز کے اندر ہر قعدہ میں **السلام علیک ایھا النبی** موجود ہے اور قعدے ظہر میں اور عصر اور مغرب اور عشا میں دو دو ہیں اور فجر میں ایک تو کل نو قعدے ہوئے۔ اور سنن موکدہ اور وتر میں لیجئے ظہر میں ایک عشاء میں تین اور صبح میں ایک تو کل ۱۷

قعدے ہوئے۔ پس یہ سترہ مرتبہ حضور کا ذکر ہوا۔ پھر پانچوں وقت فرائض اور سنن و وتر کے قعدے اخیرہ میں کل گیارہ مرتبہ درود شریف بھی پڑھا جاتا ہے پس سترہ اور گیارہ کل اٹھائیس بار تو لامحالہ ہر مسلمان کو آپ کا ذکر کرنا روزانہ ایسا ضروری ہے کہ اس سے کسی طرح مفر ہی نہیں۔

پھر پانچوں وقت اذان اور تکبیر ہوتی ہے۔ اس میں **اشهد ان محمدا رسول الله** موجود ہے جس کو موذن اور سننے والا دونوں کہتے ہیں۔ پھر ہر نماز کے بعد دعا بھی مانگتے ہیں اور دعا کے آداب میں سے کر دیا گیا ہے کہ اس کے اول و آخر درود شریف ہو۔ غرض اس حساب سے اٹھائیس سے بھی زیادہ تعداد حضور کے ذکر شریف کی ہوگی اور یہ تو وہ مواقع ہیں کہ ان میں پڑھے بے پڑھے سب شامل ہیں۔ اور جو طالب علم حدیث شریف پڑھتے ہیں وہ تو ہر وقت حضور کے ذکر میں رہتے ہیں اس لئے کہ ہر حدیث کے شروع میں آپ کے نام مبارک کے ساتھ درود شریف موجود ہے چنانچہ احادیث کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے اور ان میں جابجا **قال رسول الله صلى الله عليه وسلم** اور **قال النبى صلى الله عليه وسلم** اور **عن النبى صلى الله عليه وسلم** (الترغيب والترهيب للمنذرى ۲:۴۹۸، إتحاف السادة المتقين ۴:۵۸) واقع ہے اور درمیان میں بھی جہاں کہیں حضور کا اسم مبارک آیا ہے وہاں بھی درود شریف موجود ہے۔ گویا حضور کے ذکر کو ایسا گوندھ دیا ہے کہ بغیر ذکر کے مسلمانوں کو چارہ نہیں۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ ذکر ولادت آپ کے نزدیک جائز یا ناجائز؟ انہوں نے فرمایا کہ ہم تو ہر وقت ذکر ولادت کرتے ہیں اس لئے کہ ہر وقت کلمہ **لا اله الا الله محمد رسول الله** پڑھتے ہیں اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو ہم یہ کلمہ کہاں پڑھتے۔

معیار محبت

پس محبت کا مقتضی تو یہ ہے کہ آپ کا ہر وقت ذکر ہو اور اس کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ اس کی مجالس منعقد کی جاویں اور مٹھائی منگائی جاوے تب ذکر ہو، عاشق اور محبت کو اتنی دیر کیسے صبر آ سکتا ہے۔ دیکھو کسی سے اگر محبت ہو جاتی ہے تو محب کی کیا حالت ہوتی ہے کہ ہر وقت اس کی یاد میں بے قرار رہتا ہے اگر اس سے کوئی کہے کہ میاں ذرا ٹھہر جاؤ ہم مجلس آرائی کر لیں اور مٹھائی منگا لیں اس وقت ذکر کیجیو۔ وہ کہے گا معلوم ہوتا ہے تمہاری محبت کاذبہ ہے کہ جو اتنی دیر تک ذکر محبوب سے صبر کرتے ہو۔ محبت تو وہ شے ہے جیسے مجنوں کی حالت تھی۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　　در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم　　مے نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم　　خاطر خود را تسلی میدہم

(کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے اس نے پوچھا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔)

بتلایئے! اگر مجنوں کو اس حالت میں کوئی یہ کہتا کہ ذرا ٹھہر جاؤ ہم مجلس بنا لیں اور مٹھائی منگا لیں اس وقت لیلیٰ کا ذکر کرنا تو وہ یہ جواب دے گا کہ سلام ہے ایسی مجلس کو اور ایسی مٹھائی کو جو میرے اور محبوب کے درمیان میں حجاب ہو۔ اور ہم نے تو اکثر مجالس میں میلاد والوں کو یہی دیکھا ہے کہ یہ محبت سے بالکل خالی ہوتے ہیں اس لئے کہ بڑا معیار محبت کا محبوب کی اطاعت ہے کسی نے خوب کہا ہے۔

تعصی الرسول و انت تظہر حبہ　　ھذا لعمری فی الفعال بدیع
لوکان حبک صادق لا طعتہ　　ان المحب لمن یحب مطیع

("یعنی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور ان کی محبت کو ظاہر کرتا ہے اپنی جان کی قسم! یہ امر افعال عجیبہ میں سے ہے اگر تیری محبت صادق ہوتی تو حضور کی اطاعت کرتا اس لئے کہ محب محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔)

مولد پرستوں کو دیکھا ہے کہ مجلس میلاد کا اہتمام کرتے ہیں' بانس کھڑے کر رہے ہیں' ان پر کپڑے منڈھ رہے ہیں اور سامان روشنی کا فراہم کر رہے ہیں اور اس درمیان میں جو نمازوں کے وقت آتے ہیں تو نماز نہیں پڑھتے اور داڑھی کا صفایا کرتے ہیں کیوں صاحبو! کیا محبین رسول کی ایسی ہی صورتیں اور یہی ان کی حالت ہوتی ہے؟ کیا بس حضور کا یہی حق ہے کہ پانچ روپیہ کی مٹھائی منگا کر تقسیم کر دی اور سمجھ لیا کہ ہم نے رسول کا حق ادا کر دیا؟ کیا آپ لوگوں نے حضور کو نعوذ باللہ کوئی پیشہ ور پیرزادہ سمجھ لیا ہے؟ کہ تھوڑی سی مٹھائی پر خوش ہو جاویں' تھوڑے سے نذرانہ پر راضی ہو جاویں' توبہ توبہ نعوذ باللہ' یاد رکھو! حضور ایسے محبین سے خوش نہیں ہیں سچے محب وہ ہیں جو اقوال وافعال' وضع انداز ہر شے میں حضور کا اتباع اور اطاعت کرتے ہیں۔

تائید رسول

میرے ایک دوست حافظ اشفاق رسول نامی ہیں وہ ذکر رسول کے فریفتہ ہیں وہ کبھی کبھی محبت کی وجہ سے ذکر ولادت مروج طریق سے کیا کرتے تھے انہوں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ ہم اس کی شفاعت نہ کریں گے جو ہماری بہت تعریف کرے۔ ہم اس کی شفاعت کریں گے جو ہماری اطاعت کرے۔ مطلب اس کا یہی ہے کہ جو شخص نرا دعویٰ کرتا ہو اور نعتیہ اشعار پڑھتا ہو لیکن اطاعت کرتا نہ ہو تو اس کی شفاعت نہ کریں گے۔

میں نے جو "اصلاح الرسوم" کتاب لکھی ہے اس میں ایک فصل ذکر میلاد کے متعلق بھی ہے چنانچہ وہ فصل طریق مولد کے نام سے علیحدہ طبع بھی ہو گئی ہے تو جب یہ کتاب لکھی گئی تو مجلس میلاد کے متعلق کانپور میں لوگوں نے بہت شور کیا۔ اسی اثناء میں ایک شخص صالح نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور اس اختلاف کے متعلق حضور سے دریافت کیا کہ اس میں صحیح کیا ہے؟ تو حضور نے فرمایا کہ اشرف علی نے جو لکھا ہے وہ سب صحیح ہے۔

میں نے حضور کے حالات میں جو کتاب "نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب" لکھی ہے اس کے آخر میں ان دونوں خوابوں کو مفصلاً درج کر دیا ہے لیکن میری غرض ان خوابوں کے ذکر کرنے سے مدعا کا اثبات نہیں ہے اثبات مدعا کے لئے تو مستقل دلائل ہیں یہ تو محض تائید اور مزید اطمینان کے لئے لکھ دیا ہے۔

الحاصل حضور کا وجود باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اور اس پر شکر اور فرحت مامور بہ ہے چنانچہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں اسی نعمت کا ذکر اور اس پر فرح کا امر ہے۔

خصوصیت معصیت

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے پہلے قرآن مجید کی شان حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا
فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"یعنی اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت اور دل کے امراض کے لئے شفا اور مومنین کے لئے ہدایت و رحمت آئی ہے"۔

اس میں حق تعالیٰ نے قرآن مجید کی چار صفتیں بیان فرمائی ہیں۔ موعظۃ' شفا' ہدیٰ' رحمۃ' موعظۃ کہتے ہیں وہ کلام جو بری باتوں سے روکنے والا ہے اور شفا اس کی صفت بطور ثمرہ کے فرمائی ہے۔ یعنی نتیجہ اور ثمرہ اس موعظۃ پر عمل کرنے کا یہ ہے کہ دلوں کے اندر جو روگ ہیں اس سے شفا حاصل ہو گی۔

یہاں سے ایک تصوف کا مسئلہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے یہ تو ظاہر ہے کہ ہم لوگ گناہ میں مبتلا ہیں اور شب و روز ہم سے لغزشیں ہوتی ہیں لیکن اس ابتلا کے ساتھ دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں کہ گناہ کرتے ہیں اور ان کو اس کا کچھ احساس نہیں ہوتا اور ایک وہ جن کو احساس ہوتا ہے۔ سو الحمد للہ! کہ گو ہم پھسلتے ہیں اور گناہ ہم سے صادر ہوتے ہیں لیکن اندھے نہیں ہیں کہ اس کی خبر ہی نہ ہو کہ راستہ کدھر ہے۔ الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے آنکھیں عطا فرمائی ہیں گو بعض وقت نفس کے غلبہ و شرارت سے ان سے کام نہ لیں۔ پس ان آنکھوں سے ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ جب کوئی بھی گناہ ہوا ہے۔ اس سے قلب میں ایک روگ پیدا ہو گیا ہے اسی روگ کی نسبت حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

(یعنی "بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کے رنگ کا غلبہ ہو گیا ہے"۔ اور اسی کی نسبت حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو قلب پر ایک داغ لگ جاتا ہے۔ اگر توبہ کر لے تو وہ مٹ جاتا ہے ورنہ بڑھتا ہے۔) مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

ہر گناہ زنگے ست بر مراۃ دل　　　دل شود زیں زنگہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی　　　نفس دوں را بیش گرد و خیرگی

(ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ ہے کہ دل ان زنگوں سے خوار و شرمندہ ہوتا ہے جب دل کی تاریکی زیادہ بڑھ جاتی ہے تو نفس کمینہ کو اس سے خیرگی ہوتی ہے۔)

غرض گناہ کے اندر خاصہ ہے کہ قلب میں اس سے ایک روگ پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو وہ روگ اور بڑھ جاتا ہے یہاں پر بعض اہل سلوک کو ایک عجیب دھوکا ہوا ہے اور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شیطان ان کو گناہ کی رغبت دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے قوت نور ایمان گناہ سے روکتی ہے جس سے وہ رک جاتا ہے لیکن شیطان تو اس سے بہت زیادہ پڑھا ہوا ہے وہ جب دیکھتا ہے کہ اس طور سے میرا قابو نہیں چلتا تو وہ گناہ کے اندر ایک دینی مصلحت بتاتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے یہ گناہ نہ کیا تو ہمیشہ تمہارے دل میں یہ کانٹا سا کھٹکتا رہے گا اور اگر ایک دفعہ دل بھر کر کر لو گے تو دل میں سے اس کا وسوسہ جاتا رہے گا۔ بس اس سے فراغت ہو جائے گی اس میں بڑے بڑے سمجھدار لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن مومن کامل کو اللہ تعالیٰ نے ایک نور عطا فرمایا ہے کہ وہ اس کے لاکھوں تار و پود کو اس نور کے ذریعہ سے توڑ پھوڑ دیتا ہے (چنانچہ عنقریب اس مغالطہ کا حل آتا ہے) اسی واسطے تو حدیث شریف میں آتا ہے۔ **فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد**۔ (سنن الترمذی: ۲۶۸۱، سنن ابن ماجة: ۲۲۲، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۱: ۷۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۱۷، کنز العمال: ۲۷۰۸۳.)

"یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ گراں ہے" کسی نے اس مضمون کو نظم بھی کر دیا ہے۔

فان فقیہا واحدا متورعا　　　اشد علی الشیطان من الف عابد

(بلاشبہ ایک پرہیزگار فقیہ شیطان پر ہزاروں عابدوں سے بھاری ہے۔)

یہ غلطی ہے جو اہل سلوک کو ہوتی ہے اور اہل سلوک کو جو غلطی ہوتی ہے در اصل غلطی وہی ہے اور وہ بہت سخت ہوتی ہے اسی واسطے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تم کو گناہ سے اندیشہ ہے اور ہم کو کفر سے اندیشہ ہے۔ بڑا خطرناک راستہ ہے۔ بس عافیت اس میں ہے کہ اس میں اپنی رائے کو دخل نہ دے اور کالمیت بید الغسال بدست (مثل مردہ کے غسال کے ہاتھ میں) محقق ہو کر رہے۔ شیخ شیرازی اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

اگر مرد عشقی کم خویش گیر　　　وگرنہ رہ عافیت پیش گیر

"یعنی اگر مردِ عشق ہو تو اپنے کو گم کر دو یعنی اپنی رائے کو دخل نہ دو بلکہ یہ مشرب اختیار کرو"۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست　　کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(عالم عاشقی میں اپنی فکر و رائے بالکل بے کار ہے اس مذہب میں خود بینی و خود رائی کفر ہے)

جیسے اس شخص نے خود رائی کی کہ شریعت تو حکم کر رہی ہے لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا۔ یہ اپنی رائے سے کہتا ہے کہ میں زنا سے جب بچ سکوں گا جب جی کھول کر پانچ چھ مرتبہ زنا کر لوں گا اور اس احمق کو اتنی خبر نہیں کہ مرض کو اس سے اور زیادہ قوت ہوگی۔ جیسے کسی شاعر کا شعر ہے۔

مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی　　کنار و بوس سے دونا ہوا عشق

یہ بے وقوف تو سمجھتا ہے کہ درخت میں پانی دینے سے اس کی جڑ نرم اور کمزور ہو جائے گی پھر اس کو سہولت سے باہر نکال لوں گا مگر وہ پانی دینے سے اور زیادہ نیچے کو دھنستی ہے اور زور پکڑتی ہے گناہ کرنے کے بعد اس کو قلب خالی معلوم ہوتا ہے اور خبر نہیں کہ وہ گناہ پہلے حوالی قلب میں تھا اس لئے اس کو محسوس ہوتا تھا اور اب عروق کے اندر پیوست ہو گیا اس وجہ سے اس کو محسوس نہیں ہو رہا اور وقت پر بہ نسبت سابق کے بہت زور کے ساتھ برآمد ہوگا اور نہیں سمجھتا کہ اب تو اس کا استیصال سہل ہے اور پھر مشکل ہوگا۔ بقول شیخ شیرازی

سر چشمہ شاید گرفتن بہ بیل　　چوں پر شد نشاید گزشتن بہ پیل
درختے کہ اکنوں گرفتست پائے　　بہ نیروئے شخصے برآید ز جائے
و گر ہمچناں روزگارے ہلی　　بگردونش از بیخ بر نگسلی

(چشمے کے سوراخ کو ایک کیل سے بند کر سکتے ہیں جب پر ہو جائے تو ہاتھی بھی اس میں سے نہیں گزر سکتا جس درخت نے ابھی جڑ پکڑی ہے ایک آدمی کی طاقت سے اکھڑ سکتا ہے اگر کچھ زمانہ تک اس کو اس طرح چھوڑ دو تو اس کو جڑ سے آلہ گردوں سے بھی نہیں نکال سکتے۔)

الحاصل گناہ ایسی شے ہے خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اس سے قلب میں ایک روگ پیدا ہو جاتا ہے۔

ناز و نیاز

پس ارشاد ہے کہ قرآن مجید ایسی موعظت ہے کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو وہ دلوں کے روگ کے لئے باعث شفا ہوگا اور تیسری صفت قرآن مجید کی ہدیٰ ارشاد فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نیک راہ کا بتلانے والا ہے۔ چوتھی صفت رحمت بطور ثمرہ ہدیٰ کے فرمائی ہے یعنی نتیجہ اور ثمرہ اس پر عمل کرنے کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت ہوگی پس قرآن میں مذکورہ بالا صفات کو جمع کر دیا ہے اور للمؤمنین کی قید اس لئے لگائی ہے کہ گو مخاطب تو اس کے سب ہیں لیکن منتفع اس سے مومنین ہی ہوتے ہیں اب اس آیت کے بعد بطور تفریع ارشاد ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَ بِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝

”یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ اللہ کے فضل اور رحمت ہی کے ساتھ بس صرف چاہئے کہ خوش ہوں (اس لئے) کہ وہ بہتر ہے اس شے سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ ”یعنی متاع دنیا سے یہ بہتر ہے اور عجیب بلاغت ہے کہ پہلے مضمون کا تو حق تعالیٰ نے خود اپنی طرف سے خطاب فرمایا‘ چنانچہ ارشاد ہے۔ یاایھا الناس الخ اور اس دوسرے مضمون کی نسبت حضور کو حکم دیا کہ آپ کہئے۔

اس میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ طبعی بات ہے کہ احکام یعنی امر و نہی انسان کو ناگوار اور گراں ہوتے ہیں۔ اس لئے احکام تو خود ارشاد فرمائے تاکہ حضور کی محبوبیت محفوظ رہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ فرحت کے امر کو حضور کے سپرد فرمایا کہ اس سے حضور کے ساتھ اور زیادہ محبت مخلوق کو بڑھے۔ باقی اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ بہت جگہ حضور کو بھی احکام پہنچانے کا حکم ہے۔ اس لئے کہ یہ نکتہ اس مقام کے متعلق ہے اور دوسری جگہ دوسرا نکتہ اور حکمت ہو سکتی ہے۔

بہرحال دو چیزوں پر خوش ہونے کا حکم ہے فضل اور رحمت۔ اور یہ فضل بھی رحمت ہی کے افراد میں سے ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ فضل کے اندر معنی زیادتی کے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رحمت بمعنی مہربانی کے دو مرتبہ ہیں۔ ایک نفس مہربانی اور ایک زائد۔ یا یوں کہو کہ ایک وہ مرتبہ ہے جس کا بندہ بحیثیت جزاء کے اپنے کو مستحق سمجھتا ہے اور ایک زائد۔ اگرچہ پہلے مرتبہ رحمت کا اپنے کو مستحق سمجھنا بندہ کی جہالت ہے اور وجہ اس زعم استحقاق کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر ہر شخص کو ایک ناز ہوتا ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو ہم لوگوں میں ناز ہی کی شان رہ گئی ہے نیاز بالکل نہیں رہا۔ اس لئے کہ اگر نیاز ہوتا تو ہم سے نافرمانی نہ ہوتی۔ دیکھ لیجئے کہ حکام دنیا کے ساتھ نیاز ہے اس لئے ان کی نافرمانی نہیں کرتے نہ ان پر نخرے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ بالعکس ہے جس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ رحمت ہی کی انتہا ہے حتیٰ کہ فوری سزا نہیں دی جاتی۔ سو جس قدر رحمت بڑھتی جاتی ہے اس رحمت و عنایت کو معلوم کر کے اسی قدر اعراض ان حضرات کا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گدھا ہمیشہ کسی کے کھیت میں گھس جایا کرتا تھا ایک روز کھیت والے نے اس کے کان میں کہہ دیا کہ مجھ کو تجھ سے محبت ہے۔ اس روز سے اس نے وہاں آنا چھوڑ دیا۔

پس اسی طرح حق تعالیٰ کی اس قدر عطائیں اور بے انتہا رحمتیں ہیں کہ ہم لوگوں کو ناز ہو گیا اور اپنی جہالت سے یہ سمجھ گئے کہ ہم بھی محبوب ہیں۔ بس لگے نخرے بگھارنے۔ مگر چونکہ ناز کی لیاقت نہیں ایسے ناز کا انجام بجز ہلاکت کے کیا ہو گا۔

جیسے کسی بے وقوف نے ایک سپاہی کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا ہے اور وہ گھوڑا کبھی ادھر منہ کر لیتا ہے کبھی ادھر منہ پھیرتا ہے اور یہ شخص جس طرف وہ منہ کرتا ہے اسی طرف دانہ لے جاتا ہے اور کبھی

اس کی پیٹھ سہلاتا ہے اور کبھی منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ بیٹا کھاؤ۔ اس بے وقوف نے جب یہ دیکھا تو اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے تو یہ گھوڑا ہی بہتر ہے۔ میری بیوی تو مجھ کو بڑی ذلت سے روٹی دیتی ہے۔ آج سے گھوڑا بننا چاہئے۔ یہ سوچ کر گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ آج تو ہم گھوڑے بنیں گے وہ بھی بڑی شوخ تھی اس نے کہا کہ میری بلا سے۔ آپ گھوڑے بنیں یا گدھے۔ اس شخص نے کہا کہ میں گھوڑا بنتا ہوں تم میری پیٹھ سہلانا اور دانہ میرے سامنے لانا اور یہ کہنا کہ بیٹا کھاؤ۔ ادھر ادھر منہ پھیروں گا۔

غرض یہ الو کی دم گھوڑے کی طرح کھڑا ہوا۔ بیوی صاحبہ بھی عقلمند تھیں ایک چادر جھول کی بجائے اس پر ڈالی اور اگاڑی پچھاڑی اس کی باندھ دی اور دم کی جگہ جھاڑو لگائی اور دانہ سامنے لائی اور کہا بیٹا کھاؤ۔ رات کا وقت تھا اور اتفاق سے چراغ پیچھے رکھا تھا جب اس نے ادھر ادھر منہ پھیرا اور دولتیاں چلائیں۔ چراغ کی لو جھاڑو میں لگ گئی اور آگ بھڑک اٹھی۔ بدحواسی میں یہ تو خیال نہ رہا کہ رسیاں کھول دے۔ شور مچا دیا کہ لوگو دوڑو میرا گھوڑا جل گیا۔ محلہ والوں نے جانا کہ یہ پاگل یا مسخری ہے۔ اس کے یہاں گھوڑا کہاں! یہ یوں ہی بیہودہ بکتی ہے۔ غرض وہ گھوڑے صاحب وہاں ہی جل بھن کر خاک سیاہ ہو گئے۔

یہ انجام ہوتا ہے ایسے نخرے اور ناز کا۔ صاحبو! ناز کے لئے صورت بھی تو بنوا لو جب ناز زیبا ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد   چوں نہ داری گرد بدخوئی مگرد
زشت باشد روئے نازیبا و ناز   عیب باشد چشم نابینا و باز

(ناز کرنے کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس بھی نہ جاؤ بدصورتی پر ناز برا ہے آنکھ نابینا کا کھلا ہونا عیب ہے۔)

رحمت بے پایاں

لیکن حق تعالیٰ کے کرم اور رحمت بے انتہا سے ہم لوگوں کی عادتیں بگڑ گئی ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جس قدر رحمت ہوتی شرماتے اور تضرع و نیاز زیادہ ہوتی مگر یہاں بالعکس ہے۔ اس لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر مجھ کو یہ کہا جاوے مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ. ”یعنی کس شے نے دھوکا میں ڈالا تجھ کو اپنے رب کریم کے ساتھ“ تو میں جواب دوں گا۔ قد غرنی کرمک۔ یعنی آپ کے کرم نے مغرور کر دیا۔ یعنی میں خلاف مقتضائے کرم اس کرم پر مغرور ہو گیا۔

مقصود یہ ہے اور اس کو عذر گرداننا مقصود نہیں۔ پس یہ سارا ناز اس وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ کی عطایا زائد ہیں اور مواخذات کم ہیں اور اگر یہ ہوتا کہ جب گناہ کرتے تو غیب سے ایک چپت لگتا تو تمام ناز ایک طرف رکھا رہ جاتا اور کبھی گناہ نہ ہوتا۔ چنانچہ بعض بزرگوں کے ساتھ ایسا معاملہ ہوا بھی ہے۔

ایک بزرگ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور نہایت خوف زدہ تھے اور کہتے جاتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْکَ. کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کیا حالت؟ انہوں نے فرمایا کہ طواف کرتے ہوئے میں نے ایک لڑکے کو نظر بد سے دیکھ لیا تھا۔ غیب سے میری آنکھ پر ایسا زور سے چپت لگا کہ میری آنکھ پھوٹ گئی اور یہ ارشاد ہوا اِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا. یعنی اگر تم پھر کرو گے تو ہم پھر بھی سزا دیں گے۔

غرض حق تعالیٰ پر ایسا ناز ہے کہ اس کی وجہ سے ہر شخص اپنے کو کسی نہ کسی رحمت کے حصہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ چنانچہ اتنا ضروری جانتا ہے کہ مجھ کو کھانے پہننے کو ملے اور اگر اس میں کچھ کمی ہوتی ہے تو شکایت کرتا ہے اور اگر یہ شخص اپنے کو مستحق نہ جانتا تو شکایت نہ کرتا۔ اس لئے کہ شکایت اسی کی کیا کرتے ہیں جس پر حق سمجھتے ہیں۔

ایک گنوار کا بیٹا مر گیا تھا آپ کہتے ہیں کہ میرے بیٹے کو تو مار دیا اور (عیسیٰ علیہ السلام) جو ذرا نام لگ گیا تھا تو اس کو گود میں اٹھا لیا۔ مگر اللہ اکبر! کیا رحمت ہے سب کچھ سنتے ہیں اور کچھ سزا نہیں دیتے۔

اور دوسری مثال لیجئے۔ دیکھئے اگر کسی کو دس روپیہ ماہوار ملتے ہیں تو ان پر تو شکر نہیں کرتا اور اگر کہیں سے زائد مل جاوے تو اس کو رحمت حق تعالیٰ کی جانتا ہے اس پر شکر کرتا ہے یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ ان دس روپیہ کا اپنے کو مستحق جانتا ہے۔

ایک جاہل اکھڑ کے سامنے کسی نے دال روٹی کھائی اور کھا کر کہا الحمد للہ! اے اللہ تیرا شکر ہے۔ تو بے وقوف کہتا ہے کہ توبہ توبہ! ایسے ہی لوگوں نے اللہ میاں کی عادت بگاڑ دی کہ دال روٹی کھا کر شکر کرتے ہیں بس وہ ان کو دال روٹی ہی دیتے ہیں ہم تو بدوں بکرے کے کبھی شکر نہیں کرتے پس ہم کو وہ بکری دیتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ بہر حال ہر شخص اپنے کو کسی نہ کسی حصہ رحمت کا مستحق سمجھتا ہے حالانکہ یہ غلطی ہے اگر کوئی شخص ایسا جانتا ہو جیسا کہ طرز معاملہ سے معلوم ہوتا ہے تو اس کو اس غلطی کی اصلاح کرنی چاہئے۔ اس لئے اس کا تعلق عقیدہ سے ہے۔

درجات رحمت

معتزلہ کو بھی اس مسئلہ میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہمارا حق ہے اور ان کو یہ دھوکہ ہوا ہے قرآن شریف کی بعض آیتوں کو نہ سمجھنے سے۔ چنانچہ ارشاد ہے

وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ”یعنی مومنین کی نصرت ہم پر حق ہے۔ اس آیت اور اس کی ہم معنی اور آیات سے معتزلہ نے یہ سمجھا کہ حق تعالیٰ کے ذمہ بندوں کا حق ہے۔ لیکن اہل سنت سمجھ گئے کہ یہ دھوکا ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ غنی بالذات اور لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ (وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جا سکتا) ان کی صفت ہے ان پر کسی کا حق نہیں ہو سکتا جس کے ساتھ جو معاملہ چاہیں کریں وہ سب مستحسن ہے۔

معنی ان آیات کے یہ ہیں کہ اس صیغہ سے ہم کو نصرت وغیرہا کا یقین دلایا گیا ہے۔ اس کو

وعدہ تفضل کہتے ہیں جیسے کوئی حاکم کسی امیدوار سے کہے کہ اب تم یقین رکھو اب ہم نے تمہارا یہ کام ضروری سمجھ لیا ہے تو وہ امیدوار سائل جانتا ہے کہ یہ حاکم کی مہربانی ہے ورنہ کرنا نہ کرنا دونوں قانوناً ان کے اختیار میں ہے ان کے ذمہ لازم نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رحمت کے دو درجے ہیں۔ ایک کا تعلق تو اس کی ضروریات سے ہے جس کا اپنے کو مستحق سمجھتا ہے اس درجہ کو تو رحمت فرمایا اور دوسرا زائد اس کو فضل سے تعبیر فرمایا اور آیت کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد رحمت و فضل سے قرآن مجید ہے اور اس میں بھی یہی دو درجے ہیں۔ ایک وہ درجہ جو مدار ہماری نجات کا ہے وہ تو ضرورت کا مرتبہ ہے ایک وہ جو اس سے زائد ہے۔ بہر حال دونوں سے مراد قرآن مجید ہے اور اس پر خوش ہونے کا امر ہے۔ یہ تفسیر اور گفتگو تو الفاظ آیت کی خصوصیت میں نظر کرنے کے اعتبار سے تھی۔

اب قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر دیکھنا چاہئے کہ ان دونوں لفظوں سے کیا مراد ہے تو جاننا چاہئے کہ قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ بکثرت آئے ہیں۔ کہیں دونوں سے ایک معنی مراد ہیں کہیں جدا جدا۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

(پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ٹوٹا پانے والوں میں سے ہو جاتے)

یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک فضل اور رحمت سے حضور کا وجود باجود مراد ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

(اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بجز تھوڑے لوگوں کے تم شیطان کی پیروی کرتے)

یہاں بھی بقول اکثر مفسرین حضور ہی مراد ہیں۔ ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ

پس اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو البتہ ان میں سے ایک گروہ نے تجھ کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا)

یہاں مراد فضل اور رحمت سے قرآن مجید ہے اور بعض آیات میں فضل سے مراد ہے رحمت دنیوی اور رحمت سے رحمت دینی مراد ہے چنانچہ فضل بمعنی رزق و نفع دنیوی قرآن مجید میں آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ

(تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو)

یہاں فضل سے مراد تجارت ہے۔ اس لئے کہ یہ آیت حج کے موقعہ کی ہے۔ بعض لوگ مال

تجارت حج کے سفر میں ساتھ لے جانے کو مکروہ جانتے تھے ان کو ارشاد ہے کہ اس میں کچھ گناہ نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل طلب کرو۔ حدیث شریف میں بھی رحمت سے رحمت دینی اور فضل سے رحمت دنیوی یعنی رزق یا اسباب رزق مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو یہ کہو۔

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ

(اے اللہ تو ہمارے لئے رحمت کے دروازے کھول دے۔)

یہاں رحمت سے رحمت دینی مراد ہے اس لئے کہ مسجد میں وہی مطلوب ہے اور جب مسجد سے نکلو تو یہ کہو۔

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ فَضْلِکَ

اے اللہ ہمارے لئے رزق کے دروازے کھول دے

اس لئے کہ مسجد سے باہر جا کر تحصیل معاش میں لگ جاتے ہیں تو وہاں اس کی طلب ہے ، لیجئے سورہ جمعہ میں ارشاد ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

(پس جبکہ نماز ادا ہو جائے تو تم زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ سے روزی تلاش کرو۔)

یہاں فضل سے مراد رزق ہے۔ پس مجموعہ تمام تفاسیر کا تمام دنیوی رحمتیں اور دینی رحمتیں ہوا۔ اس مقام پر ہر چند کہ آیت کے سیاق پر نظر کرنے کے اعتبار سے قرآن مجید مراد ہے لیکن اگر ایسے معنی عام مراد لئے جائیں کہ قرآن مجید بھی اس کا ایک فرد رہے تو یہ زیادہ بہتر ہے وہ یہ ہے کہ فضل اور رحمت سے مراد حضور کا قدوم مبارک لیا جائے۔ اس تفسیر کے موافق جتنی نعمتیں اور رحمتیں ہیں خواہ وہ دنیوی ہوں یا دینی اور اس میں قرآن بھی ہے۔ سب اس میں داخل ہو جائے گی۔ اس لئے کہ حضور کا وجود باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اور مادہ ہے تمام رحمتوں اور فضل کا۔ پس یہ تفسیر اجمع التفاسیر ہو جائے گی۔

نعمت عظیمہ

پس اس تفسیر کی بنا پر حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ ہم کو حق تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ حضور کے وجود باجود پر خواہ وجود نوری ہو یا ولادت ظاہری اس پر خوش ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ حضور ہمارے لئے تمام نعمتوں کے واسطہ ہیں۔ حتیٰ کہ ہم کو جو روٹیاں دو وقتہ مل رہی ہیں اور عافیت اور تندرستی اور ہمارے علوم یہ سب حضور ہی کی بدولت ہیں اور یہ نعمتیں تو وہ ہیں جو عام ہیں اور سب سے بڑی دولت ایمان ہے جس کا حضور سے ہم کو پہنچنا بالکل ظاہر ہے۔ غرض اصل الاصول تمام مواد فضل و رحمت کی حضور کی ذات بابرکات ہوئی۔ پس ایسی ذات بابرکات کے وجود پر جس قدر بھی خوشی اور فرح ہو کم ہے۔ بہر حال اس آیت سے عموماً یا خصوصاً یہ ثابت ہوا کہ اس نعمت عظیمہ پر خوش ہونا چاہئے اور ثابت بھی ہوا نہایت ابلغ طرز سے۔ اس لئے کہ اول تو جار مجرور بفضل

اللہ کو مقدم لائے کہ جو مفید حصر کو ہے۔ اس کے بعد رحمت پر پھر جار کا اعادہ فرمایا کہ جس سے اس میں استقلال کا حکم پیدا ہو گیا پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کو مزید تاکید کے لئے فبذالک سے مکرر ذکر فرمایا اور الگ حرف جار اور فاء عاطفہ لائے تاکہ اس میں اور زیادہ اہتمام ہو جائے۔ پھر نہایت اہتمام در اہتمام کی غرض سے ضمیر بہ حرف ہ لائے کہ جو مشیر ہے ایک شرط مقدر کی طرف اور وہ ان فرحوا بشئی ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شے کے ساتھ خوش ہوں تو اللہ ہی کے فضل اور رحمت کے ساتھ۔ پھر اسی کے ساتھ خوش ہوں یعنی اگر دنیا میں کوئی شے خوشی کی ہے تو یہی نعمت ہے اور اس کے سوا کوئی شے قابل خوشی کے نہیں ہے اور اس سے بدلالۃ النص یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ نعمت تمام نعمتوں سے بہتر ہے لیکن چونکہ ہم لوگوں کی نظروں میں دنیا اور دنیا ہی کی نعمتیں ہیں اور اسی میں ہم کو انہماک ہے اس لئے اس پر بس نہیں فرمایا آگے اور نعمتوں پر اس کی تفضیل کے لئے صراحتاً ارشاد ہوا۔

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ. یعنی یہ نعمت ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کو لوگ جمع کرتے ہیں۔ یعنی دنیا بھر کی نعمتوں سے یہ نعمت افضل و بہتر ہے پس جس نعمت پر حق تعالیٰ اس شدومد کے ساتھ خوش ہونے کا حکم فرمادیں وہ کس طرح خوش ہونے کے قابل نہ ہوگی؟ یہ حاصل ہوا اس آیت کا جو مبنی ہے اس پر کہ فضل اور رحمت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد لئے جائیں۔

اہمیت ولادت

دوسرے مقام پر اس سے بھی صاف ارشاد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی خوشی کی شے دنیا میں اگر ہے تو حضور ہی ہیں اور اس میں ما بہ الفرح یعنی حضور کے وجود باجود پر جو خوشی کا امر ہے وہ کس بناء پر اور حیثیت وجہت فرح کی کیا ہے یہ بھی مذکور ہے وہ آیت یہ ہے ارشاد ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

"یعنی حق تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان میں ایک رسول ان کی جنس سے بھیجا کہ وہ ان پر ان کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کو ظاہری و باطنی نجاستوں و گندگیوں سے پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت سکھلاتے ہیں اور بے شک وہ اس سے پہلے ایک کھلی گمراہی میں تھے"۔

اس آیت میں **یتلوا علیھم ایتہ و یزکیھم** الخ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اصلی شے خوشی کی اور ما بہ الفرح والمنت یہ ہے کہ حضور ہمارے لئے سرمایہ ہدایت ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضور کے متعلق خوش ہونے کی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً حضور کی ولادت اور حضور کی بعثت اور حضور کے دیگر تمام حالات مثلاً معراج وغیرہ۔ یہ سب حالات واقعی خوش ہونے کے ہیں لیکن اس حیثیت سے کہ

ہمارے لئے یہ مقدمات ہیں ہدایت وسعادت ابدی کے۔ چنانچہ اس سے صاف ظاہر ہے اس لئے بعثت کے ساتھ یہ صفات بھی بڑھائی ہیں۔ یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم الخ پس بہ قاعدہ بلاغت ثابت ہوتا ہے کہ اصل مابہ المنت یہ صفات ہیں۔ باقی ولادت شریفہ فی نفسہا یا معراج وہ باعث خوشی زیادہ اسی لئے ہیں کہ مقدمات ہیں اس دولت عظیمہ کا۔ اس لئے کہ اگر ولادت شریفہ نہ ہوتی تو ہم کو یہ نعمت کیسے ملتی۔

اسی فرق کی وجہ سے اس آیت میں تو اس مقصود کا ذکر تصریحاً اور قصداً فرمایا اور دوسری آیت میں حضور کے وجود باجود کا ذکر اشارۃً وضمناً فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

لَعَمۡرُكَ إِنَّهُمۡ لَفِي سَكۡرَتِهِمۡ يَعۡمَهُونَ.

(آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں)

اس میں حضور کی بقاء اور وجود کو مقسم بہ بنایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قسم میں جواب قسم مقصود ہوتا ہے اور مقسم بہ کو تبعاً ذکر کیا جاتا ہے اور ایک مقام پر حضور کی ولادت شریفہ کو بھی اسی طرح ذکر فرمایا ہے فرماتے ہیں۔

لَآ أُقۡسِمُ بِهَٰذَا ٱلۡبَلَدِ ۝ وَأَنتَ حِلُّۢ بِهَٰذَا ٱلۡبَلَدِ ۝ وَوَالِدٖ وَمَا وَلَدَ ۝

(میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے قسم ہے باپ کی اور قسم ہے دادا کی)۔

چنانچہ ماولد کی تفسیر میں بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس کے مصداق حضور کی ذات والا صفات ہے مگر اس اہتمام سے نہیں جیسا آیت لقد من اللہ الخ میں نبوت اور بعثت اور ہدایت اور تزکیہ کو بیان فرمایا ہے۔

حظ نفس

اسی فرق کی وجہ سے فرحت میں بھی تفاوت ہوگا کہ جس قدر ولادت شریفہ پر فرحت ہونا چاہئے اس سے زائد نبوت شریفہ پر ہونا چاہئے اگر ذکر ولادت شریفہ کے لئے مجلس منعقد کی جاوے تو ذکر نبوت مبارکہ کے لئے بطریق اولیٰ کی جاوے۔ اور اسی طرح ان اہل مجالس کو چاہئے کہ معراج شریف اور فتح مکہ معظمہ اور حضور کے غزوات مبارکہ اور ہجرت کی بھی مجالس منعقد کیا کریں۔ اس لئے کہ جیسے ولادت شریفہ حضور کا ایک حال ہے اسی طرح یہ بھی تو حضور ہی کے حالات ہیں بلکہ بعض ان میں سے ولادت شریفہ سے بڑھ کر ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ آج کل مجلس ولادت شریفہ میں حضور کے سب حالات کا اور احکام کا بھی ذکر کیا جاتا ہے حضرت بس رہنے دیجئے اور حالات ذکر محض خانہ پری کے یا صرف پالا سا چھوانے کے طور پر ہوتا ہے۔ بخلاف ذکر متعلق ولادت شریفہ کے کہ وہ ذکر نور سے لے کر وقت رضاع وغیرہ تک کیا جاتا ہے اور اگر کوئی مولوی نماز روزہ کے احکام مجلس مولود میں بیان کر دیتا ہے تو میں نے اہل مولد میں سے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ یہ کہتے تھے کہ لوگوں نے آج کل یہ نئی رسم نکال لی ہے

کہ وعظ کہتے ہیں نماز روزہ کا اور نام کرتے ہیں ذکر ولادت کا۔ یہ خیالات ہیں اہل مولد کے حالانکہ حق تعالیٰ کے کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ فرحت کے قابل یہی شے ہے۔ جیسا میں نے پہلی آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰہِ الخ کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ اب بتلایئے اس پر فرحت کون کرتا ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ذکر ولادت میں بوجہ اس کے کہ لڑکے خوش الحان گاتے ہیں اور مضامین و روایات بھی اکثر موضوع اور عجیب ہوتی ہیں اور اگر روایات صحیح بھی ہوں تو وہ ایک واقعہ اور قصہ ہے۔ جو طبعاً دلکش ہے۔ اس لئے اس کے سننے میں نفس کو حظ ہوتا ہے اور احکام میں کوئی خاص مزہ نہیں۔ اس لئے کہ اس میں تو یہی ہوگا یہ کرو وہ نہ کرو۔ تو اس میں کیا مزہ آیا۔ حالانکہ اصل سب مزوں کی احکام ہی ہیں۔ ایک مدت تک ان پر التزام کیجئے اور نفس کو خوگر بنایئے۔ پھر اس میں روحانی لطف دیکھئے۔ لیکن اس میں تو لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں اور زہر کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ اس لئے اس سے نفس بھاگتا ہے اور واقعات مولد شریف کے ذکر میں صرف سن لینا ہوتا ہے اس لئے اس میں نفس کو مزہ آتا ہے اسی لئے اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

اسی طرح تصوف کے رنگین مضامین اور عاشقانہ اشعار کی کیفیت ہے چونکہ اس میں افعل لاتفعل نہیں ہے اس لئے خوب مزہ آتا ہے' سر ہلتے ہیں بلکہ یہاں تو دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ ان اشعار و مضامین کو سمجھتے بھی نہیں ان کو بھی وجد آتا ہے۔ ایک قوال یہ شعر گا رہا تھا۔

بگویہ مار عشقت جگر کباب مارا

(تیرے مار عشق نے ہمارے جگر کو کاٹ کر کباب کر دیا۔)

ایک گنوار کو وجد آ گیا۔ اس سے پوچھا کہ تو نے کیا سمجھا جو تجھ کو وجد آیا؟ اس نے کہا کہ یوں کہتا ہے؟ ڈگرے کا باپ مارا'' ڈگرا کہتے ہیں ہندی میں نفس کو۔

ہم نے یہاں تک دیکھا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں اور رنڈیوں کے یہاں مروج مولد شریف ہوتا ہے کہ اس میں حظ نفس ہے ورنہ ہندوؤں کو اس سے کیا تعلق! غرض قرآن مجید سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ اہتمام کے قابل نبوت اور بعثت کا ذکر ہے اور ذکر ولادت اگر کہیں آیا ہے تو اشارۃً یا اجمالاً آیا ہے۔

عادت اللہ

اگر کوئی کہے کہ حق تعالیٰ نے سورہ مریم میں یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ مفصلاً بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ مولد عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام کی تفصیل بیان کرنا بھی قابل خاص اہتمام کے ہے پس اس پر ہم حضورؐ کے ذکر ولادت کو بھی قیاس کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ۔

حفظت شیئاو غابت عنک اشیاء

(ایک چیز تو نے یاد کرلی اور بہت سی چیزیں غائب کردیں)

آپ نے یہ تو دیکھ لیا کہ ان حضرات کی ولادت کا قصہ اہتمام سے بیان فرمایا ہے۔ مگر یہ نہیں دیکھا کہ کیوں اور کس حیثیت سے ذکر فرمایا۔ ان کے قصہ ولادت کے اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی ولادت ایک عجیب طریقہ سے خرق عادت کے طور پر ہوئی ہے۔ یحیٰ علیہ السلام کے ماں باپ تو بوڑھے بہت تھے کہ اسباب ظاہرہ کے اعتبار سے ان میں صلاحیت ہی توالد وتناسل کی نہ تھی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ واصلحنا له زوجه (اور ہم نے اس لئے اس کی زوجہ کو درست کر دیا) اس لئے ان کی ولادت عجیب تھی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے ہوئے" اس لئے ان کی ولادت اس سے بھی زیادہ عجیب ہے پس حق تعالیٰ نے ان دونوں قصوں سے قدرت اور توحید پر استدلال فرمایا ہے۔ یہ وجہ ہے ان قصوں کے بالاہتمام ذکر کرنے کی۔ اور حضور کی ولادت شریفہ عادت کے موافق ہوئی۔ پس اس سے مطلقاً ذکر مولد شریف کی تفصیل کا ذکر نبوت وہجرت کے برابر محل اہتمام ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

مگر آج کل بعض لوگوں نے خود اس مقدمہ میں کلام شروع کیا ہے کہ آپ کی ولادت شریفہ بطریق متعارف ہوئی ہے چنانچہ ایک شخص کا میرے پاس خط آیا تھا اس میں پوچھا تھا کہ کیا حضور بھی اپنی والدہ شریفہ کے بطن سے اسی طرح پیدا ہوئے جیسے اور آدمی ہوتے ہیں اور کسی کا قول نقل کیا تھا کہ ان سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے کہ حضور کی شان اس سے ارفع ہے کہ محل غیر طاہر سے پیدا ہوں اور پوچھا تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ طریق معہود سے پیدا ہوئے ہیں؟

میں کہتا ہوں کہ ان سائلوں کو ایسے امور کے پوچھنے سے شرم نہیں آتی۔ بہت بے حیائی اور بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے میرا جی تو چاہتا نہ تھا کہ اس خط کا جواب لکھوں لیکن طوعاً وکرہاً لکھا تا کہ ان مخالفین کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ اہل حق کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ میں نے جواب میں یہ لکھا کہ روایات میں حضور کی ولادت کے متعلق یہ الفاظ آئے۔ ولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور یہ مقدمہ مسلمہ ہے کہ جب تک مجاز کے قرائن نہ ہوں تو الفاظ اپنے حقائق پر محمول ہوتے ہیں یعنی جب تک معنی حقیقی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے اور یہ بھی مسلم ہے کہ علامت حقیقت کی تبادر الی الفهم عند الخلوص عن القرائن (قرائن سے خالی ہونے پر فہم طرف سبقت کرتی ہے) پس ان سب مقدمات سے ولد میں ولادت سے معہود ہی سے پیدا ہونا مراد لیا جائے گا۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ حضور بھی اسی طریق سے دنیا میں تشریف لائے ہیں۔

اب لوگ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور کی ولادت شریفہ کو عجیب طریقہ سے ثابت کریں اور عادت معروفہ کے موافق پیدا ہونے کو قدح جانتے ہیں حالانکہ اقرب الی الحکمۃ آپ کی شان کے اعتبار سے یہی ہے کہ جس طرح عادت اللہ جاری ہے آپ اسی طرح پیدا ہوں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ امر مسلم ہے کہ آدمی کو زیادہ انس اس شے سے ہوتا ہے جس

سے کچھ مناسبت ہو اور جس قدر مناسبت زیادہ ہوگی انس زیادہ ہوگا اور جس قدر مناسبت کم ہوگی اسی قدر اس سے توحش بڑھے گا۔ اسی واسطے آدمی کو اپنے ہم جنس کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے اور جانوروں کی طرف کم ہے اور جنوں سے اور بھی کم بلکہ توحش ہے اور اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام سب آدمی ہوئے ہیں۔ فرشتوں کو نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے اس لئے کہ ان سے آدمیوں کو توحش ہوتا اور جب توحش ہوتا تو افادہ اور استفادہ ممکن نہیں اس لئے سب رسول آدمی ہوئے ہیں۔

جب یہ امر سمجھ میں آگیا تو اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ حضرت کو محبوبیت کاملہ عطا فرمادیں اور کسی کو ذرہ برابر بھی حضور سے توحش نہ ہو۔ پس اس لئے بجز معجزات کے حضور کی کوئی اور حالت وغیرہ بھی معمول کے خلاف نہیں بنائی۔ اس لئے کہ اگر عادت جاریہ کے ذرا خلاف بھی کوئی بات ہوتی تو مناسبت میں اور پھر اس کے سبب انس میں کمی ضرور ہو جاتی۔ پس ولادت بھی حضور کی کسی نئی طرز سے نہیں ہوئی اور یہی آپ کی شان محبوبیت و افادہ کے لئے مناسب ہے اور اس کے خلاف کو ثابت کرنا اس حکمت کو نظر انداز کرنا ہے۔

حکمت الٰہیہ

بلکہ یہ حکمت یہاں تک مرعی رکھی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر کمالات بھی کہ ان میں معجزات بھی داخل ہیں نہایت لطیف ہیں جن کا عجیب ہونا امعان نظر کو مقتضی ہے حتیٰ کہ قرآن جو حضور کا بڑا معجزہ ہے وہ بھی سرسری نظر میں عجیب اور اعجاز کی شان اس میں معلوم نہیں ہوتی۔ اسی واسطے کفار نے کہا تھا۔

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا

”یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کریں“۔ لیکن ان لوگوں نے جب غور کیا اور اپنی انتہائی قوت اس کے مقابلہ میں صرف کردی تو دانت کھٹے ہو گئے۔ حالانکہ بڑے فصیح اور بلیغ تھے لیکن ایک سورت بھی ایسی نہ لا سکے باوجود اس کے کہ حق تعالیٰ نے ان کو جوش دلانے کے لئے علی الاعلان فرمایا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یعنی لے آؤ کوئی سورت اس جیسی“۔ اس کے بعد ان کے عجز کو بھی خود فرمایا۔ ولن تفعلوا یعنی ”تم ہرگز ایسی سورت نہ لا سکو گے“۔ اس کو سن کر اہل عرب کو کیسا کچھ جوش آیا ہوگا اور کس قدر بل کھائے ہوں گے لیکن مقابلہ نہیں کر سکے اور اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ آگے ارشاد ہے۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ

”یعنی اگر تم اس کا مثل نہ لا سکو تو اس آگ سے بچتے رہو جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے“۔

غرض یہ معجزہ بھی غامض اور لطیف ہے اسی طرح حضور کی ہر شان اور کمال ایسا ہی لطیف ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

یزیدک وجہہ حسنا اذا مازدتہ نظرا

"یعنی محبوب کا چہرہ تیرے لئے حسن کو بڑھا دیتا ہے جب تو اس پر نظر زیادہ کرتا ہے"۔

چنانچہ بعضوں کا حسن تو ایسا ہوتا ہے کہ دور سے وہ اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن پاس سے دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد　　چوں باز کنی مادر مادر باشد

بہت خوش قامت چادر کے اندر ہوتی ہیں جب تم چادر ہٹاؤ تو نانی معلوم ہوتی ہیں۔

اور بعضے دور سے اور سرسری نظر میں معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن جس قدر غور کرو خوبیاں معلوم ہوتی جاتی ہیں۔ حضور کے کمالات بھی ایسے ہی ہیں کہ ان میں سادگی تو اس درجہ ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند　　دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

(تمام دلفریبان نباتی زیور سے آراستہ پیراستہ ہیں ہمارے محبوب کا حسن خداداد ہے۔

اور نظر تامل کے بعد دلربائی کی یہ حالت ہے۔)

ز فرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دل کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اس کا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے۔)

پس ولادت بھی حضور کی کسی عجیب طریقہ سے نہیں ہوئی اور ولادت عیسویہ نہایت عجیب طریقہ سے ہوئی اور چونکہ اس سے توحید پر استدلال مقصود ہے اس لئے اس کو اہتمام سے بیان بھی فرمایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدار منت اور فرحت کا شان يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ الخ کی ہے اور ولادت شریفہ اور نشو ونما کے واقعات کی خوشی بھی اسی واسطے ہے کہ وہ واسطہ ہے اس دولت کی تحصیل کا خوب کہا ہے۔

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی　　کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

(وہ دن کہ تو چاند ہوا نہیں جانتا کہ ایک عالم کا انگشت نما ہوگا)

پس اصل تو مقصود حالت بدریت کی ہے لیکن ہلالیت کی خوشی بھی اسی واسطے ہے کہ وہ ذریعہ بدریت کا ہے۔ پس اصل سرور تو اس کا ہے کہ ہم کو حضور نے بڑی نعمت عطا فرمائی۔ باقی اس کے جس قدر اسباب ہیں وہ چونکہ اس کے وسائط ہیں اس لئے ان سے بھی خوشی ہے۔

ہادی راہِ حق

اسی فرح کو مولانا رومی اپنی مثنوی شریف میں چند ابیات کے اندر بیان فرماتے ہیں جو گویا حاصل ہے ان آیات کے مفہوم کا ان ابیات کو مع مختصر شرح کے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ پس فرماتے ہیں۔

لکھا العشاق اقبال جدید　　از جہان کہنہ نو در رسید

"یعنی اے عشاق! مژدہ ہو کہ نیا اقبال چمکا ہے جو ایک پرانے اور نئے جہان سے پہنچا ہے۔" اقبال جدید سے مراد قرآن مجید ہے اور جدید اس کو کلام لفظی کے اعتبار سے کہا ہے۔ ورنہ کلام نفسی اور صفت الٰہیہ کے مرتبہ میں تو وہ قدیم ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ کلام لفظی کے اعتبار سے تو اس کی ایک صفت کو ذکر فرمایا اور کلام نفسی کے اعتبار سے کوئی صفت ذکر نہیں کی تو وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کو جو خطاب ہوا ہے اور ہم کو یہ جو دولت ملی ہے تو اسی لباس یعنی کلام لفظی کے ساتھ ملی ہے۔ پس ہمارے نفع میں یہ شان جدید ہی زیادہ اور سبب قریب ہوئی۔ گو فی نفسہٖ قدیم ہے اور اسی صفت کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝

(ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو نصیحتیں تازہ آتی ہیں یہ اس کو ایسے طور سے سنتے ہیں کہ ہنسی کرتے ہیں۔)

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ

اور انکے پاس کوئی تازہ فہمائش رحمٰن کی طرف سے ایسی نہیں آتی جس سے یہ بے رخی نہ کرتے ہوں۔

اور جہان سے مراد عالم غیب ہے اور کہنہ اس کو اس لئے فرمایا کہ بہت پرانا ہے اور نو اس لئے کہا کہ اس میں تغیر نہیں ہوا۔ الان کما کان اس کی شان ہے اور عالم غیب کی تو یہ شان ہے ہی۔ آسمان جو عالم شہادت سے ہے مگر بوجہ منتہائے عالم شہادت ہونے کے اس کو عالم غیب سے کچھ قرب ہے خود اس کی بھی یہ حالت ہے کہ باوجود اس کے کہ کس قدر پرانا ہے لیکن اس میں کچھ تغیر نہیں چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ

"یعنی اے مخاطب! تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی شے میں (آسمان مراد ہے) کوئی تفاوت نہ دیکھے گا (اگر کچھ شک ہے) پس نگاہ اٹھا کر دیکھ' کیا کہیں کوئی رخنہ دیکھتے ہو"۔

آگے مکرر تاکید کے لئے اور نیز اس لئے کہ شاید ہماری خاطر سے کہہ دو کہ نہیں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے ارشاد ہے۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ یعنی بار بار نظر دوڑاؤ۔

آگے اس کا نتیجہ ارشاد ہے کہ

يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ

"یعنی ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تمہاری نگاہ پھر پھرا کر تمہارے پاس تھکی تھکائی واپس آ جائے گی اور کہیں کوئی عیب نہ پائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ اے حق تعالیٰ کے طالبو! اے حق کے شیدائیو؟ اے

مدتوں سے وادی ضلال میں بھٹکنے والو خوش ہو جاؤ۔ تمہارے اقبال کا ستارہ چمکا ہے یعنی عالم غیب سے قرآن مجید نازل ہوا ہے کہ راہ حق کی طرف ہادی ہے آگے فرماتے ہیں۔

فیض رسانی

زاں جہاں کو چارہ بیچارہ جوست صد ہزار راں نادرہ عالم دروست

زاں جہاں بدل ہے جہان کہنہ سے جو شعر بالا میں ہے یعنی وہ اقبال جدید اس جہان سے آیا ہے کہ وہ لاعلاج کا چارہ جو ہے اور لاکھوں عجائبات عالم کے اس میں ہیں۔ یعنی جو شخص امراض کفر شرک و گناہ میں مبتلا ہو کر لاعلاج ہو گیا ہو اور اس جہان کے اطباء نے اس کو جواب دے دیا ہو تو اس کا علاج اس جہان سے ہوتا ہے چنانچہ قبل از بعثت مشرکین اور کفار ایسے امراض میں مبتلا تھے کہ وہ لاعلاج ہو چکے تھے قلوب مسخ ہو چکے تھے۔ شر کو خیر اور خیر کو شر جانتے تھے۔ ہزاروں رسوم جہالت کی ان میں وباء عام کی طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ دفعۃً اقبال جدید کا ستارہ چمکا اور اس نے ایسا نور ڈالا کہ سب کا علاج ہو گیا الا من شاء اللہ۔ اور اگر ایسی زبردست روشنی ان پر نور افشاں ہوتی تو ان کی درستی کی بالکل امید نہ تھی۔ چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى
تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۱ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝۲ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۳

”یعنی کفار اہل کتاب و مشرکین اپنی گمراہی سے جدا ہونے والے نہ تھے جب تک ان کے پاس ایک روشن دلیل نہ آ جاوے وہ دلیل ایک ایسا رسول ہے جو اللہ کی جانب سے ہے۔ جو پاکیزہ صحیفے پڑھے جس میں راست راست مضامین لکھے ہوئے ہوں“۔

دوسرے مصرعہ کا حاصل یہ ہے کہ اس جہان میں عالم کے بے شمار عجائب ہیں۔ چنانچہ دوزخ وہاں موجود ہے جس سے ہولناک اور عجائبات اور واقعات کی کسی قدر حکایت احادیث میں آئی ہے اور جنت وہاں موجود ہے جس کی بے شمار اور بیروں از عقل و قیاس نعمتوں کی خبر اللہ و رسول نے دی ہے اسی طرح عالم ارواح اور صراط اور میزان وہاں موجود ہیں اور ان چیزوں کے عجیب ہونے میں کوئی شک نہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے ملاحدہ اور فلاسفہ نے ان کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ آگے ارشاد ہے۔

ابشروا یاقوم اذ جاء الفرج افرحوا یاقوم اذ زال الحرج

”یعنی اے میری قوم! خوش ہو جاؤ اس لئے کہ کشادگی آ گئی ہے اور اے قوم! خوش ہو جاؤ اس لئے کہ تنگی جاتی رہی“۔ مطلب ظاہر ہے قال

آفتابے رفت در کازہ ہلال در تقاضا کہ ارحنا یا بلال

بلال صحابی ہیں۔ مولانا نے ان کی حکایت بیان کی ہے وہ ایک اصطبل میں سائیس تھے وہ بیمار ہو گئے تھے حضور ان کی عیادت کو وہاں ہی تشریف لے گئے تھے حضور کی فیض رسانی کو مولانا بیان

فرماتے ہیں کہ اور فیض رساں تو ایسے ہوتے ہیں کہ طالبین ان کے دروازہ پر جاتے ہیں حضور کے اخلاق ایسے تھے کہ ظاہر حال کے اعتبار سے ایک شکستہ حال کے یہاں آپ خود تشریف لے گئے۔ حافظ شیرازی ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(مگر وہاں عشق کو حقارت سے نہ دیکھو اس لئے یہ بے پٹکے اور تاج کے بادشاہ ہیں۔)

ایسے ہی حضرات کے بارہ میں حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔

رب اشعث اغبر مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرہ

(الصحیح لمسلم کتاب البر والصلۃ باب: ۴۰، رقم: ۱۳۰، الجنۃ باب: ۱۳، رقم: ۴۸، شرح السنۃ للبغوی ۱۴: ۲۶۹، کنز العمال: ۵۹۲۴.)

"یعنی بہت سے پراگندہ بال غبار آلودہ دروازوں سے دھکے دیئے ہوئے اور حالت ان کی یہ ہے کہ اگر اللہ پر کسی بات کے متعلق قسم کھائیں یعنی قسم کھا کر یہ کہہ دیں کہ اللہ ایسا ہی کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو قسم میں سچا کر دیں"۔

اسی شان کو فرمایا ہے حافظ شیرازی نے

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں۔)

اور فلک اور ستارہ پر ناز کیا تعجب ہے جب وہ حضرات خالق فلک و ستارہ پر ناز کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سطوت و شوکت جو قلوب پر تھی اس کو تو سب جانتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی عناصر پر بھی آپ کی حکومت گاہے بطور کرامت ظاہر ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ زمین کو زلزلہ آیا تو آپ نے فرمایا۔ اسکنی یا ارض "یعنی اے زمین ساکن ہو جا"۔ زمین فوراً ٹھہر گئی۔

اور سنیئے! دریائے نیل کی کبھی یہ حالت ہوتی کہ اس کا پانی دفعۃً ٹھہر جاتا تھا اور اس قدر نہ بڑھتا تھا جس سے زراعت کی آبپاشی ہو سکے۔ وہاں کے لوگ یہ کرتے تھے کہ کنواری حسین لڑکی کو اس میں چھوڑ دیتے تھے۔ اس وقت اس کا پانی چڑھ آتا تھا جب مصر فتح ہوا تو لوگوں نے یہ قصہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے جو امیر لشکر تھے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا میں اس کی اطلاع امیر المومنین کو کرتا ہوں، وہ ضرور اس کا انتظام فرمائیں گے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ سب قصہ لکھا۔ آپ نے اسی وقت ایک فرمان دریائے نیل کے نام صادر فرمایا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ

"اے نیل! اگر تو خدا کے حکم سے چلتا ہے تو کسی شیطان کے اثر سے مت رک"۔

اور حضرت عبداللہؓ کو لکھا کہ یہ پرچہ دریا میں ڈال دینا چنانچہ حسب الارشاد وہ رقعہ دریا میں ڈال دیا گیا۔ دریا اس زور وشور سے چڑھا کہ کبھی اس زور سے نہ بہا تھا۔

عظمت حضرت بلالؓ

الغرض حاصل مصرعہ اولیٰ کا یہ ہوا کہ آفتاب فیض یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی عیادت کے واسطے ان کے مکان پر یعنی اصطبل میں تشریف لے گئے۔ یہ تو حضور کا فیض باعتبار ترتیب جسم کے ہوا۔ آگے فیض روحانی وفیض باطنی کا بیان ہے کہ بلال جو کہ ایک عبد حبشی تھے ان سے نہایت لطف وشفقت سے باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ ان سے بتقاضائے ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اے بلال! ہم کو راحت دو یعنی اذان کہہ دو تا کہ نماز سے راحت ہو۔ نماز واذان کی تعلیم فرمانا ظاہر ہے کہ روحانی فیض رسانی ہے۔ قال

زیر لب می گفتی از بیم عدو		برمنارہ د بگو کوری او

اے بلال! تم مکہ میں زیر لب آہستہ سے دشمن کے خوف سے اللہ کا نام لیتے تھے یعنی کلمہ توحید کبھی کبھی خفیہ کہتے تھے۔ اب مدینہ میں منارہ پر جا کر پکار کر اللہ کا نام لو۔ یعنی اذان کہو اور دشمن کو نامراد بناؤ۔ اور خفیہ کہنے میں کبھی کبھی کی قید اس لئے لگائی کہ ان کی تو یہ حالت منقول ہے کہ یہ ایک یہودی کافر کے غلام تھے اور وہ ان کو تمام دن دھوپ میں گرم پتھر پر لٹایا کرتا تھا۔ اس حالت میں بھی ان کی زبان سے توحید کے کلمات جاری رہتے تھے۔ اتفاقاً ایک روز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اس طرف گزر ہوا۔ جہاں پر حضرت بلال مبتلائے تکلیف تھے۔ حضرت صدیق ان کے مولیٰ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے پاس ایک غلام نصرانی عداس نامی تھا جو بہت روپیہ کماتا تھا اس کو دے کر حضرت بلال کو چھڑا لیا۔ اس کافر نے کہا کہ ابوبکر بہت خسارہ میں رہے کہ ایسا اچھا غلام دے کر ان کو لیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ ایک غلام کیا اگر تو ان کے عوض میرا سارا گھر بھی مانگتا تو میں وہ بھی دے دیتا۔ تو کیا جانتا ہے یہ کیا چیز ہیں اور حق تعالیٰ نے اس کافر کے کہنے کا یہ جواب دیا۔

وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ الخ

(یعنی قسم ہے زمانہ کی بے شک انسان (کافر) خسارہ میں ہے۔ مگر وہ مومن جو اعمال صالحہ کرتے ہیں وہ خسارہ میں نہیں ہیں۔)

اسی قصہ کی طرف حضرت عمر نے اس نظم میں اشارہ کیا ہے۔

ابوبکر حبا فی اللہ مالا		واعتق من ذخائرہ بلالا
لقد واسی النبی بکل فضل		واسرع فی اجابتہ بلالا

پہلے بلالا میں جو ایک کلمہ ہے مراد حضرت بلال ہیں اور دوسرے بلالا سے جو دو دو کلمے ہیں مراد بدوں لا کے ہیں۔ معنی اشعار کے یہ ہیں کہ ابوبکر نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور اپنے ذخائر سے حضرت بلال کو آزاد کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر حال کے ساتھ غمخواری اور ہمدردی کی اور بدوں انکار کے ان کی اجابت میں جلدی کی۔ ان ہی حضرت بلال کی شان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر کی مدح کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا

"یعنی ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار یعنی بلال کو آزاد کیا ہے"۔

اللہ اکبر! کہاں حضرت عمر اور کہاں حضرت بلال۔ حضرت عمر کی تو وہ شان ہے کہ حضور فرماتے ہیں۔ **لو کان بعدی نبی لکان عمر**۔ "یعنی اگر کوئی میرے بعد نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔" باوجود اس مرتبہ کے بلال رضی اللہ عنہ کو سیدنا فرماتے ہیں لیکن کسی کو کیا خبر ہے کہ بلال کی کس شے کو انہوں نے سید فرمایا ہے اگرچہ اس شے میں بھی حضرت عمر ہی بڑھے ہوئے تھے لیکن ان حضرات نے اپنے کو اسی طرح مٹایا تھا کہ ہر ایک کو اپنے سے افضل جانتے تھے آج کل دیکھا جاتا ہے کہ تھوڑا سا پڑھ لکھ کر یا کسی ادنیٰ بات سے ایسا ناز ہو جاتا ہے کہ دماغ صحیح نہیں رہتا۔ اور جو نسب میں گھٹا ہوا ہو اگرچہ زہد و تقویٰ میں بڑھ کر ہو۔ اس میں عیب نکالتے ہیں۔ یاد رکھو حق تعالیٰ کے یہاں نسب و حسب کوئی شے نہیں۔ جس پر چاہتے ہیں فضل فرما دیتے ہیں۔ دیکھو ابوجہل شریف ہو کر مطرود ہوا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ باوجود عبد حبشی ہونے کے مقبول ہو گئے۔ عجب شان ہے۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

غرض حضرت بلال تو بڑے علی الاعلان توحید کو ظاہر کرنے والے ہیں شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس مصلحت سے کہ حضور کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے کسی خاص موقع پر اس توحید کا اخفاء فرمایا ہو۔ اس لئے ارشاد ہے کہ اب کوئی احتمال نہیں رہا۔ پکار کر منارہ پر جا کر اذان کہو اور دشمن کا دل جلاؤ۔ قال مولانا الرومی

میدمد در گوش ہر غمگیں بشیر خیز اے مدبر رہ اقبال گیر

یعنی اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہر طالب دردناک اور غمگین جو درد طلب سے بے قرار ہے اس کے کان میں بشیر یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھونک رہے ہیں کہ اے بدبخت اٹھ! اقبال کا راستہ لے۔ یعنی ہدایت کے ابواب مفتوح ہو گئے اس کو اختیار کرو۔

تمام ہو گئے اشعار مثنوی کے۔ ان اشعار میں مولانا نے فیض وحی اور فیض نبوت اول بیان کیا ہے اور اس پر فرحت ظاہر کی ہے۔ پھر صحابہ کی طرف فیض رسانی کے لئے جو حضور کی توجہ تھی اس کو بیان کیا۔ گویا یہ

اشعار ان آیات کے تقارب المعنی ہیں یہ تمام تر تقریر بطور تمہید کے تھی اور اس تقریر سے مقصود مجھ کو شبہات کا زائل کرنا تھا کہ جو ہم لوگوں کی نسبت ہیں ورنہ اصل مقصود یہ تھا کہ اس نعمت عظیمہ پر فرحت مامور بہا کا طریقہ بیان کیا جاوے اور اس میں جو لوگوں نے افراط تفریط کی ہے۔ ان کی اصلاح کی جاوے اور مخالفین کے دلائل کا جواب دیا جاوے۔ لیکن تمہید ہی میں بہت تطویل ہوگئی۔ لیکن کچھ حرج نہیں اس لئے کہ بہت سے فوائد اس سے معلوم ہو گئے۔ (یہاں پہنچ کر نماز عصر کے لئے اٹھے پھر بعد نماز آگے بیان ہوا۔

فرق بدعت وسنت

اب میں مقصود شروع کرتا ہوں۔ تقریر سابق سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ حضور کے وجود باجود پر فرحت مامور بہا ہے۔ اب یہ سمجھنا چاہئے کہ اس فرحت کا طریقہ صحیحہ مقبولہ کون سا ہے۔ سو اس کے طریقے دو ہیں۔ ایک تو وہ طریقہ جس پر خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا ہو۔ اس لئے کہ جیسا امت پر اس آیت کا امتثال واجب ہے حضور پر بھی واجب ہے جیسا نبی کو نبی جاننا جس طرح امت کے ذمہ ضروری ہے اسی طرح بلا فرق اس نبی کو بھی اپنی نبوت کا اعتقاد فرض ہے۔ اس لئے یہ بات دیکھنا ضروری ہے کہ حضور نے اس فرحت کو کس طریق سے ظاہر فرمایا ہے۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کلیا یا جزئیا منقول نہ ہو بلکہ کسی نے ایجاد کیا ہو۔ جس طرح سے آج کل بہت سے محبت کا دم بھرنے والے لوگ مجالس منعقد کرتے ہیں اور ان میں سے بعض تو نرے مدعی ہی ہیں۔ ہاں جو کچھ روپیہ خرچ کرنے والے ہیں ان میں سے اکثر کی نیت بری نہیں۔ وہ محبت سے ہی کرتے ہیں مگر غلطی میں ہیں۔ اس لئے کہ محبت میں غلطی بھی تو ہو جاتی ہے یہ تو ضروری نہیں کہ جس فعل کا منشا محبت ہو اس میں غلطی نہ ہو۔ جیسے کوئی اللہ تعالیٰ کی محبت کے جوش میں مثلاً ٹھیک دوپہر کو نماز پڑھنے لگے۔ باقی جن کا کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا بلکہ ان کو آمدنی ہوتی ہے یعنی مولود خواں مولوی ان میں سے تو اکثر کی نیت بھی اچھی نہیں۔ ان کا مقصود صرف روپیہ ہی ہے بلکہ کچھ عجب نہیں کہ بعض کو ان میں سے حق واضح بھی ہو گیا ہو لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ہم یہ طریقہ جاری نہ رکھیں تو ہم کو جو روپیہ اور نذرانے اور جوڑے ملتے ہیں وہ نہ ملیں گے اس لئے وہ چھوڑتے نہیں۔

میرے پاس ضلع رہتک سے ایک صاحب کا خط آیا اس میں لکھا تھا کہ یہاں ایک بی بی ہیں جن کا نام بوبو ہے ان کے بابا بننے کی کسر ہے ورنہ سب حرف علت جمع ہو جاتے ہیں (لطیفہ کے طور پر) جیسا ایک عربی کے شعر میں کسی نے یہ حروف جمع کئے ہیں۔

رایت صبیا علی کثیب یخجل البدر والھلال
فقلت ما اسمک فقال لو لو فقلت لی لی فقال لا لا

شاعر نے کمال کیا ہے لولو اور للی اور لالا کو خوب جمع کیا ہے ترجمہ یہ ہے کہ میں نے ایک حسین لڑکے کو ایک ٹیلہ پر دیکھا اور نام پوچھا اس نے کہا لولو۔ میں نے کہا تو میرا ہے اس نے کہا نہیں نہیں اور یہ لولو بمعنی موتی کے ہے وہ لولو نہیں جس سے بچوں کو ڈراتے ہیں۔

اس پر ایک اور حکایت یاد آئی۔ نصیر شاعر کا ایک لڑکا بچہ تھا۔ ایک بار چند شعراء نصیر سے ملنے آئے۔ نصیر موجود نہ تھا۔ یہ بچہ تھا شعراء نے اس سے فرمائش کی کہ کوئی شعر فی البدیہہ بنا کر سناؤ۔ اس نے عجیب اپنے بچپن کی شان کے موافق بے ساختہ کہا۔

اے بتو مجھ کو در گوش دکھاتے کیوں ہو   میں ہوں بالا مجھے لولو سے ڈراتے کیوں ہو

غرض ان صاحب نے لکھا تھا کہ یہاں وہ بی بی مولد شریف پڑھتی ہیں اور ان کا کچھ نذرانہ بھی مقرر ہے اور ایک نئی بات یہ ہے کہ بقر عید کی نماز بھی عورتوں کو پڑھاتی ہیں اور ان سب قصوں کی جڑ وہی نذرانہ ہے۔ اسی واسطے میں تو اپنے دوستوں سے یہ کہا کرتا ہوں کہ ان بدعات کرنے والوں کو منع نہ کرو۔ لیکن ان کو دینا چھوڑ دو۔ جب مفت محنت کرنا پڑے گی۔ وہ خود ہی تنگ ہو کر ان بدعات کو چھوڑ دیں گے۔ اس لئے کہ کام تو پورا کرنا پڑے گا اور ملے گا کچھ بھی نہیں تو خواہ مخواہ کی مشقت بھی ہو گی اور وصول کچھ نہ ہو گا تو خود ہی چھوڑ دیں گے۔

بہر حال ہر عمل کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک منقول اور دوسرا اختراع شدہ۔ گفتگو اس میں ہے کہ اس فرحت کا طریق مروج کس قسم میں داخل ہے۔ اس کے لئے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتا ہوں۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ جتنی چیزیں بعد خیر القرون کے ایجاد ہوئی ہیں ان میں سے کون سی بدعت ہے اور کون سی مستحب اور مندوب اور ثابت بالشریعت ہیں اور اسی سے یہ بھی واضح ہو گا کہ اس فرحت کے ظاہر کرنے کا آیا کوئی طریقہ مقبولہ ہے یا نہیں اور نیز طریقہ مروجہ بدعت ہے یا نہیں۔

پس جاننا چاہئے کہ بعد خیر القرون کے جو چیزیں ایجاد کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ کہ ان کا سبب داعی بھی جدید ہے اور وہ موقوف علیہ ایک مامور بہ کی ہیں۔ بغیر ان کے اس مامور بہ پر عمل نہیں ہو سکتا جیسے کتب دینیہ کی تصنیف اور تدوین مدرسوں اور خانقاہوں کی بناء کہ حضور کے زمانہ میں ان میں سے کوئی شے نہ تھی اور بس داعی ان کا جدید ہے اور نیز چیزیں موقوف علیہ ایک مامور بہ کی ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے اس کے بعد سمجھئے کہ زمانہ خیریت نشانہ میں دین کی حفاظت کے لئے وسائط محدثہ میں سے کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔ تعلق مع اللہ یا بلفظ آخر نسبت سلسلہ سے بہ برکت حضرت نبوت سب مشرف تھے۔ قوت حافظہ اس ت قوی تھی کہ جو کچھ سنتے تھے وہ سب نقش کالحجر ہو جاتا تھا۔ فہم ایسا عالی پایہ تھا کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ سبق کی طرح ان کے سامنے تقریر کریں۔ ورع اور تدین بھی غالب تھا۔

بعد اس زمانہ کے دوسرا زمانہ آیا۔ غفلتیں بڑھ گئیں۔ قویٰ کمزور ہو گئے ادھر اہل ہوا اور عقل پرستوں کا غلبہ ہوا، تدین مغلوب ہونے لگا۔ پس علمائے امت کو قوی اندیشہ دین کے ضائع ہونے کا ہوا۔ پس ضرورت اس کی واقع ہوئی کہ دین کی بجمیع اجزاء تدوین کی جائے۔ چنانچہ کتب دینیہ، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، عقائد میں تصنیف ہوئیں۔ اور ان کی تدریس کے لئے مدارس تعمیر کیے گئے اسی طرح نسبت مسلسلہ کے اسباب تقویت وابقاء کے لئے بوجہ عام رغبت نہ رہنے کے مشائخ نے خانقاہیں بنائیں۔ اس لئے کہ بغیر ان چیزوں کے دین کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی۔ پس یہ چیزیں وہ ہوئیں کہ سبب ان کا جدید ہے کہ وہ سبب خیر القرون میں نہ تھا اور موقوف علیہ حفاظت دین مامور بہ کی ہیں۔ پس یہ اعمال گو صورۃ بدعت ہیں لیکن واقع میں بدعت نہیں بلکہ حسب قاعدہ مقدمۃ الواجب واجب ہیں۔

دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جن کا سبب قدیم ہے جیسے مجالس میلاد مروجہ اور تیجہ، دسواں، چہلم وغیرہ من البدعات کہ ان کا سبب قدیم ہے۔ مثلاً مجلس میلاد کے منعقد کرنے کا سبب فرح علی الولادۃ النبویہ ہے اور یہ سبب حضور کے زمانہ میں بھی موجود تھا لیکن حضور نے یا صحابہ نے یہ مجالس منعقد نہیں کیں۔ نعوذ باللہ صحابہ کا فہم یہاں تک نہیں پہنچا۔ اگر سبب اس کا اس وقت نہ ہوتا تو البتہ یہ کہہ سکتے تھے کہ منشاء اس کا موجود نہ تھا لیکن جب کہ باعث اور بناء اور مدار موجود تھا پھر کیا وجہ ہے کہ نہ حضور نے کبھی مجلس میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے۔ ایسی چیزوں کا حکم یہ ہے کہ وہ بدعت ہیں صورۃ بھی اور معنیً بھی۔ اور حدیث **من احدث فی امرنا ھٰذا ما لیس منہ** (جس شخص نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز پیدا کی جو اس میں سے نہیں ہے) میں داخل ہو کر واجب الرد ہیں۔ اور پہلی قسم ما منہ میں داخل ہو کر مقبول ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہچاننے کا۔ اس سے تمام جزئیات کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے۔

ان دو قسموں میں ایک اور فرق عجیب ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام تصرف نہیں کرتے۔ اور دوسری قسم کے تجویز کنندہ عوام کالانعام ہوتے ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں چنانچہ مولد شریف کی مجلس کو ایجاد بھی ایک بادشاہ نے کیا ہے اس کا شمار عوام ہی میں ہے اور عوام ہی اب تک اس میں تصرفات بھی کر رہے ہیں۔ چنانچہ چند روز سے اس میں ایک اور ترقی ہوئی ہے کہ اس دن عید منانے لگے ہیں اور اس کا نام رکھا ہے عید میلاد النبی۔ پرانی رسم مولد کے متعلق تو علماء نے مستقل رسائل لکھے ہیں جیسے براہین قاطعہ وغیرہ اور احقر نے بھی "اصلاح الرسوم" میں مفصل بحث لکھی ہے لیکن اس نئی رسم کے متعلق جس کا نام عید میلاد النبی رکھا گیا ہے اب تک کوئی رسالہ نظر سے نہیں گزرا۔ اگرچہ اجمالاً میں نے گذشتہ دو سال کے وعظ میں اس کا کچھ بیان کیا ہے جو طبع ہو گیا ہے لیکن مفصل بحث اس کے متعلق نہیں کی گئی آج اسی کے متعلق بیان کرنے کا ارادہ ہے لیکن تمہید میں دیر ہو گئی۔ خیر مقصود اکثر مختصر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں زیادہ دیر نہ ہوگی۔ لیکن اتنا مختصر بھی نہ ہوگا کہ کوئی پہلو رہ جائے۔

رسم عید میلاد النبیؐ

جاننا چاہئے کہ عید میلاد النبی کے نام سے جو ایک رسم شائع ہوئی ہے اس کے متعلق دو کلام ہیں۔ ایک تو اس کے نامشروع ہونے کے متعلق دلائل، دوسرے مخالفین کے دلائل کا جواب۔ اس کے بعد سمجھئے کہ شریعت کے دلائل چار ہیں۔

(۱) کتاب (۲) سنت (۳) اجماع (۴) قیاس

انشاء اللہ! چاروں سے گفتگو کی جاوے گی۔ اول کتاب اللہ کو لیجئے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

"اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ"

"یعنی کیا ان کے لئے شرکاء ہیں کہ انہوں نے ان کے لئے دین کی وہ بات مقرر کردی جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی"۔

یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ دین کی بات بدوں اذن الٰہی یعنی بدوں دلیل شرعی کسی کو مقرر کرنا مذموم و مستنکر ہے یہ تو کبریٰ ہے اور صغریٰ یہ ہے کہ عید میلاد النبی دین ہی کی بات سمجھ کر بلا دلیل مقرر کی گئی ہے اور دلیل نہ ہونا جزئیاً تو ظاہر ہے کہ امر شریعت میں نہیں۔ امر مستحدث ہے۔ اگر احتمال ہے تو اس کا ہے کہ کسی کلیہ میں داخل کرتے ہوں گے۔ مفصل گفتگو تو ان کلیات کی جس میں یہ داخل ہو سکتی ہے آگے آوے گی۔ باقی مجملاً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سبب داعی اس کا قدیم ہے خواہ وہ فرح ہو یا اظہار شوکت اسلام ہو کہ وہ بھی قدیم ہے۔ بہرحال ان میں سے جو بھی سبب ہو تو ہم یہ کہتے کہ جب یہ سبب حضور و صحابہ خیر القرون کے زمانہ میں بھی موجود تھا اور وہ حضرات قرآن و حدیث کو خوب سمجھنے والے تھے اور ایسا سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھ کر اب اجتہاد کو جائز نہیں رکھا گیا۔ پس جب مسلم ہو چکا کہ وہ کتاب و سنت کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے تھے اور یہ سبب بھی اس وقت موجود تھے یعنی اظہار فرح اور شوکت اسلام کی اس وقت بھی ضرورت تھی بلکہ اس وقت سے زیادہ ضرورت تھی۔ مگر ان حضرات نے اس پر عمل نہیں کیا۔ پس معلوم ہوا کہ کسی کلیہ میں داخل کرنا اس کا صحیح نہیں اور یہ بالکل امر مستحدث ہے جدید ہے کہ جس کی کچھ اصل نہیں اور بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ غیر دین کو دین سمجھ کر کیا جاوے اور اس کو یہ لوگ دین سمجھتے ہیں پس یہ بدعت واجب الترک ہے یہ تو قرآن مجید سے اس کے متعلق کلام تھا۔ اب حدیث لیجئے۔ حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں۔

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهورد (الصحیح للبخاری ۳: ۱۴۴۱، الصحیح لمسلم کتاب الأقضیة: ۱۷، سنن ابن ماجة: ۱۴، سنن ابی داود کتاب السنة باب: ۵، مشکوة المصابیح: ۱۴۰۔)

"یعنی جو شخص ہمارے اس دین میں وہ شے نکالے جو اس میں نہیں وہ واجب الرد ہے"۔

جو تقریر آیت کے ذیل میں کی گئی ہے وہی یہاں بھی ہے اور مراد نئی شے سے وہ ہے جس کا سبب قدیم ہو اور پھر اس وقت معمول بہ نہ ہوئی ہو۔ باقی جس کا سبب جدید ہو اور نیز وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کی ہو وہ مامنہ میں داخل ہو کر واجب ہے اور دوسری حدیث لیجئے۔ مسلم کی روایت ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لاتختصوا ليلة الجمعة بقيام من بين الليالى ولا تختصوا يوم الجمعة بصيام من بين الايام الا ان يكون فى صوم يصومه احدكم۔ (لا تختصوا يوم ليلة الجمعة الخ: الصحيح لمسلم كتاب الصيام باب: ۲۴، رقم ۱۴۸، السنن الكبرى للبيهقى ۴: ۳۰۲، مشكوة المصابيح: ۲۰۵۲، كنز العمال: ۸: ۲۳۹۰۸.)

”یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شب جمعہ کو اور راتوں میں سے شب بیداری کے ساتھ خاص مت کرو اور یوم جمعہ کو ایام میں سے روزہ کے ساتھ خاص مت کرو مگر یہ کہ اس دن میں کوئی تم میں پہلے سے روزہ رکھتا ہو“۔

اس حدیث سے یہ قاعدہ کلیہ نکلا کہ جو تخصیص منقول نہ ہو وہ منہی عنہ ہے یہ دوسری بات ہے کہ جمعہ کے روز روزہ رکھنا کیسا ہے۔ ہمارے علماء نے دوسری دلیل مستقل سے جواز کا حکم دیا ہے اور نہی کو عارضی کہا ہے اس وجہ سے کہ روزہ رکھ کر وظائف جمعہ سے ضعیف نہ ہو جاوے۔ یہ فرعی گفتگو ہے یہاں تو صرف اس قاعدہ کلیہ کا مستنبط کرنا مقصود ہے۔ سو اس قاعدہ کی صحت میں مجوزین صوم جمعہ کو بھی کلام نہیں ہے۔ غرض یہ قاعدہ کلیہ کہ تخصیص غیر منقول دین کے اندر جائز نہیں صحیح ہے یہ تو کبریٰ ہے۔

اب خاص یوم ولادت کو عید منانے کی تخصیص دیکھئے کہ یہ تخصیص کیسی ہے۔ ظاہر ہے کہ منقول نہیں ہے اور نہ تخصیص عادی ہے بلکہ اس کو دین کی بات سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کے تارک کو ملامت کرتے ہیں اور بددین سمجھتے ہیں اگر تخصیص عادی ہوتی تو ملامت نہ کرتے اور نہ اس کو بددین جانتے۔ جیسے کسی کی عادت ململ پہننے کی ہو تو اس کے تارک کو ملامت نہیں کرتے بہر حال اس کو دین سمجھتے ہیں۔ پس یہ تخصیص دین میں ہوئی اور غیر منقول ہوئی۔ یہ صغریٰ ہوا اور کبریٰ اول آ چکا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تخصیص ناجائز ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو مقیس علیہ یعنی یوم جمعہ سے بھی یہ بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ یوم جمعہ کے فضائل تو احادیث میں صراحۃ وارد بھی ہیں اور یوم ولادت کی کوئی فضیلت صراحۃ وارد نہیں۔ گو قواعد سے فی نفسہ یوم ولادت میں برکت اور فضیلت کے سب ہی مسلمان قائل ہیں ایسا کون ہو گا جو اس دن بلکہ اس ماہ کی برکت کا قائل نہ ہو۔ چنانچہ سیوطی یا علی قاری اس ماہ کی فضیلت میں فرماتے ہیں۔

لهذا الشهر فى الاسلام فضل و منقبته تفوق على الشهور
ربيع فى ربيع فى ربيع و نور فوق نور فوق نور

(اس مہینہ کے لئے اسلام میں بزرگی ہے اور ایسی منقبت ہے جو تمام مہینوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ربیع ہے ربیع ہے نور ہے نورٌ پر نور)

اور میں اس پر اضافہ کر کے کہتا ہوں۔

ظہور فی ظہور فی ظہور   سرور فی سرور فی سرور

اور اس میں دو پچھلے وعظوں کا نام بھی آ گیا۔ نور اور ظہور اور آج کے بیان کا نام ''السرور'' رکھتا ہوں اور اس میں وہ بھی آ گیا۔

تردید... عید میلاد (از قرآن وحدیث)

پس فی نفسہٖ برکت اور فضیلت کا انکار نہیں گفتگو اس میں ہے کہ جیسے جمعہ کے فضائل تصریحا وارد ہیں ایسے یوم ولادت کے نہیں۔ پس جس کے فضائل منصوص ہوں۔ جب اس کی تخصیص ناجائز ہے تو جس کے فضائل منصوص بھی نہیں اس کی تخصیص تو کیسے ناجائز نہ ہوگی؟

بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یوم ولادت کی فضیلت بھی حدیث میں آئی ہے۔ چنانچہ آیا ہے کہ حضور دوشنبہ کے دن روزہ رکھا کرتے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہیں۔ فرمایا ولدت یوم الاثنین ''یعنی میں پیر کے دن پیدا ہوا ہوں''۔ تو اس کا جواب انشاء اللہ مخالفین کے دلائل کے ذیل میں آئے گا۔ اور تیسری حدیث سنئے۔ نسائی نے روایت کیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لا تجعلوا قبری عیدا وصلوا علی فان صلوتکم تبلغنی حیث کنتم

(سنن أبی داود کتاب المناسک باب: ۹۹، کنز العمال: ۲۱۹۹.)

ترجمہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید مت بناؤ اور مجھ پر درود بھیجو کیونکہ تمہارا درود میرے پاس پہنچے گا جہاں کہیں تم ہو گے۔

اس حدیث میں غیر عید کو عید منانے کی بالتخصیص ممانعت ہے۔ شاید کوئی اس میں شبہ کرے کہ حضورؐ کی قبر پر تو سب جمع ہوتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ جانا تو جائز ہے لیکن عید کے طرز پر جمع ہونا منہی عنہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عید میں جیسے جمع ہوتے ہیں اس طرح قبر پر جمع مت ہو۔ عید میں اس طرح جمع ہوتے ہیں اس طرح تاریخ معین ہوتی ہے اور نیز اس میں تداعی یعنی اس کا ایک اہتمام ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو وہاں جمع ہونے کے لئے بلایا ہے پس اس طرح جمع ہونے کی ممانعت ہے اور اتفاقی اجتماع سے ممانعت نہیں ہے۔ چنانچہ روضہ اقدس کی زیارت کے لئے جو جاتے ہیں تو اس میں یہ دونوں امر نہیں ہیں۔ اس کی کوئی تاریخ خاص معین نہیں ہے بلکہ آگے پیچھے کیف اتفق قافلے جاتے ہیں اور زیارت کر کے چلے آتے

ہیں اور نہ کچھ اہتمام ہے کہ سب کا اجتماع ضروری سمجھا جاتا ہو بہر حال اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ قبر شریف پر بطور عید کے جمع ہونا ناجائز ہے۔ پس جس طرح عید مکانی منہی عنہ ہے اسی طرح عید زمانی بھی منہی عنہ ہوگی۔ اب رہ گئی یہ بات کہ اس کے بعد **صلوا علی فان صلوتکم تبلغنی حیث کنتم** بڑھانے سے تو اجتماع کا عدم جواز بھی مفہوم ہوتا ہے جیسا علت **فان صلوتکم** ظاہراً اس پر دال ہے۔ سو شراح نے مختلف توجیہات اس کی بیان کی ہیں۔ میرے ذہن میں سب سے اقرب توجیہ اس کی یہ آتی ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس نہی **لاتجعلوا** میں اہل بدعات یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم تو صلوۃ یعنی درود شریف پڑھنے کے لئے حضور کے روضہ اقدس پر جمع ہوتے ہیں اور صلوٰۃ مامور بہ ہے تو ہمارا اجتماع جائز ہوگا تو حضور اس شبہ کا جواب دیتے ہیں اور اس احتمال کا استیصال فرماتے ہیں کہ درود شریف یہاں آنے پر موقوف نہیں۔ جہاں کہیں تم ہو گے درود شریف میرے پاس پہنچتا ہے اس لئے یہ عذر غیر موجہ ہے۔

اس سے ایک بہت بڑی بات مستنبط ہوتی ہے کہ صلوٰۃ جس کے بعض افراد مندوب اور بعض واجب اور بعض فرض ہیں جب اس کے لئے عید کے طرز پر جمع ہونا جائز نہیں ہے تو کسی اور غرض مخترع کے لئے جمع ہونا تو کیسے جائز ہوگا۔

لیکن اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خود زیارت کے لئے جانا بھی جائز نہیں۔ اس لئے کہ وہاں جو جاتے ہیں تو مقصود اصل صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ زیارت مقصود ہے اور وہ بدوں حضور کی قبر کے ہر جگہ ممکن نہیں اور زیارت کا مندوب ہونا دوسری روایات سے ثابت ہوتا ہے بلکہ قرآن شریف سے بھی اس کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ
وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا

ترجمہ یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا یعنی معاصی ان سے سرزد ہوئے تھے اگر اس وقت یہ لوگ آپ کی خدمت میں آتے اور وہاں آ کر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول یعنی آپ بھی ان کے لئے دعائے مغفرت فرماتے تو بے شک اللہ تعالیٰ کو توبہ کا قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا پاتے۔ اور جاءوک (آپ کے پاس آتے) یہ عام ہے خواہ حیات میں ہو یا بعد الممات ہو۔ اس سے زیارت کا مندوب ہونا بلکہ تاکد معلوم ہوتا ہے اور اس پر بشارت ہے کہ وہاں حاضر ہو کر توبہ کرنے سے توبہ قبول ہوتی ہے۔

ایک لطیفہ یاد آیا کہ کانپور میں ایک مدرسہ میں بچوں کا امتحان ہو رہا تھا ان کو چہل حدیث یاد کرائی گئی تھیں۔ ممتحنین میں ایک صاحب اہل ظاہر بھی تھے۔ حدیث یہ آئی۔

من حج ولم یزرنی فقد جفانی (الدرالمنثور للسیوطی ۱: ۲۳۷' کشف الخفاء للعجلونی ۲: ۳۳۸ تنزیه الشریعة ۲: ۱۷۲)

یعنی جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے میرے ساتھ بے مروتی کی۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ حدیث تو حیات کے ساتھ مخصوص بچہ کیا جواب دیتا' وہ آگے پڑھنے لگا۔ اتفاق سے اس کے بعد یہ حدیث تھی۔

من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی (کنزالعمال: ۴۳۷۲' الترغیب و الترهیب ۲: ۲۲۴' کشف الخفاء للعجلونی ۲: ۳۴۷.)

"یعنی جس نے میری زیارت میری وفات کے بعد کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی" ایک مولوی صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً کہا کہ مولانا آپ کا جواب ہو گیا۔ دیکھئے! اس میں صاف ارشاد ہے کہ جو بعد ممات کے زیارت کرے وہ ایسا ہی ہے جیسے حیات میں زیارت کی اور زیارت فی الحیاۃ کی مشروعیۃ کو آپ بھی مانتے ہیں۔

بہر حال وہاں زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ صلوٰۃ سفر سے مقصود بالذات نہیں اور زیارت کی کوئی تاریخ معین نہیں ہے اور نہ اہتمام عید کا سا ہے پس اس کی ممانعت نہیں۔ اسی طرح اور بھی جن حدیثوں سے بعض لوگوں نے اس کی ممانعت سمجھی ہے ان کو غلط فہمی ہوئی ہے زیادہ تر ایسے لوگ اس حدیث کو پیش کیا کرتے ہیں۔

لاتشدالرحال الا الی ثلثة مساجد المسجد الحرام و مسجدی هذا والمسجد الاقصیٰ (سنن الترمذی: ۳۲۶ سنن النسائی: ۲: ۳۷' مشکوٰة المصابیح: ۶۹۳' کنزالعمال: ۳۴۶۴۸.)

"یعنی کجاوے مت باندھو مگر تین مسجدوں کی طرف۔ مسجد حرام و مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔

تقریر ان کے استدلال کی یہ ہے کہ حضور نے سفر کی ممانعت فرمائی ہے مگر ان تین مسجدوں کی جانب بس معلوم ہوا کہ مدینہ طیبہ اگر سفر کر کے جاوے تو مسجد کی نیت سے جاوے روضہ اقدس کا قصد نہ کرے کہ وہ ان ثلثہ کا غیر ہے یہ ہے تقریر ان کے استدلال کی۔

جواب یہ ہے کہ اصل یہ ہے کہ جنس مستثنیٰ منہ سے ہو۔ یہاں مستثنیٰ مساجد ہیں۔ پس مستثنیٰ منہ بھی مسجد ہی ہونا حاصل ہے کہ وہی جنس قریب ہے۔ پس تقدیر کلام کی یہ ہوگی۔ **لاتشدالرحال الی مسجد الا الی ثلثة مساجد.** (الصحیح للبخاری ۲: ۲۱' ۵: ۷۶' الصحیح لمسلم کتاب العیدین: ۱۶.) یعنی کسی مسجد کی طرف سفر کر کے مت جاؤ۔ مگر ان تین مسجدوں کی طرف۔ پس قبر

شریف سے اس حدیث میں کوئی تعرض ہی نہیں۔ اس کی زیارت کا تاکد بحوالہ دوسری احادیث سے ثابت ہے اور ان تین مسجدوں کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ ان تین میں مضاعفت اجر کی مخصوص ہے اور کسی مسجد کے لئے منصوص نہیں ہے۔ پس حاصل حدیث کا یہ ہے کہ ثواب کی زیادتی کے اعتقاد سے کسی مسجد کی طرف سفر نہ کرو۔ اس لئے کہ کسی مسجد کے لئے زیادتی ثواب کی منقول نہیں ہے۔ بہر حال خاص زیارت قبر شریف کے قصد سے بھی سفر کرنا مندوب ہے۔

چوتھی حدیث یہ ہے کہ عید کے روز کچھ لڑکیاں کھیل رہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انہوں نے ان لڑکیوں کو ڈانٹا۔ حضور نے فرمایا۔

ان لکل قوم عیدا و ھذا عیدنا

یعنے اے عمر! منع نہ کرو۔ ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔

اس حدیث میں علت ان کے کھیلنے کی اباحت کی یہ فرمائی کہ یہ ہماری عید ہے اس میں جواز لعب کو یوم عید ہونے سے معلل فرمایا گیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عید کے ساتھ خاص ہے سو اگر ہر شخص کو عید بنانا جائز ہو تو ہر روز ایسا لعب جائز ہو جائے گا اور تخصیص منصوص باطل ہو جاوے گی جس سے کلام شارع کا الغاء لازم آوے گا۔ یہ تو قرآن وحدیث سے ممانعت اس عید مخترع کی ثابت ہوئی۔

تردید از اجماع امت

اب رہا اجماع' سو اس سے بھی ثابت ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ قاعدہ اصولیہ ہے کہ تمام امت کا کسی امر کے ترک پر متفق ہونا یہ اجماع ہوتا ہے اس کے عدم جواز پر۔ چنانچہ فقہاء نے جابجا اس قاعدہ سے استدلال کیا ہے جس طرح کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کو ہمیشہ ترک کرنے سے استدلال کرتے تھے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ حضور نے عید کی نماز پڑھی لیکن اس میں اذان اور تکبیر نہیں تھی۔ اسی طرح جس شے کو تمام امت نے ترک کر دیا ہو وہ واجب الترک ہے۔ اسی بناء پر فقہاء نے صلوٰۃ عیدین میں بلا اذان وتکبیر کہا ہے پس اگر یہ قاعدہ مسلم نہ ہوتا تو آج سے عیدین میں اذان اور تکبیر کا اضافہ کر دینا چاہئے اور اگر مسلم ہے تو اس قاعدہ سے اور جگہ بھی کام لو۔

اس پر ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ تمام امت نے عید میلاد النبی کو ترک نہیں کیا۔ اس لئے کہ امتی تو آخر ہم بھی ہیں سو ہم اس کو کرتے ہیں۔ پس اجماع کہاں رہا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اصول فقہ کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ اختلاف متاخر اتفاق متقدم کا رافع نہیں ہے یعنی جس امر پر تمام امت کا اتفاق زمان سابق میں متحقق ہو چکا ہو اب اس اتفاق کو بعد کا اختلاف نہ اٹھاوے گا۔ پس جب تک تم لوگوں نے اس کو ایجاد نہیں کیا تھا اس وقت تک تو امت کا اس کے ترک

پر اتفاق تھا۔ اب وہ اتفاق مرتفع نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ کی ایک جزئی اور ہے کہ علماء حنفیہ نے نماز جنازہ کا تکرار جائز نہیں رکھا اور دلیل یہی لکھی ہے کہ صحابہ اور تابعین سے ثابت نہیں۔ غرض یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ امت کا کسی امر کو ترک کرنا اس کے عدم جواز کی دلیل ہے۔ پس بفضلہ تعالیٰ اجماع امت سے بھی ثابت ہو گیا کہ یہ عید میلاد بدعت اور امر مخترع واجب الترک ہے۔

تردید از قیاس

اب رہا قیاس تو قیاس کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ قیاس جو مجتہد سے منقول ہو اور ایک وہ جو مجتہد سے منقول نہ ہو۔ اور یہ قاعدہ کہ غیر مجتہد کا قیاس معتبر نہیں ہے۔ یہ ان واقعات میں ہے کہ جو مجتہدین کے زمانہ میں پائے گئے ہیں اور جو نئے واقعات پیش آویں ان میں قیاس غیر مجتہد کا معتبر ہے چنانچہ جس قدر نئی تجارتیں اور ایجادات اس زمانہ میں ہوئی ہیں سب کا حکم قیاس سے ہی ثابت ہوتا ہے مع ہذا ہم خود نہیں قیاس کرتے اس لئے ہم کو قیاس کرنے کی ضرورت تو جب تھی جب کہ سلف کے کلام میں اس سے تعرض نہ ہوتا اس لئے کہ ان حضرات کا قیاس ہمارے قیاس پر مقدم ہے اور ان کے کلام میں اس سے تعرض ہے۔ چنانچہ تبعید الشیطان و صراط مستقیم میں بہت زور شور سے اس پر گفتگو کی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ کسی زبان یا مکان کو عید بنانا ممنوع ہے اس میں کچھ ضروری عبارت اشاعت کے وقت آخر میں ملحق کر دی جاوے گی (چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) پس قیاس سے بھی اس عید کا نا جائز ہونا ثابت ہوا۔ یہ تو ہمارے دلائل تھے۔

تردید از موجدین عید

اب موجدین عید کے دلائل کی تقریر اور اس کا جواب سنئے۔ اور ان کی طرف نسبت دلائل کی میں نے اس احتمال سے کر دی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے۔ بلکہ اگر وہ تو برسوں بھی کوشش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو۔ اسی واسطے جی تو نہ چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیئے جاویں۔ لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش نہ رہے۔ اس لئے میں ان دلائل کو بھی مع جواب نقل کئے دیتا ہوں۔

اول یہ آیت قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا سے استدلال کر سکتے ہیں کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا ثابت ہوا اور یہ عید بھی اظہار فرحت ہے۔ لہذا جائز ہے جواب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا نکلا اور گفتگو اس ہیئت خاصہ میں ہے لہذا اس آیت سے اس کو کوئی مس نہیں اور اگر اس کلیہ میں داخل کرنا اس کا صحیح ہو تو فقہا نے کتب فقہ میں جن بدعات کو روکا ہے وہ بھی کسی نہ کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہو سکتی ہے۔ چاہیئے کہ وہ بھی جائز ہو جاویں حالانکہ کتب فقہ جو مسلم عند الفریقین ہیں ان میں ان کی ممانعت مصرح مذکور ہے اور ان اہل زیغ

کو ہمیشہ یہ دھوکا ہوتا ہے اور یا تجاہل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قضیہ کا موضوع ایک ہے۔ اسی بناء پر اہل حق پر اعتراض کر دیتے ہیں چنانچہ یہاں بھی مغالطہ ہے ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں وہ ہیئت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت فلیفرحوا سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلقہ ہے۔ پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں حالانکہ صحیح نہیں بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو ہم اس فرحت پر زیدہ عمل کرتے ہیں اس لئے کہ یہ موجدین تو سال[1] بھر میں ایک ہی مرتبہ خوش ہوتے ہیں اور درمیان میں ان کی فرحت منقطع ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت خوش ہیں۔ پس جو فرح کو منقطع کریں۔ وہ آیت کے تارک ہیں۔ ہم تو کسی وقت بھی قطع نہیں کرتے۔ پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی عمل کرتے ہیں اور دلائل منع بدعات پر بھی عامل ہیں اور اہل بدعت کو دونوں امر نصیب نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ فرح مامور بہ کے تین درجے ہیں۔ (۱) افراط (۲) تفریط (۳) اعتدال۔

تفریط تو یہ ہے کہ تحدید بالحاء المہملہ کر دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ختم ہو گئی جیسا بعض خشک مزاجوں کے کلام سے مترشح ہو گیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جاری رکھیں مگر حدود شرعیہ سے تجاوز کریں جیسا اہل تجدید بالجیم المعجمہ کا طریقہ متعارف ہو گیا۔ اور اعتدال اولمۃ میں ہے۔ پس ہم نہ محدد ہیں نہ مجدد بلکہ مدیم ہیں۔ والحمد للہ علی ذالک۔

دوسرا استدلال موجدین کا اس حدیث سے ہو سکتا ہے کہ جب ابولہب نے حضور کی ولادت کی خبر سنی تو خوشی میں آ کر ایک باندی آزاد کر دی تھی اس پر عقوبت میں تخفیف ہو گئی۔ پس معلوم ہوا کہ ولادت پر فرح جائز و موجب برکت ہے۔

جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں بلکہ اس پر ہر وقت عامل ہیں۔ گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے۔

تیسرا استدلال اس سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الی قولہ) رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ.

”یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما دیں۔ (عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعا تک) کہ اے اللہ ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جاوے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا

---

[1] اس لئے کہ اہل نسبت ایمان کی بشاشت اور اس کے ذوق سے ہر وقت مخمور رہتے ہیں۔ اور اہل حق میں ہی بہت سے افراد اس دولت سے مشرف ہیں۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء وھذا ھو الفرح المامور بہ کما صرح فی تفسیر الآیۃ ۱۲ جامع

جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا کہ امم سابقہ کے شرائع اگر حق تعالیٰ ہم پر نقل فرما کر ان پر انکار نہ فرمادیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں اور یہاں کوئی انکار نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور حضور کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظیمہ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو جہاں وہ منقول ہے۔ دیکھئے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (جبکہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو) میں سجدہ تحیہ منقول ہے اور سجدہ تحیہ وسجدہ تعظیمی ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا۔ لیکن یہاں اس پر انکار منقول نہیں۔ اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیت واحادیث ہم نے عید منانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں۔ وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں۔

یہ جواب تو اس تقریر پر ہے جب کہ آیت کے معنی یہی ہیں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بنا دیں۔ اس لئے کہ تکون میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے پس اس سے یوم نزول المائدہ لینا مجاز ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا۔ پس معنی یہ ہیں تکون المائدۃ سرورا لنا۔ یعنی وہ مائدہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہو جاوے۔ عید کے معنی متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی ہی مراد ہے۔

جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م ت ع آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک گویا شیخ سعدی کے شعر تمتع ز ہر گوشہ یافتم (ہر گوشے میں متمتع ہوا) سے بھی متعہ نکلتا ہے اور آیت رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے رب! ہمارے بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے۔ ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع ی د آوے اس سے عید میلاد النبی کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

چوتھا استدلال اس قصہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ (آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے) الخ نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمر سے کہا اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے ہی دن نازل ہوئی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوئی ہے اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے۔ نزلت فی یوم جمعۃ ویوم عرفۃ۔ (یہ آیت جمعہ کے دن یا عرفہ کے دن نازل ہوئی) یہ حدیث کا مضمون ہے تقریر استدلال کی اس حدیث سے یہ ہے کہ حضرت عمر و ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ عطائے نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک بھی نہ سوجھتا لیکن ہم نے تبرعاً نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گنجائش ہو سکتی ہے۔

اس کے دو جواب ہیں ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے تعریف یعنی یوم عرفہ میں حجاج کی مشابہت سے جمع ہونے پر انکار فرمایا ہے۔ یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں۔ نیز حضرت ابن عباس نے تحصیب کو لیس بشئی کہا ہے وہ کوئی چیز نہیں حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر صرف عادت کو عبادت سمجھنے سے انہوں نے یہ انکار فرمایا ہے۔ تو غیر منقول کو قربت سمجھنا تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انکار اجتماع علی شجرۃ الحدیبیہ پر مشہور ہی ہے پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہوگیا کہ ہر ہر مقام پر منقول نہ ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا یہودی تھا اس کو خاص طور پر الزامی جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنانا جائز نہیں ہے اس لئے ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے مگر خدا تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس یوم کو عید بنا دیا۔

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ یہ کر سکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن روزہ رکھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا۔ **ذالک الیوم الذی ولدت فیہ**. یعنی میں اس دن پیدا ہوا ہوں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم الولادت عبادت اور قربت کا دن ہے اور فرحت و سرور علی الولادۃ قربت ہے لہذا یہ جائز ہے۔

اس کے بھی دو جواب ہیں اول تو یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یوم ولادت ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور نے فرمایا کہ جمعرات اور پیر کو نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش ہوں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت صوم کی عرض اعمال ہے۔ پس جب یہ علت ہوئی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت ہوگا اور مدار حکم کا علت ہوتی ہے۔ اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہو تو تم نے حکمت کو اصل علت ٹھہرا دیا حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے مورد کے ساتھ خاص ہو ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ بھی ہو۔ اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہما کیوں منقول نہیں اور نیز مثل صوم یوم الاثنین کے کہ یوم ولادت ہے تاریخ ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے۔ روزہ رکھنا چاہیے دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں۔ مثلاً ہجرت فتح مکہ معراج وغیرہا۔ آپ نے ان کی علت سے کوئی عبادت کیوں نہ فرمائی۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام نہیں ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادت کو ذکر فرمایا اور نہ دوسری نعمتوں کے دن

بھی روزہ و تعید چاہیئے اور اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے تمام نعمتوں کی۔ پس ولادت اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص کی گئی تو ہم کہتے ہیں کہ غرض اعمال اس کی بھی اصل ہے۔ اس کو اصل ٹھہرانا چاہیئے۔

پھر حیرت یہ ہے کہ یوم الولادت دوشنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ الولادۃ یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید مناویں۔ یوم الاثنین میں تو حضور نے ایک عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس دلیل کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہر پیر کو عید کیا کریں۔ غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجدین عید کا ثابت نہیں ہوتا۔ یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے۔

عقلی تردید

اب ہم اس بات میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں سے بعضے عقل پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے ہیں جو راجع ہیں ملک اور قوم کی طرف اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ جس قدر عبادات شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس اعتبار سے مامور بہ کی چند قسمیں نکلتی ہیں اول تو یہ کہ سبب میں بھی تکرار ہو یعنی سبب بار بار پایا جاتا ہو تو سبب کے مکرر ہونے سے مسبب بھی مکرر پایا جاوے گا۔ '' بصلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت آوے گا صلوٰۃ بھی واجب ہوگی۔ اسی طرح صیام رمضان کے لئے سبب ہے جو شہود شہر ہوگا۔ صوم واجب ہوگا اور عید کے لئے فطر اور اضحیہ کے لئے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ مسبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے بیت اللہ شریف حج کے لئے چونکہ سبب ایک ہے اس لئے مامور بہ یعنی حج عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے یہ دونوں قسمیں تو مدرک بالعقل ہیں اس لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحد سے مسبب متکرر اور متوحد ہو۔

تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور مسبب کے اندر تکرار ہو جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب ارادۃ قوت تھی۔ اب وہ ارادۃ قوت تو ہے نہیں۔ اس لئے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے ضعیف اور بودا کر دیا ہے تو حضور نے صحابہ سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں۔ یعنی شانے ہلاتے ہوئے اکڑ کر طواف کرو تا کہ ان کو قوت مسلمین کی مشاہدہ ہو۔ اب وہ سبب تو نہیں لیکن مامور بہ یعنی رمل فی الطواف بحالہ باقی ہے۔ یہ امر غیر مدرک بالعقل ہے اور جو امر خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ عید میلاد النبی کا سبب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ حضور کی ولادت کی تاریخ ہونا ہے اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گزر گئی یا بار بار آتی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ ختم ہو گئی کیونکہ اب جو ۱۲ ربیع الاول کی

تاریخ آتی ہے وہ اس خاص یوم الولادت کے مثل ہوتی ہے نہ کہ عین؟ اور یہ ظاہر ہے پس مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا۔

لیکن یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضور نے یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ ولدت سے فرمائی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہوسکتا ہے کہ یوم الولادت گزر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم اصل کا کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے کہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہوسکتا۔

اب ہم تبرعاً ان حضرات کی ایک عقلی دلیل لکھ کر اور اس کا جواب دے کر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادت مسیح کے دن عید کرتے ہیں ہم مقابلہ کے لئے حضور کے یوم ولادت میں عید کرتے ہیں تا کہ اسلامی شوکت ظاہر ہو۔

جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت کسی وجہ میں صحیح ہوتا کہ جب ہمارے یہاں اظہار شوکت کے لئے کوئی شے نہ ہو ہمارے یہاں جمعہ عیدین سب اظہر شعائر اسلام کے لئے ہیں دوسرے یہ کہ ان کا مقابلہ ہی کرنا مقصود ہے تو ان کے یہاں اور دنوں میں بھی عیدیں اور میلے ہوتے ہیں تم کو بھی چاہئے کہ ہر ہر دن کے مقابلہ میں تم بھی عید کیا کرو اسی طرح عاشورہ کے دن تعزیہ داری بھی کیا کرو تا کہ اہل تشیع کا مقابلہ ہو چنانچہ بعض جاہل محض مقابلہ کے لئے ایسا کرتے بھی ہیں اور جناب اگر یہی مصلحت ہے تو ہندوؤں کے یہاں ہولی دیوالی ہوتی ہے تم ان کے مقابلہ کے لئے ہولی دوالی کیا کرو۔

میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اصل اور قاعدہ آپ کا بالکل بے اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کفار نے ایک درخت بنا رکھا تھا اس پر ہتھیار لٹکاتے تھے اور اس کا نام ذات انواط رکھا تھا بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ **اجعل لنا ذات انواط یعنی یا رسول اللہ** ہمارے لئے بھی اب ایک ذات انواط مقرر فرما دیجئے کہ اس پر ہم ہتھیار کپڑے وغیرہ لٹکا دیا کریں دیکھئے بظاہر اس میں کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ کسی درخت پر کپڑے یا ہتھیار لٹکا دینا ایک امر مباح ہے اس میں تشبہ بھی کچھ نہیں لیکن چونکہ صورت ان کی مشابہت تھی اس لئے حضور کا چہرہ مبارک متغیر ہوگیا اور فرمایا سبحان اللہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے قوم موسیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا **اجعل لنا الٰھا کما لھم الھۃ**

جیسے ان کے معبود ہیں آپ ہمارے لئے بھی ایک معبود مقرر فرما دیجئے۔

پس جب اتنی مشابہت کو بھی حضورؐ نے ناپسند فرمایا تو جس صورت میں ان کی پوری شکل بنائی جاوے یہ تو بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا یہ اس بات میں گفتگو تھی جو اختصار کے ساتھ بیان کی گئی غرض عقل سے نقل سے ہر طرح بحمد اللہ ثابت ہوگیا کہ یہ عید مخترع ناجائز اور بدعت واجب الترک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو فرحت کا حکم ہوا ہے اور اس کی تحدید یا تجدید کا حکم نہیں بلکہ فرح دائم اور مسرت

دائمی کا حکم ہے اس لئے کسی خاص دن کو اس کے لئے مخصوص نہ کریں اور ہر وقت آیت پر عمل کریں چونکہ یہ بیان سرور اور فرحت کے مامور بہ ہونے کے باب میں ہے اس لئے میں اس کا نام السرور رکھتا ہوں اور عید میلاد النبی پر چونکہ اس میں مفصل کلام ہے اس لئے اس کو "ارشاد العباد فی عید المیلاد" کے لقب سے ملقب کرتا ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرما دیں اور بدعات اور تمام نامرضیات سے محفوظ رکھیں آمین یارب العالمین۔

ضمیمہ وعظ ہذا

اب حسب وعدہ مذکورہ وعظ میں عبارات "صراط مستقیم" وتمہید کی آخر میں ملحق کی جاتی ہیں۔

فائدته فی الروایات المتعلقة' بعید یوم من الایام و تقیده ببعض الاحکام فی تبعیدالشیطن بتقریب اغاثه اللهفان لابن القیم و من ذالک اتخاذهاری القبور عیدا وهوا مایحاد قصده من مکان وزمان فالزمان کقوله صلی الله علیه وسلم یوم عرفته و یوم النحر و ایام منی عیدنا اهل الاسلام رواه ابوداؤد وغیره والمکان کماروی ابوداؤد فی سننه ان رجلا قال یا رسول الله انی نذرت ان انحرببوانته قال انها و ثن من اوثان المشرکین او عیدامن اعیادهم قال لاقال فاوف بنذرک و کقوله لاتجعلواقبری عیدا وهو ماخوذ من المعاودة والاعتیاد فاذا کان اسماللمکان فهو المکان الذی یقصدالاجتماع فیه و قصده للعبادة اولغیرهما کما ان المسجد الحرام و منی ومزدلفة وعرفة والمشاعر جعلها الله عیداللحنفاء و مثابته کما جعل ایام التعبد فیهاعیداوکان للمشرکین اعیاد زمانیته ومکانیته ابطلها الاسلام وعوض الحنفاء من الزمانیته عیدالفطر وعید النحر وایام منی ومن المکانیته الکعبة وعرفته ومنی والمشاعر الخ ص ۲۱۷ فی القول الفاضل الفاروق عن الصراط المستقیم لابن تیمیة و من المنکرات فی هذالباب سائر الاعیاد والمراسم المبتدعة فانها من المنکرات المکروهات سواء بلغت الکراهة التحریم اولم تبلغه وذلک ان اعیاد اهل الکتب والاعاجم نهی عنها لسببین احدهما ان فیها مشابهته للکفار والثانی انها من البدع فما احدث من المراسم والاعیاد فهو منکروان لم یکن فیه مشابهة لاهل الکتاب لوجهین احدهما ان ذلک داخل مسمی البدع والمحدثات فیدخل فیما رواه مسلم فی صحیحه الی ان قال وایاکم و محدثات الامور فان کل بدعة

ضلالة ثم قال هذا قاعدته قددلت عليها السنة والاجماع مع مافى الكتب من الدلالة عليها ايض قال الله تعالىٰ ام لهم شركاء شرعوالهم من اللين مالم ياذن به الله و فيه اى الصراط المستقيم ايض فاما اتخاذ اجتماع راتب يتكرر بتكرر الاسابيع والشهود والاعوام غير الاجتماعات المشروعة فان ذلک يضاهى الاجتماعات للصلوات الخمس والجمعة والعيدين والحج و ذلک هوالمبتدع المحدث ففرق بين مايتخذ سنته وعادته فان ذلک يضاهى المشروع و هذا الفرق فهوالمنصوص عن الامام احمد وغيره من الائمة الخ و فيه عن فتح البارى وقد مضى فى كتاب العلم ان ابن مسعود كان يذكر الصحابة كل خميس الى قوله وقد كان ذلک فى عهدالنبى صلى الله عليه وسلم لكن لم يجمله راتبا الخطبة الجمعة بل يحسب الحاجة .الخ

خلاصہ مقصود وعظ

یہاں دو مقام پر کلام ہے ایک دلائل تعیید کے غیر مشروع ہونے کے دوسرے جواب اہل تعیید کے دلائل کے سو امر اول کا بیان یہ ہے کہ اس میں چند دلائل ہیں۔

نمبر۱: قرآن مجید میں ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ

کیا ان کے لئے شرکاء ہیں کہ انہوں نے دین کے لئے وہ بات مقرر کر دی جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔

اس سے ثابت ہوا کہ کوئی امر بدوں اذن شرعی دین کے طور پر مقرر کرنا ناجائز ہے اور بدعت یہی ہے یہ تو کبریٰ ہوا اور صغریٰ ظاہر ہے کہ یہ عمل کہیں وارد نہیں جزئیا تو ظاہر ہے اور کلیا بھی نہیں اور یہ محتاج بیان ہے کیونکہ اہل ابتداع اس کو کسی کلیہ میں داخل کر سکتے ہیں مگر وہ ادخال بدلیل قوی غیر صحیح ہے وہ دلیل یہ ہے کہ جو داعی ہے اس کے ایجاد کا خواہ اظہار سرور و فرح نعمت الیہ پر یا اظہار شوکت اسلام مخالفین پر وہ داعی جدید نہیں قدیم ہے اور باوجود اس کے کسی نے خیر القرون میں ایسا عمل نہیں کیا اور وہ حضرات قرآن مجید حدیث شریف کو تمام امت سے زیادہ سمجھنے والے تھے پس یہ دلیل ہے اس کی کہ یہ ادخال صحیح نہیں۔

نمبر۲: **من احدث فى امرنا هذا ماليس منه فهورد (انظر تخريج الحديث الرقم ۱: ۹۲.)**

(جو شخص ہمارے اس دین میں وہ شے نکالے جو اس میں نہیں ہے وہ واجب الرد ہے اس میں بھی وہی تقریر ہے جو ابھی مذکور ہوئی۔)

نمبر۳: مسلم کی روایت ہے۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاتختصوالیلة الجمعة بقیام من بین اللیالی ولاتختصویوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصومه احدکم. (انظر تخریج الحدیث الرقم ۲: ۹۲.)

اس حدیث سے تخصیص غیر منقول بطور قربت کا منہی عنہ ہونا بطور قاعدہ کلیہ کے ثابت ہوا گو بعض علماء نے صوم جمعہ کو بانفراد بھی جائز رکھا مگر وہ بھی اس کلیہ کو مانتے ہیں۔ انہوں نے اس تخصیص کو نقل سے ثابت کر کے اجازت دی ہے اور نہی کو اعتقاد وجوب وغیرہ پر محمول کیا ہے سو یہ دوسری بات ہے مقصود ہم کو صرف اس کلیہ کی صحت کا ثابت کرنا ہے سو وہ بالاجماع ثابت ہے یہ تو کبریٰ اور صغریٰ ظاہر ہے کہ عمل مبحوث فیہ میں صریح تخصیص ہے اور تخصیص بھی بطور دین وعبادت کے کیونکہ اس کو عوام کیا بلکہ خواص بھی دین کی بات سمجھتے ہیں جس کی کھلی نشانی یہ ہے کہ اس تخصیص کے تارکین کو دینا برا سمجھتے ہیں اور تخصیصات عادیہ میں ایسا نہیں سمجھتے دوسری علامت اس کے تخصیص عادی نہ سمجھنے کی یہ ہے کہ اس میں کبھی تقدیم و تاخیر گوارا نہیں کرتے اور تخصیصات عادیہ میں عوارض سے تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے پس یقیناً یہ تخصیص منہی عنہ میں داخل ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کیونکہ یوم جمعہ کے تو فضائل بھی وارد ہیں۔ جب اس میں ایسی تخصیص جائز نہیں تو جس تاریخ کے فضائل بھی منقول نہیں اس میں ایسی تخصیص کب جائز ہوگی اور اس کے منقول ہونے پر جو ان موجدین کا استدلال ہے اس کا جواب وہاں آئے گا جہاں دوسرے مقام پر کلام ہوگا یہ دلائل عامہ ہیں آگے دلیل خاص ہے در باب خصوص تعید کے۔

نمبر۴: نسائی نے حدیث روایت کی ہے۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم

لاتجعلو قبری عیداً وصلو علی فان صلواتکم تبلغنی حیث کنتم

(سنن ابی داود کتاب المناسک باب: ۹۹' کنز العمال: ۲۱۹۹. المصنف لابن ابی شیبة ۲: ۳۷۵' تفسیر ابن کثیر ۲: ۳۶۵.)

یہ حدیث صریح ہے اس امر میں کہ عید کے طرز پر کہ اس میں اہتمام اجتماع کا ہوتا ہے۔ جمع ہونے کو منع فرمایا ہے اور اس اجتماع کی اگر کوئی تاویل کرتا کہ ہم تو صلوۃ کے لئے جمع ہوتے ہیں جیسے عادت ہے اہل ابتداع کی کہ کلیات منقولہ میں زبردستی جزئیات مبتدعہ کو داخل کیا کرتے ہیں اس کو رد فرمادیا کہ صلوۃ ہر جگہ ہو سکتی ہے یہ اجتماع پر موقوف نہیں اور اس رو سے بہت بڑی بات ثابت ہوگی کہ جب صلوٰۃ کے لئے جو کہ مندوب وقربۃ ہے ایسا اجتماع کالعید جائز نہیں تو دوسرے اغراض کے لئے جو اس سے بھی ادنیٰ ہیں ایسا اجتماع کہاں جائز ہوگا یہ حدیث خاص عید کی تخصیص پر دال ہے کہ کسی عید کا ابتداع ناجائز ہے اور اس تقریر سے نفس زیارت قبر نبوی یا اس کے لئے سفر کرنے کی نہی نہیں لازم

آئی کیونکہ وہاں صرف زیارت کے برکات حاصل کرنا مقصود ہے جو کہ دوسری روایات سے مندوب ہے وہاں تاریخ مقصود نہیں اور نہ محض صلوۃ کے لئے سفر کیا جاتا ہے جس پر **صلوا علی فان صلاتکم تبلغنی حیث کنتم** سے شبہ ہو سکے۔

نمبر۵: حدیث میں ہے کہ عید کے روز خاص طرق فرح وسرور پر حضرت عمر نے انکار فرمایا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہٰذا عیدنا اس سے صاف معلوم ہوا کہ رائے سے عید بنانا جائز نہیں ورنہ یہ تعلیل خاص نہ رہے گی عید منقول کے ساتھ کیونکہ جس روز کو کوئی عید بنالے وہاں ہی یہ تعلیل جاری ہو جائے گی حالانکہ خاص ہونا تعلیل کا صاف ظاہر ہے اور عدم تخصیص سے انعاء کلام شارع لازم آوے گا یہ تو دلائل کتاب وسنت سے ہیں۔

نمبر۶: امت کا اجتماع کسی امر کے ترک پر یہ اجماع ہے جس سے استدلال کرنا خلفا عن سلف منقول ہے چنانچہ ماہر اصول وفقہ پر مخفی نہیں جیسا عیدین میں اذان نہ ہونے کو اسی غرض کے لئے نقل کیا گیا اور جمعہ میں صلوۃ کی تقدیم کو خطبہ پر نظر انکار سے دیکھا گیا ہے حنفیہ نے صلوۃ جنازہ کے عدم تکرار یا صلوٰۃ علی القبر کی نفی پر اسی سے استدلال کیا ہے کہ سلف نے نہیں کیا یہی قصہ عید میلاد میں ہے کتاب وسنت کے بعد یہ اجماع ہو گیا۔

نمبر۷: علماء نے اپنی کتب میں اس سے بحث کی ہے۔ **کما فی تبعید الشیاطین و فی الصراط المستقیم** پس یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ شاید تمہارے استدلال میں کوئی خدشہ ہو پس قیاس بھی اس پر دال ہو گیا۔

دوسرا مقام جواب ہے موجدین کے دلائل کا اور جو دلائل میں نقل کرتا ہوں میں نے ان سے کہیں منقول نہیں دیکھے اور شاید ان کے ذہن میں بھی نہ آئے ہوں مگر احتیاطاً تمام محتملات کا جہاں جہاں گنجائش محمل تھی انسداد کئے دیتا ہوں۔

نمبر۱: یہ جو آیت میں نے پڑھی ہے اس میں احتمال ہے کہ شاید استدلال کر سکیں۔ جواب ظاہر ہے کہ فرح کو کون منع کرتا ہے اس کی خاص ہیئت کو منع کرتے ہیں اور اس کا جواز آیت میں منقول نہیں۔ اگر ایسے کلیات سے استدلال ہوتا تو فقہا کی تصریحاً منع کی ہوئی بدعات صلوۃ الرغائب وغیرہ سب جائز ہوں گی کسی نہ کسی کلیہ میں تو وہ بھی داخل ہیں اور یہی ایک خرابی ہے اہل زیغ میں کہ تامل نہیں کرتے کہ قضیہ ناصہ میں موضوع اور ہے اور قضیہ مجوزہ میں اور۔ اور پھر تناقض کہاں کہ ایک کے اثبات سے دوسرے کی نفی ہو جاوے۔ اس کی نظیر الزنجی اسود والزنجی لیس باسود ہے۔ بلکہ اگر غور سے کام لیا جاوے تو اس آیت پر ہم زیادہ عامل ہیں۔ اس لئے کہ موجدین کا فرح تو متجدد ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ درمیان میں فرح نہ رہا تھا پھر تازہ کیا ہے اور ہمارا فرح دائم ہے پس آیت ان کے خلاف ہو گی جو فرح کو منقطع سمجھتے ہوں یعنی اس نعمت کا شکر ترک کر دیا ہو جس کو حق تعالیٰ نے لقد من اللہ الخ میں بھی ذکر فرمایا ہے اور اس آیت میں بھی فضل و

رحمت کی سب سے بڑھ کر فرد وجود باجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پس جو فرح کو منقطع کر چکے ہوں وہ آیت کے مخالف ہوں گے جیسے کہ جو فرح کو متجدد کرتے ہیں وہ دوسری آیت ناہیہ من الابتداع کے خلاف کرتے ہیں حاصل تقریر کا یہ ہے اس فرح کی تحدید تو تفریط ہے اور اس کی تجدید بالجیم افراط ہے اور اس کی ادامت مطلوب ہے سو بحمد اللہ تعالیٰ ہم اس نعمت و برکت سے مشرف کیے گئے ہیں نہ محدد ہیں نہ مجدد۔

نمبر ۲: ایک استدلال مشہور ہے کہ ابولہب نے ثویبہ کو آزاد کر دیا تھا اور اس کو تخفیف ہو گئی جواب اس کا بھی وہی ہے جو گزرا کہ نفس فرح کو کون منع کرتا ہے مگر اس سے قیود و خصوصیات یا تعید کیسے ثابت ہوئی۔

نمبر ۳: شاید کوئی اس آیت سے استدلال کرے۔

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ
تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا

کہ دیکھو! اس میں مصرح ہے کہ یوم عطائے نعمت کو عید بنانا تجویز کیا اور اصول میں مقرر ہے کہ اذا قصی اللہ الخ اور اس پر یہاں انکار کیا نہیں گیا۔ پس حجت ہمارے لئے بھی ہو جاوے گی۔

جواب اس کے لئے دو ہیں اول یہ کہ یہ ضرور نہیں کہ اسی جگہ انکار ہو۔ شریعت میں کہیں بھی ہو کافی ہے چنانچہ سجدہ ملائکہ علیہ السلام وسجدہ والدین واخوۃ یوسف علیہ السلام جس جگہ منقول ہے وہاں انکار نہیں اور پھر فقہا نے سجدہ تحیۃ للمخلوق کی حرمت مانی ہے اور اس سے تعید کے انکار کے دلائل شرعیہ اول منقول ہو چکے ہیں پس استدلال تام نہ رہا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں یوم نزول مائدہ کا عید بنانا مذکور ہی نہیں صرف مائدہ کی طرف ضمیر راجع ہے اور عید بمعنی سرور ہے یعنی وہ مائدہ ہمارے اول و آخر کے لئے مایہ سرور بن جاوے کہ اس نعمت پر دائما فرحاں و شاداں و شاکر رہیں۔ **كما ذكر في فضل الله و رحمته.**

نمبر ۴: بخاری میں قصہ ہے کہ ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر آیت الیوم اکملت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس یوم کو عید بنا لیتے جس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے **نزلت يوم جمعة و عرفة و كلاهما بحمدالله لنا عيد.** اور طبری اور طبرانی میں یہ ہے **وهما لنا عيدان** اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے یہ جواب دیا۔ **نزلت في يوم عيدين يوم جمعة و يوم عرفة** دیکھو! ان دونوں حضرات نے تعید پر انکار نہیں کیا بلکہ اس کو ثابت کیا کہ اس روز ہماری بھی عید تھی۔

اس کے بھی دو جواب ہیں ایک یہ کہ انکار اسی جگہ ضرور نہیں جیسا کہ مذکور ہوا۔ دلائل شرعیہ انکار کے کافی ہیں چنانچہ ہمارے فقہا نے تعریف پر انکار کہ وہ بھی ایک عید ہے اور حضرت عمرؓ سے شجرہ حدیبیہ پر اجتماع کا انکار کہ وہ بھی مشابہ عید کے تھا منقول ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی تعید کو جائز نہ سمجھتے تھے نیز حضرت ابن عباسؓ کا قول صحیحین وسنن ترمذی ونسائی میں مروی ہے۔

ليس التحصيب بشيئ انما هو منزل نزله رسول الله صلى الله عليه وسلم كذا فى التعليق الممجد (الصحيح لمسلم كتاب الصيام باب: ٣٦، رقم ١٩٧، المسند للإمام احمد بن حنبل ٥:٢٩٧، حلية الأولياء ٩ : ٥٢.)

حالانکہ تحصیب منقول بھی ہے لیکن صرف اتنی بات پر کہ کوئی شخص عادت کو عبادت سمجھ جاوے اس کو لیس بشیئ کہتے ہیں تو جو سرے سے منقول بھی نہ ہو نہ کلیا نہ جزیا اس کو عبادت سمجھنا ان کے نزدیک کس قدر قابل انکار ہوگا اور یہاں ہی سے معلوم ہوا کہ ان سے جو تعریف مذکور نقل کی گئی ہے وہ روایت یا اس علت سے جس پر ان کا فتویٰ تحصیب کے باب میں دال ہے معلول ہے یا ماول ہے قصد دعا بلا التزام و بلا تشبہ باہل عرفات کے ساتھ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہودی کو اس مسئلہ فرعیہ کے بتلانے کی حاجت نہ تھی کہ یہ تعیید کیسی ہے بلکہ اس کو ایک خاص طرز پر جواب دیا کہ تو جو کہتا ہے کہ ایسی نعمت عظمیٰ میں عید نہیں ہوئی یہ غلط ہے ہم تو پیچھے عید کرتے ہمارے یہاں پہلے سے عید ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو اس سے بھی نکیر علی التعیید ثابت ہوتا ہے یعنی ہماری شریعت میں چونکہ ایسے اسباب سے عید کرنا درست نہ تھا اور اللہ تعالیٰ کو اس کے نزول کے یوم کو عید کرنا مقصود تھا اس لئے ایسے ہی دن نازل فرمایا کہ عید بھی ہو جاوے اور بدعت سے بھی بچے رہیں۔

نمبر ۵: ایک احتمال اس حدیث سے استدلال کرنے کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے روز روزہ رکھتے تھے اور سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ **ذالک الیوم الذی ولدت فیه**۔ اس سے معلوم ہوا کہ یوم ولادت میں کچھ قربات ادا کرنا مشروع ہے اور فرح و سرور اجتماع اللذ کرو تقسیم طعام یا شیرینی یہ سب قربات ہیں یہ بھی مشروع ہوں گے۔

جواب اس کے دو ہیں ایک یہ کہ حدیث میں ایک دوسری وجہ بھی منقول ہے وہ یہ کہ اس یوم میں اور خمیس میں بھی اعمال پیش ہوتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ حالت صوم میں میرے اعمال پیش کیے جاویں پس اس صورت میں احتمال ہو گیا کہ **ذالک الیوم الذی ولدت فیه** علت نہ ہو بلکہ علت تو عرض اعمال ہو اور وہ حکمت ہو اور حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔ دوسرے دو حال سے خالی نہیں آیا یہ علت عام اور یہ حکم موافق قیاس کے ہے یا علت خاص اور حکم خلاف قیاس ہے اگر شق اول ہے تو کیا وجہ کہ یوم الاثنین میں کہ یوم ولادت ہے نوافل اور تلاوت قرآن و اطعام طعام حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ سے منقول نہیں باوجود توفیر رغبت الی الخیر کے۔ نیز ربیع الاول کی ۸ یا ۱۲ کی تاریخ ولادت ہے خود روزہ کیوں منقول نہیں۔ نیز ولادت جیسی نعمت ہے بہت سی اور نعمتیں بھی آپ کو عطا ہوئیں۔ نبوت، ہجرت، فتح مکہ وغیرہا ان کے ساتھ کسی عبادت کو معلل کیوں نہیں فرمایا پس معلوم ہوا کہ نہ علت عام ہے نہ حکم موافق قیاس کے ہے علت بھی خاص ہے اور حکم بھی خلاف قیاس ہے اور اصل مدار اس کا وحی اور نقل ہے پس اس حالت میں قیاس کہاں جائز ہوگا خاص کر غیر مجتہد کو جب کہ ایسے مقام پر مجتہد کو بھی جائز نہیں۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہے تو موافق قیاس کے لیکن اور نعمتیں فرح ہیں اور ولادت اصل ہے اس لئے اس روز قربات مشروع ہیں۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ حمل ولادت کی بھی اصل ہے اس تاریخ میں کوئی قربت کیوں نہیں مشروع ہوئی۔ پھر یہ کہ دوسری قربات آپ سے خود یوم ولادت یا تاریخ ولادت میں کیوں منقول نہیں۔ علاوہ اس کے اگر اس سے استدلال کیا جاوے تو حیرت ہے کہ یوم ولادت کہ یوم الاثنین ہے جو کہ حدیث میں مذکور بھی ہے اس میں تو عید نہ کریں اور تاریخ ولادت جس میں کوئی چیز بھی حضور سے منقول نہیں اس میں عید کریں۔ پس چاہیئے کہ ہر دوشنبہ کو وہی اہتمام کیا کریں جو ۱۲ ربیع الاول کو کیا جاتا ہے۔ یہ گفتگو تھی دلائل سمعیہ میں جانبین سے۔

اب ہم اہلسنت کی طرف سے ایک عقلی دلیل بھی بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ شریعت میں ہر فعل کا ایک سبب خاص ہوتا ہے اور اس سببیت اور مسببیت کی تین صورتیں شریعت میں پائی جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ سبب بھی بار بار پایا جاتا ہے جیسے اوقات، صلوۃ کے لئے اور رمضان صوم کے لئے، فطر صیام کے لئے، یوم الضحیٰ اضحیہ کے لئے۔

دوسرے یہ کہ سبب بھی ایک ہی ہے مسبب بھی ایک جیسے بیت اللہ حج کے لئے اور یہ دونوں امر مدرج بالعقل ہیں۔

تیسری صورت یہ کہ سبب ایک بار پایا گیا اور مسبب بار بار پایا جائے جیسے مشرکین کو قوت دکھلانے کے لئے رمل کیا گیا تھا پھر اراءۃ قوت تو نہ رہی مگر رمل رہ گیا اور یہ عمل مدرک بالعقل نہیں۔ اس لئے اس میں بجز وحی کے کوئی سبیل نہیں۔

جب یہ قاعدہ ممہد ہو گیا اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ عید میلاد کا سبب کیا ہے ظاہر ہے کہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی تاریخ ہونا اب دیکھئے کہ وہ تاریخ واحد ہے جو منقضی ہو گئی یا متجدد ہے ظاہر ہے کہ وہ منقضی ہو چکی۔ دوسری تاریخ اس کا عین نہیں صرف مثل ہے اور مثل کا مدار حکم ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ پس اس حالت میں عید کا متجدد ہونا امر غیر مدرک بالعقل ہو گا اس لئے محتاج وحی ہو گا قیاس اس میں حجت نہ ہو گا۔ اور وحی ہے نہیں اس لئے اس کو زیادت علی الشرع کہیں گے اور اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد **ذالک الیوم الذی ولدت فیه** پر شبہ نہ کیا جاوے کہ وہ یوم تو منقضی ہو گیا تھا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں ہم کہہ چکے ہیں کہ وحی کی ضرورت ہے اور آپ کے پاس اس حکم پر وحی تھی۔

جس طرح یہ ہمارے پاس دلیل عقلی ہے اسی طرح ان کے پاس بھی ایک دلیل عقلی ہے وہ یہ کہ اس میں مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادت مسیح علیہ السلام کے دن اظہار شوکت کرتے ہیں۔ پس ہم ولادت نبویہ کے روز کرتے ہیں۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ ہمارے لئے اظہار شوکت کا دن شارع علیہ السلام مقرر فرما چکے ہیں عید بقرعید بلکہ ہر جمعہ پھر اس اختراع کی کون سی حاجت رہی دوسرے اگر یہی بات ہے کہ ان کے ہر عمل کے مقابلہ میں ایک ایسا ہی عمل ہو تو چاہئے کہ اہلسنت محرم کی دسویں بھی کیا کریں۔ تا کہ اہل تشیع کے مقابلہ میں اظہار شوکت اہل حق ہو اور نیز عوام ان کی دسویں میں جانے سے بچیں اور اگر اس کا کوئی التزام کرے تو اس کے جواب کے لئے ایک حکایت نقل کرتا ہوں۔

جون پور میں ایک صاحب ہر مہینہ کی دسویں کو مجلس کیا کرتے تھے اور ایسی ہی مصلحت بیان کرتے تھے ایک محقق عالم نے ان سے کہا کہ اگر ایسی ہی مصلحت ہے تو ہنود کے ہولی دیوالی ہوتی ہے تو چاہیے مسلمان بھی ایک ہولی دیوالی کیا کریں۔

اسی روز کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مقابلہ پر انکار صریح فرمایا ہے۔ جب کہ صحابہ نے عرض کیا **اجعل لنا ذات انواط کما لهم ذات انواط** (لم احد الحديث فى "موسوعة اطراف الحديث النبوى الشريف" التى رتبها ابوهاجر محمد السعيد) تو آپ نے فرمایا' یہ تو ایسی ہی بات ہو گئی جیسے بنی اسرائیل نے کہا تھا۔ **اجعل لنا الها کما لهم الهة**

جاننا چاہئے کہ بعض مقامات پر ایک مجلس رجبی کے نام سے بتخصیص ۲۷ رجب نہایت اہتمام سے منعقد ہوتی ہے دلائل مذکورہ منع کے اور جوابات و شبہات کے جواب میں بھی اکثر جاری ہیں۔ پس اس کا حکم بھی یہی ہے کہ وہ بھی داخل بدعت ہے۔

كتبه ليلة الاثنين من ربيع الاول تاريخ المولد الشريف
عند كثير من العلماء ١٣٣٣ هجرى ثم بعد هذا التحرير
ذكر هذا المضمون تقرير اليوم الجمعة ثانى عشر من الشهر
المذكور تاريخ المولد الشريف على القول المشهور
من السنة المذكورة.

النور

آداب ذکر النبی کے متعلق یہ وعظ ۲۸ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ حاضری تقریباً ۱۵۰ تھی ۲ گھنٹہ ۳۳ منٹ میں ختم ہوا۔ مولوی سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّـَٔاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّہۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ہَادِیَ لَہٗ وَنَشۡہَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡہَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

اَمَّابَعۡدُ: اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

قَدۡ جَآءَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ نُوۡرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ

تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح۔

دو نعمتیں

یہ ایک مختصری آیت ہے اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی دو نعمتوں کا عطا فرمانا اور ان دونوں نعمتوں پر اپنا احسان ظاہر فرمانا بیان فرمایا ہے۔ ان دونوں نعمتوں میں ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود ہے اور دوسری نعمت قرآن مجید کا نزول ہے۔ ایک کو لفظ نور سے ذکر فرمایا ہے اور دوسرے کو کتاب کے عنوان سے ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہ توجیہ اس آیت کی ایک تفسیر کی بناء پر ہے یعنی جب کہ نور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود مراد لیا جائے۔ اور اگر دوسری تفسیر اختیار کی جاوے یعنی نور اور کتاب دونوں سے قرآن مجید ہی مراد لیا جاوے تو توجیہ بدل جاوے گی اور اس صورت میں عطف کتاب کا نور پر باوجود اتحاد ذات کے تغائر حیثیت وصفت کے اعتبار سے ہوگا کہ ایسی کتاب عطا فرمائی کہ اس میں ایک صفت نوریت کی ہے اور دوسری صفت کتابیت کی ہے اور اس توجیہ کی بنا پر بھی وہ تعداد نعمت فوت نہ ہوگی یعنی وہ دو نعمتیں اب بھی رہیں گی۔ لیکن ایک پر دلالت مطابقی ہوگی اور دوسری پر دلالت التزامی۔ یعنی قرآن پر تو دلالت مطابقی ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور چونکہ قرآن کا نزول حضور پر ہوا

اور حضور کی برکت سے ہم کو یہ نعمت عطا ہوئی۔ اس لئے اسی کلام میں بطریق لزوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود پر بھی دلالت ہوگی بہرحال دونوں بطریق مطابقت مذکور ہوں یا ایک بطریق مطابقت اور دوسری بطریق لزوم مگر ہر حال میں اس آیت میں دو نعمتوں کا ذکر ہے۔

ضرورت بیان

یہ حاصل ہے اس آیت کا مگر قبل اس کے کہ اس کے متعلق کچھ بیان کیا جاوے اس سوال کا جواب دیتا ہوں کہ اس وقت اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہوئی۔ سو اول تو یہ سوال ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ایسا نہیں کہ جس پر یہ سوال ہو سکے۔ مگر یہ سوال ہمارے کم سمجھ مدعیان محبت اخوان کی بدولت پیدا ہوا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو آج کل ذکر مولد میں تخصیصات کے پابند ہیں۔ سوان حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو خاص خاص ازمنہ کے ساتھ مختص کر دیا ہے جیسے بعض مدعیان محبت حضرت حسین نے ذکر حسین کو محرم کے ساتھ خاص کر دیا ہے ایسا ہی ان حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کو ربیع الاول کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔

عجب نہیں کہ میرے اس وقت کے اس بیان سے کسی کے ذہن میں یہ بات آئی ہو کہ یہ بیان بھی شاید اسی وجہ سے ہو رہا ہے کہ یہ مہینہ اس بیان کا ہے اور اس کے ذہن میں آنے سے دو قسم کے لوگوں کو دو تعجب پیدا ہوئے ہوں۔ **منهمكين فى التخصيصات** کو تو یہ تعجب کہ یہ لوگ تو اس تخصیص پر کلام کرتے ہیں پھر خود اس کا ارتکاب کرنے کی کیا وجہ؟ کیا ان لوگوں کے قول و فعل مطابق نہیں ہوتے؟ اور مانعین تخصیصات کو یہ تعجب کہ اس نے محققین کا مسلک کیوں چھوڑا؟

بہرحال چونکہ ایک خاص جماعت نے ذکر رسول کو خاص کر دیا ہے خاص اوقات کے ساتھ اسی لئے اس وقت میرے اس بیان پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے ورنہ یہ سوال بالکل لایعنی تھا اور یہ کسی مسلمان کے دل میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ایسی چیز ہے کہ اس کی نسبت یہ سوال ہو سکے کہ اس وقت اس ذکر کو کیوں اختیار کیا گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک تو ایسی چیز ہے کہ ہر وقت ہر انسان کے رگ و پے میں ساری ہو بلکہ دوسرے اذکار بھی اسی ذکر کی طرف راجع ہو جایا کریں۔ اور اس کو ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے انسان ہر ذکر سے اسی کا ذکر نکال لیتا ہے اور ہر گفتگو کا خاتمہ اسی کے تذکرہ اور یاد پر ہوتا ہے۔

ظہور اسماء جلالیہ و جمالیہ

حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ کو چونکہ محبت حق اور توحید میں کمال تھا اور توجہ بحق غالب تھی۔ آپ ہر بات کو توحید کی طرف منعطف فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر بعض حکام مکہ کے تشددات کا تذکرہ شروع کیا کہ یوں ظلم کرتے ہیں یوں پریشان کر رکھا

ہے مگر وہاں تو دل میں ایک ہی بسا ہوا تھا اور یہ حالت تھی کہ۔

خلیل آسا در ملک یقین زن نوائے لا احب الآفلین زن

(ابراہیم علیہ السلام کی طرح یقین حاصل کر کے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا کی صدا لگاؤ۔)

اور یہ حالت تھی کہ

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے چہ کنم کہ چشم یک بیں نہ کند بہ کس نگاہے

(سارا شہر حسینوں سے بھرا پڑا ہے میں ہوں اور ایک حسین محبوب کا خیال ہے بدخو آنکھوں کا کیا کروں کسی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔)

بس معاً ہی فرماتے ہیں کہ آج کل اسماء جلالیہ کا ظہور ہو رہا ہے اور اس کے بعد خدا تعالیٰ کے اسماء جلالیہ و جمالیہ یعنی لطیفہ و قہریہ کی تحقیق ہونے لگی اور ان اسماء جمالیہ و جلالیہ کے وہ معنی نہیں جن کو عاملین اسماء جلالیہ و جمالیہ کہتے ہیں اور جن میں ان کے نزدیک گوشت چھوڑ دینا ضروری ہے وہ تو ایک مخترع اصطلاح ہے بلکہ مراد اسماء جلالیہ سے اسماء قہریہ اور اسماء جمالیہ سے اسماء لطیفہ ہیں تو یہ سختی وغیرہ جو کچھ ہوتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کا ظہور ہوتا ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں۔

ظلم و ستم اگرچہ ہمارے افعال ہونے کی حیثیت سے اور ہمارے اعتبار سے معصیت ہے مگر اس کی تخلیق و تکوین میں بھی خدا تعالیٰ کے مصالح اور بہت سی حکمتیں ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے استاد سے سنا ہے کہ دنیا میں چوری ہوتی ہے مگر اس کا وجود بھی حکمت سے خالی نہیں ہے اگرچہ یہ تو اعتقاد ہے کہ خدا کی حکمت نے چاہا کہ کوئی ایسا ہو اور کوئی ایسا ہو اور اس فعل میں گناہ بھی ہوگا۔ بوجہ اس کے اختیاری ہونے کے مگر یہ ایسا ہے جیسے گھر میں پاخانہ ہوتا ہے کہ وہ تمام قطعات سے ارذل ہے لیکن مکان بغیر اس کے ناتمام ہے۔ ایسا ہی عالم بدوں کفر کے ناتمام ہے۔ ایک مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ بزرگوں کے برکات کا تو مقتضا یہ تھا کہ ان کے مزارات پر خرافات نہ ہوا کرتے۔ اسی شب خواب میں یہ شعر وارد ہوا۔

درکار خانہ عشق از کفر ناگزیر است آتش کرا بسوزد گر بو لہب نباشد

(دنیا میں کفر کا وجود بھی ضروری ہے اگر کوڑا کرکٹ نہ ہو تو آگ کیسے روشن ہو اگر ابولہب نہ ہو تو دوزخ کی آگ کیوں جلاتے۔)

اسی طرح چوری کیسی بری چیز ہے مگر بہت سی حلال روزیاں اس کی بدولت ہیں۔ مثلاً لوہاروں سے عمدہ عمدہ قفل بنوائے جاتے ہیں اور یہ اسی کی بدولت بڑھئی سے مضبوط کواڑ تیار کرائے جاتے ہیں پاسبانوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں یہ سب اسی کی بدولت ہے۔ تو اسماء جلالیہ کے ظہور کے یہ معنی ہیں۔ تو حضرت حاجی صاحب فرمانے لگے کہ آج کل اسماء جلالیہ کا ظہور ہو رہا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غیبت وغیرہ سب بھاگ گئی۔

ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

تو جس کے دل میں کوئی چیز بسی ہوئی ہوتی ہے اس کو ہر چیز میں اسی کا ذکر یاد آتا ہے۔ جب ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کی محبت کا یہ اثر ہے تو جن لوگوں کو خدا اور رسول کی محبت نصیب ہے ان کا تو کیا ذکر ہے۔ جو لوگ دنیا کی کسی عورت یا کسی مرد پر عاشق ہو جاتے ہیں ان کو دیکھئے کہ ہر بات میں، ہر تذکرہ میں ان کو اس کی یادگی رہتی ہے۔

ایک کنجوس کی حکایت ہے کہ اس نے اپنے کسی دوست کو ایک مرغی دے دی تھی۔ اب جب کبھی کسی بات کا تذکرہ آتا اس کو فوراً وہ مرغی یاد آ جاتی کہ زید اس دن گیا تھا جب ہم نے تم کو مرغی دی تھی۔ فلاں واقعہ اس دن ہوا تھا جب ہم نے تم کو مرغی دی تھی۔ غرض جو واقعہ ہو اس پر یہی ذکر۔ وہ مرغی ہر واقعہ کا پتہ بتلانے میں اس کے لئے ایسی ہوگئی جیسے ہندوستان کا غدر کہ غدر میں یوں ہوا تھا اور غدر میں ہماری عمر نو برس تھی۔ تو جیسے ہندوستان کے لئے غدر تاریخ ہوگئی ہے ایسے ہی اس کے لئے مرغی تاریخ ہوگئی۔ آخر اس دوست نے تنگ آ کر مرغی خرید کر اس کے حوالہ کی کہ بھائی تو مرغی لے لے اور اس ذکر کو چھوڑ۔

تو جس چیز کا خیال بندھ جاتا ہے وہ ہر وقت یاد آتی ہے پس جس کو خدا اور رسول سے محبت ہو تو اگر ہر بات میں وہی یاد آویں تو کیا تعجب ہے۔ صحابہ کرام کی تو یہ حالت تھی کہ بات بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ آ جاتا تھا۔ حضرت ہند ابن ابی ہالہ کی نسبت حدیث میں ہے کہ۔ کان وصاف الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آخر ہم کو دیکھئے کہ ہم مثلاً حاجی صاحب کے سلسلہ میں ہیں تو ذرا سے بہانے سے اس سلسلہ کے بزرگوں کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور پھر اس کے قطع کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ محض محبت کے سبب ہے۔ اسی کو کسی نے کہا ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد   در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم   مینمودی بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں   می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ می کنم   خاطر خود را تسلی می دہم

(ایک مسافر نے مجنوں کو جنگل میں دیکھا کہ اکیلا اپنے غم میں بیٹھا ہے۔ زمین پر قلم کی بجائے انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے۔ اس مسافر نے مجنوں سے پوچھا یہ کس کو خط لکھ رہے ہو۔ کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔)

یعنی اگر مسمی میسر نہیں تو اسم ہی سہی۔ جب نفسانی کیفیت کی یہ حالت ہے تو خدا کی محبت کی کیا حالت ہوگی۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

کیا مولیٰ کا عشق لیلیٰ سے بھی کم ہو گیا۔ دیکھو لیلیٰ کی محبت میں مجنوں کا کیا حال تھا۔

کیا خدا کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہے۔ اس کے واسطے تو بہانہ کافی ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف ہے کہ اس کے واسطے کسی اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو ہر بات میں آ جانا چاہئے۔ نیز اس کی بھی کیا ضرورت ہے کہ اگر بیان ہو تو صرف ولادت شریفہ اور معجزات ہی کا بیان ہو۔ آپ کی تو ہر ہر بات ذکر کے قابل ہے۔ نشست و برخاست، اخلاق و عادات، مجاہدات و ریاضات، افعال و احکام، اوامر و نواہی۔ مگر بات یہ ہے کہ انسان کا نفس راحت طلب ہے۔ جس بات میں کچھ کرنا پڑتا ہے تو اس سے جان چراتا ہے تو ہر ہر بات کے تذکرہ میں چونکہ احکام پر بھی عمل کرنا پڑتا ہے اس لئے اس کو بالکل ترک کر دیا۔

کانپور میں مجھ سے ایک شخص کہنے لگے کہ۔ لوگوں نے مولود شریف کو مٹانے کا ایک اور بھی طریقہ ایجاد کیا ہے کہ اس میں نماز روزہ وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ اکبر! بتلائیے کہ جو لوگ نماز وغیرہ کے تذکرہ کو حضور کے ذکر کا مٹانا کہیں کیا وہ محب رسول ہیں۔ صاحبو! یہ سب امور بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ذکر ہیں۔

حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب سے مولود کی بابت پوچھا گیا فرمایا کہ میاں! ہم تو ہر وقت ذکر مولد کرتے ہیں کیونکہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے ہیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو ہم یہ کیوں پڑھتے۔ غرض آپ کا ذکر تو ہر وقت ہی ہونا چاہئے پھر آپ کی ہر ادا کا ذکر ہونا چاہئے۔ حتیٰ کہ آپ کے غصہ اور خفگی کا بھی ذکر ہونا چاہئے۔ محبوب کی تو خفگی اور تیزی بھی محبوب ہوتی ہے کسی نے کہا ہے۔

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

دولت محبت

محبت وہ چیز ہے کہ واللہ العظیم اگر حضور کے غصہ اور عتاب کا بھی ذکر ہو تو مزے لے کر ذکر کریں۔ صحابہ کرامؓ نے اس راز کو سمجھا تھا اور محبت کی یہ دولت ان حضرات کو نصیب تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اکثر آزادی سے پوچھتے تھے اور ان کے مزاج میں تحقیق کا مادہ زیادہ تھا اور وہ ذرا آزاد تھے۔ لیکن یہ ان کا حال تھا ان پر اس سے ملامت بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ مولانا کہتے ہیں۔

گفتگوئے عاشقاں درکار رب جوشش عشقست نے ترک ادب
بے ادب ترنیست زوکس در جہاں باادب ترنیست زوکس در جہاں

عاشقین خدا تعالیٰ کا اس کی شان میں جوش اور غلبہ حال میں کوئی کلمہ منہ سے بظاہر خلاف شان نکال دینا بے ادبی نہیں ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ بے ادب کوئی نہیں باطنی طور پر اس سے زیادہ باادب کوئی نہیں۔ باادب تو اس لئے کہ جان و مال سے حاضر ہے اور بے ادب اس معنی کر کہ اس کے الفاظ ذرا

بے ٹھکانے ہوتے ہیں غرض حضرت ابوذر غفاریؓ ایک حدیث میں بار بار دریافت کر رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار میں فرمایا کہ وان رغم انف ابی ذر۔

یعنی تمہارا جی چاہے یا نہ چاہے مگر اسی طرح ہوگا۔ حدیث یہ تھی کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہہ لے گا وہ جنت میں داخل ہو جاوے گا اور حضرت ابوذر کو اس لئے تعجب ہوا کہ انہوں نے نفس ایمان لانے پر دخول اولی کو مرتب سمجھا۔ تو حضرت ابوذر غفاری کی یہ حالت تھی کہ جب کہیں اس حدیث کو ذکر کرتے تھے وہیں پیار میں آ کر مزے لینے کو یہ بھی کہتے تھے۔ وان رغم انف ابی ذر۔

حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید حج کو گئے انہوں نے فرمایا کہ جب مدینہ جاؤ تو روضہ اقدس پر میرا بھی سلام عرض کرنا۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ اپنے بدعتی پیر سے ہمارا بھی سلام کہنا۔ بدعتی اس لئے فرمایا کہ ان سے بعض باتیں بصورت بدعت صادر ہوتی تھیں اگرچہ واقع میں وہ بدعت نہ تھیں۔ یعنی کسی معذوری کی وجہ سے ان سے بعض افعال ظاہر سنت کے خلاف صادر ہو جاتے تھے تو یہ جب واپس آئے تو حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب نے پوچھا کہ ہمارا سلام بھی کہا تھا۔ انہوں نے عرض کر دیا کہ میں نے عرض کر دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے پیر سے ہمارا سلام کہہ دینا۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ وہی لفظ کہو جو وہاں سے ارشاد ہوا ہے مرید نے عرض کیا کہ حضرت جب آپ کو وہ لفظ معلوم ہے تو پھر میرے ہی کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ نیز میں وہ لفظ کیسے عرض کروں۔ آپ نے فرمایا کہ گو معلوم ہے مگر سننے میں اور ہی مزا ہے اور میاں تم خود تو نہیں کہتے وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تو گویا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان سے ادا ہوگا آخر انہوں نے وہی لفظ ادا کر دیا۔ بس ان کی یہ حالت ہوئی کہ وجد میں کھڑے ہو گئے اور بے ساختہ زبان پر یہ شعر جاری تھا کہ۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی　　جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(تو نے مجھے برا کہا مگر میں خوش ہوں تیرے لب لعل کے لئے جواب ہی اچھا ہے۔)

وجد کرتے تھے اور اس شعر کو پڑھتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ محبت وہ چیز ہے جس کے آثار کی نسبت میں نے پہلے کہا ہے کہ

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ　　ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

(اس لئے اگر حضور ناخوش بھی ہوتے تھے تو صحابہ کرام اس کا بھی ذکر لذت سے لے کر فرماتے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ　از محبت تلخہا شیریں شود　(محبت سے تلخیاں شیریں معلوم ہوتی ہیں)

تو اگر کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو تو کیا وہ ذکر مولد میں نماز و روزہ کے ذکر کو ناگوار سمجھے گا۔ ہرگز نہیں۔ صاحبو! حضور کا تو اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، حتیٰ کہ حوائج ضروریہ میں مشغول ہونا

سب عبادت ہے بلکہ ذکر ولادت سے بھی زیادہ برکت کی چیز ہے۔ یہ احکام اور افعال کا ذکر کرنا اس واسطے کہ حضور کی ولادت شریفہ تو محض ایک ہی حیثیت سے ایک نعمت عظیمہ ہے جس پر شکر کر کے ہم اپنے درجات بڑھالیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال واحکام دو حیثیتوں سے نعمت ہیں۔

ایک تو یہ کہ آپ کی بدولت یہ ہم کو ملے تو اس عطا پر شکر کریں اور اپنے درجات بڑھاویں۔

دوسرے اس حیثیت سے کہ ہم ان پر عمل کریں اور عمل کر کے قرب الٰہی حاصل کریں۔

نیز تمام شریعت سے غرض یہی ہے کہ ہم اس پر عمل کریں اور قرب خداوندی ہم کو حاصل ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام عمر میں اپنی ولادت شریف کا ذکر تو بہت ہی کم کیا اور احکام کا ذکر بہت زیادہ کیا۔ یعنی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تیئس سال تک تبلیغ احکام فرمائی ہے ان تیئس سال میں سے اگر وہ تین سال نکال دیئے جاویں جن میں وحی موخر رہی ہے۔ تو تمام مدت تبلیغ بیس سال ہوتے ہیں ان بیس سال میں تتبع کر کے دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ولادت شریفہ کا جتنے وقت میں ذکر فرمایا ہے اس کی مجموعی مدت غالباً ایک ہفتہ بھی نہ ہوگی۔ اور اگر ایک ہفتہ مان بھی لیا جاوے تو ذکر ولادت اور ذکر احکام میں یہ نسبت ہوگی کہ ایک ہفتہ کم بیس سال تک تو احکام کی تبلیغ فرمائی اور صرف ایک ہفتہ ولادت شریفہ کا ذکر فرمایا۔ تو کیا اتباع سنت کے یہی معنی ہیں کہ جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس برس تک ذکر فرمایا ہے اس کو تو بیس منٹ بھی کبھی ذکر نہ کیا جاوے اور جس کا ذکر تمام مدت تبلیغ میں چند مرتبہ ہی فرمایا ہے اس کو عمر بھر ذکر فرمایا جاوے۔

حقیقت قیاس مجلس

اتباع سنت تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مدت العمر میں جس قدر اپنی ولادت شریفہ کا ذکر فرمایا ہے اسی قدر تم بھی ذکر ولادت کرو اور جتنا احکام کا ذکر فرمایا ہے اسی قدر تم بھی احکام کا ذکر کرو۔ مگر بات یہ ہے کہ ذکر ولادت میں تو آسانی ہے کہ زبان سے ذکر کر لیا اور اس میں کھڑے ہو گئے اور اگر کسی متبع سنت نے اس میں احتیاط سے کام لیا تو اس پر ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دی کہیں اس کو وہابی کہنا شروع کر دیا کہیں تکفیر کر دی۔

میں کھڑے ہونے کو فی نفسہ منع نہیں کرتا لیکن یہ بھی تو سمجھو کہ اس کی حقیقت کیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک وجد ہے اور وجد ہوتا ہے واردات پر۔ تو بغیر کسی وارد کے وجد کی صورت بنانا نہایت درجہ تصنع ہے۔ محققین نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک شخص کے منہ سے باآواز بلند لفظ اللہ نکل گیا۔ آپ نے فرمایا کہ آہستہ کہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر اسی طرح کہا اللہ! آپ نے فرمایا کہ اس کو مجلس سے اٹھا دو کیونکہ آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شخص بدوں مغلوبیت کے کہہ رہا ہے۔

حضرت جنید کی مجلس میں ایک خوش آواز نے ایک شعر پڑھ دیا اس کو سن کر ایک صوفی کو وجد شروع ہوا لیکن جنید اسی طرح بیٹھے رہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت آپ کو وجد نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ

(اور تو پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے ان کو خیال کر رہا ہے کہ جنبش نہ کریں گے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑے اڑے پھریں گے)

کہ میاں! تم سمجھتے ہو کہ ہم کو حرکت نہیں ہوئی حالانکہ ہم خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ مگر وہ حرکت تم کو محسوس نہیں ہوئی اور یہ کیا ضرور ہے کہ اگر کوئی وارد ہو تو اس کو ظاہر ہی کر دیا جاوے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بار وعظ بیان فرمایا۔ بعضوں نے متاثر ہو کر کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اسی وقت وحی نازل ہوئی کہ ان سے فرما دیجئے کہ دلوں کو پھاڑو۔ کپڑے پھاڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ مگر اس سے سب کپڑے پھاڑنے والوں پر اعتراض مقصود نہیں۔ اس کا بھی ایک درجہ ہے۔ حضرت شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

مکن عیب درویش حیران و مست   کہ غرق است ازاں می زند پا و دست
بہ تسلیم سر در گریباں برند   چو طاقت نماند گریباں درند

(بزرگوں کی ظاہری برائی دیکھ کر حیران نہ ہو وہ محبت خداوندی کے عشق میں غرق ہونے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر گریباں میں منہ ڈالتے رہتے ہیں جب برداشت کی طاقت نہیں رہتی تو گریبان پھاڑتے ہیں۔)

کہ جب بالکل از خود رفتہ ہو جاتے ہیں تو کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں۔ اب یہ تھوڑا ہی جائز ہو گا کہ خواہ مخواہ کپڑے پھاڑنے شروع کر دے۔

جیسے کانپور میں ایک صاحب نے کسی کے مکان پر مولد پڑھا۔ آپ کے پاس کرتہ پرانا تھا۔ جی چاہا کہ نذرانہ کے ساتھ صاحب خانہ سے ایک کرتہ بھی وصول کریں۔ آپ نے بیان کرتے ہوئے ایک موقع پر پہنچ کر نہایت زور سے ایک وجدی حالت پیدا کی اور کرتہ پھاڑ ڈالا۔ آخر صاحب خانہ نے نذرانہ بھی دیا اور شرم کے مارے ایک نیا کرتہ بھی بنا دیا۔ اب بتلایئے کہ ہم اب بھی اگر منع نہ کریں تو کیا کریں۔

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است   اگر خاموش بنشینم گناہ است

(کسی نابینا کو دیکھتی آنکھوں کنویں میں گرتے دیکھنا اور اس کو نہ بچانا گناہ ہے۔)

ایسے ہی لوگوں کی حالت تباہی دیکھ کر ہماری زبان کھلتی ہے اور ہم کو مجبور ہو کر منع کرنا پڑتا ہے۔ بعض خیر خواہ کہتے ہیں کہ اس میں گفتگو کرنے سے عوام میں بدنامی ہوتی ہے مگر آخر کب تک بدنامی کے خوف سے خاموش رہیں گے خاموشی ہی کی بدولت تو یہ منکرات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اہل حق کا

ملامت و بدنامی کے باب میں یہ مذہب ہونا چاہئے کہ۔

ساقیاں برخیز و در دہ جام را　　　خاک برسر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اے ساقیا جام چھوڑ کر اٹھ جا اور گزرے ہوئے دنوں کی یاد دل سے نکال دے۔ ظاہری عقل والوں کے نزدیک ہماری یہ باتیں بدنامی کا سبب ہوتی ہیں لیکن ہم عزت وشہرت کے بھوکے نہیں رہے اور ظاہری بدنامی و نیک نامی کی پرواہ نہیں رہی۔)

حضرت بایزید بسطامی بدنامی سے نہ ڈرے منصور نہ ڈرے اور بضرورت غلبہ حال کیا کیا کہا مگر سب نے ان کے اقوال کی تاویل کی تو علماء جو بضرورت غلبہ اصلاح شریعت کے موافق کہتے ہیں۔ ان پر کیوں ملامت ہوتی ہے اور ان کے قول کو قبول کیوں نہیں کرتے۔

غرض ہم نفس قیام کو منع نہیں کرتے۔ مگر قیام حرکت وجدیہ ہے اور یہ وارد پر ہوتی ہے۔ تو اگر کوئی شخص وارد کے غلبہ سے مضطر ہو جاوے تو اس کو جائز ہے مگر یہ یاد رہے کہ وہ اضطرار کسی خاص مضمون کے ساتھ مخصوص نہ ہوگا۔

ابتداء اس کی اس طرح ہوئی کہ ایک شخص مضطر ہو کر کھڑا ہو گیا ہے اس کی حالت کی تائید میں اور اس حالت مستحسنہ کو باقی رکھنے کے واسطے حاضرین مجلس بھی کھڑے ہو گئے اور اس کو علامہ غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اگر ایک شخص وجد سے کھڑا ہو جاوے تو اس کے ساتھ سب کو کھڑا ہو جانا چاہئے کیونکہ اس میں اس کی تانیس اور اس کی حالت کا ابقاء ہے۔ علی ہذا حضرت شیخ گنگوہیؒ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو کوئی کیفیت ہو وہ کیفیت خدا تعالیٰ کی مہمان ہے۔ اس کی قدر کرو اور اس کی قدر میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس سے اس کا دل بجھ جاوے اور وہ کیفیت جاتی رہے۔ غرض صوفیہ نے اس کی کیفیت کو محفوظ رکھنے کے لئے ایسا کیا ہے۔ لیکن مجلس بھر میں اول جو شخص کھڑا ہوگا اس کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ مکر کرے۔

میں شاہجہان پور میں ایک صوفی سے ملا ہوں کہ وہ سماع سنتے تھے۔ مگر مکار و متصنع نہ تھے اور ان میں یہ بات نہایت غنیمت تھی کہ وہ مسائل کو علماء سے پوچھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ سماع سنتے تھے کہ مجلس میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر چٹکیاں بجانی شروع کر دیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اٹھا اور پھر چٹکیاں بجانی شروع کر دیں۔ انہوں نے پھر بٹھلا دیا۔ تیسری مرتبہ وہ پھر اٹھا' انہوں نے مجلس سے نکلوا دیا۔ غرض محققین صوفیہ اس کا بہت خیال کرتے تھے۔

غرض قیام کی ابتداء یوں ہوئی کہ اول کسی کو وجد ہوا پھر بلا وجد ہی اس کو رسم کر لیا۔ اور ہم اس رسم ہی کو منع کرتے ہیں حالت کو منع نہیں کرتے کیونکہ حالت تو غیر اختیاری ہے اس کو کیوں کر منع کیا جا سکتا ہے۔ شیخ شیرازی اسی کو کہتے ہیں۔

مکن عیب درویش حیران و مست　　　کہ غرق است ازاں می زند پاؤ دست

ایسے شخص پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں! مگر ایسے کتنے ہیں؟ آپ سو پچاس مولویوں کو دیکھئے تو وہاں ایک بھی ایسا نہ ملے گا اور اگر ہوں گے بھی تو بمشکل ایک دو، باقی سب خشک۔

بے بنیاد اعتقاد

میں توسع کر کے کہتا ہوں کہ اگر یہ فعل صرف رسم کے مرتبہ میں رہتا تب بھی خیر ممکن تھا کہ اس پر خاموشی کی جاتی۔ مگر اب تو یہ غضب ہے کہ اس سے اعتقاد بھی خراب ہونے لگا ہے۔ یعنی بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں حالانکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ اور اگر دلیل میں کسی کا کشف پیش کیا جاوے تو اول تو ممکن ہے کہ کشف صحیح نہ ہو۔ دوسرے اگر کشف صحیح بھی ہو تو اس کا خلاصہ یہ ہوگا کہ کسی مجلس خاص میں کسی صاحب کشف کو ایسا مکشوف ہو تو اس سے دوام پر کیوں کر استدلال ہو سکتا ہے اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جب ایسا ہوگا تو ایسا بھی ہوگا۔ یعنی جب مولد ہوگا تشریف آوری ضرور ہوگی۔ لزوم اور دوام کے لئے تو کسی مستقل دلیل کی ضرورت ہے (و اذ لیس فلیس) تو یہ اعتقاد بے بنیاد اور خلاف شریعت ہوا تو اس کی اصلاح واجب ہوئی۔

بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف تو نہیں لاتے لیکن اس ذکر کے وقت جو شخص قیام نہ کرے وہ بے ادب ہے لہذا قیام کرنا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے۔ صحابہ ارشاد فرماتے ہیں کہ۔

کنا لانقوم له لما کنا نعرف من کراهية له صلی الله علیه وسلم

تو کیا کوئی شخص ایسی جرات کر سکتا ہے کہ صحابہ کرام کو گستاخ کہے (نعوذ باللہ) جب خود مذکور کے قرب کے وقت ترک قیام بالاذن بے ادبی نہیں تو ذکر شریف کے وقت وہ خلاف ادب کیسے ہوگا۔ نیز اگر حضور کے ذکر مبارک پر قیام نہ کرنا ترک ادب ہے تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ جتنے متبعین قیام و مدعیان محبت ہیں سب کے سب بے ادب ہیں کیونکہ یہ لوگ صرف اسی مجلس خاص میں حضور کے ذکر پر قیام کرتے ہیں اور دوسرے مواقع پر جو آپ کا ذکر مبارک ہوتا ہے جیسے مثلاً اب میں ذکر کر رہا ہوں تو ان میں سے ایک بھی قیام نہیں کرتا۔ غرض لوگوں نے اس میں یہ غلو کر دیا ہے۔ اس لئے اس کی اصلاح ضروری ہے۔ یہ تحقیق تھی قیام کی۔ باقی ذکر ولادت شریفہ کی نسبت میں عرض کر چکا ہوں کہ جب ذکر ولادت شریفہ سے زیادہ ذکر احکام موجب برکت ہے تو ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ یہ سب ذکر رسول ہی ہیں۔

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست　　　یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

دنیا میں تیرے سوا کچھ نظر نہیں آتا یا تو خود ہے یا تیری عادت ہے یا تیری خوشبو ہے

ایک شاعر نے کہا ہے۔

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا　　نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

مگر اس میں ایک صاحب حال نے اصلاح دی ہے کہ

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا　　تری ہی سی رنگت تری ہی سی بو ہے

مصلح کا مطلب یہ ہے کہ شاعر تو نابینا تھا اس کو نظر نہ آیا حالانکہ وہاں ہر ایک سے تیرا ہی جلوہ نظر آ رہا ہے۔ اسی کو فارسی میں کہا ہے۔

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست　　یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(دنیا میں تیرے سوا کچھ نظر نہیں آتا یا تو خود ہے یا تیری عادت ہے یا تیری خوشبو ہے۔)

تو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو جیسا ذکر ولادت آپ کا ذکر ہے۔ ایسا ہی لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً (زنا کے پاس مت پھٹکو بے شک وہ بے حیائی کا کام ہے) بھی آپ کا ذکر ہے اور قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم مومنین سے فرما دیں کہ اپنی آنکھوں کو پست رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔) اور اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ بھی آپ ہی کا ذکر ہے۔

محبت اہل مولود

مگر بات یہ ہے کہ ایک جگہ تو کرنے کا کام ہے وہ نفس پر گراں گزرتا ہے اور دوسری جگہ کچھ کرنا پڑتا نہیں۔ اور چلتے وقت نذرانہ ملتا ہے اور بہت سا مٹھائی کا حصہ مل جاتا ہے۔ صاحبو! یہ محبت تو ایسی ہے جیسے سفر میں ایک شخص کی رفاقت تھی کہ اس کے رفیق نے کھانا تیار کرنے کی نسبت جب کسی کام کو کہا تو اس نے کوئی نہ کوئی عذر کر دیا۔ سب سے اخیر میں جب کھانا تیار ہو چکا تو اس کے ساتھی نے کہا کہ یہاں آؤ کھانا کھا لو۔ کہنے لگا کہ مجھے انکار کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب ہر بات میں انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے تم کہو گے کہ سخت نافرمان آدمی ہے کہ کسی بات کو بھی نہیں مانتا۔ لاؤ خیر کھانا تو کھا ہی لوں۔

بس جیسی یہ رفاقت تھی کہ مشقت میں عذر اور حظ نفس میں موافقت' ایسی ہی یہ محبت ہے کہ مشقت کی چیزوں کا ذکر نہیں اور جس میں نفس کی خوشی تھی اس میں سرخرو ہو گئے تو جناب اگر محبت رسول اس کا نام ہے تو ایسی محبت کو سلام ہے۔

محبت تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں کسی مقام پر تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک مکان قبہ دار گچ سے بنا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھ کر دریافت فرمایا کہ کس کا مکان ہے صحابہ نے عرض کیا کہ فلاں شخص کا ہے۔ آپ سن کر خاموش ہو رہے۔ دوسرے وقت جب اس گھر

ے مالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری طرف رخ پھیر لیا۔ وہ دوسری طرف حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا آپ نے ادھر سے بھی رخ پھیر لیا۔ آخر انہوں نے دوسرے صحابہ سے دریافت کیا کہ آج کیا بات ہوئی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اور تو کچھ ہم کو معلوم نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے مکان کو دیکھا تھا۔ اس وقت سے خاموش ہیں۔ گویا صحابہ کا گمان ہی تھا مگر ان بزرگ عاشق نے صرف گمان ہی پر اتنا سنتے ہی فوراً جا کر تمام مکان کو گروا دیا۔ گویا بزبان حال یہ کہتے تھے کہ

بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا
بہر چہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں

(یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کوئی چیز ہو۔)

اور یہ کہتے تھے کہ

ہر چہ جز ذکر خدائے احسن است
گر شکر خواری است آں جاں کندن است

خدا تعالیٰ کے ذکر کے سوا خواہ وہ شکر ہی کیوں نہ ہو موت کے برابر ہے۔

اور عجیب تر لطف اس محبت کا یہ دیکھئے کہ اس کو گرا کر جتلایا تک نہیں۔ اور کیوں جتلائیں اگر مکان گرا دیا تو آپ پر کیا احسان کیا۔ آخر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ خود ہی اس طرف تشریف لے گئے اور وہاں مکان نہیں پایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ وہ مکان کیا ہوا؟ اور صحابہ نے عرض کیا کہ حضور فلاں شخص نے اسی روز اس کو گروا دیا تھا۔ تب آپ کو خبر ہوئی اور اس وقت آپ نے تعمیر کے تکلفات کی مذمت بیان فرمائی۔ حضرت محبت تو یہ ہے کہ انسان اپنے مال اور جان سب کو فدا کر دے نہ یہ کہ خالی مزے دار حکایات بیان کرے اور بس۔

رسمی محبت کے آثار

اب ربیع الاول کا مہینہ ہے اس میں بہت جگہ مولود ہوا ہوگا۔ ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ تم نے اپنے حظ کو محفوظ رکھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام پر جو اس وقت سخت مصیبت آ رہی ہے اور ڈانواں ڈول ہو رہا ہے اس کی تم نے کیا مدد کی۔ اس کو کیا سہارا پہنچایا۔ افسوس ہے کہ امسال بجائے اس مہم امداد اسلام کے بعض مقامات پر محض عید میلاد النبی کے منانے کو مٹھائی کے واسطے چھ سو روپے کا چندہ ہوا۔ ایک وہ مسلمان ہیں کہ اسلام کی خدمت کے لئے اپنی گردنیں کٹا رہے ہیں اور ایک یہ ہیں کہ ان کو مٹھائی کھانے کی سوجھ رہی ہے۔ ہماری وہ حالت ہے کہ

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانی کہ شمشیر بلا بر سر خورند

تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم ان لوگوں کی حالت کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر مصیبت کی تلوار چل رہی ہے۔

اس بے حسی اور بے تمیزی کی حالت کو دیکھ کر کسی نے پریشان ہو کر کہہ دیا ہے کہ۔

اے بسرا پردہ یثرب بخواب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(اے مدینہ منورہ میں آرام فرمانے والے اٹھیے کہ مشرق و مغرب خراب ہوتا چلا جارہا ہے)

پھر غضب یہ ہے کہ اس چھ سو روپے کو مٹھائی میں بھی صرف نہیں کیا بلکہ اس سے اس مسجد کو سجایا گیا جس میں بیان تھا اور سجایا بھی ہندوؤں کے طرز پر۔ اس میں ایک چھتر بنایا گیا۔ جھالر لٹکائے گئے۔ بہر حال اس مسجد کو ایسا بنایا گیا جیسے معلوم ہو کہ کسی ہندو نے اپنے گھر کو سجایا ہے۔ کیا اس کو محبت کہیں گے؟ ہاں محبت تو ہے مگر اپنے ہی نفس کی۔ ان سے قسم دے کر پوچھا جاوے کہ اگر اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوتے اور آپ سے دریافت کیا جاتا کہ یہ چھ سو روپیہ ہم مٹھائی میں صرف کر دیں یا آپ کے جانبازوں پر لگا دیں تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ رائے دیتے کہ مٹھائی میں صرف کر دو۔ صاحب! کیا کسی دردمند کو ایسے وقت میں مٹھائی کا کھانا بھلا معلوم ہو سکتا ہے؟ ہائے کس منہ سے ایسی حالت میں بھی لوگوں سے مٹھائی کھائی جاتی ہوگی۔ کیسی بے حسی ہے کتنا بڑا ظلم ہے اور پھر غضب یہ ہے کہ یہ لوگ دعویٰ محبت کرتے ہیں۔ کیوں صاحب! آپ نے تو مولود شریف کیا اور ترکوں نے اپنی جان لڑائی تو کون شخص محب رسول ہوا۔ آپ نے ساری محبت کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ سال بھر میں ایک دفعہ مولود کر لیا۔ صاحبو! ہمارے جی کو تو یہ محبت نہیں لگتی بلکہ واقع میں ان کے جی کو بھی نہیں لگتی مگر رسم اور اہل حق کی ضد نے مجبور کر رکھا ہے۔

حتیٰ کہ ایک صاحب نے ایک اہل حق کی نسبت یہ کہا تھا کہ میں ان کا اس قدر مخالف ہوں کہ اگر یہ کسی چیز کو حلال کہیں گے تو میں اس کو حرام کہوں گا اور بالعکس۔ ان اہل حق نے جواب میں کہا کہ میں تو ماں سے نکاح کرنے کو حرام کہتا ہوں۔ اب آپ اس کو حلال کہئے۔ اور میں تو کلمہ شہادت کو حلال کہتا ہوں آپ حرام کہئے۔ وہ مدعی صاحب تو دم بخود رہ گئے۔ مگر چند روز کے بعد ان کے ایک شاگرد صاحب پیدا ہوئے کہ میرے استاد کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھے تھے ان کا مطلب یہ تھا کہ اپنی طرف سے جس کو حلال یا حرام کہیں گے۔ سبحان اللہ! کون مسلمان ہے کہ وہ اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال یا حرام کہہ دے گا۔

علیٰ ہٰذا ایک اور قصہ ضد کا مجھے یاد آیا کہ دہلی میں ایک شخص نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی بھی دعوت کی اور بعض ان کے مخالفین کی بھی اور ہر کو دوسرے کی خبر نہیں ہونے دی۔ جب سب جمع ہو گئے اور کھانا سامنے آیا تو میزبان نے کہا کہ صاحب یہ شیخ سدو کا بکرا میں نے پکایا ہے۔ اب جس کا جی چاہے کھاؤ اور جس کا جی نہ چاہے نہ کھاؤ۔ شاہ اسحاق صاحب تو شیخ سدو کے بکرے کو حرام فرماتے تھے انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور ان کے ساتھ ان کے مخالفین نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ صاحب خانہ نے ان سے پوچھا کہ آپ تو اس کو جائز کہتے ہیں آپ نے کیوں ہاتھ روکا۔ کہنے لگے کہ بھائی ہے تو حرام ہی مگر ان کی ضد میں اس کو حلال کہہ دیتے ہیں لیکن یہ بھی اسی زمانہ کے لوگ تھے۔ آج تو ہرگز بھی اس کا اقرار نہ کریں گے بلکہ حرام بھی کھا جائیں گے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ ان کو ضد نہیں ہے مگر وہ اس لئے مولود کرتے ہیں کہ سال بھر تک برکت رہے گی۔ رشوت لیں گے تو اس کا وبال نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ رنڈیاں تک مولود کراتی ہیں جن کو کچھ بھی مناسبت دینی اعمال سے نہیں ہے اور بعض لوگ محض اس لئے مولود کراتے ہیں کہ اس کی بدولت کسی تقریب میں رونق ہو جاوے گی۔

چنانچہ کانپور میں ایک صاحب نے اپنے لڑکے کی شادی کی اور اس میں ناچ کرانا چاہا لیکن چونکہ بعض احباب ان کے ایسے بھی تھے کہ وہ ناچ میں شریک ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ اس ضرورت سے رونق مجلس پوری کرنے کو انہوں نے مولود بھی کرایا۔ چنانچہ پہلے مولود ہوا اور اگلے دن اسی جگہ رنڈی کا ناچ ہوا۔ اب بتلائیے کہ جب یہاں تک نوبت پہنچ جائے تو کیونکر خاموشی اختیار کی جا سکتی ہے۔

غرض محبت کی علامت میں نے بتلا دی کہ محبوب کی ہر بات کا ذکر ہو ولادت شریفہ کا بھی آپ کی سخاوت کا، عادات کا، عبادات کا اور اس میں نہ کسی مہینہ کی کچھ تخصیص ہے۔ نہ کسی مقام کی۔ پس میں بھی اس وقت ربیع الاول کی تخصیص سے یہ ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ گو اگر یہ تخصیص رسم لازم کے درجہ میں نہ پہنچتی تو اس تخصیص عملی کا بھی مضائقہ نہیں تھا لیکن اب تو اس عارض لزوم علمی یا عملی کی وجہ سے اس کو اصلاً پسند نہیں کرتا یعنی ایسے شخص کے لئے بھی پسند نہیں کرتا جو معتقد لزوم کا نہ ہو کیونکہ یہ خود اس کے لئے یا کسی دوسرے کے لئے اس لزوم تک مفضی ہو جاوے گا اور اس ناپسندیدگی اور ممانعت کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی طبیب مریض کو دو تولہ مصری کی بھی اجازت اس اندیشہ سے نہیں دیتا کہ مبادا یہ بجائے دو تولہ کے چار تولہ استعمال کرے اور پھر تکلیف اٹھائے۔

غرض ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ بلا تخصیص لازم اس ماہ میں بھی جائز ہے لیکن اجازت نہ دی جائے گی کیونکہ مطلقاً اجازت دینے سے آئندہ پھر اعتقاد کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ بس یہ ہمارا مسلک ہے۔ اب اس کے سن لینے کے بعد ہم پر جس کا جو جی چاہے تہمت لگائے۔

طاعون کا روحانی علاج

غرض اس وقت ذکر کی یہ وجہ نہیں ہے کہ تخصیص زمانہ کی مقصود ہے بلکہ دو وجہ ہیں۔ ایک[1] یہ کہ اس وقت مختلف اطراف سے طاعون کی خبریں آ رہی ہیں۔ طاعون کا ایک متبرک علاج منجملہ اور علاجوں کے ذکر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بھی ہے اور یہ علاج تجربہ میں آیا ہے۔ یعنی میں نے ایک کتاب ''نشر الطیب'' لکھی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں۔ اس کے لکھنے کے زمانہ میں خود اس

---

[1] ایک دوسری وجہ وعظ میں یاد نہ رہی تھی گو وعظ میں اس کا بیان آ گیا تھا مگر اس عنوان سے نہ آیا تھا کہ دوسری وجہ یہ ہے مگر بعد وعظ کے اثنائے مضمون میں خطوط وحدانیہ میں اسی کا اضافہ جامع سے کرا دیا گیا۔ چنانچہ عنقریب وہ مقام ملے گا۔

قصبہ میں طاعون تھا۔ تو میں نے یہ تجربہ کیا کہ جس روز اس کا کچھ حصہ لکھا جاتا تھا اس روز کوئی حادثہ نہیں سنا جاتا تھا اور جس روز ناغہ ہو جاتا تھا۔ اس روز دو چار اموات سننے میں آتی تھیں۔ ابتداء میں تو میں نے اس کو اتفاق پر محمول کیا۔ لیکن جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو مجھے خیال ہوا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کی برکت ہے آخر میں نے یہ التزام کیا کہ روزانہ کچھ حصہ اس کا ضرور لکھ لیتا تھا۔

آج کل بھی لوگوں نے مجھے طاعون ہونے کے متعلق اطراف و جوانب سے لکھا ہے تو میں نے ان کو بھی جواب میں یہی لکھا ہے کہ ”نشر الطیب“ پڑھا کرو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجلس منعقد کی جائے اور اس میں مٹھائی منگوائی جاوے۔ اور ایک شخص بیٹھ کر پڑھے اور سب سنیں۔ کیونکہ ان التزامات میں تو علاوہ اور مذکورہ خرابیوں کے ایک یہ بھی ہوگی کہ کبھی ہوگا کبھی نہ ہوگا کیونکہ اس قدر التزامات کے ساتھ دوام مشکل ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دوسرے وظائف کی طرح سے روزمرہ اس کا بھی وظیفہ مقرر کر لیا جاوے۔ یہ نہیں کہ سال بھر میں ایک دو دفعہ مقرر تاریخوں پر کر لیا اہل محرم کی طرح اور پھر سال بھر کروٹ بھی نہ لی۔

مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شاعر حلب میں پہنچا۔ وہاں شہر کے شیعہ ماتم کر رہے تھے اس نے پوچھا کہ آج کوئی مر گیا ہے۔ لوگوں نے کہا تو دیوانہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے تو شیعی نہیں۔ ارے یہ دن شہادت امام کا ہے۔ کہنے لگا ’اللہ اکبر‘ یہاں آج اتنے دنوں کے بعد خبر پہنچی ہے یا تم لوگ سوتے تھے اسی طرح ہمارے ان مدعیان محبت رسول کی بھی یہی حالت ہے کہ سال بھر تک غافل رہتے ہیں پھر چونکتے ہیں۔

مذاق کی خرابی

میں تو کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہر وقت کرو اور ایسی کتاب اپنے وظائف کے ساتھ رکھو مگر مولود غلام امام شہید یا اور غیر معتبر کتاب نہیں۔ اس قسم کی کتابیں تو بالکل بے سروپا ہیں۔ اور بعض میں اشعار ایسے خرافات بھرے ہیں کہ نعت کے اشعار میں بعض مضامین کفر تک پہنچ گئے۔ نیز اس کے پڑھنے والے بھی میں نے دیکھے ہیں کہ امرد پرست‘ تارک صلوٰۃ وصوم‘ آج کل کچھ ایسا مذاق بگڑ گیا ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے امور کی ذرا حس نہیں رہی۔

میں ایک جگہ بیان کرنے کے لئے گیا۔ اس روز مجھے اتفاق سے زکام ہو رہا تھا۔ بیان سننے کے بعد ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ خوش الحان نہیں ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ بھائی میں ڈوم کا لڑکا نہیں ہوں کہ مجھ کو خوش الحانی اور بدالحانی سے کیا واسطہ؟

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے ابتداء زمانہ میں اجمیر میں تشریف رکھتے تھے وہاں ایک شخص شریف سید فن موسیقی میں کامل تھے مولانا کو چونکہ ہر فن کی تحصیل کا شوق تھا اس لئے مولانا نے چندے ان سے اس فن کے اصول کو سیکھا تھا۔ لیکن اللہ والے اگر کوئی معمولی نفع بھی کسی سے

حاصل کرتے ہیں' تو اس دوسرے کو بھی دینی نفع پہنچاتے ہیں۔

اس پر مجھے ایک اور حکایت مسموعی یاد آئی۔ حضرت سلطان نظام الدین کی کہ آپ بیمار ہو گئے تھے حتیٰ کہ خدام کو بالکل مایوسی ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں دہلی میں ایک شخص رہتا تھا کافر کہ وہ توجہ سے مرض کو سلب کر دیتا تھا۔ خدام نے آپ سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو اس کو بلا لیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ اس میں سخت فتنہ ہوگا اور میرا کیا ہے۔ زندہ رہا رہا نہ رہا نہ رہا۔ اس کے بعد آپ کو پھر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اسی حالت بے ہوشی میں خدام آپ کو اس کے گھر لے گئے۔ اس کے لئے تو حضرت کا تشریف لے جانا موجب فخر ہو گیا۔ فوراً اس نے توجہ کی اور حضرت کا تمام مرض سلب کر دیا۔ اسی وقت حضرت کو افاقہ ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ میں ایک ملحد کے مکان میں ہوں اور مرض بالکل زائل ہو گیا ہے آپ سمجھ گئے اور خیال ہوا کہ

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ

(یعنی احسان کا بدلہ سوائے احسان کے اور کیا ہے؟)

اس کو بھی اس نفع کا صلہ دینا چاہئے۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ میاں یہ کمال تم میں کس بات سے پیدا ہوا۔ اس نے کہا کہ صرف ایک بات ہے۔ وہ یہ کہ میرے گرو نے کہہ دیا تھا کہ جس بات کو جی چاہے وہ نہ کرنا۔ بس میں یہی مجاہدہ کرتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ سچ کہنا کیا مسلمان ہونے کو جی چاہتا ہے کہنے لگا کہ نہیں۔ فرمایا کہ پھر اسی قاعدے کے موافق ہو جانا چاہئے کچھ تو حضرت کی توجہ کچھ اس تعلیم کا خیال' وہ ایسا مغلوب ہوا کہ کچھ بن نہ پڑا اور مسلمان ہو گیا اور حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہو کر ساتھ ساتھ ہو لیا' غرض اللہ کے بندے ہر جگہ فیض ہی پہنچاتے ہیں۔

اسی طرح مولانا محمد یعقوب صاحب نے ان سے سیکھا تو ہوگا ہفتہ دو ہفتہ ہی تک مگر اس کا یہ اثر ہوا کہ چند روز کے بعد ان کی ہدایت کا سامان پیدا ہوا۔ اس طرح سے کہ ان کے پاس ایک شخص آیا کہ وہ بھی اس فن میں ماہر تھا۔ اس نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ انہوں نے سنایا۔ جب سنا چکے تو وہ کہنے لگا کہ سبحان اللہ! کیا گلا پایا ہے۔ یہ جملہ سن کر ان کو سخت غصہ آیا اور کہا کہ افسوس! اتنی محنت کا یہ صلہ ملا کہ میری وہ تعریف کی گئی جو ایک ڈوم کی ہو سکتی ہے اور عہد کر لیا کہ اس کے بعد پھر کبھی اس مہمل کام کے پاس بھی نہ جاؤں گا' پس مولانا کی برکت سے تائب ہو گئے اور اخیر راگ یہ دین کا رہا۔

تو آج کل لوگ خوش الحانی' کو تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ میرے بیان میں یہ عیب نکالا کہ خوش الحان نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بھائی انسان تو ہوں آواز منہ سے نکلتی ہے دوسرے کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے جو مضامین کی تبلیغ میں کافی ہے۔ میں خوش الحانی و بدالحانی کو کیا جانوں اور میں تو اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آواز کے درست کرنے کے لئے گلے پر حلوے باندھے جاویں جیسا کہ آج کل بعض قراء کا معمول ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ حدیث میں آیا ہے کہ قرآن خوش آوازی سے پڑھو۔ اس لیے حلوا باندھتے ہیں تو جناب جہاں حدیث پڑھی ہے اس کی تفسیر بھی تو پڑھی ہوتی۔ اسی حدیث میں راوی کہتے ہیں کہ خوش آوازی یہ ہے کہ پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہو کہ اس کے دل میں خدا کا خوف بھرا ہوا ہے۔ اور اگر بلغم کا صاف کرنا مقصود ہے تو میں اس کا ایک دوسرا طریق بتلاتا ہوں اس طریق سے صاف کرو۔

نسخہ عشق

عشق خدا پیدا کرو۔ بلغم اور سب رطوبات خود خاکستر ہو جاویں گی۔ خوب فرمایا ہے۔

عشق آں شعلہ است کہ چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ بماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہو جاتا ہے سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے۔ لا الٰہ کی تلوار اپنی غرض فاسد پر چلا۔۔۔ اس کے بعد دیکھ نتیجہ کیا رہا الا اللہ باقی رہ گیا باقی سب فنا ہو گیا

مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

باقی اگر کوئی کہے کہ یہ تو ایک شاعرانہ نکتہ ہے اس کو بلغم سے کیا واسطہ تو سمجھو کہ یہ سب رطوبتیں ہیں اور محبت کی آگ میں زاید رطوبت ہی نہ رہے گی۔ آپ نے کبھی کسی عاشق کو موٹا نہ دیکھا ہو گا لیکن یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی عاشق قدرتی موٹا نہ ہو گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ کھا کھا کر بے فکری سے جو انسان پھول جاتا ہے وہ بات اس میں نہ ہو گی کیونکہ وہاں تو ہر وقت سوختن و گداختن ہے۔ تو اس نسخہ سے ویسے ہی گلا صاف رہے گا۔

ایسے موٹے ہونے کی نسبت حدیث شریف میں ہے۔ **ان اللہ یبغض الحبر السمین.**

(إتحاف السادة المتقين للزبيدى ۷:۳۸۸، الكاف الشاف فى تخريج أحاديث الكشاف: ۶۲، اسباب النزول للواحدى: ۱۳۷، ۱۶۷).

(یعنی اللہ تعالیٰ کو موٹے عالم سے نفرت ہے مگر وہی بے فکری کا پھولا ہوا ہو نہ وہ جو طبعی و فطری ایسا ہو۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ میں اپنے لڑکپن میں شہر میرٹھ میں ایک مسجد میں بیٹھا ہوا وضو کر رہا تھا اور میرے قریب ہی ایک اور مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ذرا موٹے تھے۔ وہاں ایک شخص رجب علی تھے۔ وہ ان مولوی صاحب سے اکثر مزاح کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہ بھی آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم اس قدر دبلے کیوں ہو رہے ہو؟ میں نے ظریفانہ کہا کہ بھائی حدیث میں ہے کہ **ان اللہ یبغض الحبر السمین.** (بے شک اللہ تعالیٰ موٹے عالم سے بغض رکھتے ہیں)

اس واسطے میں دبلا ہوں۔ اور مجھ کو خیال نہ رہا کہ یہاں مولوی صاحب موٹے بیٹھے ہیں۔ رجب علی ان مولوی صاحب کی طرف منہ کر کے کہتے ہیں کہ مولوی صاحب آپ سنتے ہیں۔ اس وقت مجھے تنبہ ہوا کہ یہ بھی بیٹھے ہیں تو میں بہت شرمندہ ہوا اور میں نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ جو کھا کھا کر بے فکری میں موٹا ہو۔ کہنے لگے کہ جناب اب آپ جو مطلب چاہیں بیان کریں باقی حدیث مولوی صاحب پر صادق آ ہی گئی۔

خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے مگر مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو بے فکر کھا کھا کر موٹا ہو۔ غرض نسخہ عشق سے بلغم میں زیادتی ہی نہ ہوگی۔ پھر یہ کہ حلوہ گلے کے اندر جانے کے لئے بنا ہے نہ کہ گلے کے اوپر باندھنے کے لئے۔ ہاں اگر کوئی ایسا کرے کہ باندھ کر پھر کھا بھی لے تو دوسری بات ہے لیکن اس کو کون کرے گا۔ اگرچہ میں نے بعض ایسے لطیف المزاج لوگوں کی حکایت بھی سنی ہے کہ انہوں نے پان منہ سے نکال کر رکھ دیا اور کھانا کھا کر پھر اس کو کھا لیا۔ تو خوش الحانی کے وہ معنی نہیں ہیں جو حلوہ باندھنے سے حاصل ہو بلکہ اس کے وہ معنی ہیں کہ جو اوپر مذکور ہوئے کہ اگر کوئی اس کو پڑھتے ہوئے سنے تو یوں سمجھے کہ خوف خدا سے اس کا قلب لبریز ہے مگر لوگ آج کل خوش الحانوں کو ڈھونڈتے ہیں چنانچہ پڑھنے والے اپنے ساتھ خوش آوازوں کو رکھتے ہیں اکثر تین تین چار چار مرد اور جوان لڑکے رہتے ہیں کہ وہ گلے ملا ملا کر گاتے ہیں۔ سو ان رسوم کو تو چھوڑو۔

طریق ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک تو غذا ہے اس میں کسی وقت کی تخصیص کی کیا ضرورت ہے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی کتابیں لے کر جن میں صحیح حالات ہوں اگرچہ ان میں ایک شعر بھی نہ ہو۔ اس کو روزانہ پڑھا کرو۔ اس لئے میرا بہت روز سے جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی صحیح معتبر کتاب لکھ دوں۔ چنانچہ بحمد اللہ وہ کتاب تیار ہو گئی۔ (نشر الطیب) اور میں نے اس کتاب میں اس کی بھی رعایت کی ہے کہ اس میں غذا کے ساتھ تفریح کا سامان بھی رکھا ہے۔ یعنی میں نے اس میں اشعار بھی لکھے ہیں اور بہت کثرت سے ہیں۔ یعنی کتاب میں اکتالیس فصلیں ہیں۔ ہر فصل کے اخیر میں اشعار لکھے ہیں اور نہایت لذیذ اشعار عربی کے ہیں اور ان کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ لکھ دیا ہے' تو جس کا جی چاہے اس کتاب کو اپنے پاس رکھے کہ یہ ان شاء اللہ اس کے لئے بہت مفید ہوگی مگر اس کو مجلسوں میں ان رسوم کے ساتھ نہ پڑھا جاوے بلکہ بطور وظیفہ کے قرآن شریف کے بعد پڑھ لیا جاوے۔ جیسا میں نے اوپر مجنوں کی حالت ذکر کی ہے۔

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم　　خاطر خود را تسلی می کنم

مجنوں کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے دل بہلا رہا ہوں۔

تو مجنوں نے کہا لیلیٰ کی سالگرہ کی تھی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے لئے قیود کیسے؟ وہ تو ہر وقت کا وظیفہ ہونا چاہئے۔

میں نے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ کو دیکھا ہے کہ ہر وقت درود شریف کا ورد رہتا تھا اور ہر بات بہت ہی کم کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ جو لوگ سال بھر میں صرف ایک مرتبہ یاد کریں وہ تو محب ہوں اور جو ہر وقت سرشار رہے اس کو منکر سمجھا جاوے کیسا غضب ہے۔ صاحبو! کہاں گیا انصاف اور تدین! یہ چاہتے ہیں کہ ذکر بھی اگر ہو تو دوسروں کو دکھلا کر ہو۔ بھائی محبت میں دکھلانے کی کیا ضرورت ہے! اپنی اولاد کے لئے انسان محبت سے کیا کچھ نہیں کرتا۔ مگر کیا کسی کو دکھلاتا پھرتا ہے۔

غرض یہ معمول کرلو کہ اس کتاب کے دو چار ورق روز پڑھ لیا کرو یا اگر خود پڑھنا نہ آتا ہو تو کسی سے سن لیا کرو اور گھر میں روزانہ پڑھ کر سنایا کرو اور عمر بھر اسی طرح معمول رکھو۔ دیکھیں تو کون منع کرتا ہے۔ تم تو اپنے ہاتھوں منع کراتے ہو۔ صاحبو! یہ تو ذکر مستحب ہے (گو عشاق کے نزدیک فرض عشقی ہے مگر فتویٰ کی رو سے تو مستحب ہی ہے) نماز بھی جو کہ فرض ہے از روئے فتویٰ بے ڈھنگے پن سے پڑھی جاوے تو اس سے بھی منع کیا جاوے گا۔ اور مشروع طور پر ذکر کرنا خود قرآن سے ثابت ہے۔ دیکھو اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف ہے اور میں نے اسی لئے اس وقت اس آیت کو پڑھا ہے کہ اس سے آپ کے ذکر کو بھی ثابت کردوں اور اس کا طریق اور آداب بھی بتلادوں۔ پس آپ اس ذکر شریف کے برکات حاصل کیجئے۔ ان برکات میں سے ایک برکت دفع طاعون بھی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(اور بعد وعظ کے فرمایا کہ اس آیت کے اختیار کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی جس کو وعظ میں بیان کرنا یاد نہیں رہا کہ آپ کے ذکر ولادت کے متعلق لوگوں میں آج کل بہت سے منکرات اور اختراعات شائع ہو گئے ہیں جن سے عملاً و اعتقاداً لوگوں کی حالت خراب ہو گئی اور ان منکرات کا ارتکاب اس مہینہ میں اکثر کیا جاتا ہے۔ اس لئے بھی اس وقت یہ مضمون اختیار کیا گیا کہ یہ بتلا دیا جاوے کہ شریعت میں ان کا کہیں ثبوت نہیں ہے۔)

غرض اس آیت سے ذکر شریف بھی ثابت ہوا اور آداب پر بھی تنبیہ موجود ہے کیونکہ اسی آیت میں آگے ارشاد ہے۔ **لیهدیهم الیٰ صراط مستقیم**

سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔)

بعثت کی غرض

سو اصل غرض آپ کی بعثت سے یہ ہے کہ ہدایت ہو صراط مستقیم کی تو جو امر صراط مستقیم کے خلاف ہو گا وہ اس مقصود کے منافی اور قابل ترک ہوگا۔ اور ان ہی امور غیر مستقیمہ سے ایک تخصیص لازم بھی ہے۔ پس بنا اس وقت کے ذکر کی تخصیص ربیع الاول کی نہیں ہے جیسا اوپر بھی عرض کر چکا ہوں۔ اور اس عدم تخصیص سے ربیع الاول کی فضیلت کا انکار نہ سمجھا جاوے کیونکہ فضیلت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس زمانہ فاضل کو بلا دلیل شرعی جن عبادات کے لئے چاہے خاص کر لیا جاوے۔ پس ربیع الاول میں فضیلت ہو مگر اس کی تخصیص ذکر نبویؐ کے لئے ثابت نہیں جیسے جمعہ کے روزہ کی تخصیص کی ممانعت حدیث میں آئی ہے باوجود یہ کہ اس کے فضائل بھی وارد ہیں۔ چنانچہ حدیث میں اس کی فضیلت میں آیا ہے۔

فیه ولد ادم و فیه ادخل الجنة و فیه هبط الی الارض (المسند للإمام احمد بن حنبل ۲: ۱۰۳.)

اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ اسی دن جنت میں داخل ہوئے اسی دن زمین کی طرف بھیجے گئے۔

اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہبوط الی الارض میں کونسی نعمت ہے جو اس کو دلائل فضیلت میں ذکر فرمایا۔ یہ تو بظاہر نہایت درجہ تکلیف ہے تو اس شبہ کا جواب عارفین سے پوچھئے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ بھائی اگر حضرت آدم جنت سے نہ نکلتے تو ان کی اولاد میں سے کوئی نکلتا کیونکہ جو ممانعت ان کو ہوئی تھی چونکہ وہ شجرہ قابل نہی کے تھا وہی ممانعت ان کی اولاد کو بھی ہوتی اور یہ ظاہر ہے کہ اس ممانعت کے خلاف بھی بہت لوگ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ نکالے جاتے۔ اور اخراج ایسی حالت میں ہوتا کہ جنت خوب آباد ہوتی۔ وہاں اس کے ماں باپ' بھائی' بیٹے' بیوی سبھی ہوتے اور ان سب سے علیحدہ کر کے اس کو دنیا میں بھیجا جاتا تو جنت میں ایک کہرام مچ جاتا۔ تو وہ جنت مثل دوزخ کے ہو جاتی۔ اس لئے اللہ میاں نے وہاں سے سب کو رخصت فرما دیا۔ یہ مصلحت تو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے حق میں ہے کہ جنت میں تکلیف ہونے سے سخت تکلیف ہوتی۔

نعمت معرفت

باقی خود حضرت آدم علیہ السلام کے حق میں جو حکمت تھی اس کو حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ عارفوں کے لئے بڑی نعمت معرفت ہے اور معرفت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمی اور ایک عینی۔ معرفت علمی تو یہ ہے کہ صفات کمال اور اس کے کمال کا علم ہو جاوے۔ اور معرفت عینی یہ ہے کہ اس صفت کے اثر کا مشاہدہ ہو جاوے۔ تو اس وقت آدم علیہ السلام کو معرفت علمی تو حاصل تھی لیکن۔ معرفت

یعنی بعض صفات کی حاصل نہ تھی۔ جیسے کہ منعم کو اس صفت کا اس وقت مشاہدہ ہو رہا تھا لیکن ان صفات کا مشاہدہ اس وقت نہ تھا مثلاً تواب کہ اس صفت کی معرفت علمی تو حاصل تھی۔ باقی معرفت عینی حاصل نہ تھی اور معرفت عینی افضل ہے معرفت علمی سے۔ تو جنت سے علیحدہ کر کے خداتعالیٰ کو حضرت آدم علیہ السلام کی تکمیل عرفان کی مقصود تھی۔ پس یہ اخراج حقیقت میں عقوبت نہ تھی تکمیل تھی۔

بعض قرائن سے آدم علیہ السلام کو اس کا کچھ پتہ بھی چل گیا تھا۔ چنانچہ ایک حدیث ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی ناک میں روح داخل ہوئی تو آپ کو چھینک آئی۔ ارشاد ہوا کہ کہو الحمد للہ۔ اور فرشتوں کو حکم ہوا کہ کہو یرحمک اللہ۔ تو بعض روایات میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام روئے اور کہا کہ دعائے رحمت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی لغزش ضرور ہوگی اور توبہ کے بعد رحمت ہوگی۔

اس کمال معرفت کی مصلحت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے اتنا بخار چڑھتا تھا جتنا دو آدمیوں کو چڑھتا تھا کیونکہ جس اسم کا یہ مظہر ہے اس کی معرفت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علی وجہ الکمال عطا فرمائی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے آنا بھی نعمت ہے پس یہ بھی وجوہ فضائل جمعہ سے ہوا تو دیکھیے جمعہ کے بارہ میں باوجود یہ کہ یہ فضائل خود حدیث سے ثابت ہیں لیکن اس دن میں تخصیص صوم کی ممانعت ہے۔

فضائل ربیع الاول

ربیع الاول کے فضائل تو منصوص بھی نہیں تو اس میں تخصیص ذکر کی اجازت کیسے ہوگی۔ مگر پھر مکرر کہتے ہیں کہ باوجود اس منع تخصیص کے اس ماہ کی فضیلت کے ہم منکر نہیں ہیں فضیلت اس میں ضرور ہے۔ اگر اس میں فضیلت نہ ہوتی تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کیوں کئے جاتے۔ جیسے جمعہ میں حضرت آدم کے تین واقعہ ہیں ایسے ہی یہاں بھی تین واقعے ہیں۔

ایک ولادت شریفہ کہ بالاتفاق اسی ماہ میں ہے۔ مشابہ ولادت آدم علیہ السلام کے۔ دوسری بعثت بعض روایات پر مشابہ دخول جنت آدم علیہ السلام کے ہے۔

تیسری وفات شریف کہ ماہ اور یوم تو علی الاتفاق عین زمانہ ولادت شریفہ ہے اور تاریخ بھی علی الاشہر وہی ہے۔ جیسا تیسرا واقعہ وہاں ہبوط تھا کہ مشابہ وفات کے تھا۔

غرض اس ماہ کے لئے یہ فضائل ضرور ثابت ہیں اور اسی ولادت شریفہ کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے۔

لھذ الشھر فی الاسلام فضل و منقبۃ تفوق علی الشھور
ربیع فی ربیع فی ربیع و نور فوق نور فوق نور

اسلام میں اس مہینہ کی بڑی فضیلت ہے اور یہ تمام مہینوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

اول ربیع سے مراد ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرا ربیع ہے موسم بہار کہ اس وقت یہ موسم تھا' یا یہ کہا جاوے کہ آپ کے پیدا ہونے سے بہار ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس سن کو لوگوں نے سن الفتح والابتہاج کہا ہے اور تیسری ربیع سے مراد ہے مہینہ۔ اور دوسرے مصرعہ میں نور فوق نور ... الخ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں کہ آپ میں انوار مجتمعہ متزائدہ تھے تو یہ فضیلت اس ماہ کو حاصل ہے۔ خواہ وہ فضیلت اس طرح ہو کہ اس ماہ کو پہلے سے فضیلت عطا کی گئی تھی اور اس ماہ کے ذی فضیلت ہونے کی وجہ سے حضورؐ کی ولادت شریفہ کے لئے اس کو خاص فرمایا۔

رہی یہ بات کہ اس کو کیوں فضیلت عطا ہوئی تھی۔ سو اس کی علت ہم کو معلوم نہیں خدا تعالیٰ کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں فضیلت عطا فرماویں۔ اور اسی طرح دوشنبہ کے دن میں فضیلت پہلے سے ہو اور بوجہ ان دونوں کے ذی فضیلت ہونے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں پیدا کیا گیا ہو جیسے جمعہ میں فضیلت پیدا کر کے حضرت آدم علیہ السلام کو اس میں پیدا کیا گیا اور خواہ وہ فضیلت اس طرح ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اس میں ہوئی ہے۔ اس تلبس سے اس کو فضیلت حاصل ہو گئی ہے اور ایسا ہی احتمال جمعہ میں بھی ہے کہ خود ولادت آدم علیہ السلام اور دیگر واقعات سے اس میں فضیلت آ گئی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے سے فضیلت ثابت ہو اور ان واقعات کو علامت کے طور پر ذکر فرمایا ہو۔ تو ایک احتمال پر یہ واقعات دلیل لمی ہوں گے۔ فضائل کے اور دوسرے احتمال پر دلیل انی علی ہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن روزہ رکھتے تھے اور اس کی وجہ یہ فرماتے تھے کہ۔

فیه ولدت و فیه انزل علی (الصحیح لمسلم کتاب الصیام: ۱۹۸' مشکوۃ المصابیح: ۲۰۴۵ مسند الامام احمد ۵:۲۹۹)

(اسی ماہ میں میں پیدا ہوا اور اسی میں مجھے نبوت عطا ہوئی)

اس میں بھی دونوں احتمال ہیں کہ چونکہ میری ولادت اور بعثت سے اس میں فضیلت آ گئی ہے اس لئے روزہ رکھتا ہوں یا یہ کہ یہ دن پہلے سے فضیلت کا ہے جس کی علامت یہ ہے کہ **فیه ولدت و فیه انزل علی.** (انظر تخریج الحدیث السابق.) (اسی میں میں پیدا ہوا اور اسی میں مجھے نبوت عطا ہوئی) اس فضیلت سابقہ کی وجہ سے روزہ رکھتا ہوں تو دونوں احتمال دونوں جگہ ہیں اور اصل مقصود ثبوت فضیلت میں ہر دو مفید ہیں خواہ وہ فضیلت سبب ہو یا مسبب ہو۔ خوب کہا ہے۔

بخت اگر مدد کند دانش آورم بکف   گر بکشد زہے طرف ور بکشم زہے شرف

(قسمت نے اگر یاوری کی تو اس کا دامن پکڑوں گا اگر میں نے اپنی طرف کھینچ لیا تو اچھا اور اگر اس نے کھینچ لیا تو بہت ہی اچھا ہے)

اس نے کھینچ لیا یا میں نے مگر اصل مقصود یعنی قرب تو حاصل ہو گیا علی ہذا یہ اس کی فضیلت کی علامت ہو دونوں میں کچھ مضائقہ نہیں۔

بے حسی کا غلبہ

مگر قابل تعرض کے ایک اور بات ہے وہ یہ کہ اس حدیث **ذالک الیوم الذی ولدت فیه**

(الصحیح لمسلم کتاب الصیام باب: ۳۶ رقم: ۱۹۷، مسند الإمام احمد ۵: ۲۹۷ حلیة الأولیاء ۹: ۵۲)

(اس میں میں پیدا ہوا اور اس میں مجھے نبوت عطا ہوئی) سے بعض لوگوں سے (کیا کہوں بعض لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ہوائے نفسانی کے لئے محض بہانہ ہی ڈھونڈا کرتے ہیں جیسے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے شائقان متعہ کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ لوگ متعہ کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ جہاں میم تے عین ان کو ملا اور انہوں نے اس سے متعہ ثابت کیا۔ اور فرمایا کہ اگر متعہ ایسا ہی سستا ہے تو شیخ سعدی کے اس شعر میں بھی یہی مراد ہوگا۔ تمتع ز ہر گوشہ یافتم

(میں نے ہر طرح سے فائدہ اٹھایا)

اور میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں **ربنا استمتع بعضنا ببعض** میں بھی یہی مراد ہوگا کہ انسان اور جن آپس میں متعہ کرتے تھے۔ تو بعض لوگوں نے) جو یہ حدیث سنی تو اس کو اپنی ایک غلطی کا سہارا بنا لیا اور وہ ہے تو پرانا خیال مگر اب اس میں ایک نیا رنگ قومیت کا چڑھا ہے جب سے یہ نئی جماعت بڑھی ہے۔ اس وقت سے برابر میں ایک قومیت اور تمدن کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور وہ غلطی عید میلاد النبی کی ایجاد ہے اور یہ پہلے سے بھی لوگوں میں رائج تھا کہ اس میں کپڑوں کا بدلنا اور مکان سجانا، احباب کو جمع کرنا اور ذکر شریف کا رسم کے طور پر اہتمام کرنا اطیبہ یا شیرینی کا انتظام کرنا یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ مگر اب کے نو تعلیم یافتہ نے اس میں ایک اور سیاسی نیا رنگ چڑھایا ہے۔ اور میں کیا کہوں اب کی مرتبہ ایک قصہ نئے رنگ کا بعض قدیم الخیال لوگوں کا سننے میں آیا ہے۔

یعنی ایک جگہ ذکر میلاد ہوا ہے تو یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اخیر شب میں ہوگا جو عین وقت ولادت شریفہ کا ہے۔ چنانچہ اخیر شب میں لوگ جمع ہوئے اور عین طلوع فجر کے وقت ذکر ولادت شریفہ ہوا۔

صاحبو! کیا یہ امور قابل منع کے نہیں ہیں۔ صاحبو! آپ تو اس کی ممانعت سے وحشت کرتے ہیں جس کی کوئی اصل بھی قرآن و حدیث میں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے تو اس درخت کو کہ جس کی گونہ فضیلت خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذیبا یعونک تحت الشجرة

(بے شک اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہوا جبکہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے)

محض اس لئے جڑ سے کٹوا دیا تھا کہ لوگ اس کی زیارت کا زیادہ اہتمام کرنے لگے تھے۔

صاحبو! جو اساطین دین ہیں وہ دین کی خرابی پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ وہ محض اپنی بدنامی کے خوف سے

ہرگز خاموش نہیں ہو سکتے اگرچہ ان سے کوئی ناراض ہو۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ حق سن کر کوئی ناراض نہیں ہوتا اگر سمجھا کر کہا جاوے۔ زیادہ تر جو لوگ ناراض ہوتے ہیں اس کی اکثر وجہ یہ ہوتی ہے کہ ناصح ادھوری بات کہتے ہیں جس سے عوام سمجھتے ہیں کہ یہ بالکل اصل ہی کے منکر ہیں۔ پوری بات کہنے والے سے کوئی نہیں بگڑتا اور اگر کوئی پوری بات کہنے پر بگڑے تو اس میں خود زیغ ہے۔ اس کی ایسی حالت ہے جیسے یرقانی کی کہ اس کو ہر چیز زرد یا سیاہ نظر آتی ہے۔

غرض اس حدیث سے بعض لوگ عید میلاد النبی کو ثابت کرتے ہیں اور یہ تھی پہلے سے لیکن امسال اس پر ایک نیا رنگ چڑھا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو اہتمام کے ساتھ سب جمع ہوں اور جمع ہو کر دعا کریں مسلمانوں کی فلاح کے واسطے۔ دعا بہت اچھی چیز ہے مگر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ دین میں چیز کا بڑھانا کہ جمع کے لئے یہ تاریخ معین کی جاوے کیسے جائز ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس میں دین کی شوکت ہے۔

مجھ سے ایک مولوی صاحب نے کہا کہ تعزیوں کو منع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس میں کرتب دکھانے سے مشق ہو جاتی ہے اور شجاعت کی تحریک ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک جنٹلمین صاحب نے فرمایا کہ شب برات میں آتش بازی وغیرہ سے منع نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے بہادری کی اسپرٹ محفوظ رہتی ہے۔ اللہ اکبر! کس قدر بے حسی غالب ہو گئی ہے اور لوگوں کی عقول کیسی ماؤف ہو گئی ہیں۔ اگر ان کے قبضہ میں دین ہوتا تو یہ حضرات خدا جانے اس میں کیا کچھ کتر بیونت کرتے۔

بدعت کی حقیقت

صاحبو! تمہارے اوپر ایک شرعی قانون حاکم ہے۔ تم کو اس کا اختیار ہرگز نہیں ہے کہ تم خود کوئی قانون بنا لو۔ مگر جو قانون تمہارے پاس ہے اس پر عمل کرنے کا حکم تم کو ہے۔ دیکھو! بہت سے قانون ایسے ہیں کہ وہ حکام کو مفید ہو سکتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص تعزیرات ہند چھپنے کے وقت اخیر میں مثلاً یہی ایک دفعہ بڑھاوے کہ جو شخص حکام کے نام کے ساتھ جناب کا لفظ نہ کہے گا اس پر پچاس روپیہ جرمانہ ہوگا تو تصحیح قانون کے وقت جب اس زیادتی کی اطلاع ہوگی۔ فوراً اس شخص کے نام وارنٹ جاری ہو جاوے گا اور اسی مثال سے بدعت کی معنی بھی ان شاء اللہ آپ کی سمجھ میں آ جاویں گے۔ صاحب وجہ اس کے جرم ہونے کی یہ ہے کہ قانون کا بنانا سلطنت کا کام ہے تو جب کسی شخص نے کوئی قانون بنایا تو اگرچہ وہ قانون سراسر مفید حکام ہی کیوں نہ ہو لیکن در پردہ اس مقنن نے اپنے صاحب سلطنت ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی بدعت سراسر مسلمانوں کے لئے بزعم موجد نافع ہے لیکن دین سے زائد ہو تو وہ ایسی ہے جیسے کہ یہ قانون بڑھانا تو اس کی وہی سزا ہوگی ...... یہ جواب ہے ان لوگوں کو جو یہ کہتے ہیں کہ فلاں بدعت میں یہ مصلحت ہے۔

صاحبو! اس میں تو خدا اور رسولؐ پر سخت اعتراض لازم آتا ہے کہ فلاں امر نافع تھا لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو دین میں نہیں رکھا (نعوذ باللہ منہ) غرض عید میلاد النبیؐ پر آج کل یہ رنگ چڑھایا گیا ہے اور مقصود اس سے وہی اظہار شوکت قومی ہے۔ لیکن ہمارا مذہب تو تفویض الی الشرع ہے۔

بے حکم شرع آب خوردن خطاست
وگر خوں بفتوی بریزی رواست

بلا شرعی حکم کے پانی پینا بھی گناہ ہے اور شرعی فتویٰ کی رو سے قتل کرنا بھی جائز ہے۔

رہی دعا تو وہ نمازوں کے بعد بھی ہو سکتی ہے اور دعا کے لئے جو جلسے کئے جاتے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے لوگ جمع ہوتے ہیں کہ وہ نماز بھی نہیں پڑھتے۔ بس اس واسطے کہ اپنا نام ہو اور بعض محض اقتضاء طبیعت کی وجہ سے ان کی طبیعت میں اس قسم کے کاموں کا جوش پیدا ہوتا ہے لیکن شریعت مطہرہ نے ہم کو نرا جوش نہیں سکھلایا۔ اس جوش کی کیا انتہا ہے کہ بعض نے قربانی ہی کو حذف کر دیا۔ صاحبو! ہم کو شریعت نے جوش سے زیادہ ہوش کا حکم دیا ہے۔ یہ تو انگریزی خوانوں کا قصہ تھا۔ جو غریب اپنی اس ایجاد کا اس سے زیادہ جواب نہیں دے سکتے کہ اس میں قومی مصلحت ہے مگر کوئی شرعی دلیل نہیں بیان کرتے۔ تو اس سے پھر بھی گمراہی کم ہوتی ہے لیکن یہ عربی پڑھے لکھے جو بگڑے تو انہوں نے ایک جواب شرعی بھی تیار کر لیا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ذالک الیوم الذی ولدت فیہ (یہ وہی دن ہے جس میں میں پیدا ہوا) اس سے اس دن کا مبارک ہونا معلوم ہوا اور اس کی فضیلت ثابت ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس میں روزہ بھی ثابت ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ زمانہ ولادت نبویہ یوم العبادت ہے۔ تو جب ایک عبادت اس میں ثابت ہے اور دوسری کو بھی کہ فرحت و سرور بالنعمت ہے اس پر قیاس کر لیا جاوے گا اور وہ دوسری بھی ثابت ہو جاوے گی۔

لیکن ہم کو دونوں مقدموں میں کلام ہے۔ اس میں بھی کہ ممکن ہے کہ روزہ اس لئے رکھا ہو کہ وہ پہلے سے یوم الفضیلت ہے اور یوم الولادۃ ہونا اسی فضیلت کے سبب تجویز فرمایا گیا ہو۔ اور اس پر کہ روزہ کا سبب اس یوم کا کسی دوسری وجہ سے افضل ہونا ہے۔ ایک دلیل بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس روز میں اعمال پیش ہوتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل روزہ کی حالت میں پیش ہو تو معلوم ہوا کہ یوم دوشنبہ پہلے سے یوم العرض ہونے کے سبب ذی فضیلت ہے۔ اور اسی وجہ سے اس میں آپ کی ولادت بھی متحقق ہوئی جیسے دسویں محرم کی کہ اس میں حضرت حسینؓ کو شہادت ہوئی لیکن وہ دن آپ کی شہادت کی وجہ سے افضل نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے ذی فضیلت ہونے کی وجہ سے اس میں آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ اور اگر ثابت بھی ہو جاوے کہ فضیلت، اسی وجہ سے ہے یا دونوں کو سببیت میں من وجہ دخل ہے تو زیادہ سے زیادہ اسی قدر تم بھی کر لو جو حضورؐ سے ثابت ہے اور اگر قیاس ایسا ہی عام ہے تو چاہئے کہ مکہ والے ہر دوشنبہ کو حج بھی کر لیا کریں کہ جب روزہ ثابت ہے حج کو بھی قیاس

کر لیں حضرت! قیاس کرنا آپ کا کام نہیں ہے۔ اگر قیاس ایسا سستا ہے تو غیر مقلدوں کو ہرگز برا نہ کہو۔ غیر مقلد اس کو نہیں کہتے ہیں جو اپنے کو غیر مقلد کہے بلکہ آج بلا ضرورت شرعیہ جو لوگ قرآن و حدیث سے استخراج کی کوشش کرتے ہیں یہ سب غیر مقلد ہی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ یہی لوگ غیر مقلدوں کے دشمن ہیں۔ غرض جو شخص اعمال ظاہرہ کے اثبات میں کذا فی الہدایہ کذا فی الدر المختار نہ کہے بلکہ خود دعویٰ استنباط کا کرے بس وہ غیر مقلد ہے۔

صاحبو! علماء نے تصریح فرمادی ہے کہ چوتھی صدی سے اجتہاد منقطع ہے۔ ہمارے لئے اسلم یہی ہے کہ جو بات ہم کو پیش آوے اس کو ہدایہ میں دیکھیں یا درمختار میں۔ اور اس کا پتہ نہ ہدایہ میں ہے نہ درمختار میں۔ محض ایک مسلمان بادشاہ کی ایجاد ہے اس نے عیسائیوں کے توڑ پر ایجاد کیا تھا کہ جیسے ان کے ہاں بڑے دن کی خوشی ہوتی ہے اور رونق ہوتی ہے اسی طرح ہم بھی کریں مگر خیر اس کے اہتمام سے گو وہ سنت کے خلاف تھا مگر یہ غرض تو حاصل تھی اور اب تو وہ بھی نہیں۔ کیا دو آنہ کی مٹھائی تقسیم کر دینے سے یا چند آدمیوں کے جمع ہو جانے سے ان کا توڑ ہو سکتا ہے اور اصل تو یہ ہے کہ اس بادشاہ کی یہ رائے ہی غلط تھی۔ اسلام کو ان عارضی شوکتوں کی ضرورت نہیں ہے۔

شوکت اسلام

اسلام کی تو وہ شوکت ہے کہ جب حضرت عمرؓ ملک شام میں تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں نے نیا لباس بدلنے کیلئے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ۔

نحن قوم اعزنا الله بالاسلام

صاحبو! اگر ہم سچے مسلمان ہیں تو ہماری عزت سب کے نزدیک ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب معمولی وضع میں رہتے تھے۔ مگر لیفٹیننٹ گورنر ان کے سلام کو آئے تھے۔ حضرت خالدؓ ماہان ارمنی کی مجلس میں تشریف لے گئے وہاں حریر کا فرش بچھا ہوا تھا حضرت خالدؓ نے اس کو ہٹا دیا۔ ماہان نے کہا اے خالد! میں نے تمہاری عزت کی تھی لیکن تم نے اس کو قبول نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے ماہان! تیرے فرش سے خدا کا فرش اچھا ہے۔ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حریر کے استعمال سے منع فرما دیا ہے۔

تو کیا اس حریر کے ہٹا دینے سے ان کی شوکت کم ہوئی یا اور بڑھ گئی۔ مسلمانوں کی عزت یہی ہے کہ ہر موقع پر کہہ دیں کہ ہم کو فلاں کام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا ہے۔ مگر آج لوگ اسلام کے احکام ظاہر کرنے کو ذلت سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ میں نے ریل میں نماز اس لئے نہیں پڑھی کہ وہاں سب ہندو ہی تھے۔ دیکھ کر اسلام پر ہنستے انا للہ۔

ایک وہ وقت تھا کہ ہر بات میں قرآن و حدیث زبان پر آتا تھا حتی کہ جب صحابہ کرامؓ نے روم

پر حملہ کیا ہے تو وہاں کے عیسائیوں نے کہا کہ تم بھی اہل کتاب ہو اور ہم بھی اہل کتاب ہیں۔ تو ہم میں تم میں ایسا زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ تم اول مجوس فارس سے لڑو کہ وہ مشرک ہیں۔ واقعی ہم تو شاید اس سوال کا جواب نہ دے سکتے لیکن صحابہ کرام نے فوراً ارشاد فرمایا کہ ہم کو حکم ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ

(ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں۔)

اور تم ان کی نسبت نزدیک ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے قلب میں قرآن بسا ہوا تھا۔ تو انہوں نے فرمایا ماہان ارمنی سے کہ تیرے فرش سے خدا کا عرش افضل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے کا ہے اور آج تک چلا آتا ہے۔ نہ دھونا پڑتا ہے نہ کچھ بلکہ اور ناپاکی کو بھی پاک کر دیتا ہے۔

یہ وہ فرش ہے کہ حضرت بشر حافیؒ نے جب سنا کہ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا (اور ہم نے زمین کو فرش بنایا) تو جوتہ نکال کر پھینک دیا کہ خدا کے فرش پر جوتہ لے کر نہ چلنا چاہئے۔ آخر تمام درند چرند کو حکم ہوا کہ جہاں جہاں بشر حافیؒ جاویں وہاں وہاں بیٹ نہ گرنے پاوے۔ صاحبو! ہماری عزت سامان سے نہیں ہے اگر ہے تو بے سروسامانی سے ہماری عزت ہے۔ یہ بے سروسامانی کی وہ عزت ہے کہ۔

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند　　اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد
دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند　　دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

پھل پھول والے درخت بوجھ میں دبے ہوئے ہیں سرو کا درخت کتنا اچھا ہے جو ہر قسم کی خوشی وغمی سے آزاد ہے۔ دلفریبان نباتی زیور سے مزین اور خوبصورت بنے ہوئے ہیں مگر ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے۔

بدعات کی مصلحتیں

اور سنئے (واقعی اگر آدمی غور کرے تو بدعت کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے) جونپور ایک صاحب نے دسویں ایجاد کی تھی کہ وہ ہر مہینہ کی دسویں تاریخ کو شہادت نامہ پڑھواتے تھے۔ نیت تو یہ تھی کہ لوگ شیعوں کی مجالس میں شریک نہ ہوں۔ لیکن ان کا یہ مقصود بھی حاصل نہ ہوا۔ لوگ اس سے فارغ ہو کر شیعوں کی مجالس میں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ میاں چلو! ان کم بختوں کے ہاں بھی دیکھ آویں کیا ہو رہا ہے یہ ہیں بدعات کی مصالح۔

میں تو کہتا ہوں کہ اگر یہ مصالح واقع میں مصالح ہیں۔ تو خدا تعالیٰ نے باوجود ان مصالح کی رعایت نہ کرنے کے یہ کیوں فرمادیا تھا کہ۔ الیوم اکملت لکم دینکم (آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔)

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اذکار و اشغال بہیات و قیود خاصہ بھی تو در مختار میں نہیں ہیں تو

سمجھو کہ اذکار و اشغال خاصہ سے غرض تحصیل ثواب نہیں ہے بلکہ مقصود ان سے خاص[۱] کیفیات کا طبیعت میں پیدا کرنا ہے مثل تقلیل خطرات و جمعیت و یکسوئی۔ گو پھر ان سے عبادت میں کام لیا جاوے۔ ان کی حالت مثل ادویہ طبیہ کے ہے کہ کوئی دوا بخار کو نافع ہے اور کوئی کھانسی کو نافع ہے۔ تو مقصود ان سے تحصیل کیفیت صحت ہے۔ پھر چاہے وہ ذریعہ عبادت کا بن جاوے۔ اور یہ تجربہ ہے کہ وہ کیفیات ان خاص طرق سے حاصل ہوتی ہیں۔

تو جواب کا حاصل یہ ہے کہ ہم ان کو نفع عاجل کے لئے کرتے ہیں اور ان کو مثل ادویہ طبیہ کے سمجھتے ہیں۔ مثلاً ہم حبس دم کو ہرگز عبادت نہیں سمجھتے بلکہ تدبیر سمجھتے ہیں جمع طبیعت کی بخلاف بدعات متعارفہ کے کہ وہ کی جاتی ہیں تحصیل ثواب کے لئے اور حبس دم وغیرہ تحصیل کیفیات کے لئے کی جاتی ہیں اور یہ نفع ان کا مشاہد ہے پس چونکہ اس کو دین سمجھ کر نہیں کیا جاتا اس لئے اس کے درمختار میں ہونے کی ضرورت نہیں اور بدعات کو چونکہ دین[۲] سمجھ کر کیا جاتا ہے اس واسطے اس کے درمختار میں ہونے کی ضرورت ہے اور جب کہ یہ درمختار میں نہیں ہے تو معلوم ہوا بدعت ہیں لغو ہیں خلاصہ یہ ہوا کہ ہر حکم کے ثبوت کا مدار شریعت پر ہے۔ پس حدیث سے اتنا ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھا تو تم بھی اتنا ہی کرلو۔ باقی عید میلاد النبیؐ وغیرہ یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو تھے دلائل شرعیہ۔

عجیب و غریب الہام

اب میں ایک اور دلیل بیان کرتا ہوں جو کہ بطور الہامی دلیل کے ہے اور اس کے بیان سے کچھ فخر مقصود نہیں ہے بلکہ ہر امر جو شریعت کے خلاف نہ ہو اور کہیں مدون بھی نہ ملا ہو اور وہ القاء ہو قلب میں تو اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام سمجھا جاوے گا۔ وہ یہ ہے کہ عجیب اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت و وفات اور ماہ ولادت و وفات بالاتفاق اور دونوں کی تاریخ بھی علی المشہور ایک ہی ہے۔ تو عجب نہیں کہ اس اتحاد میں اس طرف اشارہ ہو کہ کوئی شخص اس دن کو نہ یوم العید بناوے اور نہ یوم الحزن۔ کیونکہ اگر کوئی اس کو یوم العید بنانا چاہے تو وفات کا خیال مانع خوشی ہو جاوے۔ اور اگر کوئی یوم الحزن بنانا چاہے تو ولادت شریفہ کا خیال مانع رنج ہو جاوے تو اس سے بھی اس دن کے یوم العید ہونے کی جڑ کٹ گئی اور چونکہ ان دونوں واقعوں سے زیادہ کوئی واقعہ سرور و حزن کا نہیں ہے۔ جب ان ہی کے زمانہ میں یوم عید و یوم الحزن بنانے کی جڑ کٹ گئی تو اور واقعات کے ازمنہ کے لئے تو بدرجہ اولیٰ۔

---

[۱] اور اس پر یہ شبہ کیا جاوے کہ محققین کیفیات کو غیر مقصود کہتے ہیں سو ان کا مطلب یہ ہے کہ مقصود بالذات نہیں ۱۲ منہ۔

[۲] اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اگر کسی دین کو بدعت نہ سمجھیں بلکہ دنیوی شوکت کیلئے کریں تو کیا حرج ہے۔ بات یہ ہے کہ ہوگی تو وہ دین ہی کی شوکت گو فی الدنیا ہو اور اظہار شوکت دین عبادت ہے۔ پس وہ ہر حال میں دین ہو گیا ۱۲ منہ۔

اگر شرعی دلائل موجود نہ ہوتے تو ہم اس دلیل کو کوئی چیز نہ سمجھتے لیکن چونکہ اب یہ شریعت کے موافق ہے اس لئے ہم اس پر خدا کا شکر کرتے ہیں۔ غرض وشبہ جو حدیث ذالک الیوم الذی ولدت فیہ (الصحيح لمسلم كتاب الصيام باب:۳۶ رقم:۱۹۷/ مسند الإمام أحمد ۵:۲۹۷ حلية الأولياء ۹:۵۲) (آج کا دن میرا یوم ولادت کا ہے) سے ہوا تھا اب زائل ہو گیا ہوگا۔ یہ ہے ہمارا کلام اس مسئلہ کے متعلق۔

باقی نفس ذکر قطع نظر رسوم سے تو خدانخواستہ ہم اس کا انکار کیسے کر سکتے ہیں ہم تو کہتے ہیں کہ اس کو وظیفہ کے طور پر کرو۔ اور قرآن ہی میں اس کا وظیفہ ہونا جگہ جگہ مذکور ہے۔

لقد جآء کم رسول من انفسکم اور **قدجآء کم من اللہ نور و کتاب مبین** علی ہذا۔

(تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح)

اور بھی بہت جگہ قرآن شریف میں مذکور ہے تو جو شخص روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے وہ ایک دو آیت آپ کے ذکر شریف کی ضرور پڑھتا ہے تو کیا ایسا شخص منکر ہوگا۔ اور دیکھئے جہاں **اشھد ان لا الہ الا اللہ** ہے وہیں **اشھد ان محمد رسول اللہ** بھی ہے۔

علی ہذا نماز میں بھی تشہد میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔ اور تشہد کے بعد تو درود شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا زیادہ تر ذکر ہے۔ تو نماز اور قرآن بھی آپؐ کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝

وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے بے شک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپؐ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور روشن چراغ ہیں۔

تو کون ظالم ہے کہ اس سے منع کرے اور کون ظالم ہے کہ وہ کسی کو منع کرنے والا کہے لیکن حدود سے باہر نہ نکلو۔ نماز پڑھو لیکن قبلہ کی طرف منہ کر کے پڑھو۔

تفسیر آیت کریمہ

پس منجملہ ان آیات کے ایک یہ آیت بھی ہے۔ جس کی میں نے تلاوت کی ہے اور اس کی ایک تفسیر یہ ہے جو میں نے ذکر کی کہ نور سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور اس تفسیر کی ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ اس سے اوپر بھی قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا فرمایا ہے۔ تو یہ قرینہ ہے اس پر کہ دونوں جگہ جاء کم کا فاعل ایک ہو۔ دوسرے اوپر قد جاء کم رسولنا کے ساتھ جو آپ کی شان بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے۔

يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ

کتاب میں سے جن امور کا تم اخفا کرتے ہوئے ان میں سے بہت سی باتوں کو تمہارے سامنے صاف صاف کھول دیتے ہیں۔

یعنی آپ کو مبین و مظہر فرمایا ہے۔ اب سمجھئے کہ نور کی حقیقت ہے ظاہر بنفسہ مظہر لغیرہ۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مظہر کے بہت مناسب ہے کہ مراد نور سے آپ ہوں اور اس کے آگے قرآن کی شان میں فرماتے ہیں۔ کتاب مبین یھدی بہ اللہ۔ تو کتاب کو تو آلہ اظہار فرمایا اور آپ کو مبین میں خود مظہر فرمایا ہے۔ پس یہ قرینہ ہے تفسیر بالا کا اور گو کتاب بھی ظاہر کرنے والی ہوتی ہے مگر اس میں آلیت کی شان زیادہ ملحوظ ہوتی ہے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ کتاب میں بھی ظہور اور اظہار دونوں ہوتے ہیں اور نور میں بھی دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن ایک فرق ہے کہ نور پر جب اول بار نظر ہوتی ہے تو یہ نیت اور خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ خود نظر آیا ہے۔ مثلاً نور سے کتاب دیکھیں تو اس طرف ذہن بھی نہیں گیا کہ ہم کو اول نور نظر آیا ہے پھر اس کے ذریعہ سے کتاب نظر آئی ہے بلکہ اس میں اول ہی سے مظہر کی شان ظاہر ہوتی ہے برخلاف کتاب کے کہ اول یہی نیت ہوتی ہے کہ وہ خود سمجھ میں آوے۔ پھر سمجھ میں آنے کے بعد ان مضامین سے دوسری جگہ کے احکام منکشف کیے جاتے ہیں تو نور کی شان میں تو اظہار غالب ہے اور کتاب میں ظہور غالب ہے۔ تو یھدی بہ اللہ کتاب کے زیادہ مناسب ہے اور نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ مناسب ہے۔ یہ ہے وجہ ترجیح مگر اس میں ایک اشکال ہو سکتا ہے کہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا

(یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آ چکی ہے اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے۔)

تو یہاں برہان سے مراد غالباً بقرینہ جاءکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور نور سے مراد غالباً بقرینہ انزلنا قرآن ہے۔ اور یہی نور وہاں بھی آیا ہے۔ اور القرآن یفسر بعضہ بعضا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ہم کب دعویٰ کرتے ہیں کہ جہاں لفظ جاء ہو وہاں اس کا فاعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے۔ ممکن ہے کہ یہاں جاءکم کی اسناد کتاب کی طرف مجازاً ہو مگر جہاں اسناد حقیقی بن سکے۔ وہاں اس کو کیوں اختیار نہ کیا جاوے اور یہاں یعنی قد جاءکم نور میں ہو سکتا ہے پس یہاں یہی مناسب ہوگا۔ دوسرے ہم انزلنا سے بھی رسولؐ ہی مراد لے سکتے ہیں۔

چنانچہ ایک اور مقام پر ہے۔ انزلنا الیکم ذکرا رسولا رسولاً بدل بطور تفسیر ہے۔ ذکراً سے یہاں بھی انزلنا کا معمول لفظ رسولاً واقع ہوا ہے۔ پس اس سے بھی تفسیر مختار پر کوئی غبار نہیں رہا۔

خیر یہ تو طالب علموں کے کام کی بات تھی۔ مقصود یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے تشریف لانے کو بطور امتنان کے فرمایا ہے تو اس سے ہم کو سبق لینا چاہئے کہ ہم ایک تو روزانہ ذکر کیا کریں اور اگر کوئی کہے کہ قرآن میں آ ہی جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مجمل ہوتا ہے اس سے اکثر کچھ تفصیل نہیں سمجھ سکتے ۔ دوسرا یہ سبق لینا چاہئے کہ اس امتنان کے بعد یہ ارشاد ہے کہ ان سے ہدایت ہو اور بار نہ ہو اور اگر یہ حاصل نہیں کیا تو محبت نہیں ہے ۔ اسی کو کہتے ہیں ۔

تعصی الرسول و انت تظهر حبه　　هذا لعمری فی الفعال بدیع
لو کان حبک صادقاً لا طعته　　ان المحب لمن یحب مطیع

تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور آپ کی محبت کا اظہار کرتا ہے میری عمر کی قسم عمل میں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے اگر تیری محبت سچی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا کیونکہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے ۔

یعنی حیرت ہے کہ تم دعویٰ حب رسول کا کرتے ہو اور پھر ان کی نافرمانی کرتے ہو ۔ اگر تم سچے محبّ ہوتے تو ضرور اطاعت کرتے کیونکہ محبّ محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے ۔

بس یہی بیان کرنا تھا ۔ اس وقت اس کی تو گنجائش تھی نہیں کہ مفصل حالات کا ذکر کرتا اس لئے اصول پر اکتفا کیا ۔ دوسرے میں نے ایک کتاب کا پتہ بھی دے دیا ہے ۔ مفصل ذکر کو جس کا جی چاہے اس کو منگا کر اپنے پاس رکھے ۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ توفیق مرضیات عطا فرماوے اور ہم سب کو اپنی اور اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اطاعت عطا فرمائے ۔

نورالنور

حضور کے ذکر وفضائل ولادت کے متعلق یہ وعظ ۳ صفر ۱۳۴۵ھ کو بعد نماز جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا جو ۳ گھنٹہ ۴۵ منٹ میں ختم ہوا۔ حاضری ۱۰۰ کے قریب تھی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

(بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور اور کتاب آئی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضامندی کا اتباع کرتے ہیں سلامتی کے راستے بتلاتے ہیں اور اپنی مشیت سے ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتے ہیں اور سیدھے راستے کی ہدایت کرتے ہیں۔)

منت عظیمہ

یہ ایک آیت کا جزو ہے جس میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنی منت عظیمہ اور نعمت جسیمہ کا ذکر فرمایا ہے جو بندوں کو عطا کی گئی ہے اور وہ مجمل عنوان میں تو ایک نعمت ہے مگر در حقیقت تفصیل کے درجہ میں وہ دو نعمتیں ہیں لیکن وہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ باہم لازم و ملزوم ہیں ایک کا ذکر دوسرے کے ذکر کو مستلزم ہے اب خواہ دونوں کو ذکر کیا جائے یا ایک ہی کے ذکر کو دلالت علی الالازم کی وجہ سے کافی سمجھا جاوے دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اب سمجھئے کہ وہ دو نعمتیں کیا ہیں؟ ایک تو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا دوسرے قرآن کا نازل ہونا یہ دونوں نعمتیں باہم متلازم ہیں اب اختیار ہے خواہ ان میں سے ایک کو مدلول نص

قرار دیا جائے اور دوسرے کو لزوماً مذکور مانا جائے یا برعکس کہ دوسرے کو مدلول نص مان کر اول کو لزوماً مذکور مانا جائے یعنی خواہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعمت کہا جاوے تو قرآن کا نزول آپ کی نبوت کے لئے لازم ہوگا یا قرآن کو نعمت کہا جاوے اور حضور کی بعثت کو لازم کہا جاوے غرض ہر نعمت دوسرے کو مستلزم ہے اور ہمارا مدعا دونوں صورتوں میں حاصل ہے خواہ حضور کو نعمت کہیں یا قرآن کو ہم کو بہر حال دونوں نعمتیں حاصل ہیں پس اب یہ نعمتیں اس شعر کا مصداق ہوگئیں۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف   گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(اگر خوش قسمتی سے اس کا دامن ہاتھ لگ جائے اور اگر وہ مجھے کھینچ لے تو بے حد مسرت کا سبب ہے اور اگر میں اس کو کھینچ لوں تب بھی باعث نشاط ہے۔)

دونوں میں تلازم ہے حضور کی بعثت کے لئے نزول قرآن لازم اور نزول قرآن کے لئے آپ کی نبوت لازم اسی لئے بعض نے نور و کتاب دونوں سے قرآن مراد لیا ہے اور بعض نے نور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا ہے یہ حاصل ہے اس حصہ آیت کا۔

وجہ محرک آج کے بیان کی بعض عزیز مہمانوں کی طلب ہے ورنہ میں نے آج کل وعظ کم کر دیا ہے جس کی وجہ کچھ تو عذر ہے جو آج کل مجھے لاحق ہے اور کچھ سبب یہ ہے کہ اب بیان کی امنگ نہیں رہی ایک تو اس لئے کہ اب تجربہ ہوگیا ہے کہ بیان سے جتنی توقع نفع کی ہوتی ہے اتنا نفع نہیں ہوتا جوانی میں تو جوش زیادہ تھا اور تجربہ بھی اس وقت کے برابر نہ تھا اس لئے باوجود عدم نفع متوقع کے بھی بیان کر دیا کرتا تھا اور اب جوانی کا جوش تو ہے نہیں اور تجربہ پہلے سے زیادہ ہوگیا اس لئے اب امنگ نہیں رہی اب جو کبھی بیان کا خیال ہوتا ہے کسی کی طلب پر ہوتا ہے۔ بہر حال ایک سبب تو بعض اضیاف کی تحریک ہے اور ایک وجہ یہ ہے کہ میرا اکثر مذاق یہ ہے کہ ربیع الاول کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ یہ مہینہ حضور کی ولادت و تشریف آوری کا ہے اس وقت حضور کی یاد تقاضے کے ساتھ دل میں پیدا ہوتی ہے اور ایک خاص تحریک حضورؐ کے ذکر کی ہوتی ہے اگر اس کے ساتھ منکرات منضم نہ ہوتے تو اس ماہ میں یہ حالت اور اس حالت میں آپ کا ذکر کرنا علامت محبت ہوتی ہے مگر افسوس ہے کہ منکرات کی وجہ سے اہل فتویٰ کو اس ذکر کی ہیئت مخصوصہ سے روکنے کی ضرورت ہوئی ورنہ یہ مسئلہ اختلافی ہونے کے لائق نہ تھا مگر اہل فتویٰ کو روکنے کی ضرورت ہوئی کہ یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ دفع مضرت جلب نفع سے مقدم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت حاصل ہے اس لئے اس کی تبلیغ وجوب کے درجہ میں نہیں ہے۔ صرف مستحب اور احب الستحباب ہے اور منکرات سے بچنا واجب ہے تو اس حالت میں حضورؐ کا ذکر کرنا اس وقت مستحب ہو سکتا ہے جب کہ منکرات سے خالی ہو اب اس میں صوفیہ کی اور علماء کی رائے مختلف ہے صوفیہ کہتے ہیں کہ فعل مستحب کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے اور منکرات کی اصلاح کی جائے

اور علماء کہتے ہیں کہ بعض احوال میں منکرات کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود بھی اس مستحب کو ترک نہ کیا جائے اس لئے شیوع منکرات کے وقت وہ اس مستحب ہی کے ترک کا امر کرتے ہیں جس کے ساتھ منکرات کا انضمام ہوا ہے اور اس بارہ میں رائے علماء کی مانی جائے گی کیونکہ صوفیہ تو اہل شوق ہیں ان کو دوسروں کے انتظام کی پرواہ نہیں یعنی جو صوفیہ کہ محض صوفی ہوں عالم محقق نہ ہوں اور علماء منتظم ہوتے ہیں اور منتظم کی رائے غیر منتظم کی رائے سے مقدم ہوتی ہے دونوں کی حالت کا فرق ایک مثال سے سمجھئے مثلاً موسم وباء میں اطباء کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ آج کل امرود زیادہ کھانا مضر ہے اس کے بعد ایک طبیب نے تو یہ کیا کہ امرود کھانا نہیں چھوڑا بلکہ قلیل مقدار میں مصلحات کے ساتھ کھاتا رہا اور ایک طبیب وہ ہے جس نے خود بھی امرود کا کھانا چھوڑ دیا اس خیال سے کہ میں قلیل مقدار میں یا مصلحات کے ساتھ کھاؤں گا تو مجھے کھاتا ہوا دیکھ کر دوسرے بھی کھائیں گے اور ان امور کی رعایت نہ کریں گے جن کی رعایت میں کرتا ہوں بلکہ اندھا دھند کھائیں گے اور ہلاک ہوں گے اس لئے وہ بالکل ہی امرود کھانا چھوڑ دیتا ہے اور دوسروں کو بھی علی الاطلاق منع کرتا ہے بلکہ ٹوکرے کے ٹوکرے پھینکوا دیتا ہے دبوا دیتا ہے جس کی اس حالت کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو امرود سے رغبت نہیں اور جو طبیب امرود کھا رہے ہیں ان کو امرود سے بہت رغبت ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ رغبت تو ان کو ان کے برابر یا ان سے بھی زیادہ ہے مگر محض دوسروں کی رعایت سے ترک کر رہا ہے بتلایئے ان دونوں میں سے کونسا طبیب لائق اتباع ہے یقیناً یہ دوسرا زیادہ قابل اقتداء ہے کیونکہ اس کی رائے انتظام پر مبنی ہے سب اسی کی رائے کو ترجیح دیں گے۔ بس یہی حال علماء اور صوفیہ کا ہے اپنے غلبہ شوق کو ضبط نہیں کرتے بلکہ مستحب کو برابر کرتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اصلاح منکرات کا قصد کرتے ہیں اور علماء بشرطیکہ خشک نہ ہوں انتظام کی وجہ سے اپنے شوق کو ضبط کر لیتے اور ظاہر میں اس مستحب ہی کو ترک کر دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بدوں ترک مستحب کے منکرات کو ترک نہیں کر سکتے۔ صاحبو! کیا ہمارے دل میں یہ دیکھ کر گدگدی نہیں اٹھتی کہ ہر طرف مجلس مولد ہو رہی ہے مگر محض انتظام عوام کی وجہ سے ہم اپنے شوق کو دبائے بیٹھے رہتے ہیں؟

مشاہدہ ومجاہدہ

ایک صوفی نے جو صاحب سماع تھے اور مجھ سے محبت کرتے تھے اور میں بھی بوجہ ان کے ذاکر اللہ ہونے کے ان سے محبت کرتا تھا کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہو خواہ وہ کسی حال میں ہو ذکر اللہ کی وجہ سے مجھے اس سے محبت ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ دوسرے منکرات پر انکار بھی دل میں ہوتا ہے اور بشرط امید نفع امر بالمعروف بھی کر دیتا ہوں ان صوفی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ چشتی ہو کر منکر سماع ہیں حیرت ہے؟ میں نے کہا کہ میں منکر سماع نہیں جس چیز کو بزرگوں نے کہا ہے میں اس کا منکر کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ البتہ تارک سماع ہوں کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا آپ یہ بتلایئے کہ اس طریق کا حاصل

کیا ہے کہا مجاہدہ اور واقعی اس طریق کا خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں ایک مشاہدہ ایک مجاہدہ وہ مقصود ہے اور یہ وسیلہ ہے مگر مشاہدہ کے معنی رویت نہیں ہیں بلکہ یہ اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ خاص علماً بھی عملاً بھی غالب رہے اور میں نے اس میں علماً و عملاً کی قید اس لئے بڑھائی کہ محض غلبۂ توجہ علماً مشاہدہ نہیں ہے بلکہ مشاہدہ غلبہ توجہ مع العمل کا نام ہے بعض لوگوں کو اس میں دھوکا ہو گیا ہے انہوں نے محض ملکہ یادداشت کا نام نسبت و مشاہدہ رکھ لیا ہے ان کو بوجہ مشق طویل کے کسی وقت ذہول عن الحق نہیں ہوتا اس پر وہ خوش ہیں کہ ہم صاحب مشاہدہ ہیں ہم کو کسی وقت ذہول عن الحق نہیں ہوتا ہم کو کسی وقت حق تعالیٰ سے غیبت نہیں ہوئی حالانکہ جب وہ غیبت کرتے ہیں اس وقت ان کو حق تعالیٰ سے غیبت ہوتی ہے گو علماً غیبت نہ ہو مگر عملاً غیبت ضرور ہے اور جب عملاً غیب ہے تو ان کا مشاہدہ علمی بھی کامل نہیں بلکہ ناقص ہے۔ مشاہدہ علمی بھی اس شخص کا کامل ہے جو عملاً بھی صاحب مشاہدہ ہو ورنہ وہ مشاہدہ علمی جو عمل سے خالی ہو۔ محض ایک مشق کا درجہ ہے جو کافر کو بھی چند روز میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا نام نسبت و مشاہدہ نہیں بلکہ نسبت اس تعلق کا نام ہے جو محبت مع اللہ کی وجہ سے جزر قلب میں پیوستہ ہو جائے جس کے لئے عمل بالاحکام لازم ہے اور جو تعلق بدوں عمل کے ہو وہ محبت سے خالی ہے اور جزر قلب میں پیوستہ نہیں بلکہ دل کے اوپر اوپر ہے۔ جیسے متنبی کہتا ہے۔

عذل العواذل حول قلب التاۂ
وھوی الاحبۃ منہ فی سوداۂ

(ملامت کرنے والوں کی ملامت اس کے دل متحیر کے گرداگرد ہے اور اس کے اندرون دل میں محبوب کی محبت جاگزیں ہے۔

بس ان اصحاب مشق کے تعلق کا وہ حال ہے جو متنبی کے نزدیک عذل العواذل کا حال ہے اور اہل تقویٰ کا یہ حال ہے کہ وہ سویدائے دل میں پہنچا ہوا ہے یہ ہیں اصحاب مشاہدہ اور یہ ہیں اصحاب نسبت جن کے عمل سے قلبی حالت کا ظہور ہوتا ہے۔

ایمان کامل

ابھی چند روز ہوئے میرے پاس ایک عالم کا خط آیا تھا کہ ایمان کامل کیا چیز ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ میں نے جواب میں لکھا کہ آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نفس ایمان کی حقیقت معلوم ہے۔ تو پہلے آپ وہ لکھیں پھر میں ایمان کامل کی حقیقت بتلاؤں گا۔ یہ سوال میں نے ٹالنے کے واسطے نہیں کیا تھا بلکہ تسہیل کے واسطے کیا تھا تاکہ مطلق ایمان کی حقیقت طے ہو جانے کے بعد ایمان کامل کی حقیقت کا معلوم ہونا سہل ہو جائے اور اگر نفس ایمان میں سائل نے کچھ غلطی کی ہو تو پہلے اس کو رفع کر دیا جائے۔ چنانچہ جواب آیا کہ نفس ایمان کی حقیقت تو یہی ہے۔

امنت باللہ و رسولہ وماجاء بہ رسولہ

میں نے اللہ (کی واحدانیت) اور اس کے رسول کی (رسالت) کا۔ اور جن جن امور کی اس کے رسول نے اطلاع دی ان سب کا یقین کامل کیا۔

اس کے بعد اس کا ترجمہ لکھ دیا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ تو ایمان کی تعریف نہ ہوئی کیونکہ اس میں بھی لفظ ایمان موجود ہے تو ایمان کی تعریف ایمان سے کرنا تعریف الشئی بنفسہ ہے جو جائز نہیں۔ اس کے بعد جواب آیا کہ ایمان کہتے ہیں۔ یقین کو۔ میں نے لکھا کہ واقعی اب آپ نے ایمان کی تعریف صحیح لکھی۔ اس کے بعد ایمان کامل کا سمجھنا آپ کو سہل ہوگا۔

اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک طبیب کے پاس دو مریض گئے اور دونوں کو اس کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ یہ شخص کامل طبیب ہے دونوں نے اپنی نبض دکھلائی اور طبیب نے دونوں کو نسخہ لکھ کر دیا۔ مگر ایک شخص نے تو نسخہ پر عمل کیا اور اس کو استعمال کر کے صحت یاب ہو گیا اور دوسرے نے نسخہ پر عمل نہ کیا۔ پہلے کا یقین کامل ہے کیونکہ اس نے یقین کے مقتضا پر عمل بھی کیا اور دوسرے کا ناقص ہے۔ اور اس یقین کامل کے حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے مقتضا پر ہمت کر کے عمل کرے۔ اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں اس میں اول اول تو تعب ہوگا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ حال راسخ ہو کر ملکہ بن جائے گا تو دشواری کچھ نہ رہے گی۔

اسی طرح مشاہدہ کو سمجھئے کہ مشاہدہ کا معاملہ وہ ہے جس کے مقتضیٰ پر عمل ہو اور مشاہدہ بمعنی ملکہ یادداشت محضہ میں کامل مشاہدہ نہیں۔ کیونکہ درجہ عمل میں وہاں غیبت موجود ہے۔ مشاہدہ کاملہ یہ ہے کہ علما و عملاً استحضار رہے محض مشاہدہ علمی مشاہدہ کاملہ نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ عاصی سے طاعت کی نفی کی ہے اسی طرح ایمان کی بھی نفی کی ہے۔

لایزنی الزانی حین یزنی و هو مؤمن ولایشرب الشارب حین یشرب و هو مؤمن (الصحیح للبخاری ۳:۱۷۸، ۷:۱۳۶، ۸:۱۹۵، ۱۹۷ الصحیح لمسلم کتاب الایمان باب: ۲۴ رقم: ۱۰۰، ۱۰۵ سنن ابی داود: ۴۶۸۹ سنن الترمذی: ۲۶۲۵ سنن النسائی ۸:۶۴، ۶۵، ۳۱۳ سنن ابن ماجۃ: ۳۹۳۶ مسند الامام احمد ۲:۳۷۶، ۳:۱۳۹)

(نہیں زنا کرتا کوئی زنا کرنے والا اور نہیں شراب پیتا کوئی شراب پینے والا اس حال میں کہ وہ مومن (کامل) ہو۔

علماء ظاہر تو چکرا گئے کہ جب وہ ایمان رکھتا ہے تو محض ایک عمل کے ترک پر اس ایمان کی نفی کیسی؟ اس کا جواب کسی نے اولاً یہ دیا ہے کہ ایمان کامل کی نفی کی گئی ہے اور واقعی کمال اسی مجیب کا ہے۔ الفضل للمتقدم (فضیلت پہلے کے لئے ہے) پھر ہم نے اسی میں کچھ باتیں بڑھا دیں۔ جیسے اصولی امام فخر الاسلام ہی کی مثالیں اب تک بیان کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر موقعہ میں انہیں کو الٹ پھیر سے بیان کر دیتے ہیں۔ گو اس

میں بھی میں نے ایک نکتہ بیان کر دیا ہے کہ جو مثال پہلے سے چلی آ رہی ہے اس کے سمجھنے میں سہولت ہے۔ بہر حال مشہور جواب تو یہ ہے کہ کامل کی نفی کی گئی ہے مگر جس کو ایمان کامل کی حقیقت معلوم نہیں اس کی تسلی اتنے سے نہیں ہوتی اور ایمان کامل کی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد اس جواب سے تسلی ہو جائے گی کیونکہ اب معلوم ہو گیا کہ ایمان اور یقین کے مختلف درجے ہیں جس درجہ کا ایمان اور یقین ہوتا ہے اتنا ہی عمل میں اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے تو جب اس شخص کو حق تعالیٰ کی رویت و معیت کا عمل میں استحضار نہیں ہوا تو اس درجہ میں اس کو ایمان حاصل نہیں ہے کیونکہ ایمان کی حقیقت یقین ہے اور یقین علم کی ایک فرد ہے اور علم کے مختلف درجے ہیں ایک وہ علم ہے جس کا عمل میں اثر ظاہر ہو اور عمل کے وقت اس کا استحضار ہو۔ اور دوسرا علم وہ ہے جو محض اعتقاد ہی کے درجہ میں ہو اور عمل میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ پہلا علم کامل ہے دوسرا ناقص ہے۔

ایک قصہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ علم کا اثر عمل پر کیونکر ہوتا ہے مہتمم صاحب مدرسہ صولتیہ نے مجھ سے اپنے قسطنطنیہ جانے کا قصہ بیان کیا کہ جس وقت میں نے قصر یلدز میں قدم رکھا اور میں نے سنا تھا کہ سامنے جو بالا خانہ ہے سلطان کبھی کبھی بغرض تفریح وہاں آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس وقت یہاں کا آدمی بالکل ان کے سامنے ہوتا ہے۔ راوی کہتے تھے کہ اس کے بعد میری یہ حالت ہو گئی کہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ ادھر ادھر نگاہ بھی نہ اٹھتی تھی حالانکہ وہاں چاروں طرف بہت خوشنما پھول پھلواری لگی تھی مگر اس خیال سے کہ شاید سلطان مجھے دیکھ رہے ہوں میری نگاہ کسی طرف نہ اٹھتی تھی۔ وہ تو قصہ بیان کر رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اے اللہ! ایک ادنیٰ سلطان کے احتمال رویت کا تو یہ اثر ہے اور ہم لوگوں پر حق تعالیٰ کی یقینی رویت کا اس سے آدھا بھی اثر نہیں۔

تو حضرت! جب علم کامل ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی رویت و معیت کا استحضار پوری طرح ہوتا ہے اس وقت ہرگز گناہ نہیں ہو سکتا۔ اسی کی نفی ہے حدیث **لایزنی الزانی حین یزنی و ھو مؤمن** میں اور اس سے معلوم ہو گیا کہ معصیت کے وقت جیسا کہ عمل منتفی ہوتا ہے اور عملاً غیبت ہوتی ہے علماً بھی غیبت ہوتی ہے۔ اگر علماً استحضار کامل ہوتا تو عملاً غیبت ہونا محال تھی اور ملکہ یادداشت والوں کو اس وقت جو استحضار ہوتا ہے وہ محض تصور ہے غلبہ استحضار نہیں۔ اگر غلبہ استحضار ہوتا تو ان کی معیت رویت کا بھی استحضار ہوتا اور اس وقت معصیت کا صدور دشوار ہو جاتا۔

غرض وہ بزرگ مجھ سے کہنے لگے کہ طریق میں اصل مجاہدہ ہے مشاہدہ کو میں نے بڑھا دیا ہے اور جس طرح مشاہدہ کے معنی میں آج کل غلطی کی جاتی ہے اسی طرح مجاہدہ کی حقیقت میں بھی آج کل غلطی کی جا رہی ہے۔

مجاہدہ کی حقیقت

لوگ مجاہدہ کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ بیوی بچوں کو چھوڑ دے۔ بس جہاں کوئی شاہ صاحب بنے وہ

اس کے ساتھ ہی سیاہ صاحب بن جاتے ہیں یعنی ان کا دل سیاہ ہو جاتا ہے بیوی بچوں پر ظلم کرنے لگتے اور ان سے الگ ہو جاتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں اپنے متعلق بھی اور اپنے مریدوں کے متعلق بھی کہ فلاں شخص جب سے ہم سے مرید ہوا ہے بیوی بچوں کو منہ نہیں لگاتا۔

چنانچہ نواب ڈھاکہ کو ایسے ہی پیروں نے ایک بیوی کی محبت سے منع کر رکھا تھا کہ یہ سبب بعد عن الحق ہوگا وہ بے چارے بڑے پریشان تھے جب میں گیا تو مجھ سے پوچھا کہ میں نے ایک نوعمر لڑکی سے شادی کی ہے جس سے میری طبیعت کو انس زیادہ ہے کیا یہ محبت مجھے مضر ہوگی! میں نے کہا ہرگز نہیں بلکہ سبب قرب حق اور موجب ثواب ہوگی کہنے لگے کہ مجھے تو لوگوں نے ڈرا رکھا ہے کہ یہ سبب بعد ہوگی میں نے کہا' سبحان اللہ! سبب بعد تو وہ محبت ہے جو رضائے حق کے خلاف ہو اور بیوی کے ساتھ محبت کرنے کا تو امر ہے یہ سبب بعد کیوں ہونے لگی بشرطیکہ اس محبت کی وجہ سے حقوق الٰہیہ میں کوتاہی نہ ہو اور اگر بیوی سے محبت کرنا مطلقاً سبب بعد ہے تو پھر تو معاذ اللہ حضور تک بات پہنچے گی کیونکہ حضرت عائشہؓ سے حضورؐ کو ایسی محبت تھی کہ اس کو درجہ عشق کہہ سکتے ہیں اور اگر اس وقت لفظ عشق کا استعمال معتاد ہوتا تو صحابہ اس کو عشق ہی سے تعبیر فرماتے۔

ایک دفعہ میں میرٹھ گیا چھوٹے گھر میں کا وہاں علاج کرانا تھا اس وقت بعض مستورات نے بیعت کی درخواست کی بعض عورتوں نے ان کو بہکایا کہ ان سے بیعت نہ ہو یہ تو اپنی بیوی کو ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں تم ہمارے پیر سے بیعت ہونا انہوں نے پچاس سال سے اپنی بیوی سے بات تک نہیں کی (گویا وہ ان کے زعم میں بڑے مجاہد اور تارک تھے ۱۲) وہ مسماۃ بہت سمجھدار تھیں اس کو سمجھیں کہ وہ تو پچاس سال سے خدا کا نافرمان ہے وہ ہرگز پیر بنانے کے قابل نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے تو جو شخص پچاس سال سے بیوی بچوں کو چھوڑے ہوئے ہے وہ تو نہایت ظالم ہے کہ پچاس سال سے حقوق العباد ضائع کر رہا ہے میں تو ہرگز اس سے بیعت نہ ہوں گی غرض وہ مسماۃ مجھ سے بیعت ہو گئیں اور ان کے اس جواب سے میں بہت خوش ہوا کہ الحمد للہ! اس کو دین کا فہم حاصل ہے۔

صاحبو! مجاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ معاصی کو مطلقاً ترک کرے اور یہ نفس کی مخالفت واجب ہے اور مباحات میں تقلیلاً مخالفت کرے اور یہ مخالفت مستحب ہے مگر ایسا مستحب ہے کہ مخالفت واجبہ کا حصول کامل اس مخالفت مستحبہ پر موقوف ہے جیسے بہت سونا' بہت کھانا' بہت عمدہ کپڑے پہننا' بہت باتیں کرنا' لوگوں سے زیادہ ملنا ملانا' سو ان سے تقلیل کرے مگر تقلیل ہر ایک کی اس کی حالت کے موافق ہے یہ نہیں کہ تم چھ گھنٹے سوتے ہو اور دوسرا سات گھنٹے سوتا ہے تو تم یہ کہنے لگو کہ ہم مجاہد ہیں اور وہ نہیں ممکن ہے کہ اس کی نیندیں دس گھنٹے روزانہ کی ہو اور تمہاری آٹھ کی تھی تم نے آٹھ گھنٹہ میں سے دو گھنٹہ کم کیے اور اس نے دس میں سے تین گھنٹے کم کیے تو اب بتلاؤ زیادہ مجاہد کون ہوا؟

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کا ایک مرید بہت کھاتا تھا ساری خانقاہ میں غل پڑ گیا کہ یہ تو حبشی ہے چار آدمیوں کے برابر کھاتا ہے آخر نقیب نے شیخ سے کہا کہ حضرت فلاں شخص کو نصیحت کر دیجئے کہ اپنی خوراک کم کرے وہ تو بہت ہی کھاتا ہے شیخ نے اس کو بلایا اور کہا بھائی اہل سلوک کو زیادہ نہ کھانا چاہئے اوسط مقدار اختیار کرنا چاہئے مرید میں شیخ کی صحبت سے فہم صحیح پیدا ہو گیا تھا وہ سمجھ گیا کہ شیخ کی مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی خوراک کے اعتبار سے اوسط کو اختیار کرے مگر چونکہ شیخ کو میری اصلی خوراک معلوم نہیں اس لئے موجودہ حالت کو اوسط سے زیادہ سمجھ رہے ہیں تو شیخ کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہئے کہنے لگا کہ حضرت ہر ایک کا اوسط الگ ہے حضرت میری اصلی خوراک پچاس روٹیوں کی ہے آپ کی بیعت سے پہلے میں اتنا ہی کھاتا تھا اب جب سے خانقاہ میں آیا ہوں پندرہ روٹیاں کھاتا ہوں تو فرمایئے اوسط ہے یا اوسط سے بھی کم اور دوسرے لوگ جو چار پانچ روٹیاں کھاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی خوراک بہت سے بہت سات آٹھ روٹیوں کی ہے ان کے حساب سے تو میں بہت ہی زیادہ مجاہدہ کرتا ہوں کہ پچاس کی بجائے پندرہ کھاتا ہوں جو اصل خوراک کا ثلث ہے بلکہ ثلث سے بھی کم اس کو سن کر شیخ نے کہا ہاں بھائی ہماری غلطی تھی بس تم اس سے کم مت کرنا تمہارے لئے یہی بڑا مجاہدہ ہے۔ جس شخص کو یہ پورا واقعہ اس تفصیل سے معلوم نہ ہو صرف اتنا معلوم ہو کہ فلاں شخص نے اپنے مرید کو پندرہ روٹیاں کھانے کی اجازت دی وہ تو ظاہر میں شیخ پر اعتراض کرے گا کہ اس نے اکل فوق الشبع کی اجازت دی مگر جس کو حقیقت معلوم ہوگی وہ کبھی اعتراض نہ کرے گا مشائخ پر اکثر اعتراضات حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان سے ایک چور بیعت ہوا اور چوری سے تائب ہو کر خانقاہ میں رہنے لگا دو چار دن تو اس نے صبر کیا پھر یہ حرکت شروع کی کہ خانقاہ والوں کی جوتیاں گڑبڑ کر دیتا کسی کا جوتا یہاں سے وہاں رکھ دیا کسی کا وہاں سے یہاں اب جو صبح کو ذاکرین اٹھتے ہیں تو کسی کو اپنا جوتا موقع پر نہیں ملتا بڑے پریشان ہوتے کہ یہ کس کی حرکت ہے اور کون اس طرح سب کو پریشان کرتا ہے آخر پہرہ دیا گیا اور ایک رات کو یہ حضرت پکڑے گئے صبح کو شیخ کے سامنے لائے گئے کہ حضرت آپ کے اس نئے مرید نے ساری خانقاہ کو پریشان کر رکھا ہے کسی کا جوتا صبح کو موقع پر نہیں ملتا ادھر ادھر پڑا ہوا ملتا ہے ہم نے پہرہ دیا تو معلوم ہوا کہ یہ حرکت ان حضرت کی ہے شیخ نے پوچھا کہ بھائی! تم لوگوں کو اس طرح کیوں پریشان کرتے ہو تم نے تو چوری سے توبہ کر لی تھی کہنے لگا سنیئے حضرت! میں نے چوری سے توبہ کی ہے ہیرا پھیری سے نہیں کی۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ میں جب سے آپ کے ہاتھ بیعت ہوا ہوں اسی دن سے چوری سے تائب ہو چکا ہوں مگر میری حالت یہ ہے کہ جب رات کو وہ وقت آتا ہے جس میں چوری کے لئے گشت کیا کرتا تھا تو اس وقت میری طبیعت پر چوری کا سخت تقاضا ہوتا ہے نفس کہتا ہے کہ چل کر چوری کر۔ میں اس کو دو تین روز تو ڈراتا دھمکاتا رہا اور تقاضے کو دباتا رہا مگر جب بہت غلبہ ہوا تو میں نے نفس سے اس پر صلح کر لی ہے کہ تو

خانقاہ والوں کی جوتیاں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں رکھ دیا کر۔ یہ بھی ایک قسم کی چوری ہے کیونکہ بلا اذن مالک تصرف ہے۔ اس عمل سے میرا وہ تقاضا فرو ہو جاتا ہے۔ اب اگر آپ اس کو گوارا فرمائیں فبہا ورنہ میں آج سے یہ حرکت چھوڑ دوں گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی اطلاع کرتا ہوں کہ پھر میں سچ مچ چوری میں مبتلا ہو جاؤں گا کیونکہ جب تقاضا پیدا ہوگا اور اس کی تسکین کی کوئی اور صورت ہوگی نہیں تو ممکن ہے کہ میں تقاضا سے مجبور ہو کر چوری کرنے لگوں اب آپ کو اختیار ہے جس شق کو چاہیں فرمالیں۔

شیخ نے فرمایا' بھائی! تجھ کو ہیرا پھیری کی اجازت ہے اور خانقاہ والوں سے کہا کہ تم اس کو معذور سمجھ کر معاف کرو۔ اس نے معصیت کبیرہ سے ایک صغیرہ پر نفس سے صلح کی ہے۔ اس کو صغیرہ سے روکنا گناہ کبیرہ میں مبتلا کرنا ہے۔

اب اس واقعہ کو ناتمام سن کر جہلاء تو اعتراض کرنے لگیں گے کہ شیخ نے ایذائے مسلم کی اجازت دی ہے مگر یہ خبر نہیں کہ اس نے کبیرہ سے بچا کر صغیرہ کو اس کا وقایہ بنایا۔ اور اس صغیرہ کی اجازت اس لئے نہ تھی کہ اس کو گناہ میں مبتلا رکھیں۔ بلکہ اس لئے تھی کہ سرقہ کا تقاضا مٹا دیا جائے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ صغیرہ بھی مٹ جائے گا۔

یہی راز ہو سکتا ہے موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا کہ انہوں نے ساحران فرعون سے فرمایا تھا۔ **القوا ماانتم ملقون** (جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ڈالو) بظاہر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ساحران فرعون کا سحر تو کفر یا معصیت تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس سحر کی اجازت کیوں دی۔ جواب یہ ہے کہ یہ اجازت ابقاء کفر کے لئے نہ تھی بلکہ اس سے احقاق حق اور ابطال باطل مقصود تھا کیونکہ جب وہ لوگ اولاً اپنا سحر ظاہر کریں گے اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا سب کو فنا کر دے گا تو اس طرح اظہار حق کامل طور سے ہوگا۔ اس مصلحت اظہار حق کے لئے انہوں نے فرمایا تھا۔

القوا ماانتم ملقون وعندی جواب اخروهوان الامرهناک للتعجيز القوا ماانتم ملقون فانی لا اعباء به فافعلوا ماشئتم کما فی قوله تعالى فمن شاء فليكفر.

(میرے نزدیک ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں پر اجازت دینا ان کو عاجز کرنے کے لئے تھا۔ یعنی تم جو کچھ سحر بندی کر سکتے ہو کرو۔ میں پہلے سے تم کو روکتا نہیں۔ تاکہ ان کی کامل سحر بندی کے بعد اس کو تار عنکبوت کی طرح ختم کر دیں اور وہ عاجز ہو کر اقرار کریں حق کا۔)

تو یہ اجازت ابقاء سحر کو مٹانے کے لئے تھی کیونکہ اس کے مٹانے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا کہ اول وہ اپنی کوشش کو ظاہر کریں بعد میں موسیٰ علیہ السلام کا عصا نہایت سہولت سے دفعۃً سب کو مٹا

دے یہ آیت صوفیہ کے اس طرز عمل کی دلیل ہے جس سے بعض اہل ظاہر متوحش ہوتے ہیں کہ انہوں نے منکر شرعی کی اجازت دی حالانکہ وہ منکر کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اس کو جڑ سے مٹانا چاہتے ہیں جس کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔

مجاہدہ کی صورت

یہ گفتگو مجاہدہ پر چلی تھی کہ لوگ اس کے معنے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ غرض اپنے حال پر دوسروں کو قیاس نہ کرو کہ تم چار روٹی کھاتے ہو دوسرا دس کھاتا ہے تو اس کو غیر مجاہد سمجھ لو۔ یا تم ایک وقت کھاتے ہو دوسرا دو وقت کھاتا ہے تو اس کو غیر مجاہد کہنے لگو۔ ممکن ہے کہ اس کی عادت چار وقت کھانے کی ہو اس کے لئے دو وقت پر اکتفا کرنا ہی مجاہدہ ہے اسی طرح اگر ایک بزرگ ہنستے ہوں دوسرے بالکل نہ ہنستے ہوں تو اس سے یہ مت سمجھو کہ ہنسنے والا مجاہد نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے دل پر زیادہ آرے چلتے ہوں مگر کسی مصلحت سے ضبط کر کے ہنستا ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت حدیث میں آتا ہے کان کثیر التبسم کہ آپ ہنس مکھ تھے۔ اکثر باتوں میں تبسم فرمایا کرتے تھے۔ مگر اس سے کوئی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ آپ بے فکر تھے۔ نعوذ باللہ! آپ کی حالت یہ تھی کہ حدیث میں یہ بھی آتا ہے۔

كان دائم الفكرة متواصل الاحزان

(کہ آپ ہمیشہ فکر مند اور غمگین رہا کرتے تھے۔ اور حدیث میں آتا ہے کہ جب آپ نماز پڑھتے تو رویا کرتے تھے۔)

ولصدره ازيز كازيز المرجل

اور آپ کے سینے میں سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے ہانڈی میں سے پکتے ہوئے آواز نکلتی ہے۔

اور ایک حدیث میں آپ فرماتے ہیں۔

ودت ان اقتل في سبيل الله ثم احيى ثم اقتل ثم احيى ثم اقتل.

(تاریخ بغداد للخطیب ۴:۷)

(میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستہ میں قتل ہوں پھر زندہ ہوں پھر قتل ہوں پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں)

اس سے سمجھ لیجئے کہ حضورؐ پر کیا حالت گزرتی تھی۔ وہ کیسا اشتیاق اور غلبہ حب تھا جس کی وجہ سے آپ یوں بار بار قتل فی سبیل اللہ کی تمنا فرما رہے ہیں۔ مگر پھر آپ کا گاہے تبسم فرمانا مصلحت کی وجہ سے تھا کہ آپ اپنی حالت کو ضبط کر کے تبسم فرماتے تھے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں کسی نے کوئی شعر پڑھ دیا۔ سب لوگ مست و مضطرب ہوئے مگر حضرت جنید کو جنبش بھی نہ ہوئی کسی نے پوچھا حضرت کیا بات ہے کہ آپ پر سماع کا اثر نہ ہوا فرمایا۔

و تری الجبال تحسبها جامدة و هی تمر مر السحاب

(قیامت میں نفخ صور کے وقت تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ سمجھو گے کہ وہ (ایک جگہ) جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے)

اور فرمایا میرے بدن کو انگلی لگاؤ۔ انگلی لگانے کے ساتھ ہی خون کا فوارہ جوش زن ہوا۔ اسی طرح سماع میں کاملین بہت دور پہنچ جاتے ہیں مگر ظاہر میں حرکت نہ ہونے سے ناقص یہ سمجھتا ہے کہ ان پر اثر نہیں ہوا۔ حالانکہ ان کو ضبط کامل کی وجہ سے حرکت نہیں ہوتی۔

حضرت شیخ عبدالحق ردولوی ہمارے مشائخ میں بڑے صاحب کمال تھے مگر اسی کے ساتھ باضابطہ بھی بہت تھے غلبہ حال کی تو یہ کیفیت تھی کہ جامع مسجد میں چالیس سال تک پنج وقتہ نماز باجماعت پڑھی مگر راستہ کبھی یاد نہیں ہوا۔ حضرت کے خادم بختیار آگے آگے حق حق پکارتے تھے ان کی آواز پر شیخ چلتے تھے اور اسی طرح مسجد تک پہنچتے تھے۔

ایک دفعہ حال کا غلبہ ہوا تو اسی مغلوبیت میں کسی طرف کو چل کھڑے ہوئے اور وطن سے بہت دور ایک دریا کے کنارہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ تین دن کے بعد افاقہ ہوا تو بختیار سے دریافت فرمایا کہ آہا! یہاں ندی کب سے ہو گئی۔ انہوں نے عرض کیا حضرت آپ وطن میں نہیں ہیں فرمایا تو گھر چلو گھر والے پریشان ہوں گے۔ یہ غلبہ حال کی کیفیت تھی اور ضبط کی یہ حالت تھی کہ کبھی زبان سے شطحیات کا ایک کلمہ بھی نہ نکلا۔ فرمایا کرتے تھے منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ (منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ برداشت نہ کر سکا) مگر وہ قطرہ بھی غضب کا تھا جیسا کسی نے کہا ہے۔

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں یک قطرہ آب خوردن و دریا گریستم

(اے اللہ محبت کا یہ چشمہ کیسا ہے کہ میں نے ایک قطرہ پیا اور دریا بقدر رو دیا۔)

آگے فرماتے ہیں ہے کہ۔

"ایں جا مردانند کہ دریا ہا فرو بردہ اندو آروغ نہ زنند"

(یہاں ایسے لوگ بھی ہیں کہ دریا کے دریا پی گئے اور ڈکار بھی نہ لی۔)

آداب جلوت وخلوت

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کیا پوچھنا۔ آپ نے تو دریا پئے ہیں۔ پھر حضور اگر یہ فرمائیں۔ وددت ان اقتل ثم احیی۔ تو کیا بعید ہے۔ آپ پر تو نامعلوم کیا کیا حالتیں گزرتی ہوں گی۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضور تو تمنا فرما رہے ہیں اور شیخ احمد جام یہ فرماتے ہیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگرست

تسلیم و رضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے زندگی ملتی ہے۔

(جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ حالت حاصل ہے کبھی کشتہ ہوتے ہیں کبھی زندہ۔)

جواب یہ ہے کہ جو بات ان کو حاصل ہے وہ قتل باطنی ہے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ حاصل ہے اور جس امر کی آپ تمنا فرما رہے ہیں وہ قتل ظاہری ہے اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عدم ضحک پر تعجب نہیں بلکہ آپ کے تبسم پر تعجب ہے کہ آپ کو ان حالات و کیفیات کے ساتھ تبسم بھی کیسے رہتا تھا ایک حدیث میں آپ کا خود ارشاد ہے۔

لو تعلمون ما اعلم لضحكتم قليلا و لبكيتم كثيرا (سنن الترمذی ۲۳۱۲، ۲۳۱۳، سنن ابن ماجة: ۴۱۹۰، ۴۱۹۱، مسند الإمام أحمد ۲.۲۵۷.)

"اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے جو مجھ کو معلوم ہے تو تم کم ہنستے اور زیادہ روتے"۔

مگر آپ کے تبسم کا راز وہ تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مناظرہ میں حضرت حق جل عزہ کے محاکمہ سے ظاہر ہوا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر خشیت کا بہت غلبہ تھا اور زیادہ وقت رونے میں گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ روتے روتے رخساروں کا گوشت گل کر گر پڑا تھا۔ کیونکہ آنسوؤں میں ایک قسم کا تیزاب ہے اس لئے آپ کی والدہ روئی کے پھائے رخساروں پر چپکا دیا کرتی تاکہ بدنما نہ معلوم ہوں۔ حضرت زکریا علیہ السلام جب عذاب نار کا ذکر فرماتے تو پہلے یہ دریافت کر لیتے تھے کہ اس مجلس میں یحییٰ علیہ السلام تو نہیں ہیں۔ جس مجلس میں وہ ہوتے اس میں عذاب کا ذکر نہ فرماتے تھے تو ایک مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا اے یحییٰ تم تو اتنا روتے ہو گویا تم کو خدا تعالیٰ سے رحمت کی امید ہی نہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا اے عیسیٰ تم اتنا ہنستے ہو گویا تم کو قہر الٰہی کا اندیشہ ہی نہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو جواب دے دیا۔ اب حضرت حق کی طرف سے فیصلہ صادر ہوا۔ وحی نازل ہوئی کہ اے یحییٰ خلوت میں تو تم ایسے ہی رہو جیسے اب ہو اور مخلوق کے سامنے ویسے رہو جیسے عیسیٰ علیہ السلام ہیں یعنی ہنستے اور تبسم کرتے رہا کرو۔ بندوں کے سامنے زیادہ نہ رویا کرو۔ کہیں ہمارے بندوں کا دل نہ ٹوٹ جائے اور مایوس نہ ہو جائیں۔ اللہ اللہ! حق تعالیٰ کو اپنے بندوں کی کس قدر رعایت ہے کہ ان کا دل نہ ٹوٹنے۔

عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ اے عیسیٰ ہمارے بندوں کے سامنے تو تم ویسے ہی رہو جیسے اب تک ہو اور خلوت میں ایسے رہو جیسے یحییٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی خلوت میں ہمارے عذاب کو یاد کر کے رویا کرو۔ عجیب فیصلہ ہے جس میں ہر ایک کو اس کی حالت سے کچھ کچھ ہٹایا گیا ہے ویسے ہی فیصلہ ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان فرمایا تھا۔

ایک بار رات کو حضرت عمر کو دیکھا خوب بلند آواز سے نماز میں قرائت کر رہے ہیں اور حضرت ابوبکر کو دیکھا کہ بالکل آہستہ پڑھ رہے ہیں۔ صبح کو ہر ایک سے سوال فرمایا کہ اے ابوبکر تم اتنا آہستہ

کیوں پڑھ رہے تھے۔ عرض کیا کنت اسمع من اناجی۔ یارسول اللہ! جس سے میں مناجات کر رہا تھا اس کو سنا رہا تھا اور حق تعالیٰ تو آہستہ کو بھی سنتے ہیں۔ حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ تم چلا کر کیوں پڑھ رہے تھے؟ عرض کیا کنت اطرد الشیطان و اوقظ الوسنان۔ کہ میں شیطان کو بھگاتا اور اونگھنے والوں کو جگاتا تھا تا کہ وہ بھی اٹھ کر خدا تعالیٰ کو یاد کریں۔ حضور نے فیصلہ فرمایا۔

یابابکر ارفع قلیلا و یا عمر اخفض قلیلا" (یا ابا بکر ارفع من صوتک
شیئا: سنن ابی داود کتاب التطوع باب: ۲۶ الدر المنثور ۴: ۲۰۷)

اے ابوبکر! تم کسی قدر اپنی آواز کو بڑھا دو اور اے عمر! تم کسی قدر آواز پست کر دو۔

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک کو ان کی طبیعت سے نکال کر دوسرے مرکز پر ڈالا ہے پھر آپ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ولا تجھر بصلاتک ولا تخافت بھا و ابتغ بین ذالک سبیلاً

اپنی نماز کو پکار کر نہ پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔ یہ تو صحابہ کا اختلاف تھا جس کا فیصلہ حضور نے فرمایا کیونکہ صحابہ سے حضور بڑھے ہوئے ہیں اور وہ نبیوں کا اختلاف تھا جس میں فیصلہ حق تعالیٰ نے فرمایا کیونکہ نبیوں سے بجز خدا تعالیٰ کون بڑھا ہوا ہے۔

اس واسطے ہمارے ماموں صاحب فرماتے تھے کہ یہ جو مشہور ہے ولی را ولی می شناسد۔ یہ صحیح نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ولی را نبی می شناسد شناسد و نبی را خدا می شناسد کیونکہ ولی کو دوسرا ولی بعض دفعہ نہیں پہچان سکتا۔ ہاں نبی البتہ پہچانتا ہے کیونکہ اس کا مقام مقام ولی سے اعلیٰ ہے اور نبی کو گو نبی بھی پہچان سکتا ہے لیکن چونکہ انبیاء نبوت میں سب برابر ہیں اس لئے فیصلہ ان کا حق تعالیٰ ہی فرما سکتے ہیں۔

تو حضور کے تبسم میں حکمت وہ تھی جس کی بناء پر یحییٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہمارے بندوں کے سامنے ہنستے ہوئے رہا کرو تا کہ مخلوق دل شکستہ نہ ہو کہ جب یہ نبی ہو کر اتنے خائف ہیں تو بس ہمارا تو کیا ہی حال ہوگا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کمالات میں سب انبیاء سے زیادہ ہیں تو کیا آپ کو یحییٰ علیہ السلام کے برابر خوف وخشیت نہ تھا یقیناً تھا مگر آپ حکمت کی وجہ سے ضبط کر کے تبسم فرماتے تھے اور اسی لئے کبھی کبھی مزاح بھی فرماتے تھے۔

اتباع حکمت

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آپ اپنی طبیعت سے کچھ کام نہ کرتے تھے۔ یہ سوال اسی وقت ذہن میں آیا اس سے پہلے کبھی اس طرف التفات نہیں ہوا۔ اور اس کا جواب بھی ۶۵ برس کی عمر میں آج ہی عطا ہوا۔

جواب یہ ہے کہ حضور صاحب طبیعت بھی تھے مگر اتباع حکمت بھی آپ کی طبیعت بن گئی تھی۔

اپنی طبیعات کو حضور کی طبیعات پر قیاس نہ کرو۔ ہمارے طبیعات طبعی محض ہیں اور آپ کی طبیعات حکمت کے موافق ہیں۔ اب جو کام طبیعت سے بھی صادر ہوتا تھا حکمت کے موافق ہوتا تھا۔ الحمدللہ ۶۵ سال کے بعد آج یہ علم عظیم حاصل ہوا۔

اشکال کا منشا یہ ہے کہ ہم نے حضور کی طبیعت کو اپنی طبیعت پر قیاس کیا کہ جس طرح بعض دفعہ ہم تقاضائے طبیعت سے ہنستے اور مزاح کرتے ہیں جس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی یوں ہی حضور بھی تقاضائے طبیعت سے ہنسے اور مزاح کرتے ہوں گے۔ کوئی حکمت نہیں طبیعت سے ایسا کرتے تھے پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہوگا کہ آپ کے تبسم میں یہ حکمت تھی اور مزاح میں یہ حکمت تھی۔ کیونکہ حکمتیں افعال اختیاریہ میں ہوتی ہیں نہ کہ اضطراریہ میں۔ اور اگر آپ ہمیشہ ہر کام حکمت و اختیار سے کرتے تھے تو پھر یہ اشکال ہے کہ کیا طبیعت سے کچھ بھی نہ کرتے تھے اور یہ بظاہر دشوار ہے۔

بحمداللہ! میرے جواب سے اشکال حل ہوگیا کہ آپ طبیعت سے بھی بعض کام کرتے تھے مگر وہ طبیعت بالکل حکمت کے موافق تھی اور خود اتباع حکمت آپ کی فطرت و طبیعت بن گئی تھی۔

كما قالت عائشة كان خلقه القران اى اتباعه وهوالحكمة (مسند الإمام أحمد۶:۹۱، ۱۶۳، السنن الكبرى للبيهقى۲:۴۹۹، إتحاف السادة المتقين۷:۹۲، ۳۱۸، كنز العمال:۱۸۳۷۸، ۱۸۷۱۸، تفسير ابن كثير۵.۴۵۳.)

(جیسا کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا۔ مطلب یہ کہ قرآن کا عملی نمونہ آپ کی ذات بابرکت تھی۔ قرآن کی اتباع کرنا جو کہ مقصود اصلی ہے وہی آپ کا خلق تھا)۔

خوب سمجھ لو اور حضور کی طبیعت کو اپنی طبیعت پر قیاس نہ کرو۔ مولانا اسی قیاس کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد   کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر   ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

(تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اولیاء اللہ کو نہیں پہچانا اور کہنے لگے کہ ہم بھی انسان ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں اور ہم بھی کھاتے پیتے ہیں۔)

یعنی کفار اسی سبب سے تو گمراہ ہوئے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو اپنے اوپر قیاس کیا اور یہ سمجھا کہ یہ بھی ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں۔ پھر فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر   گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو گرچہ لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہیں (حالانکہ شیر ایک درندہ کا نام ہے اور شیر دودھ کو کہتے ہیں)

اس کے بعد مولانا نے ایک سوداگر کی طوطی کی حکایت لکھی ہے کہ وہ بہت بولتی اور باتیں کرتی تھی جس کی وجہ سے دکان بہت بارونق تھی۔ ایک دن سوداگر کسی کام کو گیا اور طوطی پنجرہ سے باہر بیٹھی تھی۔ ایک بلی نے اس پر حملہ کیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر ایک سمت کو اڑی۔ اس سے روغن بادام کی شیشی گر کر سب روغن ضائع ہو گیا۔ سوداگر جو واپس آیا اور روغن بادام کی شیشی کو گرا ہوا پایا تو طوطی پر اسے بہت غصہ آیا اور اسے بہت مارا یہاں تک کہ گنجا کر دیا۔ اب طوطی نے بولنا موقوف کر دیا۔ دوسرے وقت آقا نے اس سے باتیں کیں اس نے جواب ہی نہ دیا جب کئی دن اسی طرح ہو گئے تو وہ اپنی حرکت پر بہت نادم ہوا اور اپنے کو کوسنے لگا کہ میرے یہ ہاتھ کیوں نہ ٹوٹ گئے جن سے میں نے اس کو مارا تھا۔ میری دکان کی رونق ہی جاتی رہی۔ جب کسی طرح طوطی نہ بولی تو اس نے درویشوں بزرگوں سے دعا کرانا شروع کی مگر وہ جب بھی نہ بولی۔ اتفاق سے ایک دن اس کی دکان کے سامنے ایک گنجا گزرا تو طوطی نے اس کو پکارا اور کہا۔

از چہ اے کل باکلاں آمیختی تو مگر از شیشہ روغن ریختی
از قیاسش خندہ آمد خلق را کو چو خود پنداشت صاحب دلق را

(اے گنجے تو گنجوں میں کیونکر آ ملا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے بھی شیشی میں سے تیل گرایا ہوگا۔)

طوطی کے اس قیاس پر سب لوگوں کو ہنسی آ گئی کہ اس نے گنجے فقیر کو بھی اپنے ہی اوپر قیاس کیا۔

یہی حال ہمارے قیاس کا ہے کہ ہم اپنی طبیعات پر انبیاء کے طبیعات کو قیاس کرتے ہیں۔ بھلا جس کے سامنے اس قدر مہالک وخطرات ہوں کہ دوزخ کو بھی دیکھ ہو ملکوت سموات وارض کا مشاہدہ کیا ہو اس کو ہماری طرح بے ساختہ تبسم کیونکر ہو سکتا ہے اور سب سے زیادہ مشاہدہ تو ذات تھا۔ جس کو ذات سے بلاواسطہ خشیت ہو اور عظمت وجلال ذات کا مشاہدہ ہو چکا ہو وہ تو سب سے زیادہ صاحب خشیت ہوگا اور اس کی جان پر نہ معلوم کتنی مرتبہ قتل وحیات کا توارد ہوتا ہوگا۔

روح اعمال

تو یہ نہ کہا جائے کہ احمد جام تو "ہر زماں از غیب جان دیگر ست" (ہر زمانہ میں غیب سے دوسری جان عطا ہوتی ہے) کہتے ہیں اور حضورؐ اس کی تمنا فرما رہے ہیں۔ ارے حضورؐ کو تو ایسی ایسی ہزار شہادتیں حاصل تھیں اور وہاں تو یہ حال تھا۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(آدھی جان لیتے ہیں اور سو جانیں عطا کرتے ہیں جو خواب وخیال میں نہیں آتا وہ کرتے ہیں)

احمد جام کو تو ایک ہی جان ملتی ہوگی۔ حضورؐ کو تو ہر ساعت میں صد جان بلکہ ہزار جان عطا ہوتی تھیں۔ اس حدیث میں حضورؐ نے اس شہادت معنویہ کی طلب نہیں کی بلکہ شہادت حسیہ کی طلب فرمائی ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ ظاہر بھی بیکار نہیں ورنہ شہادت معنویہ کے ہوتے ہوئے حضورؐ کو ظاہری شہادت کی طلب کیوں تھی۔ بعض لوگوں نے ظاہر کے تعطل پر مولانا رومی کے اس شعر کو سند بنا لیا ہے۔

پنج وقت آمد نماز اے رہنموں　　　　عاشقاں ہم فی صلوۃ دائموں

اے صاحب نماز تو پانچ وقت ہی فرض کی گئی ہے مگر عشاق ہر وقت نماز میں معروف ہیں۔

کہ نماز کے پانچ وقت عام طور سے مقرر ہیں مگر عشاق ہر دم نماز میں ہیں۔ اس سے انہوں نے یہ مطلب نکالا ہے کہ جو نماز عشاق کی ہر دم ہے وہ یہ نماز بہیئت مخصوصہ تو ہے نہیں کیونکہ یہ ہر دم نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوا کہ عشاق کی نماز دوسری ہے۔ یعنی حضور القلب مع اللہ پس اس کے ہوتے ہوئے نماز ظاہری کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مولانا کے کلام سے یہ مضمون کیوں کر نکلا کہ اس کے ہوتے ہوئے نماز ظاہری کی ضرورت نہیں بلکہ پہلا مصرع تو نماز پنجوقتہ کی ضرورت پر دال ہے کیونکہ فرماتے ہیں۔

پنج وقت آمد نماز اے رہنموں

یعنی نماز پانچ وقت کی تو وارد اور ثابت ہے ہی۔ اب اگلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ عشاق ان پانچ وقتوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نماز میں رہتے ہیں۔

بعض صوفیہ کی یہ غلطی ہے کہ وہ طاعات معنویہ کے ساتھ حسیہ کو بیکار سمجھتے ہیں اور طلبہ کی یہ غلطی ہے کہ وہ حسیہ کے سامنے معنویہ کو بیکار سمجھتے ہیں۔ باطن ہوتے ہوئے ظاہر کی ضرورت کا راز یہ ہے کہ محض روح کی ترقی قرب مقصود کے لئے کافی نہیں ورنہ ہم عالم ارواح ہی میں رہتے دنیا میں کیوں آتے کیا نعوذ باللہ! حق تعالیٰ تمہارے بدخواہ ہیں جو خواہ مخواہ راحت سے نکال کر تم کو کلفت میں بھیجا نہیں بلکہ اس میں راز یہی ہے کہ جو درجہ قرب کا مقصود تھا وہ اعمال خاصہ صلوۃ وصوم وغیرہ پر موقوف تھا۔ اس لئے عالم ارواح میں رہ کر تم کو حاصل نہ ہو سکتا تھا پس جس طرح روح کی ترقی کے لئے جسم کی ضرورت ہے اسی طرح اعمال میں بھی ایک روح ہے ایک قالب ہے اور دونوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ روح صلوۃ بدوں صورت صلوۃ کے کامل نہیں ہو سکتی روح صوم بدوں صورت صوم کے کامل نہیں ہو سکتی وعلی ہذا القیاس ورنہ اگر تمہارے نزدیک اعمال میں روح ہی کافی ہے تو بیٹے کی بھی روح ہی کافی ہونا چاہئے۔ پھر اس کے مرنے پر کیوں روتے ہو۔ کیونکہ روح تو ظاہر بھی موجود ہے۔ صرف جسم ہی تو مرا ہے۔ معلوم ہوا کہ باطن کے ساتھ ظاہر بھی ضروری ہے پس حضورؐ کا شہادت حسیہ کو طلب فرمانا یہ اس جمع بین الصلوۃ والمعنی کی طلب ہے۔

جنت کی نعمتیں

یہ سب گفتگو مجاہدہ پر چلی تھی۔ تو ان بزرگ نے فرمایا کہ طریق میں عمل مجاہدہ ہے میں نے کہا اچھا اب بتلایئے کہ آپ کا جی سماع کو چاہتا ہے۔ کہا ہاں! میں نے کہا ہمارا جی چاہتا ہے مگر ہم نہیں سنتے اور تمہارا جب جی چاہتا ہے جب ہی سن لیتے ہو۔ اب بتلاؤ مجاہد کون ہے؟ ولولہ تو ہم کو بھی بہت ہوتا ہے مگر ہم اپنے شوق کو روکتے ہیں تاکہ معاصی کی طرف شوق نہ ہو اور ساری عمر اس شوق کو دبائے رہیں گے۔

انشاء اللہ تعالیٰ بس اس بھروسہ پر نفس کو مارے ہوئے ہیں کہ جنت میں سنیں گے تو بتلاؤ مجاہدہ ہم نے کیا یا تم نے اس جواب پر وہ بزرگ لاجواب ہو گئے اور اپنی غلطی کو تسلیم کیا۔

شاید تم یہ کہو کہ جب گانا بجانا جنت میں ہوگا تو یہ بہت اچھا کام ہے۔ پھر دنیا میں بھی جنت کا کام کرنا چاہیے میں کہتا ہوں کہ جنت میں تو بہت کچھ ہوگا۔ وہاں تو نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے اور وہاں شراب بھی پینے کو ملے گی اور ستر حوریں بعض کو ملیں گی اور وہاں پر مرد ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنیں گے۔ ریشم کے کپڑے پہنیں گے۔ تو کیا یہ کام بھی تم دنیا میں کرو گے؟

جیسے ایک بوڑھے مولوی صاحب جو زنانہ طبیعت رکھتے تھے کہتے تھے کہ گوٹہ لچکہ پہننے کو بہت ہی جی چاہتا ہے۔ بعضوں کی طبیعت میں فطرۃ زنانہ پن ہوتا ہے اور جیسے ایک طالب علم نے حدیث میں حضرت عائشہ کے فضائل اور ان کے ساتھ حضور کی محبت کا حال سن کر کہا کاش میں عائشہ ہوتی یا ہوتا۔ طلباء نے کہا سبحان اللہ آپ کو یہ طلب نہ ہوئی کہ میں ابوبکرؓ عمرؓ ہوتا۔ طلب بھی ہوئی تو یہ کہ عائشہ ہوتا۔

اسی طرح ایک بادشاہ کے لڑکے میں زنانہ پن تھا۔ بادشاہ نے بہت تدبیر کی کہ اس میں مردانگی اور شجاعت پیدا ہو گھوڑے کی سواری اور ہتھیار چلانا بھی سکھایا مگر اس کی طبیعت سے یہ مادہ نہ نکلا۔
لوگوں نے کہا اس کو شاہنامہ پڑھایئے کیونکہ اس میں شجاعت و بہادری کے ایسے ایسے اشعار ہیں۔

بزور نبرد آں یل ارجمند　　بشمشیر و خنجر بگرز و کمند
یلاں را سر و سینہ و پاؤ دست　　برید و درید و شکست و بہ بست

(اے بلند مرتبہ بہادر پوری قوت سے ان کا سامنا کر یعنی تلوار خنجر گرز اور کمند سے دشمن کا مقابلہ کر۔ مد مقابل دشمنوں کے سر سینہ اور ہاتھ پاؤں کو قطع کر دے اور پھاڑ دے اور شکست دے دشمنوں کو اور باندھ دے۔

بادشاہ نے اس پر بھی عمل کیا اور ایک استاد شاہنامہ پڑھانے کے لئے رکھا گیا سال بھر کے بعد امتحان کیا گیا کہ دیکھیں اس میں کچھ بہادری پیدا ہوئی یا نہیں۔ کہا گیا کہ کوئی مقام کتاب کا سناؤ تو آپ نے یہ مقام نکالا۔

منیرہ منم دخت افراسیاب　　برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

"میں منیرہ ہوں افراسیاب کی بیٹی۔ جس کے بدن کو آفتاب نے بھی کبھی نہیں دیکھا"۔ لوگ ہنس پڑے کہ شاہنامہ پڑھ کر بھی آپ کو منیرہ ہی بننے کا شوق ہوا۔

غرض طبیعت نہیں بدلا کرتی۔ دوسرے آپ کو معلوم بھی ہے کہ جنت میں یہ نعمتیں کس کو ملیں گی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دنیا میں ان کو ترک کرے گا اس کو جنت میں یہ نعمتیں ملیں گی میں نے ایک مضمون پہلے بھی بیان کیا ہے اب پھر کہتا ہوں کہ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت میں اہل جنت کو اول زمین کی روٹی کھلائی جائے گی اس پر بعض نے یہ شبہ کیا ہے کہ کیا ڈلے پتھر کھلائے جائیں گے۔ اس کا

جواب بھی میں نے پہلے دیا ہے کہ ڈلے پتھر نہیں کھلائیں گے بلکہ زمین کا جوہر کھلایا جائے گا۔ اور زمین کا جوہر وہ ہے جو گیہوں میں سے نکال کر آپ کھاتے ہیں۔ آخر گیہوں کیا چیز ہے اجزاء ارضیہ ہی تو ہیں اسی طرح انار انگور سیب نارنگی کیلا پھلی اور آم وغیرہ جو آپ کھاتے ہیں یہ کیا ہیں یہ بھی تو زمین ہی کے اجزاء ہیں لیکن آپ اگر زمین کو چھانیں گے تو بجز خاک کے کچھ حاصل نہ ہوگا حق تعالیٰ کے پاس ایسی چھلنی ہے جس سے وہ یہ لذیذ جواہر زمین سے نکال کر آپ کو کھلاتے ہیں۔ پس اسی طرح قیامت میں حق تعالیٰ اسی جوہر کو جو حبوب وغلات وفواکہ وثمرات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے زمین سے نکال کر مسلمانوں کو کھلائیں گے۔ اب غور کر لیجئے کہ وہ جوہر کتنا لذیذ ہوگا جس میں یہ سب لذائذ مجتمع ہوں گے۔

تو اہل حقائق نے فرمایا کہ اصل میں یہ ضیافت سب کے لئے مقصود نہ ہوگی بلکہ خاص تارکین لذات دنیا کے لئے ہوگی۔ باقی سب طفیلی ہوں گے اور اس میں راز یہ ہوگا کہ جن لوگوں نے دنیا میں لذائذ کو ترک کیا ہے حق تعالیٰ ان کو دخول جنت سے پہلے تمام لذائذ دنیا کا مزہ چکھائیں گے کہ لو دیکھ لو دنیا کی لذائذ یہ تھیں۔ اب جنت کی لذائذ کو چکھو اور ان کا ان سے مقابلہ کرو۔ تو یہ دولت بدولت ترک ہی ملے گی۔

حدیث سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے حدیث میں ہے کہ جو شخص دنیا میں شراب پئے گا وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا اور جو شخص دنیا میں ریشم پہنے گا آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔ اس سے یہ صاف سمجھا جاتا ہے کہ جو شخص دنیا میں لذائذ کو ترک کرے گا وہ آخرت میں ان لذائذ سے زیادہ بہرہ ور ہوگا۔

ترک لذات

یہاں بعض کو اشکال ہوا ہے کہ ترک لذات مباحہ رہبانیت وبدعت ہے تو اس پر اجر کیسے ملے گا۔ سو اس کی حقیقت سمجھئے کہ تارکین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کو بوجہ افلاس کے یہ لذائذ ملے ہی نہیں اور ایک وہ جن کو لذائذ ملے اور پھر ترک کیا۔ پہلی قسم پر کوئی اشکال نہیں۔ لیکن پھر اس دوسری قسم میں دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ترک لذات کو عبادت سمجھ کر ترک کیا یہ البتہ قابل اعتراض ہے اور بدعت ہے کیونکہ ترک لذات کو عبادت سمجھنا نصوص کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ عبادت سمجھ کر ترک نہیں کیا بلکہ بطور معالجہ و اصلاح نفس کے ترک کیا۔ جیسا کہ بیماری میں حکیم کے کہنے سے بہت سی لذات سے پرہیز کرتا ہے وہ اس کو عبادت نہیں سمجھتا بلکہ محض علاج و تدبیر سمجھتا ہے۔ سو جن محققین صوفیہ سے ترک لذات منقول ہے وہ صرف علاج و تدبیر کے طور پر ترک کرتے تھے اس لئے ان پر اعتراض کا حق نہیں۔

یہاں ایک بات طالب علموں کے کام کی ہے وہ یہ کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ جو دنیا میں شراب پئے اور حریر پہنے گا وہ آخرت میں ان سے محروم رہے گا۔ اس میں بعض علماء نے تو یہ کہا ہے کہ ایک خاص زمانہ تک محروم رہیں گے۔ دخول اولیٰ میں یہ نعمتیں ان کو نہ ملیں گی اور بعض نے کہا ہے کہ دواماً محروم رہیں گے۔

اس معصیت کا یہ اثر ہے کہ اس کے ارتکاب سے آخرت میں اس کی نظیر سے محرومی ہوگی۔ جیسے معتزلہ کے بارہ میں بعض علماء نے کہا ہے کہ بوجہ انکار رویئت کے آخرت میں یہ لوگ رویئت حق سے محروم رہیں گے گو جنت میں جائیں گے کیونکہ معتزلہ کافر نہیں مسلمان ہیں۔ مگر اس معصیت سے اعتقاد کی یہ نحوست ہوگی کہ جنت میں جا کر بھی رویت سے محروم رہیں گے اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ تم تو رویت حق کو جنت میں بھی محال سمجھتے تھے تو بس اب تم محال کی تمنا نہ کرو تم کو رویئت نہ ہوگی۔

یہ جواب ایسا ہی ہے جیسا کہ سرسید کے جواب میں مولوی محمد علی صاحب تحصیلدار نے فرمایا کہ سرسید نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مولوی صاحبان شب قدر کے وقوع کے قائل ہیں۔ ہم تو بہت راتوں میں بیدار رہے' بدقسمتی سے ہم کو تو کبھی نظر نہ آئی۔ نہ معلوم کیا وجہ ہے۔ تو مولوی محمد علی صاحب لکھتے ہیں کہ وجہ تو تم خود بتلا رہے ہو یعنی بدقسمتی' پھر ہم سے کیا پوچھتے ہو۔ بڑے مزے کا جواب ہے اسی طرح ایک فرقہ باطلہ کا اعتقاد ہے۔

سگ و خوک است و میت و کافر

یعنی ان کے نزدیک مسلمان میت بھی کتے اور سور کی طرح ناپاک نجس العین ہے۔ اہل حق کا مذہب یہ نہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا مردہ اصل میں پاک ہے اور غسل نجاست عارضہ کے ازالہ کے لئے ہے۔ ایک دفعہ دونوں فرقوں کے کچھ آدمی اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ جب دیر ہوگئی تو ایک بزرگ نے فرمایا بھائی! اس میں گفتگو کی کیا ضرورت ہے وہ بھی سچ کہتے ہیں اور تم بھی سچ کہتے ہو۔ ہر شخص اپنے اپنے مردوں کا حال بیان کر رہا ہے۔ تم کو اپنی خبر ہے ان کو اپنی خبر ہے۔ ان کے مردے ایسے ہی ہیں جیسے وہ کہتے ہیں۔ تمہارے پاک صاف ہیں۔ پھر تم ان کی تکذیب کیوں کرتے ہو۔ ان کے مردے نجس العین ہی ہوتے ہوں گے۔ بس یہ جواب سن کر فرقہ باطلہ والے خاموش ہی تو ہوگئے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جنت کی نعمتیں ترک لذات فی الدنیا کی بدولت حاصل ہوں گی۔ تو دنیا میں سماع سننے سے اندیشہ ہے کہ جنت میں سماع سے محرومی ہو۔ اس لئے میں نے ان صوفی صاحب سے کہا کہ ہم تو جنت کے ادھار پر بیٹھے ہوئے ہیں گو ولولہ بہت اٹھتا ہے مگر صبر و ضبط سے کام لیتے ہیں۔ گو فقہاء کے برابر تو ہم سے ضبط نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو سماع صوت غنا کو مطلقاً حرام فرماتے ہیں۔ گو مزامیر بھی نہ ہوں۔ گو امرد اور عورت کی آواز نہ ہو اور سننا تو حرام ہے ہی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر آواز بلا قصد بھی کان میں پڑے تو کانوں کو بند کر لے۔ اس کی ہمت ابھی تک نہیں ہوئی۔ اگر امرد و عورت کی آواز نہ ہو اور مزامیر بھی نہ ہوں' ایسی حالت میں بلا قصد طبیعت ادھر مائل ہو جاتی ہے اور اگر امرد و عورت کی آواز ہو یا مزامیر بھی ہوں تو الحمد للہ! اس وقت دل کو ہٹانے کی توفیق ہو جاتی ہے اور جس کو ضبط کامل کی پوری ہمت ہو کہ پہلی صورت میں بھی کان بند کرنے کی توفیق ہو جائے اس کی یہ حالت مبارک حالت ہے۔ واقعی فقہاء ضابط کامل ہیں۔ ان

سے زیادہ کون ضابط ہوگا۔ تو جس طرح سماع کے باب میں باوجود شوق وولولہ کے ہم ضبط سے کام لیتے ہیں اور جو درجہ سماع کا محدثین کی رائے پر مباح ہے اس کو بھی انتظام عوام کے لئے ترک کئے ہوئے ہیں۔

تعظیمی قیام

اسی طرح ماہ ربیع الاول میں گو ہر طرف مجلس مولود کو دیکھ کر ہمارے دل میں گدگدی اٹھتی ہے اور ایک تحریک وتقاضا پیدا ہوتا ہے مگر عوام کے غلو فی المنکرات کی وجہ سے ہم اس ماہ میں خاص تاریخوں میں یہ ذکر نہیں کر سکتے۔ اس پر لوگ ہم کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ لوگ ذکر رسول سے منع کرتے ہیں۔ استغفراللہ! ارے ذکر رسول وحب رسول تو ہمارے یہاں عین ایمان ہے۔ پھر بھلا عین ایمان سے بھی کوئی مسلمان منع کر سکتا ہے بلکہ دراصل ہمارے علماء ان منکرات سے روکتے ہیں جو اس ذکر کے ساتھ عوام نے منضم کر رکھی ہیں مگر چونکہ ان منکرات کی اصلاح اس ذکر کو باقی رکھ کر نہیں ہو سکتی اور یہ ذکر خاص ایام میں واجب نہیں۔ اس لئے وہ منکرات کی اصلاح کے لئے قیود کے ساتھ ذکر ہی سے منع کرتے ہیں۔

چنانچہ منجملہ ان منکرات کے ایک قیام ہے جس میں عوام کے اعتقادات حدود شرع سے متجاوز ہیں۔ اس میں بعض لوگ ہمارے علماء کو بدنام کرتے ہیں کہ قیام تو ذکر رسول کی تعظیم کے لئے ہے۔ اور یہ مولوی حضور کی تعظیم سے منع کرتے ہیں۔ اس کا جواب ایک مولوی صاحب نے خوب دیا کہ ہم ذکر رسول کی تعظیم سے نہیں روکتے بلکہ ذکر اللہ کی بے تعظیمی سے روکتے ہیں کیونکہ تم ذکر اللہ کے وقت قیام نہیں کرتے۔ پس اگر سارا ذکر مولد قیام ہی سے کرو اور سامعین بھی سارا ذکر کھڑے ہو کر سنیں تو ہم اس قیام سے کبھی منع نہ کریں گے۔

مزا یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات تو مولویوں ہی پر کئے جاتے ہیں صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا حالانکہ بعض دفعہ وہ مولویوں سے بھی وحشت ناک حکم دیتے ہیں۔

چنانچہ حضرت خواجہ باقی اللہ کی مجلس میں ایک شخص کی زبان سے جہر کے ساتھ اللہ نکل گیا چونکہ وہ نقشبندی تھے جن کے یہاں ضبط احوال کی تاکید ہے یہاں تک کہ ذکر بھی خفی بتلاتے ہیں جہری نہیں بتلاتے اس لئے آپ نے فرمایا کہ نکال دو اس کو ظاہر میں یہ حکم بہت وحشت ناک تھا کہ اللہ کہنے پر مجلس سے نکال دیا اگر کوئی مولوی ایسا کرتا تو اسی وقت کفر کا فتویٰ دیا جاتا کہ ذکر اللہ سے منع کرتے ہیں مگر صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا یہاں بڑی جلدی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ذکر اللہ پر نہیں نکالا بلکہ عدم ضبط پر نکالا کہ اس سے اتنا ضبط بھی نہ ہو سکا اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو قرائن سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس کو ضبط کی طاقت تھی باوجود طاقت ضبط کے پھر ضبط نہیں کیا اور اگر واقعی حد ضبط سے نکل جاتا۔ تو پھر ملامت نہ فرماتے۔ اسی کو شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

دما دم شراب الم در کشند　　　وگر تلخ بینند دم در کشند
بہ تسلیم سردرگریباں برند　　　چوں طاقت نماند گریباں برند

دمادم رنج کی شراب پیتے ہیں اگر تلخ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں تسلیم کرکے سر گریباں میں ڈالتے ہیں اور جب طاقت نہیں رکھتے تو گریبان پکڑ لیتے ہیں۔

یہ نقشبندیہ کا مذاق ہے اور چشتیہ کا مذاق یہ ہے کہ تقاضے کو دبایا نہ جائے اگر رونے کو جی چاہے رو لو چلانے کا تقاضا ہو چلاؤ دل کو گھوٹ کر بیٹھنا اور حالات کو دبانا ان کے یہاں نہیں ہے مگر ہاں مکاری اور فریب کی اجازت ان کے یہاں بھی نہیں جیسا کہ آج کل اکثر لوگوں کا حال و وجد محض مکر سے ہوتا ہے۔

ایک دفعہ حافظ محمد حسین صاحب شاہجہان پوری کی مجلس میں ایک شخص پر حال طاری ہوا۔ حافظ صاحب بہت اچھے آدمی تھے دکاندار نہ تھے بلکہ طالب حق تھے مگر صاحب سماع تھے اور چونکہ سچے آدمی تھے۔ اس لئے مجھ سے محبت کرتے تھے کیونکہ سچا آدمی محض اختلاف مسلک کی بناء پر کسی سے مکدر نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ اس اختلاف کا منبع صدق ہے یا کذب اگر منبع صدق ہے تو سچے آدمی کو اس سے محبت ہوگی گو مسلک میں اختلاف ہو میرے پاس کبھی کبھی حافظ صاحب کے خطوط بھی آتے تھے جن میں مسائل شرعیہ کی تحقیق ہوتی تھی تو ان کی مجلس میں ایک شخص وجد میں کھڑا ہو گیا اور ادب سماع میں سے یہ ہے کہ صاحب حال کا سب ساتھ دیں اگر وہ کھڑا ہو تو سب کھڑے ہو جائیں اور جس شعر پر اسے وجد ہوا ہو قوال اسی شعر کو بار بار پڑھتا رہے امام غزالی نے بھی اس قیام کو آداب سماع میں ذکر کیا ہے۔

دراصل یہ مسئلہ طبی ہے جس کا راز یہ ہے کہ موافقت حال سے صاحب حال کو انبساط و سکون ہوتا ہے اور صاحب حال کی مخالفت کرنے سے انقباض ہو جاتا ہے جس سے بعض اوقات ہلاکت کا خطرہ ہے اسی لئے یہ معمول ہے کہ جس شعر پر حال طاری ہوا اسی کو مکرر پڑھتے رہیں اس کا بھی یہی راز ہے کہ اس کے تکرار سے انبساط ہوتا ہے قبض نہیں ہوتا صوفیہ نے اس مسئلہ کو صوفی ہونے کی حیثیت سے ذکر نہیں کیا بلکہ طبیب ہونے کی حیثیت سے ذکر کیا ہے کیونکہ یہ حضرات طب روحانی کے ساتھ کچھ طب جسمانی سے بھی واقف ہوتے ہیں اب لوگوں نے اس مسئلہ کو تصوف کا مسئلہ بنالیا ہے یہ غلط ہے گو کتب تصوف میں اس کا ذکر ہے مگر تصوف کے طور پر نہیں ہے بلکہ طبی حیثیت سے استطرادا ذکر کر دیا گیا ہے جیسا کہ فقہاء بھی بعض دفعہ تبعاً کسی مسئلہ طبی کو بیان فرما دیتے ہیں۔

کما قالوا فی الوضوء بالماء الشمس انه یکره لاضراره ۱۲ ظ)

غرض حافظ صاحب بھی اس کے ساتھ کھڑے ہوئے کچھ دیر کے بعد وہ بیٹھ گیا حافظ صاحب بھی مع مجمع کے بیٹھ گئے تھوڑی دیر میں وہ پھر کھڑا ہوا حافظ صاحب بھی کھڑے ہو گئے پھر بیٹھ گیا تو وہ بھی بیٹھ گئے۔ تیسری بار وہ پھر کھڑا ہوا تو حافظ صاحب نے اب قیام نہیں کیا بلکہ فرمایا اس کو باہر نکال دو وہ

مکار ہے کیونکہ وہ مبصر تھے قرائن ظاہرہ یا باطنہ سے سمجھ گئے ہوں گے کہ اس کا حال صادق نہیں کاذب ہے مگر چونکہ ایک صوفی نے نکلوایا اس لئے کوئی اعتراض نہیں اور کوئی مولوی نکلواتا تو اسی وقت فتوے لگ جاتے تو یہاں قیام کی وجہ سے حافظ صاحب نے اس کو نہیں نکالا بلکہ مکر کی وجہ سے نکلوایا۔

اسی طرح مولوی بھی قیام تعظیمی کو منع نہیں کرتے بلکہ قیام بے تعظیمی سے روکتے ہیں جس میں احکام شرعیہ کی مخالفت کی جاتی ہے اور شریعت میں ایک بدعت تراشی جاتی ہے لیکن وہ غریب دنیا میں بدنام ہیں ان کے اقوال کی حقیقت سمجھنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا مگر مولویوں کو شریعت کی حفاظت کے سامنے اپنی بدنامی کی بھی پرواہ نہیں ہے چاہے کوئی کچھ کہے ان کی بلا سے۔ ایک غازی پوری مولوی اٹاوہ میں مجھ سے کہنے لگے کہ جماعت دیوبند کے تقویٰ اور تقدس کی تمام دنیا معتقد ہے صرف ایک بات لوگوں کو کھٹکتی ہے کہ آپ حضرات قیام نہیں کرتے اگر آپ قیام کرنے لگیں تو تمام دنیا آپ کی غلام ہو جائے میں نے کہا کہ وہ ہمارے آقا بن جائیں لیکن مکھی بال تو ہم قصداً نہیں کھا سکتے اب چاہے دنیا معتقد ہو یا بے اعتقاد ہو۔

فضیلت ربیع الاول

بہر حال ربیع الاول کے مہینہ میں ایک تحریک ذکر فضائل نبوی کی ہوتی ہے مگر کبھی ۱۲ ربیع الاول سے پہلے کبھی بعد کیونکہ اس خاص تاریخ میں تو ذکر ہم کر نہیں سکتے جس کی وجہ اوپر مذکور ہو چکی اور کبھی اگلے ماہ میں تحریک ہوتی کبھی پچھلے ماہ میں کیونکہ اس ماہ کے قرب سے بھی کچھ انوار محسوس ہونے لگتے ہیں اور کیوں نہ ہو اس ماہ میں اسی ذات کی تشریف آوری ہوئی ہے جو مجمع الانوار اور منبع الانوار ہیں اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

لهذا الشهر فی الاسلام فضل   و منقبته تفوق علی الشهور

اس مہینہ کی اسلام میں بڑی فضیلت ہے اور یہ تمام مہینوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

ربیع فی ربیع فی ربیع   و نور فوق نور فوق نور

بہار پر بہار ہے اور نور پر نور اس پر بھی نور ہے۔

باقی یہ گفتگو تو فضول ہے کہ ربیع الاول افضل ہے یا رمضان افضل ہے ایک عارف ایسے سوالات کی نسبت فرماتے ہیں کہ یہ سوال ایسا ہے جیسا کہ یہ سوال کیا جائے کہ پانی افضل ہے یا کھانا ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ تفضیل نوع واحد کے افراد میں ہوا کرتی ہے نہ کہ نوعین مختلفین میں کھانا اور پانی ایک نوع نہیں ہیں بلکہ دو نوع ہیں ہر نوع اپنے درجہ میں مستقل ہے ہر ایک کے خواص جدا ہیں پانی اپنے خواص میں افضل ہے اور کھانا اپنے خواص میں افضل ہے اس لئے ان میں تفضیل کا سوال ہی فضول ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ نوع واحد کے افراد میں بھی ہر فرد کا حسن الگ ہے اور اختلاف مذاق کے اعتبار سے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک فرد کسی کے نزدیک حسین ہو دوسرے کے نزدیک حسین نہ ہو۔

چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ حبشہ میں بڑا حسین وہ ہے جو خود سیاہ ہو جس کی سیاہی میں چمک پیدا ہو گئی ہو اور ہونٹ خوب موٹے موٹے ہوں۔ حبشیوں کے نزدیک یہی حسن ہے اور ان کی طبائع اسی پر فریفتہ ہوتی ہیں واقعی اگر اللہ تعالیٰ ان میں یہ بات پیدا نہ کرتے تو حبشنیں تو سب کنواری ہی رہتیں۔

اس اختلاف مذاق کا یہ اثر ہے کہ ہمارے سامنے قورما اور ماش کی دال رکھی جائے تو ہم قصباتی لوگ تو ماش کی دال ہی کو پسند کریں گے اور اگر ہمارے سامنے نئے کھانے لائے جائیں جو کبھی نہ کھائے ہوں تو ہم کو ان کی قدر نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ ایک قصبہ میں جہاں کے لوگ بھولے مشہور ہیں اور بھولے کے معنی معلوم ہیں تھانہ بھون سے بارات گئی وہاں باراتیوں کے لئے تنجن پکا تو تھانہ بھون کے ایک صاحب نے جنہوں نے تنجن کبھی نہ کھایا تھا کہنے لگے واقعی اس قصبہ کے لوگ بیوقوف ہوتے ہیں دیکھو! میٹھے چاولوں میں گوشت ڈال رکھا ہے اس کے پاس والے نے کہا کہ چپکا چپکا کھالے تھانہ بھون کو بدنام نہ کر باہر جا کر میں تجھے اس کی حقیقت بتلا دوں گا تو دیکھئے اس شخص کو تنجن کی قدر نہ ہوئی گو وہ فی نفسہ بہت لذیذ کھانا ہے۔

اسی طرح ملاجیون کا قصہ مشہور ہے کہ شاہ دہلی کے یہاں مہمان تھے۔ بادشاہ نے عرض کیا اگر کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو ارشاد فرمایئے فرمایا گلگلوں کو جی چاہتا ہے بادشاہ نے باورچی کو حکم دیا اگلے وقت دسترخوان پر گلگلے حاضر کئے گئے ملا جی نے کھا کر کچھ تعریف نہ کی بادشاہ نے پوچھا کچھ پسند آئے فرمایا جیسے ہمارے گھر پکتے ہیں۔ یہ ویسے نہیں ہیں بادشاہ نے باورچی کو تاکید کی کہ دوسرے وقت ذرا اور اہتمام سے پکانا اس نے دوسرے وقت گھی اور مصالح کی زیادتی کی ملا جی نے پھر بھی تعریف نہ کی بادشاہ نے باورچی کو دھمکایا کہ تم سے گلگلے بھی ملا جی کی مرضی کے موافق نہیں پکتے باورچی سمجھدار تھا سمجھ گیا اور کہا حضور انشاء اللہ کل کو ملا جی کی مرضی کے موافق پکیں گے اگلے دن اس نے بجائے شکر کے بہت سا گڑ ڈالا اور بجائے گھی کے تیل ڈالا اور ان کو خوب اچھی طرح بھونا گیا سیاہ ہو گئے اب جو وہ دسترخوان پر آئے تو بادشاہ کا تو تیل اور گڑ کی تیزی سے دماغ پریشان ہو گیا مگر ملا جی کھا کر خوش ہو گئے کہ ہاں یہ ہیں گلگلے جس میں گڑ کی گڑاہنڈ اور تیل کی تلاہنڈ نہ ہو وہ بھی کچھ گلگلے ہیں۔

خیر یہ تو ہنسی کی باتیں ہیں مگر ان عارف کا یہ جواب بہت لطیف ہے کہ رمضان اور ربیع الاول کی مثال پانی اور کھانے جیسی ہے ان میں یہ سوال کرنا کہ کون افضل ہے فضول ہے ہر ایک اپنے درجہ میں مستقل ہے اور ہر ایک کے انوار و خواص جدا ہیں وہ اپنے درجہ میں افضل ہے یہ اپنے درجہ میں افضل ہے اس لئے ربیع الاول میں ایک خاص برکت و نور ہے جس سے ذکر فضائل نبویہ کی تحریک پیدا ہوتی ہے مگر میں نے ۱۲ تاریخ کو کبھی ذکر نہیں کیا بلکہ اکثر اس کے بعد اور پہلے کیا ہے۔

شریعت کی مزاحمت

بہت لوگ علماء سے اس تخصیص کے مسئلہ میں الجھتے ہیں کہ صاحب اس میں کیا حرج ہے اور اگر ہم نے ۱۲ تاریخ کو مولود پڑھ لیا تو کونسا جرم کیا' تو سمجھ لیجئے کہ اصل میں تو تخصیص اعتقادی جرم ہے کہ کسی خاص تاریخ یا وقت کے ساتھ کسی مستحب کو اعتقاداً بلا دلیل شرعی مقید کر لینا کہ اس مستحب کا اس تاریخ میں کرنا دوسری تاریخوں میں کرنے سے افضل ہو کیونکہ اس میں قانون شکنی ہے اور شریعت کی مزاحمت ہے جب شریعت نے کسی چیز کو مطلق رکھا ہے اور کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا اس کو مقید کرنا گویا قانون شریعت میں اضافہ اور اصلاح ہے اور اس کا جرم ہونا سب کو معلوم ہے۔ ذرا کوئی سلاطین دنیا کے احکام میں تو ایسا کر کے دیکھے کہ قانون عام کو کسی قید سے مقید کر دے فوراً ملزم اور باغی شمار ہو جائے گا لیکن تخصیص عملی اس لئے ممنوع ہے کہ اس میں تخصص فی الاعتقاد کے ساتھ تشبہ ہے دیکھنے والے یہ سمجھیں گے کہ یہ بھی اعتقاداً اس طاعت کو اس وقت کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہوگا اور مسئلہ تشبہ فقہ کی بہت بڑی اصل ہے جس سے بے شمار مسائل مستنبط کئے گئے ہیں۔

مثلاً ایک شخص دکان پر یا دسترخوان پر شراب کی سی بوتلیں بھر کر رکھے گو ان میں پانی ہو شراب نہ ہو وہ مجرم ہے اور شرعاً گنہگار ہے کیونکہ اس نے شراب خوروں کے ساتھ تشبہ کیا کس کس سے کہتا پھرے گا کہ ان میں پانی ہے شراب نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو سر بازار ایک عورت سے باتیں کرتے دیکھا فوراً درہ لے کر لپکے اس نے کہا یہ تو میری بیوی ہے فرمایا کیا تو دنیا بھر کے آدمیوں سے کہتے جائے گا کہ یہ میری بیوی ہے لوگوں کو تو تجھ پر تعلق بالاجنبیہ کا ہی شبہ ہوگا پھر بلاوجہ مسلمانوں کو بدظنی میں کیوں مبتلا کرتے ہو؛ خبردار! جو آج سے سربازار کسی عورت سے بھی بات کی چاہے بیوی یا باندی ہی کیوں نہ ہو۔

واقعی انتظام تو اسی طرح ہو سکتا ہے اب اگر تم یہ کہو کہ ہمارا تو اعتقاد صحیح ہے تو ہم اس کا یہی جواب دیں گے کہ دیکھنے والوں کو کیا خبر کہ تمہارا اعتقاد کیسا ہے وہ تو تخصیص عملی سے تخصیص اعتقادی ہی کا شبہ کریں گے گو تمہارا اعتقاد صحیح ہے مگر دوسروں کو تمہاری تخصیص سے سند لینے کا موقعہ ملے گا۔ اور وہ تخصیص اعتقادی کے گناہ میں مبتلا ہوں گے شاید کوئی کہے کہ ان تخصیصات کو واجب کون کہے گا میں کہتا ہوں یہ خیال غلط ہے۔ آپ کو عوام کا تجربہ نہیں ہے۔ یہاں ان اطراف میں تو اکثر خوش اعتقاد لوگ ہیں۔ مگر جہاں اہل مولد کی کثرت ہے وہاں جا کر دیکھئے کہ ترک صلوٰۃ و ترک صیام و زکوٰۃ پر ملامت نہیں زنا کے ارتکاب اور داڑھی کے منڈانے پر ملامت نہیں مگر ان تاریخوں میں مجلس مولد کی عدم شرکت پر ملامت ہے اسی طرح صریح گناہوں پر ملامت نہیں اور ترک قیام پر ملامت ہے۔ آخر وہ اس کو واجب نہیں سمجھتے تو اور کیا ہے؟

میں نے ایک دفعہ کانپور میں کہا تھا کہ ہم میں اور اہل قیام میں اختلاف ہے۔ ہم ان کو کہتے ہیں

کہ تم قیام کو واجب سمجھتے ہو اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور وہ ہم کو کہتے ہیں کہ تم حرام سمجھتے ہو اور ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ تو اچھا اس کا ایک امتحان ہے کہ آج سے ہم تمہارے قیام والے مولد میں شرکت کریں گے اور تم ہمارے عدم قیام والے مولد میں شرکت کیا کرو۔ اگر دونوں طرف سے شرکت ہوگی تو دونوں کا گمان غلط اور اگر ایک طرف سے شرکت ہوگی اور دوسری طرف سے نہ ہوئی تو شرکت نہ کرنے والے کا گمان غلط مگر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ہم تو شرکت کریں گے ان سے نہ ہو سکے گی جس سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ لوگ قیام کو ضروری سمجھتے ہیں ہم حرام نہیں سمجھتے۔

اصلاح اعتقاد

اگر سب کے اعتقاد درست ہو جائیں تو ہم بھی کبھی کبھی قیام کرنے لگیں۔ دواماً تو نہ کریں گے کیونکہ دوام ہی کی بدولت تو یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا ہے کہ آج مسلمانوں کی دو جماعتوں میں ایسا افتراق ہو گیا ہے کہ وہ اس کے دشمن ہیں اور یہ ان کے دشمن۔ مگر اس میں جس طرح اہل قیام کی زیادتی ہے تھوڑی سی زیادتی تارکین کی بھی ہے۔

وہ یہ کہ ہماری جماعت کے لوگوں کو جس شخص کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مولد کرتا یا قیام کرتا ہے تو فوراً اس سے بدظن ہو جاتے ہیں اور اس کو فاسق سمجھنے لگتے ہیں اور پہلے ہی دن اس کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ مولد و قیام کو بالکل ترک کر دے تب ہم اس سے میل جول کریں ورنہ نہیں۔ حالانکہ جو شخص کسی چیز کا ایک مدت دراز سے عادی ہے وہ اس کو ایک دن میں کیونکر ترک کر سکتا ہے۔ ہم کو یہ چاہئے تھا کہ عامل قیام سے اگر قیام ترک نہ ہو سکے تو ہم اس کے اعتقاد ہی کو درست کریں اور اس سے کہیں کہ بھائی تم مولد و قیام کرتے رہو مگر اعتقاد یہ رکھو کہ یہ تخصیصات واجب نہیں ہیں۔

اس طرح امید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ راہ پر آ جائے گا۔ مگر نہیں تم تو یہ چاہتے ہو کہ یہ بالکل ترک ہی کر دے۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

غور کیجئے اگر ایک شخص کو بواسیر ہو جس کی وجہ سے بہت خون گرتا ہو اور کسی دوا سے خون کا گرنا بالکل موقوف نہ ہو مگر سوا سیر کی جگہ پاؤ سیر رہ جائے تو یہ فائدہ ہے یا نہیں۔ یقیناً یہ بھی بڑا فائدہ ہے۔ اس دوا کو ترک نہ کرنا چاہئے۔

اسی طرح اگر عامل مولد سے تخصیص عملی ترک نہ ہو سکے مگر اعتقاد کی اصلاح ہو جائے تو یہ بھی بڑا فائدہ ہے اس لئے ہم کو محض یہ دیکھ کر کسی کا دشمن اور مخالف نہ ہونا چاہئے کہ وہ مولد یا قیام کرتا ہے مگر یہاں تو ہر طرف پہلوان ہیں بلکہ پہلوان یعنی جاہل۔ اسی واسطے یہ قصہ اتنا بڑھ گیا ہے ورنہ محقق کے کلام سے فتنہ نہیں بڑھ سکتا۔ محقق کے کلام کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی بات نہ سمجھنے پر تو سب اس کے دشمن ہو جاتے ہیں اور سمجھنے کے بعد سب اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔

مجھ سے مولوی محمد یحییٰ صاحب سیوہاروی بیان کرتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بار سیوہارہ تشریف لے گئے تو وہاں مولود اور قیام کا جھگڑا تھا۔ دونوں فریق مولانا کی خدمت میں فیصلہ کے لئے حاضر ہوئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی سچ بات تو یہ ہے کہ یہ عمل نہ تو اتنا اچھا ہے جتنا تم کہتے ہو اور نہ اتنا برا ہے جتنا دوسرے کہتے ہیں۔

واقعی کیسا محققانہ جواب ہے مگر یہ متن ہے جس کے لئے شرح کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک شرح جس کو قاضی تشریح کہنا چاہئے وہ ہے جو میں نے ابھی عرض کی کہ اصل میں تو تخصیص اعتقادی ناجائز ہے اور تخصیص عملی بوجہ تشبہ کے ناجائز ہے مگر تخصیص اعتقادی کے برابر نہیں۔ تو اگر کوئی شخص محض تخصیص عملی میں مبتلا ہو اور اس کا اعتقاد درست ہو اس سے نہ الجھنا چاہئے اور جو دونوں میں مبتلا ہو اس کے اعتقاد کی اصلاح کرنا چاہئے پہلے ہی دن ترک عمل کی کوشش نہ کرنا چاہئے اگر ہماری جماعت اس طریقہ کو اختیار کرے تو زیادہ فساد نہ ہو۔ پس یہ تخصیصات واقعی ناجائز ہیں۔ اس میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ مگر اہل حق کو یہ نہ چاہئے کہ ہر مولود خواں سے فوراً ہی بدگمان ہو جائیں ممکن ہے کہ اس کا اعتقاد درست ہو اور محبت کی وجہ سے تخصیص عملی میں مبتلا ہو جس میں کسی قدر معذور ہو۔

شاید تم یہ کہو کہ اس تفصیل کے ساتھ تو آج تک کسی نے بیان نہیں کیا جس نے بھی بیان کیا تخصیص کو مطلقاً ممنوع کہا تو بات یہ ہے کہ تبلیغ کے وقت تفصیل نہیں کیا کرتے بلکہ تفصیل تحقیق کے وقت ہوتی ہے۔

دیکھو اگر موسم وبا میں امرودوں سے روکنے کی منادی کرائی جائے تو یوں نہ کہیں گے کہ گورنمنٹ امردوں سے ان لوگوں کو منع کرتی ہے جن کو وہ مضر ہوں کیونکہ اس تفصیل سے مقصود حاصل نہ ہوگا۔ ہر شخص کھائے گا اور یہ کہہ دے گا کہ مجھ کو مضر نہیں ہاں جس وقت کوئی ڈاکٹر سے تحقیق کا طالب ہوگا اس وقت وہ تفصیل کرے گا کہ سب کو تو مضر نہیں بلکہ فلاں کو مضر ہے۔

غرض تبلیغ کے وقت تفصیل نہ کرنا تو اہل حق کا بجا فعل ہے مگر تحقیق کو بالکل نظر انداز کر دینا اور اہل مولد کو مطلقاً برا سمجھنا اچھا نہیں بلکہ ان میں تفصیل کرنا چاہئے یہ نہیں کہ اپنے کو تو مخلص سمجھو اور دوسروں کو مہمل سمجھو۔

کمالات نبویؐ

بہر حال ربیع الاول کے مہینہ میں اکثر ذکر فضائل نبوی کی تحریک ہوتی تھی۔ اس لئے ماہ صفر میں وعظ کے لئے اضیاف کی تحریک ہوئی تو وہ مضمون یاد آ گیا کیونکہ اس کا مہینہ قریب آ گیا ہے۔ تو اب میں نے حضور کے ذکر کے لئے یہی موقعہ تجویز کیا تا کہ مہینہ کی تخصیص کا بھی شبہ نہ ہو اور حضور کا ذکر بھی ہو جائے جس کو دل چاہتا تھا اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر ہے۔

شاید یہ کہو کہ ولادت کا ذکر کہاں ہوا۔ تو میں کہتا ہوں کہ بعثت میں ولادت کا ذکر بھی آ گیا۔ جیسے

سو میں ایک دو تین بھی داخل ہیں کیونکہ جس طرح سو بدوں ایک دو تین کے نہیں بن سکتے اسی طرح بعثت بھی بدوں ولادت کے نہیں ہو سکتی۔ دوسرے بعثت کا ذکر ولادت کے ذکر سے رتبتاً مقدم ہے کیونکہ حضور کی ولادت سے مقصود یہی ہے۔ ولادت تو اس کے لئے محض وسیلہ و ذریعہ ہے۔

غور کیجئے اگر کسی سلطان کی تعریف کی جائے یا سیرت لکھی جائے تو اول اس کے قوانین اور انتظام سلطنت کے کارنامے بیان کئے جاویں گے کہ اس نے یوں راستوں کا انتظام کیا۔ اس طرح خطرات کو رفع کر کے رعایا کو مطمئن کیا اور لشکروں کو اس طرح آراستہ کیا اور نہایت ہوشیاری اور تدبیر سے دشمنوں پر جنگ میں غالب آیا۔ اس سے فراغت پا کر پھر اس کے اخلاق و عادات اور لباس کی حالت بیان کی جائے گی۔ کیونکہ ان سے بھی روح کے آثار معلوم ہوتے ہیں چنانچہ شیخ سعدی ایک بادشاہ کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

شنیدم کہ فرماندہی دادگر　　　قبا داشتے ہر دو رو آستر

میں نے سنا کہ بادشاہ منصف تھا اپنی رعیت سے شفقت و ہمدردی کا سلوک رکھتے ہوئے خود انتہائی سادہ لباس پہن کر بے تکلف رہتا تھا۔

پھر اس کے بعد حسن ظاہر کا بیان کیا جائے گا کہ ان کمالات سیرت کے ساتھ خدا نے اس کو حسن صورت بھی اعلیٰ درجہ کا دیا تھا۔ اور اگر کوئی عقلمند صرف اس کی ولادت کے حالات اور حسن صورت کی حکایات بیان کر دے تو اس کو بادشاہ کی سیرت نہ کہا جائے گا۔ بلکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں گے کہ کسی معشوق کا تذکرہ ہے۔

ایسے ہی سمجھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ یا سیرت میں اول کمالات نبوت کا ذکر ہوگا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا کمال یہی ہے کہ آپ نبی ہیں اور خاتم النبیین و سید المرسلین ہیں۔ جن میں اول احکام بیان کئے جائیں گے تاکہ معلوم ہو کہ آپ ایسی معتدل اور کامل اور سہل شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہیں جس کے بعد واقعی کسی اور شریعت کی ضرورت نہیں۔ پھر معجزات کا ذکر ہوگا کیونکہ عقلاء تو احکام و شریعت کی خوبی سے کمال کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مگر متوسط العقول کی فہم وہاں تک دیر میں پہنچتی ہے اور کم عقل کی تو پہنچتی ہی نہیں اور نبی عامہ مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتا ہے تو چاہئے کہ اس میں وہ کمالات بھی ہوں جن کو ہر شخص سمجھ سکے وہ معجزات ہیں اس کے بعد پھر حسن و جمال ظاہری کا تذکرہ ہوگا اور یوں کہا جائے گا۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری　　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم حسن یوسف علیہ السلام دم عیسیٰ علیہ السلام اور ید بیضا رکھتے ہیں تمام اوصاف جو انبیاء رکھتے ہیں وہ تنہا آپ میں موجود ہیں۔)

اب آج کل جو سیرتیں حضور کی لکھی گئی ہیں جن میں سے شبلی نعمانی کی سیرت النبی بہت مشہور ہے اور لوگ اس پر بہت فریفتہ ہیں مگر ذرا ان میں اس معیار کو ملحوظ رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ حضور کی سیرت نہیں ہے بلکہ دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا کسی بادشاہ کی سوانح ہے کیونکہ کمالات

نبوت سے جو حضور کا اصلی کمال ہے اس میں تعرض ہی نہیں۔ معجزات تو بالکل حذف ہی ہیں۔ بس یہ کمالات ذکر کیے گئے ہیں کہ حضورؐ نے قریش کو اس تدبیر و تحمل سے تابع کیا۔ مدینہ والوں میں یوں اتفاق پیدا کیا۔ جنگ بدر میں اس طرح انتظام کیا اور غزوہ احد میں یہ کیا۔ غزوہ خندق میں ایسا انتظام کیا۔ بھلا یہ نبی کریم کی سیرت ہے۔ ہم نے مانا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملک و سلطان بھی ہیں مگر آپ اول نبی ہیں پھر ملک ہیں محض بادشاہ ہونا آپ کا مخصوص کمال نہیں۔ بادشاہت تو کسریٰ و ہرقل کو بھی نصیب تھی مگر وہ محض بادشاہ تھے اور حضورؐ نبی اور ملک تھے۔ نبوت و سلطنت کے جامع تھے تو سب سے پہلے آپ کے سیرت و تذکرے میں کمالات نبوت کا ذکر ہونا چاہیے مگر آج کل اکثر سیرتیں اس سے خالی ہیں۔

کمالات عمری

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت بنام الفاروق چھپی ہے۔ اس کے بھی لوگ بہت مداح ہیں مگر اول سے آخر تک اسے دیکھا جائے بس یوں معلوم ہوگا کہ کسی بڑے مدبر بادشاہ یا کسی فوجی جرنیل کی سوانح ہے۔ بس اس میں یہی تذکرے ہیں کہ حضرت عمر نے ڈاک کا یوں انتظام کیا۔ لشکروں کو اس طرح تقسیم کیا۔ استغفر اللہ کیا یہی کمالات عمری ہیں کیا اس نظام سلطنت سے پہلے حضرت عمر وہ عمر ہی نہ تھے جن کی یہ تعریف کی جا رہی ہے اور اگر سلطنت و خلافت سے پہلے بھی وہ وہی عمر تھے تو وہ کمالات کیوں نہیں بیان کیے جاتے جن کی بدولت سلطنت و خلافت سے پہلے وہ عامہ صحابہ میں ممتاز تھے اور جن کمالات کو تم بیان کرتے ہو جن کا وقوع بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوا ان کی وقعت تو ان حضرات کی نظر میں اتنی تھی کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا کہ کیا تم اس پر بھی راضی ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو اعمال ہم نے کیے ہیں حق تعالیٰ ان پر تو ہم کو ثواب دے دیں اور جو اعمال حضور کے بعد کیے ہیں ان میں برابر سرابر چھوڑ دیں کہ نہ گناہ ہو نہ ثواب حضرت ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا کہ ہم نے حضور کے بعد بھی بہت کام کیے ہیں جہاد کیے اور بہت سے ملک فتح کیے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہمارے ہاتھ پر ایمان لائے اور نماز روزہ و حج وغیرہ جو کیا وہ الگ رہا ہمیں حق تعالیٰ سے ان اعمال پر بھی ثواب کی امید ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بھائی! تم کو امید ہوگی باقی میں تو یہ کہتا ہوں کہ حضورؐ کے سامنے جو اعمال ہم نے کیے ہیں ان پر ثواب مل جائے اور باقی اعمال میں برابر سرابر چھوٹ جائیں جو آپؐ کے بعد ہم نے کیے ہیں اور ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے جس قدر فتوحات اور سلطنت و لشکر کا انتظام کیا ہے وہ سب حضور کے بعد کیا ہے تو یہ ایسے کارنامے ہیں جن کی وہ حضرات خود قدر نہ کرتے تھے۔

مگر آج کل ان کو ان حضرات کے روشن کارنامے ظاہر کیا جاتا ہے اور جن کارناموں کو وہ خود اپنے روشن کارنامے سمجھتے تھے ان کا کہیں ذکر اور پتہ ہی نہیں ان حضرات کے اصلی کمالات یہ ہیں کہ ان کو حق تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت درجہ محبت تھی اور اخلاص و توحید میں کامل تھے خدا

کے سوا کسی سے خوف وطمع نہ تھا۔ کسی کام میں نفسانیت نہ تھی۔ عبادت میں کسی وقت غفلت نہ ہوتی تھی نہ زراعت اس سے مانع تھی نہ تجارت۔ اور یہ سب حضور کی رویت وصحبت کا فیض تھا۔

یہی ان حضرات کے کمالات ہیں جن کی بناء پر ایک بزرگ (غالباً یہ بزرگ حضرت غوث الاعظم ہیں) نے فرمایا ہے کہ حضرت معاویہ وعمر بن عبدالعزیز میں اتنا فرق ہے کہ حضرت معاویہ کے گھوڑے کی ناک میں جو گرد بیٹھ کر جم گئی ہو وہ ہزار عمر بن عبدالعزیز جیسوں سے افضل ہے کیوں؟ اس واسطے کہ عمر بن عبدالعزیز وہ آنکھیں کہاں سے لائیں گے جن سے حضرت معاویہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور وہ زمانہ کہاں سے لائیں گے جس میں وہ حضور کے ساتھ رہے اور آپ کے ساتھ اٹھے بیٹھے ہیں۔ حضرات صحابہ کے یہ کمالات ایسے ہیں ان میں کوئی عمر ثانی تو کیا عمر صدم وعمر ہزارم بھی نہیں ہو سکتا۔

رہا عدل وانتظام سلطنت سو اس میں اگر کوئی حضرت عمر کے برابر ہو جائے یا بڑھ جائے تو کیا دشوار ہے کیونکہ اس وقت انتظام ممالک کے لئے وہ سامان موجود نہ تھے جو آج کل ریل اور تار سے مہیا ہو گئے ہیں۔ تو فقط بادشاہ عادل ہونا حضرت عمر کا اصلی کمال نہیں۔

یہ تو ایسا کمال ہے کہ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) نے وفات کے پندرہ برس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے آ رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے پوچھا کہ اے امیر المومنین! آپ کا کیا حال ہے فرمایا کہ مرنے کے بعد سے اب تک سلطنت کے حساب وکتاب میں مشغول تھا آج چھٹکارا ہوا ہے اور اگر حق تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔ تو کیا یہ کمالات ایسے ہیں جن کو سیرت فاروق میں افضل بنایا جائے ہرگز نہیں۔

اقرار مولود

اسی طرح حضور کے حالات میں مقدم احوال بعثت ہیں یعنی کمالات نبوت باقی کمالات سلطنت یا کمالات طفولیت کا مرتبہ بعد میں ہے مگر اب مولود خوانوں کی حالت یہ ہے کہ مولود میں سوائے حالات طفولیت کے کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ جس مولود میں حالات طفولیت اور ولادت نہ ہوں اس کو مولود اور ذکر رسول ہی نہیں سمجھتے حالانکہ آپ کا ہر ذکر ذکر رسول ہی ہے۔ ولادت ہی کی کیا تخصیص ہے۔

مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے کسی نے کہا کہ حضرت آپ مولود نہیں کرتے فرمایا ہم تو ہر دم مولود کرتے ہیں کیونکہ ہر وقت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتے ہیں جس میں حضور کا ذکر ہے بس یہی مولود ہے۔ اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو محمد رسول اللہ کیوں کر کہتے۔

ایک دفعہ کسی اور شخص نے درخواست کی کہ حضرت مولود سننے کو جی چاہتا ہے فرمایا لو ہم ابھی سناتے ہیں۔ یہ کہہ کر کھڑے ہوئے اور نہایت مزے سے شعر پڑھا

تر ہوئی باراں سے سوکھی زمین یعنی آئے رحمۃ للعالمین

مولانا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجہ محبت تھی۔ حضور کا ذکر بڑے مزے سے کیا کرتے تھے۔ فرمایا لو مولود ہوگیا نہ مجمع اکٹھا کیا' نہ مٹھائی تقسیم کی نہ چوکی پر کھڑے ہوئے مگر آج کل تو یہ باتیں مولود کے لوازم سے ہیں۔ بدوں ان کے مولود ہی نہیں ہوسکتا چاہے کتنا ہی حضور کا ذکر کرلو۔

چوکی پر ایک حکایت یاد آئی۔ مولوی عبداللہ صاحب انصاری ساکن انبہٹہ ایک زمانہ میں گلاوٹھی ضلع میرٹھ میں مدرس تھے۔ ان کے پاس انبہٹہ کے ایک بھولے بھالے واعظ مولوی صاحب پہنچے اور ان سے کہا کہ تم یہاں کے رئیسوں سے میری تعریف کرو اور میرا وعظ کہلاؤ۔ تو شاید وہ لوگ میری کچھ خدمت کردیں۔ آج کل میں ضرورت مند ہوں۔ انہوں نے رئیسوں میں ان کی تعریف کردی کہ یہ بڑے فاضل مولوی ہیں۔ وعظ اچھا کہتے ہیں لوگوں نے وعظ کا اشتیاق ظاہر کیا اور وعظ کا انتظام کیا گیا۔ مولوی عبداللہ صاحب نے ان کو بہت سمجھایا کہ دیکھو وعظ میں واہی تباہی حکایتیں اور موضوع روائتیں بیان نہ کرنا اور قصباتیوں کی طرح الفاظ غیر مشددہ کو مشددہ نہ بولنا کہیں تم میری ساری تعریف کو غلط کردو ور مجھے شرمندہ کرو۔ کہا میں ایسا بے وقوف تھوڑا ہی ہوں۔

غرض وقت آیا اور وعظ کی مجلس میں لوگ جمع ہوئے اور مولوی صاحب ایک جبہ اور بڑا سا عمامہ پہن کر تشریف لائے۔ کیونکہ جن میں اصلی کمالات نہیں ہوتے وہ ایسے ہی عوارض سے اپنی شان بناتے ہیں۔ جب وہ مجلس میں پہنچے تو اول تو لوگ ان کی صورت ہی دیکھ کر حیران ہوئے کہ ان کو اس قدر بناوٹ کی کیا ضرورت تھی۔ پھر دوسری حرکت یہ کی کہ وہاں واعظ کے بیٹھنے کی چوکی نہیں بچھائی گئی تھی بلکہ قالین کا انتظام تھا۔ تو آپ نے وہاں پہنچتے ہی فرمایا اور چوکی (تبشدید کاف) تو ہے نہیں لوگ اس تلفظ پر بھی حیران ہوئے اور مولوی عبداللہ صاحب کو فکر ہوئی کہ اللہ خیر کرے (یہ تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی) مولوی عبداللہ صاحب نے کہا کہ حضرت مجمع کم ہے۔ اس لئے چوکی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ تو آپ فرماتے ہیں نہیں نوشو تو چوکی ہی پڑھوکیں گے (بتشدید شین مہر دو کاف) ان الفاظ کا مطلب کوئی بھی نہ سمجھا اور سب ایک دوسرے کے منہ کو تکنے لگے اور مولوی عبداللہ صاحب انصاری کا تو رنگ فق ہوگیا کہ آج انہوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ غرض چوکی لائی گئی تب نوشہ صاحب نے وعظ کہا اور وعظ میں بھی یوں ہی نور برسایا۔

تو مولانا فضل الرحمن صاحب نے چوکی نہیں منگائی۔ اسی جگہ کھڑے فرمایا۔

تر ہوئی باراں سے سوکھی زمین یعنی آئے رحمۃ للعالمین

یہ بتلا دیا کہ ہم ذکر ولادت کے منکر نہیں بلکہ ان تخصیصات و قیودات کے منکر ہیں۔ مولانا فضل الرحمن صاحب نے ایک غیر مقلد مولوی کو بھی عجیب جواب دیا۔ وہ مولود کے بالکل منکر تھے اور کہتے تھے کہ ذکر ولادت کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا بھائی ہاں نہ معلوم اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی

ولادت کا قصہ قرآن میں کیوں بیان فرمایا ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے اس پر وہ مولوی صاحب چپ رہ گئے اور جواب نہ بن پڑا۔

مولانا نے اس جواب میں بتلا دیا کہ نفس ذکر میلاد میں کچھ مضائقہ نہیں بلکہ منکرات وقیود میں قباحت ہے۔ پس اہل مولود اگر ایسا ہی کریں کہ ان قیود وتخصیصات کا التزام نہ کیا کریں اور ذکر ولادت کے بھی پابند نہ ہوں بلکہ کبھی احکام کبھی معجزات کا بھی ذکر کیا کریں تو اچھا ہو۔

میں آج کل نوازل کی وجہ سے صبح کی نماز میں قنوت پڑھتا ہوں مگر بعض دفعہ نہیں پڑھتا کیونکہ حنفیہ کے نزدیک قنوت صبح کی نماز میں سنت دائمہ نہیں۔ ہاں شافعیہ کے نزدیک سنت دائمہ ہے۔ تو حنفی کو گاہے گاہے ترک کر دینا چاہیے تاکہ التزام نہ ہو جائے شاید مقتدی کسی دن میری قنوت نہ پڑھنے سے یہ سمجھے ہوں کہ آج پیشاب کا تقاضا زیادہ ہوگا جو قنوت نہیں پڑھی مگر اس ترک کی وجہ یہ نہیں بلکہ وہ ہے جو میں نے ابھی عرض کی۔

لیکن اس کے بعد بھی میں اپنے دوستوں کو ایک مشورہ دیتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ کسی ایسے مولد میں پھنس جائیں جہاں قیام ہوتا ہو تو یہ اس مجلس میں مجمع کی مخالفت نہ کریں بلکہ قیام کر لیا کریں کیونکہ ایسے مجمع میں ایک دو کا قیام نہ کرنا موجب فساد ہے۔ ہاں جہاں ہر طرح اختیار ہو وہاں تمام قیود کو حذف کر دیا جائے کیونکہ ایسے موقع میں خاموش رہنا گناہ ہے۔

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

اگر میں کسی نابینا کو کنویں کے پاس دیکھوں اور خاموش بیٹھا رہوں تو گناہ ہے۔

ایک دفعہ میں کانپور میں تھا۔ وہاں جمعہ میں میرا بیان ہوا۔ اس کے ایک رئیس نے شب کے وقت مولود کی درخواست کی۔ میں نے اول تو انکار کیا اور تعب کا عذر کر دیا۔ پھر ان رئیس سے کسی نے کہا کہ یہ لوگ اس عمل کو پسند نہیں کرتے اس نے کہا کیا وجہ اس نے جواب دیا کہ بعضے طریقے ان کو پسند نہیں مولود کے تو منکر نہیں۔ جو اہل بدعت نے ایجاد کر رکھی ہیں جیسے قیام وغیرہ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اس پر وہ رئیس بولے تو پھر طریقہ سے جس مولود کو جائز سمجھتے ہیں اسی طرح بیان کر دیں اور مجھ سے بھی درخواست کی۔ میں خوش ہوا اور بیان کا وعدہ کر لیا۔ اور یہ شرط کر لی کہ میرے بغیر پوچھے کوئی کام نہ کیا جائے۔ انہوں نے بخوشی اس کو منظور کیا۔

اب میں نے سوچا کہ روایات وقیام تو میرے قبضہ میں ہیں احتیاط کر لوں گا لیکن مٹھائی کا کیا انتظام ہو کیونکہ مٹھائی وہ پہلے ہی منگا چکے تھے۔ اس کا انتظام یہ کیا کہ ان کی رضامندی سے ان کو ایک کوٹھڑی میں مقفل کرا کر کنجی اپنے پاس منگا لی کہ جب میں کہوں اس وقت تقسیم کی جائے۔ چنانچہ بیان ہوا

اور میں نے قیام نہیں کیا اور نہ وہ موضوع اور ضعیف روائتیں بیان کیں جو اہل مولود بیان کرتے ہیں بلکہ حضورؐ کی تشریف آوری سے عالم میں جو انوار پھیلے اور مخلوق کی اصلاح ہوئی اس کو بیان کیا۔ جب بیان ختم ہوا بدوں مٹھائی لئے ہوئے چلے گئے۔ اگلے دن میں نے مٹھائی کی کنجی بھیج دی اور ان رئیس صاحب سے کہلا بھیجا کہ رات مجلس میں جو لوگ آپ سے ملنے والے آئے تھے جن کو پہچانتے ہوں ان کے گھروں پر کچھ مٹھائی بھیج دیں۔ باقی غرباء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصال ثواب کی نیت سے تقسیم کر دیں۔ اس پر رئیس صاحب نے کہا کہ جو لوگ میرے جاننے والے رات آئے تھے وہ سب خوشحال ہیں۔ اس مٹھائی کے وہ محتاج نہیں میری رائے تو یہ ہے کہ سب غرباء ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح کے ایصال ثواب کے لئے دے دوں۔ میں نے کہا یہ تو سب سے اچھا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حتیٰ کہ میرا حصہ بھی نہیں آیا۔ مجھے اس مولد میں خاص نور معلوم ہوتا تھا۔

بہر حال یہ تحقیق ہے اس مبحث کی اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ مولود کے منکر نہیں بلکہ ان تخصیصات وقیود کے منکر ہیں۔

اس پر ایک شبہ طالب علمانہ ہوتا ہے وہ یہ کہ حضورؐ کی شہادت حسیہ مستلزم ہے قتل نبی کو اور قتل نبی کفر مستقل ہے تو اس کی طلب مستلزم ہوئی ہے کسی شخص کے کافر ہونے کی طلب کو۔

جواب یہ ہے کہ یہاں اپنے لئے شہادت کی طلب ہے دوسرے کے لئے کفر کی طلب نہیں گو لازم آجائے اور اشکال التزام میں ہے لزوم میں کچھ اشکال نہیں۔ ورنہ بہت دور تک شبہ ہوگا (کیونکہ مثلاً نزول قرآن کے دو فرقے ہو گئے بعض نے اس کو مانا بعض نے نہیں مانا۔ جو لوگ قرآن سے منکر ہوئے وہ ہمیشہ کے لئے جہنمی ہوئے۔ حالانکہ نزول قرآن سے پہلے وہ صرف اعتقاد توحید یا اعتقاد انجیل وتورات سے ناجی ہو سکتے تھے اور نزول قرآن کے بعد یہ اعتقاد نجات کے لئے کافی نہ رہا۔ اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ نزول قرآن سے مقصود تو مخلوق کی اصلاح وترقی ہے وہ خود فی ذاتہ کسی کے کفر کو مستلزم نہیں۔ گو نزول کے بعد بعض کا کفر لازم آگیا)

تجلی خاص

اے صاحبو! حضورؐ کی ولادت شریفہ کے ذکر کا حکم حضورؐ ہی سے پوچھ لو جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی وقت خدانخواستہ کفار کسی نبی کو گرفتار کر لیں اور ان کو ترس (ڈھال) بنا لیں اور کفار پر حملہ کرنے سے نبی کی ایذاء کا اندیشہ ہو تو اس وقت کیا کیا جائے فقہاء فرماتے ہیں کہ اس وقت ان نبی ہی سے دریافت کیا جائے کہ حضرت اس حالت میں ہم کو کیا حکم ہے؟ حملہ کریں یا نہ کریں۔ جو وہ کہیں اس پر عمل کرو۔

اسی طرح ذکر مولد میں جو اختلاف ہے تو اس کا فیصلہ بھی حضورؐ ہی سے کرانا چاہئے شاید تم کہو کہ

حضورؐ اس وقت کہاں؟ تو میں کہتا ہوں کہ جیسے حق تعالیٰ کی ایک خاص تجلّی جو فیصلہ کا مدار ہے عالم میں موجود ہے۔ حق تعالیٰ کی تجلّی عالم میں کس طرح ہے اس کو ایک حکایت سے سمجھ لیجئے۔

ایک دفعہ شاہ ایران کے ذہن میں ایک بے معنی مصرع موزوں ہو گیا۔

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود   کہ چتکبرا موتی کسی نے کم دیکھا ہوگا مگر دوسرا مصرع نہ بنا۔

تمام شعراء بلائے گئے مگر کسی سے اس مہمل مصرع پر مصرع نہ بنا۔ تو شاہ ایران نے شاہ دہلی کو لکھ کر بھیجا کہ وہاں کے شعراء سے اس پر مصرع لگوائیں۔ بادشاہ نے شعراء کو حکم سنا دیا کہ اس مصرع کو پورا کرو۔ یہاں بھی سب حیران ہو گئے۔ بادشاہ کی بہن زیب النساء بھی فارسی کی عمدہ شاعرہ تھیں اس کو بھی اس مصرع کی خبر لگی اور اسے بھی اس کے پورا کرنے کا خیال ہوا۔ کئی دن گزر گئے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا ایک دن صبح کو وہ سرمہ لگا رہی تھی۔ سرمہ کچھ آنکھ میں لگا تو اس سے ایک آنسو ٹپکا جس میں آنسو کی سفیدی اور سرمہ کی سیاہی ملی ہوئی تھی فوراً اس کا ذہن شاہ ایران کے مصرع کی طرف منتقل ہوا۔ اور دوسرا مصرع موزوں ہو گیا یعنی۔

در ابلق کسے کم دیدہ موجود   مگر اشک بتان سرمہ آلود

دُرِ ابلق کسی نے کم دیکھا ہوگا مگر محبوب کی سرمہ آلود اشکوں نے

اور اس موزونی سے بہت خوش ہوئی اور بادشاہ کے پاس یہ شعر لکھا کر بھیجا۔ کہ شاہ ایران کا مصرع پورا ہو گیا۔ شاہ دہلی بھی خوش ہوا کہ جو مصرع ایران کے شعراء سے پورا نہ ہو سکا وہ ہندوستان کی شاعرہ نے پورا کر دیا اس نے ایران لکھ بھیجا مگر شاعر کا پتہ نہیں لکھا۔ وہاں کے تمام شعراء جمع ہوئے اور ان کے سامنے یہ مصرع زیب النساء کا پڑھا گیا تو سب دنگ رہ گئے اور اس کی ذہانت پر تعجب کرنے لگے اور بادشاہ سے درخواست کی کہ اس شاعر کو ایران بلایا جائے۔ ہم سب اس کی شاگردی کریں گے۔ شاہ ایران نے اس مصرع کی موزونیت پر شاعر کے لئے انعام و خلعت بھی بھیجا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس شاعر کو ایران بھیج دیا جائے۔ بادشاہ دہلی یہ خط لے کر اپنی بہن کے پاس آئے کہ اور شاعر بن۔ اب تیری طلبی ایران سے آئی ہے۔ بتلا کیا جواب دوں اس نے کہا آپ اس کے جواب میں میرا ہی ایک شعر لکھ لیجئے کہ اس شاعر نے یہ جواب دیا۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل   ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

میں شعر و سخن میں اتنی مخفی و پوشیدہ ہوں جس طرح پھول کی خوشبو پھول میں چھپی ہوتی ہے۔

اور مخفی اس کا تخلص ہے۔ اس جواب سے لوگ سمجھ گئے کہ شاعر عورت ہے۔ غرض زیب النساء نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں اپنے کلام میں متجلّی ہوں۔ جس کو مجھے دیکھنے کا شوق ہو وہ مجھے میرے کلام میں دیکھ لے۔ تو حق تعالیٰ کو تو سب سے زیادہ حق ہے اس دعوے کا کہ ہمارے کلام میں ہماری تجلّی موجود ہے جب ایک مخلوق کا کلام اس کے لئے مراۃ بن سکتا ہے تو کلام حق مراۃ حق نہ ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

چیست قرآں اے کلام حق شناس   رونمائے رب ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در بر معنٰے   معنٰے در معنٰے در معنٰے

(اے کلام حق کو پہچاننے والے قرآن کیا ہے یہ تو لوگوں کے لئے لوگوں کے رب کی رونمائی ہے۔ اس کا حرف حرف سچ ہے اور معنی سے لبریز ہے اس کے معنوں کے اندر معنی اندر معنی مضمر ہیں۔)

ایسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر نظر نہیں آتے تو کیا ہوا آپ بھی اپنے کلام کے ذریعہ سے عالم میں متجلی ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ حق تعالیٰ تو دنیا میں مستور ہی رہیں گے کسی کی مجال نہیں کہ دنیا میں ان کو دیکھ سکے اور حضورؐ کو دنیا میں بھی بہت سوں نے دیکھا ہے غرض حضورؐ کو اس کہنے کا حق ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

اور وہ کلام حضورؐ کا کون سا کلام ہے جس میں آپ متجلی ہیں۔ وہ احادیث نبویہ ہیں جو بروایات ثقات ہم تک پہنچی ہیں۔ غرض اس طرح حضورؐ عالم میں اب بھی موجود ہیں۔

تبلیغ حضرت شہید

اور یہی تو وہ بات ہے جس سے عارفین اپنے خصوم کے مقابلہ میں ہمیشہ جیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید دہلوی نے جب بدعات سے منع کرنا شروع کیا اور بیوی کی صحنک سے عورتوں کو روکا تو اس کی خبر شاہ دہلی کی خالہ یا پھوپھی کو پہنچی جو بڑی بوڑھی عورت تھیں اور شاہی خاندان میں سب پر حاوی تھیں۔ غالباً یہ زمانہ اکبر شاہ ثانی کا تھا اور گو اس وقت شاہ دہلی کی حکومت دہلی سے باہر بہت کم تھی مگر تاہم بادشاہت کا رعب باقی تھا تو ان بڑی بی نے مولانا شہید کو بلوا بھیجا۔ مولانا بادشاہ کے محلات میں بلائے ہوئے چلے جایا کرتے تھے۔ ان حضرات کا یہ رنگ نہ تھا کہ امراء و سلاطین سے اینٹھ مروڑ کریں بلکہ دین کی عزت باقی رکھ کر سب سے ملتے تھے اور خاص کر مولانا شہید تو امر بالمعروف کے لئے ہر جگہ پہنچ جاتے تھے چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور پردہ کرا کر مولانا کو اندر بلا لیا گیا مولانا نے بڑی بی کو ادب سے سلام کیا اور انہوں نے پرانی بوڑھیوں کے دستور کے موافق سلام کا جواب دیا اور دعا بھی دی کہ عمر دراز ہو اقبال میں ترقی ہو۔ اس کے بعد مولانا نے دریافت کیا کہ مجھ کو کس لئے یاد فرمایا بڑی بی نے کہا اسماعیل میں نے سنا ہے کہ تو بی بی کی صحنک کو منع کرتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کسی نے غلط کہا اماں میں منع نہیں کرتا بلکہ بی بی کے ابا جان منع کرتے ہیں۔ پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا سنیئے اور یہ کہہ کر مولانا نے خطبہ پڑھا۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره الخ

اور اس کے بعد

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ
وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً
عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ

کا یا حدیث کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت گمراہی ہے) کا بیان شروع کیا۔ اور یہ بات تو مولانا کی خصوصیات میں سے تھی کہ ہر وعظ میں سے لوگ توبہ کر کے اٹھتے تھے۔ نہ معلوم کیا ستم تھا۔ بس بات یہ تھی کہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ ان کو امت کے ساتھ شفقت بے حد تھی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ مخلوق کی اصلاح ہو ہی جائے۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ ہر وعظ میں لوگ تائب ہو کر اٹھتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے وعظ بیان فرمایا تو ایک ہیجڑا بھی اس میں موجود تھا جس کے ہاتھ مہندی سے رنگے ہوئے تھے اور کنگن چوڑیاں چھلے پہنے ہوئے تھا۔ بیان کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ سب چوڑیاں اور کنگن ہاتھ سے نکال پھینکے اور مہندی چھڑانے کے لئے پتھر پر ہاتھوں کو رگڑنے لگا اور اس قدر رگڑا کہ خون نکلنے لگا۔ مولانا نے فرمایا کہ جتنا اثر زائل نہ ہو سکے وہ معاف ہے۔ بس اب زیادہ مت رگڑو۔ اس نے کہا مولانا بس اب خاموش رہیے۔ یہ ہاتھ اسی قابل ہیں کہ لہولہان ہو کر کٹ جائیں اور بے ساختہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

ایک اور ایسا ہی قصہ مولانا کا ہے کہ ایک دفعہ بہت رات گئے مدرسہ سے تنہا نکلے اس وقت چھوٹے میاں مولانا محمد یعقوب صاحب بیدار تھے۔ ان کو فکر ہوئی کہ مولانا اس وقت تنہا کہاں چلے۔ پھر حفاظت کے خیال سے پیچھے پیچھے اس طرح ہو لئے کہ مولانا کو خبر نہ ہو۔ اب دیکھا کہ مولانا نے چکلے کی طرف رخ کیا ہے ان کو حیرت ہوئی کہ ادھر کیا کام ہے۔ پھر دیکھا کہ دہلی کی ایک مشہور رنڈی مینا کے مکان پر ٹھہر کر مولانا نے فقیروں کی طرح ایک صدا لگائی۔ اس رات اس رنڈی کے یہاں کچھ تقریب تھی۔ شہر کی ساری رنڈیاں وہاں جمع تھیں اور باہر کی رنڈیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ مولانا کی آواز سن کر گھر والے یہ سمجھے کہ کوئی فقیر ہے۔ رنڈی نے اپنے ماما سے کہا کہ اس کو کچھ پیسے دے دے وہ پیسے لے کر باہر آئی اور مولانا کو دینے لگی۔ مولانا نے فرمایا کہ اپنی بی بی سے جا کر کہو کہ فقیر کہتا ہے کہ میں ایک صدا کہا کرتا ہوں۔ بغیر صدا سنائے کچھ نہیں لیا کرتا۔ اس نے جا کر پیام پہنچایا۔ چونکہ تقریب کا موقع تھا اس نے کہا اچھا فقیر سے کہہ دو کہ اندر آ کر صدا سنائے کچھ دیر اسی کا لطف رہے گا۔

مولانا اندر تشریف لے گئے اور خطبہ پڑھ کر بیان شروع کیا اور زنا کی مذمت اور زنا کاروں کی وعید بیان کی۔ اس کا ایسا اثر ہوا کہ تمام رنڈیاں روتے روتے بے تاب ہو گئیں اور جب بیان ختم ہوا تو سب قدموں میں گر پڑیں کہ ہم کو توبہ کرائیے اور ہمارا نکاح کر دیجئے۔ آپ نے وہیں بیٹھے بیٹھے ان کے آشناؤں سے ان کے نکاح کر دیئے اور لوٹ کر مدرسہ کی طرف چلے۔

اس وقت مولانا محمد یعقوب صاحب سامنے آئے اور کہا صاحبزادے تم نے اپنے کو کیسا ذلیل کردیا۔ فرمایا کیسی ذلت؟ کہا صاحبزادے! تم اس خاندان کے چراغ ہو جس کے سلامی بادشاہ رہے ہیں اور آج تم رنڈیوں کے مکانوں پر مارے مارے پھرتے ہو۔ مولانا نے فرمایا' حضرت کیا آپ اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔ واللہ! میں تو اپنی عزت اس دن سمجھوں گا کہ جبکہ دلی والے میرا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کر کے میرے سر پر جوتے مارتے ہوں اور یوں کہتے ہوں کہ یہ فاسق ہے بے دین ہے اور میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے۔

قال اللہ کذا وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا

مولانا محمد یعقوب صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت میری آنکھیں کھلیں اور مجھے اپنی بات پر بڑی ندامت ہوئی کہ میں نے یہ کیا کہا اور اس ندامت میں کئی روز تک آنکھیں سامنے نہ کرسکا غرض مولانا کے بیان میں یہ خاص بات تھی کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ محل شاہی میں بھی بیان کا یہی اثر ہوا اور وہ بڑی بی تائب ہوئیں اور کہا بیٹا اسماعیل! ہم تو بی بی کے ابا جان ہی کے خوش کرنے کو صحنک کرتے تھے اور جب وہی اس سے ناخوش ہیں تو آج سے ہم کبھی نہ کریں گے۔

مقام فکر وطریق فکر

تو مولانا کا یہ فرمانا کہ بی بی کے ابا جان منع فرماتے ہیں اسی بنا پر تو تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی بواسطہ اپنے کلام میں متجلی ہیں۔ تو اب حضور کا ذکر ولادت حضور ہی سے پوچھ کر کرو۔ احادیث میں غور کرو حضور نے اپنی ولادت اور طفولیت کے احوال کب اور کس قدر بیان فرمائے ہیں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حضور نے زیادہ تر احکام کا ذکر فرمایا ہے ولادت اور طفولیت کا ذکر بہت ہی کم ملے گا۔ وہاں بعض صحابہ یا صحابیات نے اسلام کے بعد کچھ واقعات آپ کی طفولیت وولادت کے بیان فرمائے ہیں تو یہی طریقہ ہم کو بھی اختیار کرنا چاہئے زیادہ ذکر احکام کریں اور کبھی کبھی ولادت وطفولیت کا ذکر بھی کر دیا کریں۔ یہ نہیں کہ اس کے بغیر ذکر رسول معتبر ہی نہ ہو۔ یہ غلو فی الدین ہے۔

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اگر محقق سے ذکر مولد کا حکم دریافت کرو گے تو وہ مطلقاً منع نہ کرے گا بلکہ کچھ تو وسعت بھی دے گا مگر جس مرکز پر تم اب ہو اس سے ضرور ہٹائے گا۔ چنانچہ حضور کے ذکر کا ایک طریقہ اس آیت میں بھی مذکور ہے جس کو میں نے اس وقت تلاوت کے لئے اختیار کیا ہے وہ آیت یہ ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ
رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ
وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور اور کتاب آئی ہے۔ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضامندی کا اتباع کرتے ہیں۔ سلامتی کے راستے بتلاتے ہیں اور اپنی مشیت سے ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتے ہیں اور سیدھے راستے کی ہدایت کرتے ہیں۔

اس آیت کی دو تفسیر ہیں جن کی طرف پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے اس میں بعض نے نور سے بھی قرآن ہی مراد لیا ہے اور ان کے پاس وجہ ترجیح یہ ہے کہ آگے یہدی بہ اللہ میں ضمیر واحد ہے اگر نور سے مراد حضور اور کتاب سے مراد قرآن ہو تو یہدی بہما اللہ بصیغہ تثنیہ ہوتا۔ گو دوسرے حضرات یہ جواب دے سکتے ہیں کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن باہم دیگر متلازم ہیں۔ اس لئے ان میں سے ایک کی ضمیر میں لزوماً دوسرے کا ذکر بھی ہو گیا۔

دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ نور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں ان کی وجہ ترجیح یہ ہے کہ یہاں نور کی طرف جاء کی اسناد کی گئی ہے اور اصل میں یہ ہے کہ مجی کے اسناد ذوی العقول کی طرف ہو۔ چنانچہ اسی بناء پر دوسری ایک آیت۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا

اے لوگو! تمہارے پاس آپہنچی ہے تمہارے رب کی طرف سے سند اور اتاری ہم نے تم پر روشنی واضح۔

میں بھی ان مفسرین نے کہا کہ برھان سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور نور سے مراد قرآن ہے کیونکہ انزلنا کی اسناد میں اصل یہ ہے کہ کتاب کی طرف ہو۔ اور اس سے معلوم ہوا کہ نور قرآن کی بھی صفت ہے اور حضور کی بھی۔ اسی طرح برھان قرآن کی بھی صفت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی۔ بہر حال یہ وجوہ ترجیحات ہیں ہر قول کی۔ گو ان میں یہ احتمال باقی ہے کہ بعض جگہ اسناد مجیی قرآن کی طرف ہے جیسے **قد جاء کم الحق من ربکم** اور بعض جگہ انزال کی اسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جیسے۔

قد انزل اللہ الیکم ذکراً رسولاً یتلواعلیکم ایٰت اللہ مبیّنٰت
لیخرجکم من الظلمٰت الی النور

میں اور اس کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ یہ اسناد مجازی ہے اور اصل وہی ہے کہ اسناد مجیی کی حضور کی طرف ہو اور اسناد انزال قرآن کی طرف۔ اب اس اصل کو کسی قرینہ صارفہ کی وجہ سے چھوڑا جا سکتا ہے جو اس جگہ موجود نہیں۔ تو گو تفسیر میں سب صحیح ہیں مگر جی یہ چاہتا ہے کہ نور سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ لیکن میں اس پر زور نہیں دیتا۔ کیونکہ ہر قول کی طرف مفسرین کی ایک جماعت ہے اور ہر ایک کے پاس وجوہ ترجیح ہیں۔

مگر اس جگہ میرے ذوق میں ترجیح ان حضرات کے قول کو ہے جو نور سے حضور کو مراد لیتے ہیں مگر اس پر زور دینے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ہمارا مطلب ہر طرح حاصل ہے خواہ حضور نور کے مصداق

ہوں یا قرآن۔ ہر ایک کا نور ہونا دوسرے کے نور ہونے کو مستلزم ہے میں پھر وہی کہوں گا۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف   گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(بخت اگر مدد کرتے تو اسکا دامن میرے ہاتھ آجائے اگر میں اسے کھینچ لوں تو باعث مسرت ہے اور اگر وہ مجھے کھینچ لے تب بھی باعثِ مسرت ہے۔) اور یوں کہوں گا

عبارا تنا شتّٰی و حسنک واحد   و کل الی ذاک الجمال یشیر

ہماری عبارتیں متعدد ہیں مگر آپ کا حسن ایک ہے اور سب عبارات آپؐ کے جمال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اور جب حضور بھی نور ہیں اور قرآن بھی نور ہے تو اب ہمارے پاس نور علی نور ہے۔ جیسا کہا گیا ہے۔

نبی خود نور اور قرآں ملا نور   نہ ہو پھر مل کے کیوں نور علی نور

اس حالت میں ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو حضور سے محبت زیادہ ہے یا قرآن سے ہر اک کی محبت دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہم کو تو حضور سے بھی تعلق محبت ہے اور قرآن سے بھی۔ وہ اپنی طرف کھینچتے ہیں وہ اپنی طرف۔ بس ہمارا تو وہ حال ہے کہ لعل سے کسی نے پوچھا کہ تو اپنے کو چاہتا ہے یا آفتاب؟ کہا کچھ نہ پوچھو۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اپنے سے محبت ہے تو وہ بھی آفتاب ہی کی محبت ہے کیونکہ میرے اندر جو کچھ نور اور رونق ہے سب اسی کی بدولت ہے اور اگر کہوں کہ آفتاب سے محبت ہے تو یہ بھی اپنے ہی ساتھ محبت ہے کیونکہ آفتاب سے اس لئے محبت ہے کہ اس نے مجھے لعل بنا دیا تو وہ اپنی ہی محبت ہوئی۔ تو بعض جگہ دونوں طرف سے تلازم ہوتا ہے۔ وہاں ہر ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہوتی ہے۔ اس پر کسی عاشق کا شعر یاد آتا ہے۔ واقعی تلازم محبتین کو خوب ہی ظاہر کیا ہے۔

قاصد رسید و نامہ رسید و خبر رسید   در حیرتم کہ جاں بکدامی کنم نثار

(قاصد پہنچا خط پہنچا اور اطلاع پہنچی میں حیران ہوں کہ ایک جان کس کس پر قربان کروں)

ہائے قاصد بھی محبوب کا ہے اور نامہ بھی محبوب کا ہے۔ اب کیا کہیں کہ کس سے مسرت زیادہ ہے۔ یہی حال یہاں کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قاصد ہیں اور قرآن نامہ حق ہے۔ ہر ایک اپنی طرف دل کو کھینچ رہے ہیں بس یوں کہنا چاہئے کہ ہمارے لئے ہر ایک میں دوسرا موجود ہے حضور نہ ہوتے تو ہم کو قرآن کیسے ملتا اور قرآن نہ ملنے والا ہوتا تو حضور کیوں تشریف لاتے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں دونوں شانیں موجود ہیں۔ قرآن میں حضور کی بھی شان ہے یعنی نور کی اور حضور میں قرآن کی شان موجود ہے یعنی کتاب مبین کی۔ شاید تم کہو کہ حضورؐ میں کتاب کی شان کیونکر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ حضرت علیؓ تو ہر انسان کے متعلق فرماتے ہیں۔

دواءک فیک و ماتشعر   وداءک منک و ما تبصر
و انت الکتاب المبین الذی   باحرفہ یظہر المضمر
و انت تزعم انک جرم صغیر   و فیک انطوی العالم الاکبر

(تیری دوا تجھ ہی میں ہے اگر تو سمجھتا نہیں اور تیری بیماری بھی تجھ ہی سے پیدا ہوئی ہے اگر تجھ کو بصیرت حاصل نہیں تو تو وہ کتاب مبین ہے جس کے حروف سے پوشیدہ ظاہر ہوتے ہیں تو خود کو حقیر لاشی سمجھتا ہے حالانکہ ایک زبردست عالم تجھ میں موجود ہے واقعی انسان خود میں غور کرے تو عجائبات کا انکشاف ہو۔)

سو حضرت علیؓ ہر شخص کی نسبت فرماتے ہیں کہ تم کتاب مبین ہو کیونکہ انسان مظہر اتم ہے۔ الہیات کا اور ملکوت کا۔ اس میں ہر شے کی نظیر موجود ہے۔

لوح محفوظ کی نظیر

چنانچہ لوح محفوظ کی نظیر بھی اس میں موجود ہے اور اس بات کو مولانا محمد قاسم صاحب نے دیانند سرستی کے مقابلہ میں ظاہر فرمایا تھا۔ ایک دفعہ اس نے سوال کیا۔ مسلمان کہتے ہیں کہ لوح محفوظ میں اول خلقت سے قیامت تک کے تمام واقعات لکھے ہوئے ہیں اور واقعات تو لاتعداد و لاتحصی ہیں تو وہ کتاب بہت ہی بڑی ہوگی پھر وہ رکھی کہاں جاتی ہوگی۔

یہ سوال ایسا ہی تھا جیسے دو شخصوں میں بحث ہوئی۔ ایک نے کہا کہ ہمارے دادا کے ہاں اتنا بڑا اصطبل تھا کہ اگر ایک کونہ میں گھوڑی نے بچہ دیا تو دوسرے کونہ تک پہنچتے ہی پہنچتے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ دوسرے نے کہا جی ہاں پہلے لوگوں کے کارنامے ایسے ہی ہوتے تھے ہمارے دادا کے یہاں ایک بانس اتنا بڑا تھا کہ جب بارش نہ ہوتی تو وہ بادلوں میں اس سے سوراخ کر دیا کرتے تھے جس سے بارش ہو جایا کرتی تھی۔ پہلا شخص بولا کہ اتنا جھوٹ بھلا اتنا بڑا بانس رکھا کہاں جاتا ہوگا۔ کہا آپ کے دادا کے اصطبل میں رکھا جاتا تھا کیونکہ میرے دادا اور آپ کے دادا بہت دوست تھے۔

تو جیسے اس شخص کو اس بانس کے متعلق یہ اشکال ہوا کہ وہ کہاں رکھا جاتا ہوگا ایسے ہی دیانند کو لوح محفوظ پر شبہ ہوا کہ وہ کہاں رکھی جاتی ہوگی مولانا نے اس کا جلدی جواب نہیں دیا بلکہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے کہ لالہ جی! آپ کی کتنی عمر ہے؟ اس نے کہا ستر برس کی۔ مثلاً پوچھا کہاں کہاں تعلیم حاصل کی ہے کیا کیا پڑھا ہے؟ اور آپ کو اپنے بچپن کے واقعات بھی کچھ یاد ہیں؟ اس نے بیان کیا کہ میں نے پہلے وہاں تعلیم حاصل کی پھر وہاں اور میں نے اتنی کتابیں دیکھیں اور اتنی کتابیں پڑھیں۔ اور میں نے اتنے سال سیاحت کی۔ مولانا نے پوچھا کہ یہ سب واقعات آپ کو یاد ہیں کہا ہاں! اور بچپن کے واقعات بھی بہت یاد ہیں اور جوانی کے اور سیر و سیاحت و تعلیم وغیرہ کے واقعات تو گویا اس وقت میرے سامنے ہیں۔ غرض اس نے اپنے حافظہ کی بہت تعریف کی۔ مولانا نے پوچھا کہ یہ سب واقعات آپ کو محفوظ ہیں اس نے بڑے دعوے سے کہا جی ہاں۔ بجنسہٖ سب محفوظ ہیں۔ اب مولانا نے فرمایا کہ لالہ جی! اس ذرا سے دماغ میں جو ایک بالشت سے بھی کم ہے ستر برس کے واقعات اور کتابوں کے مضامین اور لوگوں کی باہمی تقریریں اور ابحاث کس طرح سما گئے اس پر وہ خاموش ہوا۔

مولانا نے فرمایا کہ لوح محفوظ کی نظیر تو خود آپ کے اندر موجود ہے آپ کا دماغ پھر حیرت ہے کہ آپ لوح محفوظ پر یہ سوال کرتے ہیں کہ وہ کہاں رکھی جاتی ہوگی۔ آپ کو کبھی اپنے دماغ پر شبہ نہ ہوا کہ اس ذرا سے دماغ میں اس قدر بے شمار واقعات و مضامین کس طرح محفوظ رہتے ہیں۔ پھر بعض انسانوں کی عمریں ہزار سال کی ہوئی ہیں اور ان کے حافظے ہم سے زیادہ قوی تھے ان کے دماغ میں ہزار سال کے واقعات اور ہزاروں آدمیوں کی صورتیں کیونکر محفوظ رہتی تھیں۔ تو یہ کیا ضرور ہے کہ جس چیز میں لاکھ دو لاکھ برس کے واقعات لکھے جائیں وہ طولاً و عرضاً بھی اتنی بڑی ہو کہ آسمانوں میں نہ سما سکے۔ خدا تعالیٰ کو قدرت ہے کہ تھوڑے سے جسم میں جتنے چاہیں واقعات محفوظ کر دیں۔ چنانچہ ایک نظیر اس کی انسان میں بھی موجود ہے اب تو دیانند مولانا کا منہ تکنے لگا۔

تو انسانی دماغ مظہر لوح بھی ہے اور اس کا نفس تو اس سے بھی بڑھا ہوا ہے اور جب ہر انسان کی یہ کیفیت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو کیسی کچھ ہونا چاہیے کیونکہ آپ تو اکمل البشر و افضل البشر ہیں۔ آپ میں اگر قرآن کریم کی شان اور لوح محفوظ کی شان موجود ہو۔ تو کیا اشکال ہے۔

مرجع کمالات

بہر حال اس آیت میں نور کا مصداق گو قرآن بھی ہو سکتا ہے مگر سہل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مراد ہوں تو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور فرمایا گیا ہے اور اس ایک لفظ میں تمام کمالات کو حضور کے لئے ثابت کر دیا گیا ہے کیونکہ تمام کمالات کا مرجع یہی ہے کیونکہ نور کہتے ہیں اس کو جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو بھی ظہور عطا کرے اور کمالات کی یہی شان ہوتی ہے کہ خود بھی ظاہر ہوتے ہیں اور صاحب کمال کو ظاہر کرتے ہیں سو جو خود نور ہو وہ محتاج بیان کمالات نہیں ہوگا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ تمام کمالات کا مرجع نور ہے علاوہ دلیل کے اس پر تمام عقلاء و محققین صوفیہ کا اتفاق بھی ہے۔ ان حضرات نے فیصلہ کیا ہے کہ اصل الکمالات الوجود ... تمام کمالات کی اصل وجود ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں کہا ہے

اصل النقائص العدم ..... تمام نقائص کی اصل عدم ہے۔

پھر بھی کہا ہے کہ وجود نور ہے کیونکہ اس سے موجود کا ظہور ہوتا ہے اور عدم ظلمت ہے کیونکہ اس میں شے مخفی و مستور رہتی ہے۔ پس جس قدر وجود کامل ہوگا اسی قدر اس میں شان نور قوی ہوگی۔ حق تعالیٰ کا وجود سب سے اکمل ہے اس لئے وہ شان نور میں اصل ہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے)

پھر جو چیز مظہر حق ہونے میں کامل ہوگی اس میں یہ شان دوسروں سے زیادہ قوی ہوگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظہر اتم ہیں صفات اللہ کے۔ اس لئے آپ کو بھی نور کہا گیا۔

باقی یہ سوال نہ کیا جائے کہ پھر بعض جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کیوں ظاہر کیے گئے ہیں اور بعض جگہ قرآن کو بھی تو نور کہا گیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہر مقام کا مقتضیٰ جدا ہے کہیں مخاطب کسی مذاق کا ہے اس کے لئے ہندی کی چندی کی ضرورت تھی۔ وہ لفظ نور سے حضور کے تمام کمالات پر استدلال نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے کمالات کی تفصیل کی گئی اور رہا قرآن کو بعض جگہ نور کہنا تو اس کا منشاء بھی وہی ہے کہ قرآن بھی حق تعالیٰ شانہ کے کمالات و صفات کا مظہر ہے اس لئے وہ بھی نور ہے۔ مگر یہاں چونکہ اہل کتاب سے خطاب ہے اور اہل کتاب کو قرآن سے چنداں ضد نہ تھی بلکہ حضور سے ضد تھی کیونکہ ضد و حسد ہم جنس سے ہوا کرتا ہے اور حضور ان کے ہم جنس تھے نہ کہ قرآن اس لئے یہاں ان پر احتجاج کے لئے حضور کو نور سے تعبیر کیا گیا کیونکہ وہ لوگ آپ سے واقف پوری طرح تھے۔

یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ یہ (کفار یہود) اس کو (حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول من جانب اللہ ہونے میں) ایسے ہی (واضح طریق پر) پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔

اثر عناد و تکبر

چنانچہ احبار یہود کبھی کبھی تقیہ سے کسی اپنے خاص دوست کو بتلا دیا کرتے تھے کہ یہ نبی برحق ہیں۔ ان کے اتباع میں نجات منحصر ہے مگر عناد و حسد و تکبر نے راہ مار رکھا تھا اس لئے خود ایمان نہ لاتے تھے۔ بس یہ عار مانع تھا کہ آج تو ہم حبر و علامہ کہلاتے ہیں ہزاروں ہمارے غلام ہیں اور اسلام کے بعد ہم غلامان رسول کہلائیں گے۔ تو اہل کتاب کے خطاب میں آپ کو نور فرمانا نہایت ہی مناسب ہوا اور اہل کتاب کا واقف ہونا تو چنداں عجیب نہیں کیونکہ وہ کتاب آسمانی سے حضور کے صفات و حالات معلوم کیے ہوئے تھے۔

چنانچہ بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ صنادید قریش نے باہم مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس وقت نماز پڑھ رہے ہیں۔ فلاں جگہ اونٹ ذبح ہوا ہے کوئی جا کر اس کی الائش اٹھا لائے اور جب یہ جدہ میں جائیں تو ان کی کمر پر رکھ دے۔ چنانچہ ایک اشقی القوم کھڑا ہوا اور آلائش لایا اور عین سجدہ کے وقت آپ کی کمر مبارک پر اس کو رکھ دیا۔ آپ سجدہ میں دیر تک پڑے رہے پھر کسی نے حضرت فاطمہ کو جو اس وقت بچی تھیں خبر کی۔ وہ تشریف لائیں اور اس آلائش کو حضور کی کمر سے جدا کیا اور سرداران قریش کو برملا خوب برا کہا۔ راوی کہتے ہیں کہ جس وقت ان بدبختوں نے یہ حرکت کی تھی اس وقت تو ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گرتے تھے مگر جب نماز سے فارغ ہو کر حضور نے بددعا کی ہے۔

اللهم عليک بقريش اللهم عليک بابی جهل بن هشام و عقبة بن ابی معيط الخ (الصحيح للبخاری ۱: ۶۹، ۱۳۸، ۴: ۵۳، الصحيح لمسلم كتاب الجهاد: ۱۰۷، ۱۰۹، سنن النسائی ۱: ۶۲، مشكوة المصابيح: ۵۸۴۷.)

تو اس وقت سب کے رنگ فق ہو گئے کیونکہ جانتے تھے کہ آپ نبیؐ ہیں اور آپ کی بد دعا ٹل نہیں سکتی۔ یہ کس قدر قہر حق ہے کہ حق واضح ہے اور پھر اس سے رکے ہوئے ہیں۔

اسی طرح ایک دفعہ ابو جہل نے کہا کہ اب کے اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے ناک رگڑتے ہوئے دیکھا (یعنی نماز پڑھتے ہوئے) تو میں ان کی گردن پر پیر رکھ کر گلا گھونٹ دوں گا۔ جرات تو دیکھو کہ اس نالائق کا پیر اور حضور کی گردن پر رکھنے کا ارادہ ارے حضور کی تو وہ شان ہے کہ۔

بمقامیکہ نشان کف پائے تو بود　　　سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

جس مقام پر آپ کے پاؤں مبارک کے قدموں کا نشان ہے صاحب نظر اس قدم شریف کے نشان پر مدتوں سجدہ کریں گے۔　　اور یہ شان ہے

در منزلیکہ جاں تا روزے رسیدہ باشد　　　باخاک آستانش واریم مرحبائے

جس مقام پر آپ کے پاؤں مبارک کے قدموں کا نشان ہے اہل نظر اس قدموں کے نشان پر مدتوں سجدہ کرتے رہیں گے۔

چنانچہ ابو جہل کو خبر ملی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب نماز پڑھنے کو تیار ہیں۔ وہ تکبر میں اکڑتا ہوا آیا اور حضور کی طرف اسی گستاخی کے قصد سے چلا مگر قریب ہی پہنچا تھا کہ ہاتھ جھاڑتا ہوا پیچھے کو بھاگا۔ کفار نے کہا اے عمرو! تجھے کس بلا نے کھایا ایسا ڈر کر کیوں بھاگا؟ کہنے لگا کچھ نہ پوچھو! میرے اور محمدؐ کے درمیان آگ کی خندق تھی جس میں بڑے بڑے جانور منہ کھولے میرے اوپر حملہ کرنے کو تیار تھے اس واسطے میں الٹا ہی بھاگ آیا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى ۝٩ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝١٠ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝١١
اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝١٢ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝١٣ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝١٤
كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝١٥ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝١٦ فَلْيَدْعُ
نَادِيَهٗ ۝١٧ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝١٨ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝١٩ سجدہ

(اے رسول) آپ نے دیکھا اس کو جو منع کرتا ہے ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھے۔ بھلا دیکھ تو اگر ہوتا نیک راہ پر سکھاتا ڈر کے کام۔ بھلا دیکھ تو اگر جھٹلایا اور منہ موڑا نہ جانا کہ اللہ دیکھتا ہے۔ کوئی نہیں اگر باز نہ آئے گا ہم گھسیٹیں گے چوٹی پکڑ کر۔ جھوٹے گنہگار اب بلا لے اپنے مجلس والوں کو ہم بھی بلاتے ہیں پیارے سیاست کرنے کو کوئی نہیں مت مان اس کا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو (اس میں سجدہ ہے پڑھنے کے بعد سجدہ ضرور کریں)

حضورؐ نے نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ آگ میں جو پرندے اس کو نظر آئے وہ فرشتے تھے۔ بخدا اگر ذرا میرے پاس آتا تو فرشتے اس کی بوٹی بوٹی کر ڈالتے۔

یہ سب کچھ دیکھا مگر قہر تھا کہ ایمان نہ لایا۔ غرض ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کا سبب عدم معرفت نہ تھی محض تکبر تھا کسی کو درجہ عناد میں کسی کو درجہ عار میں چنانچہ حضرت ابو طالب کے لئے یہی عار مانع تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت جانثار تھے اور جانتے تھے کہ میرا بھتیجا سچا ہے۔ اور ہمیشہ حضور کے صدق و دیانت کی اشعار میں مدح کرتے رہے مگر ایمان نہیں لائے اور جس وقت حضور نے نزع کی حالت میں ان سے کہا کہ اے چچا ایک دفعہ میرے کان ہی میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دو تا کہ حق تعالیٰ کے یہاں عرض معروض کا موقع مل جائے تو جواب یہ دیا کہ اے بھتیجے! میں جانتا ہوں کہ تو سچا ہے اور تیرا دین حق ہے اور میں تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا مگر مجھے شرم آتی ہے کہ قریش کی بوڑھی عورتیں یہ کہیں گی کہ ابو طالب نے موت کے خوف سے اور جہنم کے ڈر سے اپنا آبائی مذہب بدل دیا چنانچہ نہیں ایمان لائے اور اخیر بات جو زبان سے نکلی وہ یہ تھی **ھو علی دین عبدالمطلب** (کہ میں عبدالمطلب کے طریقہ پر مر رہا ہوں)

بڑی وجہ ابو طالب کے اعراض کی یہ ہوئی کہ اس وقت کم بخت ابو جہل موجود تھا جب حضور کچھ فرماتے اسی وقت وہ کم بخت یوں کہتا کہ اے ابو طالب! کیا عبدالمطلب کے طریقہ سے اعراض کرتے ہو؟ کیا موت سے ڈرتے ہو؟ یہ نالائق شیطان کا بھی شیطان تھا جیسے ہامان فرعون کا بھی فرعون تھا۔ کیونکہ سیر میں ہے کہ فرعون تو کئی دفعہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کو تیار ہو گیا تھا مگر ہر دفعہ یہ نالائق ہامان اس کو روکتا تھا۔

چنانچہ ایک دفعہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر میں ایمان لے آؤں تو مجھے کیا ملے گا۔ فرمایا آخرت کا ثواب تو الگ ہے دنیا میں تجھ کو چار چیزیں ملیں گی۔

۱۔ حیات دائمی کہ قیامت تک زندہ رہے گا۔
۲۔ سلطنت دائمی کہ قیامت تک بادشاہ ہی رہے گا۔ کبھی معزول نہ ہوگا۔
۳۔ ہمیشہ جوان رہے گا بڑھاپا نہ آئے گا اور
۴۔ ہمیشہ تندرست رہے گا بیمار کبھی نہ ہوگا۔

بھلا زندگی میں دنیا میں ان چار نعمتوں سے زیادہ اور کیا چاہئے فرعون ایمان لانے کے قریب ہو گیا کیونکہ عمر بھر کے تجربہ اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات باہرہ سے اس کا اس کو یقین تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جھوٹا وعدہ کبھی نہیں کرتے۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ

اور بے انصافی اور غرور سے ان کا انکار کیا حالانکہ یقین کر چکے تھے ان کا اپنے جی میں۔ سو دیکھ لے کیا ہوا انجام خرابی کرنے والوں کا۔

فرعون نے یہ سن کر کہا کہ اے موسیٰ! میں ذرا مشورہ کرلوں پھر ایمان لاؤں گا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہامان سے مشورہ نہ کرنا اور جس سے چاہے کرلینا اس نے اول آکر اپنی بی بی سے مشورہ کیا یعنی آسیہ علیہا السلام سے جو ولیہ اور کاملہ تھیں انہوں نے فرمایا۔

اللہ اللہ ہیچ تاخیرے مکن   کہ زبحر لطف آمد ایں سخن
اللہ اللہ زود بشتاب و بجود   چونکہ بحر رحمت است ایں نیست جود
اللہ اللہ تو گمان بد مبر   برچنیں انعام عالم اے بے خبر

مولانا نے مثنوی میں یہ قصہ لکھا ہے اور کئی شعروں میں یہی مضمون ہے کہ اللہ اللہ جلدی اس نعمت کو لے لو۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے مگر ہامان کم بخت کو جو خبر ہوئی کہ فرعون ایمان لانے پر تیار ہے تو اس نے فوراً تلوار نیام سے نکال کر سامنے رکھ دی کہ پہلے ہامان کی گردن اڑا دیجئے پھر جو چاہے کیجئے۔ مجھ سے تو یہ نہ دیکھا جائے گا کہ اب تک خدا تھے اور اب بندہ ہو گے۔ بس یہ بات سن کر اس کو بھی تکبر نے گھیر لیا اور ایمان سے انکار کر دیا۔ تو یہ تکبر بڑی بلا ہے بڑا قہر ہے اسی لئے صوفیہ کرام سب سے پہلے تکبر کا علاج کرتے ہیں۔

سراپا نور

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ ہم لوگوں کو جو بعض دفعہ یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش ہم حضورؐ کے زمانہ میں ہوتے یہ ٹھیک نہیں۔ لوگوں کا حضور کے زمانہ میں نہ ہونا اور اب ہونا یہی نعمت ہے کیونکہ ہم اگر اس وقت بھی ہوتے تو ایسے ہی ہوتے جیسے اب ہیں اور اب ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے اندر تکبر ہے اور اتباع علماء سے اعراض ہے تو اس وقت اگر حضور کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ایمان ہی نصیب نہ ہوتا کیونکہ عادت مالوفہ یک لخت ترک کر دینا بڑی ہمت کی بات ہے جو ہر اک سے نہیں ہو سکتی۔

دیکھئے آج کل بہت سے عقلاء رسوم قدیمہ کی قباحت سے واقف ہیں مگر چونکہ طبائع ان سے مالوف ہو چکی ہیں اس لئے باوجود علم کے ترک نہیں کر سکتے۔ یہی حال اس وقت کے عقلاء کا تھا کہ ان میں بھی بہت سے اسلام کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق سے بخوبی واقف تھے مگر جس طریقہ سے پہلے سے طبائع مالوف تھیں اس کا چھوڑنا گراں ہوتا تھا۔ اس لئے ہمارے حق میں تو یہی بہتر ہوا کہ بعد میں پیدا ہوئے عار و استکبار کا کوئی سبب نہیں پایا گیا۔ باپ دادا کی موافقت ایمان کا سبب ہو گیا اور مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے سے مفت میں ایمان مل گیا۔ بس یہی اچھا ہوا کہ حضور کے بعد پیدا ہوئے اور غائبانہ محبت کے اسباب ایسے جمع ہو گئے کہ آپ کی زیارت کو ترستے ہیں اور قیامت میں یا قبر میں زیارت بھی ہو جائے گی یا خواب میں شاید کبھی یہاں بھی ہو جائے۔

ایک حدیث کے بعض الفاظ سے بعض علماء نے یہ سمجھا ہے کہ قبر میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو گی وہ الفاظ نکیرین کے سوال میں یہ ہیں من ھذا الرجل ان سے اس طرح سمجھا ہے کہ

بذا کی اصل اشارہ حسیہ ہے تو مشار الیہ محسوس ہونا چاہئے بس اسی بھروسہ پر دن گزار رہے ہیں ان شاء اللہ مر ہی کر آپ کو دیکھ لیں گے۔

اس پر مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک لطیفہ یاد آیا مولانا نے فرمایا حق تو یہ تھا کہ ہم حضور کے سامنے مرتے قدموں میں جان نثار کرتے اور آپ ہمارے جنازہ کی نماز پڑھتے مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ نہیں ہوا تو اب یہ تو ہوگا کہ بجائے جنازہ پر تشریف لانے کے حضور قبر ہی میں تشریف لائیں گے پھر یہ شعر پڑھا۔

کشش عشق وارونگذاردت بدینسال　　　بجنازہ گرنیائی بمزار خواہی آمد
عشق کی کشش تمہیں آنے کے بغیر نہ چھوڑے گی اگر جنازہ پر نہ آئے تو مزار پر

یہ کسی کی بڑی اچھی غزل ہے اس میں ایک اور شعر بھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا چسپاں ہے۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف　　　بامید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد
تمام جنگل کے ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا اس امید میں کسی دن تو شکار کو آئے گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ حجۃ الوداع میں حضور نے سو اونٹ قربانی کئے تھے جن میں سے تریسٹھ اونٹ اپنے دست مبارک سے نحر فرمائے تھے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقیر و مفلس نہ تھے جیسا کہ بعض جاہل واعظ بیان کیا کرتے ہیں۔ آپ سخی تھے کہ سخاوت کی وجہ سے گھر میں کچھ رکھتے نہ تھے۔ مفلس نہ تھے ورنہ کہیں غریب و مفلس بھی سو اونٹ کی قربانی کیا کرتے ہیں۔ آپ کا فقر اضطراری نہ تھا اختیاری تھا۔ انبیاء کو مفلس و غریب کون کہہ سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور کے ہاتھ میں قوت کس درجہ تھی کہ تریسٹھ اونٹوں کی قربانی تنہا اپنے ہاتھ سے فرمائی۔ ہم سے تو ایک چڑیا بھی نہ کٹے۔

کانپور میں ایک اونٹ کو تیرہ چودہ آدمیوں نے مل کر قربانی کیا تھا پھر بھی وقت سے قابو میں آیا اور حضور نے لٹا کر ذبح نہ کیا تھا بلکہ ایک پیر کو تسمہ بندھوا کر کھڑا کر کے سب کو نحر کیا تھا۔ تو حدیث میں آتا ہے۔ **کلهن يزدلفن اليه** کہ ذبح کے وقت ہر اونٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر اپنی گردن کو آپ کے برچھے کی طرف بڑھاتا تھا کہ پہلے مجھے نحر فرمایئے۔

سبحان اللہ کیا شان محبوبیت تھی کہ جانور عاشق تھے اور آپ کے ہاتھ سے سب سے اول ذبح ہونا چاہتے تھے۔ بس اس وقت ان کی یہ حالت تھی۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف　　　بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد
(تمام جنگل کے ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا اس امید میں کہ کسی دن تو شکار کو آئے گا۔)

اور یہ حالت تھی

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے　　　کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

غرض معاصرت اصل منافرت ہے۔ اس لئے یہود کو اور صنادید قریش کو حضور سے حسد رہا ہے

ہجرت کے بعد بھی غریب لوگ زیادہ ایمان لائے صنادید قریش جب بھی پیچھے پیچھے رہتے تھے۔ حتی کہ فتح مکہ کے بعد سب سے آخر میں قریش مسلمان ہوئے تو چونکہ یہود پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نبوت اور آپ کے کمالات سب سے زیادہ ظاہر تھے اور اس جگہ یہود سے مخاطبت ہے چنانچہ اس آیت کا اول جزو اس پر دال ہے وہ یہ ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا
مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ
جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ

(اے اہل کتاب! تحقیق تمہارے پاس ہمارے رسول تشریف لائے تم پر بہت سی چیزیں ظاہر کرتے ہیں جن کو تم چھپاتے ہو کتاب میں سے اور درگزر کرتے ہیں بہت سی چیزوں سے بے شک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔)

اس لئے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وصف نور لانا زیادہ زیبا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لئے سراپا نور ہیں۔ آپ کی شان تمہارے سامنے بالکل کھلی ہوئی ظاہر ہے اور دوسرے مقامات کے مناسب دوسرے صفات بیان کئے گئے۔

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے وارد

ہر بات نکتہ اور ہر نکتہ مقام رکھتا ہے۔

تو اس جگہ حق تعالیٰ نے حضور کی ایک بہت بڑی صفت بیان فرمائی ہے جو تمام صفات سے مستغنی ہے اسی کو میں بیان کرنا چاہتا تھا کہ ہمارے حضور جو دنیا میں تشریف لائے ہیں تو سراپا نور بن کر آئے ہیں کہ خود بھی منور ہیں اور دوسروں کی ظلمت کو بھی نور سے مبدل فرماتے ہیں بشرطیکہ وہ نور کے طالب ہوں اور اسی سے طریقہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کا بھی معلوم ہوگیا کہ اس طرح ذکر کرنا چاہیے جس طرح حق تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ آپ کی شان تنویر عالم و ہدایت جان نبی آدم کو ذکر کیا جاوے۔

بس اب ختم کرتا ہوں گو اجزاء مضمون کے اور بھی رہ گئے ہیں مجھے درمیان میں وقت کا پتہ نہیں چلا اس لئے تمہید طویل ہوگئی۔ دفعۃً اذان عصر سے متنبہ ہوا کہ وقت زیادہ گزر گیا اگر موقع ہوا تو انشاء اللہ پھر بقیہ اجزاء کا بیان ہو جائے گا اس وقت تو یہی مضمون کافی ہے کیونکہ دیر بہت ہوگئی۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی محبت اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عطا فرمائیں اسی محبت میں جلائیں اور اسی پر ماریں اور اسی پر اٹھیں۔ (آمین)

وصلی اللہ علی سیدنا محمد الحبیب المحبوب وعلی الہ واصحابه اجمعین و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین.

المورد الفرسخی فی المولد البرزخی

ولادت ناسوتیہ وملکوتیہ کے متعلق یہ وعظ ۷ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا حاضری پچاس کے قریب تھی قریباً ۴ گھنٹہ میں ختم ہوا مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

إِذَا جَآءَ نَصۡرُ ٱللَّهِ وَٱلۡفَتۡحُ ۝ وَرَأَيۡتَ ٱلنَّاسَ يَدۡخُلُونَ فِي دِينِ
ٱللَّهِ أَفۡوَاجٗا ۝ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَٱسۡتَغۡفِرۡهُۚ إِنَّهُۥ كَانَ تَوَّابَۢا ۝

مجالس موالید

یہ ایک سورت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں نازل ہوئی ہے جس کا مدلول ظاہری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نعمت فائضہ پر مکہ کے مقابلہ میں مطالبہ شکر ہے کہ ایک بڑی نعمت یعنی فتح مکہ آپ کو عطا ہونے والی ہے یا ہو چکی ہے اس پر شکر کا مطالبہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ نعمت عطا ہو اس وقت شکر کیجئے یا یہ کہ وہ نعمت کاملہ چونکہ فائض ہو چکی ہے اس لئے شکر کیجئے۔ یا کلمہ تردد میں نے اس واسطے کہا ہے کہ مفسرین کو اس میں گفتگو ہے کہ اس میں اذا مستقبل کے لئے ہے یا ماضی کے لئے جیسے

اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ (یہاں تک کہ ان دونوں سروں کے بیچ کو برابر کر دیا)

اور اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا (یہاں تک کہ اس کو لال انگارا کر دیا۔)

میں ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا ہے یا بعد میں۔ مدلول ظاہری کلی تو سورت شریفہ کا یہ ہے اور مدلول خفی یہ ہے کہ جب آپ کی عمر ختم ہو جائے یعنی قریب ختم ہو جائے تو حمد و تسبیح میں مشغول ہو جائیے اور واسطہ اس ولادت کا یہ ہے کہ جب

آپ کے فیوض کی تکمیل ہو جائے جس کی طرف جاء نصرالله ورأیت الناس میں اشارہ ہے تو اس وقت طاعت میں زیادہ مشغول ہو جیئے کیونکہ شکر وحمد بھی عنوان طاعت ہی ہے صرف عنوان کا تفاوت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت آخرت کی خاص تیاری کیجئے۔

وجہ اس مضمون کے اختیار کی یہ ہے کہ میرا کئی سال تک یہ معمول رہا کہ یہ جو مبارک زمانہ ہے جس کا نام ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ جس کی فضیلت کو ایک عاشق ملا علی قاری نے اس عنوان سے ظاہر کیا ہے۔

لهذا الشهر فی الاسلام فضل　　منقبته تفوق علی الشهور
ربیع فی ربیع فی ربیع　　و نور فوق نور فوق نور

(اسلام میں اس ماہ کی بڑی فضیلت ہے اور تمام مہینوں پر اس کی تعریف کو فضیلت ہے بہار اندر بہار اندر بہار ہے اور نور بالائے نور بالائے نور۔)

تو جب یہ مبارک مہینہ آتا تھا تو میں حضور کے وہ فضائل جن کا خاص تعلق ولادت شریفہ سے ہوتا تھا مختصر طور پر بیان کرتا تھا مگر التزام کے طور پر نہیں کیونکہ التزام میں تو علماء کو کلام ہے بلکہ بدوں التزام کے دو وجہ سے۔ ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فی نفسہ طاعت و موجب برکت ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ جو مجالس موالید کی ممانعت کرتے ہیں تو وہ ممانعت نفس ذکر کی وجہ سے نہیں۔ نفس ذکر کو تو ہم لوگ طاعت سمجھتے ہیں بلکہ محض منکرات و مفاسد کے انضمام کی وجہ سے منع کیا جاتا ہے۔ ورنہ نفس ذکر کا تو ہم خود قصد کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہری وجوہ تھیں۔

بڑی بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں اور دنوں سے زیادہ حضور کے ذکر کو جی چاہا کرتا ہے اور یہ ایک امر طبعی ہے کہ جس زمانہ میں کوئی امر واقع ہوا ہو اس کے آنے سے دل میں اس واقع کی طرف خود بخود خیال ہوا جاتا ہے۔ اور خیال کو یہ حرکت ہونا جب امر طبعی ہے تو زبان سے ذکر ہو جانا کیا مضائقہ ہے یہ تو ایک طبعی بات ہے۔ مگر اس کے مقتضاء پر عمل جب جائز ہے کہ کوئی امر شرعاً مزاحم نہ ہو۔ سو بحمد اللہ شرعاً کوئی مزاحم نہ تھا۔ اس کا امر طبعی ہونا علاوہ عادت کے حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے چنانچہ حدیث صحیح میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دوشنبہ کو روزہ رکھنا اور اس کی حکمت میں یہ ارشاد کہ میں اس روز پیدا ہوا ہوں اس پر واضح دلالت ہے کہ دوشنبہ کا آنا واقعہ ولادت کا تذکرہ اور اس کے شکر کا داعی ہوتا تھا بخلاف اہل موالید و غالین فی المحبت کے کہ وہ اس امر طبعی کے اقتضاء پر عمل کرنے سے منکرات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اس امر طبعی کو ایسا واجب الرعایت سمجھا کہ اس سے بدعات پیدا ہو گئیں۔ اور اسی لئے چونکہ اس عادت سے التزام کا احتمال ہو سکتا تھا۔ خواہ التزام ہو جانے کا یا التزام کر لینے کا۔ بعبارۃ دیگر یوں کہیے کہ التزام عملی یا عصی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے درمیان میں چند سال یہ معمول ناغہ کر دیا گیا۔

التزام کے متعلق میں نے دو لفظ اس واسطے کہے کہ فقہاء نے دونوں کا حکم بیان کیا ہے یعنی جس طرح

مالا یلزم کے التزام علمی کی ممانعت ہے۔ اسی طرح بعض صورتوں میں التزام عملی کی بھی ممانعت ہے۔ یہ بات فقہاء ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میرا اور آپ کا اجتہاد معتبر نہیں۔ جیسے محض محبت وعشق کے اقتضاء پر عمل کرنا علی الاطلاق جائز نہیں۔ جب تک قواعد شرعیہ اس کی اجازت نہ دیں کیونکہ نری محبت میں غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں بعض لوگ محبت میں ایسے کام کر جاتے ہیں جو محبوب کے بھی خلاف ہوتے ہیں۔

مثلاً محبوب کسی وقت خلوت اور تنہائی کو پسند کر رہا ہو اور عاشق وہاں سے نہ ٹلتا ہو اور محبوب زبان سے کہتا ہے کہ بھائی اس وقت تم باہر چلے جاؤ۔ وہ عاشق کہتا ہے بھلا حضور میں تو عاشق ہوں سایہ کی طرح لپٹنے والا ہوں۔ بھلا میں دور رہ کر کب زندہ رہ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے محبوب اس وقت جھنجھلائے گا اور کہے گا یہ اچھا عاشق ہوا کہ مجھے ہی پریشان کر دیا اس وقت ہر عاقل کہے گا کہ یہ عاشق نہیں ہے یعنی محبوب کا عاشق نہیں ہے بلکہ اپنا ہی عاشق ہے اپنی راحت کا طالب ہے۔ اگر محبوب کا عاشق ہوتا تو اس کی رضا کا طالب ہوتا۔ اپنے جذبات چاہے جتنے پامال ہو جاتے مگر محبوب کی رضا کو نہ چھوڑتا۔ اسی واسطے عاشق حقیقی کا مذہب وہ ہوتا ہے جس کو عارف شیرازی فرماتے ہیں جو حقیقی عاشق ہیں۔

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام دوست

یعنی میں ملنا چاہتا ہوں وہ جدا رہنا چاہتا ہے میں اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ پر فدا کرتا ہوں

ایک اور عربی شاعر اسی معنی میں کہتا ہے۔

ارید وصاله و یرید ہجری
فاترک ما ارید لما یرید

یعنی چاہے مجھے کلفت ہی ہو مگر میں اپنے ارادہ پر محبوب کے ارادہ کو مقدم کرتا ہوں یہ مذہب ہوتا ہے عاشق کا نری محبت اور خواہش مطلوب نہیں تاوقتیکہ اضافہ ہو نہ وہ محبت محبت کہلانے کے قابل ہے جس کے آثار اذن محبوب کے خلاف ہوں اور جو اذن کے خلاف ہو وہ محبت ہی نہیں اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ (کہ دین کے حقیقت شناس ہیں اور اس کے آثار قریبہ و بعیدہ سب پر ان کی نظر محیط ہوتی ہے) محبت کے ہر اقتضاء پر عمل کی اجازت نہیں دیتے بخلاف غیر محقق صوفیہ کے کہ محبت کے آثار حالیہ کے غلبہ میں بعض اوقات ان کی نظر سے آثار مآلیہ غائب ہو جاتے ہیں۔

مقام علماء وصوفیاء

اسی لئے صوفیاء اور علماء میں جب بعض اوقات نزاع ہوا ہے تو بعض اہل کشف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گوشہ خاطر علماء کی حمایت و رعایت کی طرف معلوم ہوا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب میں مدینہ منورہ میں تھا تو وہاں ایک صوفی نے وحدۃ الوجود پر رسالہ لکھا۔ ایک عالم نے اس کا رد لکھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب چونکہ بڑے محقق ہیں وہ صوفی کا مطلب

صحیح سمجھے ہوئے تھے۔ عالم کا رد دیکھ کر جو کہ حقیقت ناشناسی سے لکھا گیا تھا۔ ان کو جوش ہوا اور صوفی کی حمایت میں عالم کے رد کا جواب لکھنا چاہا۔ یہ ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اسی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مفصل واقعہ مجھے یاد نہیں رہا۔ اتنا محفوظ ہے کہ شاہ صاحب کو اس وقت یہ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شاہ صاحب کے جواب لکھنے کو پسند نہیں فرماتے۔ یہ دیکھ کر شاہ صاحب خاموش ہو گئے اور اس ارادہ سے رک گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سرکار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں علماء کی رعایت زیادہ ہے اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غیر محقق صوفیاء کی نظر صرف ایک پہلو پر ہے کہ اپنے جذبات پر عمل کر کے جی خوش کر لیا۔ جو بات معلوم ہوئی کہ ذالی اور علماء کی نظر صوفیا کے جذبات کے ساتھ دوسروں کے جذبات پر بھی ہے کہ نظام اسلام میں فرق نہ آئے۔ اور نظام اسلام سے مراد تمدن اور دنیوی مصلحت نہیں ہے جیسا کہ بعض جاہل اسی کو مقصود شریعت سمجھتے ہیں بلکہ خوب سمجھ لو کہ نظام شریعت کی غایت یہ ہے کہ رضائے حق کے اسباب میں خلل نہ پڑے۔ گو آج کل بہت لوگ جن میں غیر محقق صوفی بھی داخل ہیں اور لیڈروں کا تو یہ مذہب ہو گیا۔ غرض یہ لوگ نظام شریعت کا حاصل یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں باہم اجتماع واتحاد ہو قوت میں انتشار نہ ہو اور صورت اجتماعیہ وہیئت اتحادیہ میں گڑبڑ نہ ہو امن وانتظام میں فرق نہ آئے حالانکہ یہ محض غلط عقیدہ ہے۔ یہ تو سلطنت کا انتظام ہوا اور سلطنت شریعت کی محض ایک خادم ہے۔ منجملہ اور خادموں کے۔ سلطنت روح شریعت اور مقصود شریعت نہیں ہے البتہ سلطنت سے اس مقصود میں امداد ملتی ہے باقی مقصود وہی نظام بمعنی رضاء حق کا انتظام ہے تو صرف ان صوفیوں کے جذبات کی رعایت سے اس نظام میں خلل پڑتا ہے کیونکہ دنیا میں کم فہم زیادہ ہیں اور کم فہم لوگ حقیقت کو تو سمجھتے نہیں وہ وحدۃ الوجود وغیرہ کے مضامین کو سن کر ایسے ایسے افعال واقوال میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو رضائے حق کے خلاف ہوتے ہیں مثلاً سب کے مال کو مباح سمجھنے لگتے اور امردوں اور نامحرم عورتوں کو مظہر حق سمجھ کر گھورنے لگتے ہیں۔ اس سے رضائے حق کے اسباب میں اختلال واقع ہوتا ہے اسی لئے مولانا رومی ایسے صوفیوں سے بڑے خفا ہیں جو زبان سے جو جانتے ہیں نکال دیتے ہیں فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند   از سخنہا عالمے را سوختند

(وہ قوم ظالم ہے جس نے آنکھیں بند کر لیں اور ناروا باتوں سے ایک عالم کو جلا دیا۔)

مولانا کتنے ناخوش ہیں ان لوگوں سے کتنا سخت لفظ فرمایا ہے کہ کوئی عالم اور مولوی بھی ایسا فتویٰ نہ لگاتا مگر لو فقیروں کی تو مانو گے فقیروں ہی نے فتویٰ لگا دیا کیونکہ مولانا امام العارفین رئیس العاشقین ہیں وہ ان لوگوں کو ظالم فرماتے ہیں جنہوں نے اپنے جذبات کو ظاہر کر کے کم فہموں پر کفر اور بدعت کا دروازہ کھول دیا اس واسطے میں نے کہا تھا کہ ہر جذبہ محبت پر مطلقاً عمل جائز نہیں بلکہ اس کے لئے اذن شرعی کی ضرورت ہے۔

اس کی حقیقت کو فقہاء نے خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ التزام چاہے اعتقادی ہو یا عملی دونوں کے لئے اذن کی ضرورت ہے یعنی جس چیز کو شریعت نے لازم نہیں کیا اس کا التزام جائز نہیں نہ اعتقاداً نہ عملاً اور التزام اعتقادی کا ناجائز ہونا تو ظاہر ہے لیکن ظاہراً صحت اعتقاد کے ساتھ عملی انتظام میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تو اس کو فقہا کیوں منع کرتے ہیں۔ سو واقعی فقہاء حکماء ہیں اسرار شریعت کو خوب سمجھتے ہیں۔

عقلی و طبعی قلق

بات یہ ہے کہ التزام عملی سے رفتہ رفتہ اعتقاد پر بھی اثر ہونے لگتا ہے۔ خصوصاً عام لوگوں کے اعتقاد پر اور اگر بالفرض نہ بھی ہو تو اس میں صورۃ شریعت کے ساتھ معارضہ ہے جیسا کہ التزام اعتقادی میں حقیقۃً معارضہ ہے اس لئے وہ دونوں قسم کے التزام کو منع فرماتے ہیں لیکن اس سے دوام کی ممانعت نہ سمجھی جائے کیونکہ اگر دوام کے ساتھ التزام نہ ہو نہ عملاً نہ اعتقاداً تو اس کی اجازت ہے اور دوام عملی بدوں التزام کے آثار یہ ہیں کہ اگر کبھی کوئی ضرورت ہو تو ضرورت کی وجہ سے اس کو ترک کر دے۔

مثلاً ایک شخص تہجد کا پابند ہے اور کسی وقت سفر یا مرض کی ضرورت اس کے ترک کی داعی ہو تو اس وقت اس کو ترک کر دیا جائے اور اس ترک سے اس پر تنگی اور زیادہ غم نہ ہو گو طبعاً ایک خفیف سا قلق ہو مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ کسل و بطالت سے بھی ترک کر دیا جائے۔ اہل کسل خوش نہ ہوں کہ لاؤ آج سے تہجد چھوڑ دو یہ تو اچھا نسخہ ملا بلکہ مطلب یہ ہے کہ سفر کی وجہ سے تھکا ہوا تھا پڑھ کے سو گیا اس لئے آنکھ نہ کھلی یہ عذر ہے یا مرض میں رات کو جاگنا دشوار تھا اس لئے تہجد کا ناغہ ہو گیا یہ بھی عذر ہے یا کسی ادنیٰ مصلحت شرعیہ سے ترک ہو جائے تو ان صورتوں میں تنگ دل نہ ہو کیونکہ شریعت نے اس کو لازم نہیں کیا اور مصلحت و ضرورت کے وقت ترک کی اجازت دی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ترک سے دل میں تنگی ہوتی ہے بلکہ اگر کسل سے بھی ترک ہو جائے تو اتنا رنج نہ کرے جیسا ترک واجب پر رنج ہوا کرتا ہے کہ ہر وقت اس کے پیچھے ہی پڑا رہے کہ ہائے آج تہجد نہیں ہوا۔ ہاں اس صورت میں قلق طبعی کا مضائقہ نہیں (بلکہ قلق طبعی کا تو ضرورت کے وقت ناغہ ہونے میں بھی مضائقہ نہیں کیونکہ اول تو یہ محبت کی علامت ہے پھر امور طبعیہ اختیار سے باہر ہیں) مگر قلق عقلی نہ ہونا چاہئے۔

ایک رئیس کا قصہ یاد آیا۔ ان کا اتنا بڑا التقویٰ تھا کہ ایک بار وائسرائے صاحب کے دربار میں شریک تھے۔ اس جلسہ میں سب کا فوٹو لیا گیا تو انہوں نے کلکٹر سے پوچھ کر اٹھنا چاہا کلکٹر نے منع کیا کہ یہ بات آداب مجلس کے خلاف ہے۔ مجبور ہو کر بیچارے بیٹھے رہے لیکن کمال یہ کیا کہ جس وقت آلات فوٹو ان کے سامنے لائے گئے انہوں نے معاً اپنے چہرہ پر رومال ڈال لیا۔

صاحبو! یہ بات کچھ آسان نہ تھی۔ اول تو ایک کلکٹر کے سامنے سے اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی نہ

کہ وائسرائے کے سامنے سے جانے کی مگر انہوں نے اول وہاں سے جانا چاہا ایسے وقت میں جانے کی اجازت مانگنا بھی ہمت کی بات تھی۔ جب اس کی اجازت نہ ہوئی تو دوسرا کمال یہ کیا کہ عین وقت پر رومال ڈال لیا تاکہ چہرہ کا فوٹو نہ آئے۔

غرض ان کا تقویٰ اس درجہ کا تھا وہ یہاں بغرض تربیت اخلاق آئے اور اپنے حالات کے تذکرہ میں کہنے لگے کہ ایک بار میری تکبیر تحریمہ فوت ہوگئی تھی۔ اس کا مجھے اتنا قلق ہے کہ شاید سال بھر ہوگیا اب تک اس کا غم دل سے نہیں جاتا۔ بہت استغفار کرتا ہوں مگر کسی طرح دل کو چین نہیں۔ میں نے کہا جس چیز سے آپ استغفار کرتے ہیں اس سے استغفار کی ضرورت نہیں بلکہ خود اس غم سے استغفار کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ تکبیر تحریمہ کے فوت ہونے پر پھر وہ بھی بعذر اس قدر غم کرنا یہ تقویٰ نہیں بلکہ حدود سے تجاوز ہے شریعت نے مستحبات کے فوت ہونے پر مغموم ہونے کا کہیں امر نہیں فرمایا اور اس میں غائلہ یہ ہے کہ یہ شخص شریعت سے بھی زیادہ تقویٰ تجویز کرتا ہے کہ شریعت نے ہر عمل کا جو درجہ بتایا ہے یہ اس سے زیادہ اس عمل کو درجہ دیتا ہے پھر اس پر میں نے حضرت حاجی صاحب کا ارشاد نقل کیا اور اسی سے یہ مسئلہ ہم کو حل بھی ہوا تھا ورنہ ہم بھی اس غم کو اچھا ہی سمجھتے اور ظاہر میں بھی واقعی یہ بڑی تقویٰ معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے فوت ہونے سے اتنا غم ہوا ایسے شخص سے اگر واجب فوت ہوگا تو نہ معلوم کتنا رنج ہوگا مگر حاجی صاحب کی نظر نے ہماری رہبری کی۔

اس ارشاد کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت کی خدمت میں ایک بیمار حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ حضرت مجھے اس کا بڑا افسوس ہے کہ بیماری کی وجہ سے حرم میں نماز نہیں نصیب ہوتی گھر پر ہی نماز پڑھتا ہوں اس کا بڑا رنج ہے۔ حضرت اس کی بات پر ہنسنے لگے پھر یہ یاد نہیں کہ اس کے سامنے ہی فرمایا یا وہ چلا گیا جب فرمایا کہ اگر یہ شخص عارف ہوتا تو اس حالت پر ہرگز رنج نہ کرتا کیونکہ اصلی مقصود قرب و رضا ہے اور بہت سے اس کے طرق بعضے اعمال اور بعضے احوال چنانچہ جس طرح اس کا ایک طریق حرم کی نماز ہے اسی طرح دوسرا طریق اس کا یہ ہے کہ بندہ بیمار ہو اور بیماری کے سبب گھر میں نماز پڑھے اور اس حالت پر صابر و شاکر رہے سو بندہ کو کیا حق ہے کہ اپنے لئے وصول کا کوئی خاص طریق تجویز کرے بلکہ جو طریق حضرت حق تجویز فرمادیں اسی میں راضی رہنا چاہئے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاجی کو مقصود بیت اللہ پہنچنا ہے اور اس پہنچنے کے چند راستے ہیں۔ ایک کراچی سے ایک بمبئی سے ایک چاٹگام سے ایک کلکتہ سے اور مقصود سب سے وہی وصول الی بیت اللہ ہے خواہ کسی راستہ سے ہو جائے اور اگر کوئی شخص چاٹگام یا کراچی کے راستہ سے مکہ معظمہ کے قریب پہنچ گیا ہو اور دوسرا بمبئی کے راستہ سے گیا ہو اور وہ بمبئی کی تعریف کرے کہ ہم نے وہاں خوب سیر کی بہت سے عجائبات دیکھے اس پر کراچی سے جانے والا افسوس کرنے لگے کہ افسوس میں بمبئی سے کیوں نہ آیا اور اب وہ احمق مقصود کے قریب پہنچ کر پھر لوٹے کہ میں تو بمبئی سے ہو کر آؤں گا یقیناً ہر شخص اس کو

بیوقوف بنائے گا کیونکہ طریق خود مقصود نہیں ہوتا مقصود تو منزل پر پہنچنا ہے پس طرق کے فوت ہونے سے رنج نہ ہونا چاہئے کہ ہائے ہم فلاں راستے سے کیوں نہ آئے۔

صورت دوام والتزام

ایسی ہی غلطی بعض سالکین کو ہو جاتی ہے کہ وہ ذوق و شوق اور وجدی کیفیت کے طالب ہوتے ہیں اور ان کے فقدان پر رنج کرتے ہیں یہ واہی ہے کیونکہ یہ کیفیات بھی طرق میں سے ہیں مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ اسی طرح سلاسل کو سمجھنا چاہئے کہ جس طرح اشغال چشتیہ سے وصول ہوتا ہے اسی طرح اشغال نقشبندی سے بھی پس چشتی کو طریق نقشبندی کی ہوس کرنا اور اس کے فقدان پر رنج کرنا یا نقشبندی کو طریق چشتی کی ہوس کرنا اور اس کے فقدان پر رنج کرنا محض بے وقوفی ہے۔

اسی کو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مقصود حقیقت ہے طریق مطلوب نہیں اصل مقصود رضائے حق ہے اس کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ تندرست ہو تو حرم میں جا کر نماز پڑھے اور ایک طریق یہ بھی ہے کہ بیماری میں تکلیف ہو اور شریعت معذور سمجھے تو گھر پر ہی نماز پڑھے اور بیماری کے ساتھ حرم کی حاضری سے بھی صبر کرے اس صبر میں جو بھی اثر اور قرب ہے وہ حالت صحت میں حاضری حرم سے کم نہیں۔

چنانچہ احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ اگر کوئی معمولی مرض یا سفر کے سبب رہ جاوے تو ثواب میں کمی نہیں ہوتی اس لئے حضرت نے فرمایا کہ اگر وہ بیمار عارف ہوتا تو اس وقت اپنے مقصود کے لئے حرم میں جانے کو تجویز نہ کرتا بلکہ سمجھتا کہ اب خدا کی یہی مرضی ہے کہ حرم میں نہ جاؤں اور اس کو ترسوں تو خدا کی مرضی سر آنکھوں پر ہے پہلے حرم میں جاتے تھے اسی پر راضی تھے اب بیمار کر دیا اور گھر میں بند کر دیا اسی پر راضی ہیں۔ غرض عارف ایسے تصرفات سے کبھی مغموم نہیں ہوتا اور کسی حالت میں شکایت نہیں کرتا یعنی وہ کسی غم کو لے کر نہیں بیٹھتا جیسا وہ رئیس صاحب سال بھر تک تکبیر تحریمہ کا ماتم کرتے رہے۔ میں نے کہا کہ آپ ہی اس کو کچھ کمال سمجھتے ہوں گے۔ میرے نزدیک تو یہ تجاوز عن الحدود ہے ہاں طبعی غم کا مضائقہ نہیں مگر وہ دیرپا نہیں ہوا کرتا ان کی بہت تسلی ہوئی پس التزام عملی کا یہ نمونہ ہے۔

اسی کو میں کہہ رہا تھا کہ ایک تو دوام ہے اور ایک التزام مستحبات پر دوام کی تو اجازت ہے التزام کی اجازت نہیں اور دوام بدوں التزام کے یہ ہے کہ ما علیہ الدوام کو مقصود لازم نہ سمجھے اور اگر کسی شرعی مصلحت یا کسی طبعی سبب سے ترک ہو جائے تو اس پر اتنا غم لے کر نہ بیٹھے جیسا واجبات کے ترک پر ہوا کرتا ہے اور جو لوگ اس پر دوام نہ کریں ان سے الجھیں نہیں۔

اس مقام پر ایک اشکال ہے میں اس کو بھی حل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ حدیث میں ہے **احب الاعمال الی اللہ ادومھا۔** (الصحیح لمسلم کتاب المسافرین: ۲۱۸، المسند للإمام احمد۶: ۱۲۵، کنز العمال: ۲۹۱۵.) (اللہ تعالیٰ کو اعمال میں محبوب وہ عمل ہے جو ہمیشہ ہو) اس سے

معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دوام علی الاعمال محبوب ہے (اور ظاہر ہے کہ یہاں اعمال سے مراد مستحبات و نوافل ہیں کیونکہ واجبات وسنن موکدہ پر تو دوام واجب ہے یا قریب واجب کے ہے) ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اسی سے یہ ہوا کہ ترک دوام محبوب نہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے اور تیسرا مقدمہ ذرا باریک سا ہے مگر وہ اس لئے باریک ہے کہ ہم تاریک ہیں کیونکہ تاریکی میں نظر موٹی ہو جاتی ہے۔ باریک بین نہیں رہتی وہ مقدمہ یہ ہے کہ غیر محبوب کتاب وسنت کی اصطلاح میں بمعنی مبغوض ہے چنانچہ قرآن میں حق تعالیٰ نے جہاں لاتحب فرمایا ہے وہاں غیر محبوب بمعنی مبغوض ہی ہے جیسے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ

(بے شک اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتے جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں) اور

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ

اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ

اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتے سوائے مظلوم کے۔ اور

لایحب الخائنین وغیرہ (اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے)

ظاہر ہے کہ یہ سب اعمال مبغوض ہی ہیں تو لاتحب کے معنی صرف یہی نہیں کہ یہ محبوب نہیں گو مبغوض بھی نہیں جیسا امور مباحہ ہوتے ہیں۔ بلکہ یہی مراد ہے کہ یہ مبغوض ہیں پس جب ترک دوام کا غیر محبوب ہونا ثابت ہوا تو اس محاورہ سے معلوم ہوا کہ ترک دوام غیر محبوب بمعنی مبغوض ہے اور جو شے خدا تعالیٰ کو مبغوض ہو وہ حرام ہے اور حرام کی ضد واجب ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ مستحبات پر دوام واجب ہے تو ترک دوام پر رنج کرنا بھی مثل ترک واجب کے جائز ہوا اور تارکین پر ملامت بھی جائز ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ غیر محبوب کا مبغوض ہونا تو مسلم ہے مگر ہر مبغوض کا حرام ہونا مسلم نہیں یہ کبریٰ کلیہ نہیں بلکہ بعض مبغوض مباح بھی ہوتے ہیں۔ جیسے **ابغض الحلال عند اللہ الطلاق۔**

(اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے مبغوض ترین چیز طلاق ہے)۔

اس میں طلاق کو حلال بھی فرمایا ہے اور ابغض بھی فرمایا ہے معلوم ہوا کہ بغض کا اجتماع اباحت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے میاں کیلئے طلاق دینا فی نفسہ تو جائز ہے مگر بلا ضرورت طلاق دینا خدا تعالیٰ کو پسند نہیں اسی طرح یہاں سمجھئے کہ اعمال مستحبہ پر دوام کرنا حق تعالیٰ کو محبوب ہے اور ترک دوام غیر محبوب ہے یعنی مبغوض ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فی نفسہ گو ترک دوام جائز ہے مگر بلا ضرورت شرعیہ یا طبعیہ دوام کا ترک کرنا حق تعالیٰ کو پسند نہیں۔ اب اس تقریر سے اہل بطالت کی بھی اصلاح ہو گئی کہ وہ یہ سن کر خوش نہ ہوں کہ مستحبات کا التزام جائز نہیں بلکہ کان کھول کر سن لیں کہ التزام اور چیز ہے دوام اور چیز اور دوام علی المستحبات مطلوب ہے جب تک کہ کوئی عذر ترک کی طرف داعی نہ ہو چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے

یا عبداللہ لاتکن مثل فلان کان یقوم من اللیل ثم ترکہ (الصحیح للبخاری ٢: ٦٨، الصحیح لمسلم کتاب الصیام: ١٨٥، مشکوۃ المصابیح: ١٢٣٣، المعجم الکبیر للطبرانی ١١: ٣٢٣)

"یعنی حضور نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ اے عبداللہ تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا جو رات کو اٹھتا تھا پھر تہجد کو ترک کر دیا"۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ بلاوجہ ترک دوام شارع کو پسند نہیں (رہا یہ کہ ضرورت سے تو واجبات کا ترک بھی جائز ہے جیسے مسافر کو سفر میں افطار صوم رمضان جائز ہے اور جہاد میں تاخیر صلوٰۃ جائز ہے۔ پھر واجب و مستحب میں کیا فرق ہوا؟ جواب یہ ہے کہ ترک واجب کے لئے ضرورت شدیدہ ہونا چاہئے اور ترک مستحب کے لئے ضرورت کا ادنیٰ درجہ بھی کافی ہے) بہر حال بڑی چیز یہ ہے کہ جس امر میں شرعاً تنگی نہیں اگر وہ کسی عذر شرعی سے ترک ہو جائے تو اس وقت دل میں بھی تنگی نہ ہو چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

پھر قسم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی یہ ایمان دار ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں۔

اس میں حق تعالیٰ نے ایمان کی دو شرطیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر امر میں جو بھی پیش آوے آپ کو حکم بنا دیں اور آپ کے فیصلہ کو فیصلہ سمجھیں آپ کے حکم میں منازعت نہ کریں۔ دوسری شرط اس کے بعد یہ ہے۔

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

یعنی پھر آپ کے فیصلہ پر دل سے راضی ہوں۔ دل کے اندر تنگی نہ ہو بلکہ خوشی ہو اور مستحبات میں آپ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کا ترک جائز ہے۔ پھر اس ترک پر تنگی ہونا آپ کے فیصلہ پر تنگی ہے سو یہ نہ ہونا چاہئے بلکہ جس طرح عزائم کے عمل کرنے میں سرور ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی رخص پر عمل کر کے بھی دل میں تنگی نہ آنا چاہئے کیونکہ یہ بھی آپ ہی کا فیصلہ ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

انّ[1] اللہ تعالیٰ یحب ان توتی رخصہ کما یحب ان توتی عزائمہ

بے شک اللہ تعالیٰ رخصتوں پر عمل کرنے کو ایسا پسند کرتے ہیں جیسا عزیمت پر عمل کرنے کو۔

سو مستحبات پر دوام کرنا عزیمت ہے اور کسی مصلحت شرعیہ یا ضرورت طبعیہ سے ان کا ترک کر دینا رخصت ہے اور جس طرح وہ عزیمت محبوب ہے اسی طرح یہ رخصت بھی محبوب ہے گو بلا مصلحت

---

[1] کذا فی العزیزی عن مسند احمد والبیہقی عن ابن عمرو والطبرانی عن ابن مسعود عن ابن عباس قال الشارح الاصح والقدرج اص ٣٨٩ قلت ولا یعتبر الوقف فان المعنی مما لا یدرک بالرای ١٢ منہ

و بلا ضرورت محبوب نہیں لیکن مصلحت و ضرورت کے وقت تو ترک میں تنگی نہ ہونا چاہئے اگر تنگی ہوئی تو معلوم ہوگا کہ یہ محض دوام نہ تھا بلکہ التزام مالا یلزم تھا جس کی ممانعت ہے۔

تمہید بیان

تو میرا جو معمول تھا کہ اس ماہ مبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کیا کرتا تھا وہ دوام کے حد میں تھا التزام کے طور پر نہ تھا۔ چنانچہ چند سال تک تو میں نے کئی وعظوں میں فضائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جن کے نام سب مقفّی ہیں النور الظہور السرور الشذور الحبور۔ وہاں ایک ذکر رسول جو کہ اسی سلسلہ میں ہے مقفّی نہیں پھر کئی سال سے اس کا اتفاق نہیں ہوا کچھ اسباب طبعیہ ایسے مانع ہوئے جن سے یہ معمول ناغہ ہو گیا نیز ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ اس معمول سے التزام کا خیال نہ کریں جو کہ خلاف واقع ہے کیونکہ میرے اس معمول کی بڑی وجہ صرف یہ تھی کہ ان ایام میں حضورؐ کے فضائل اور دنوں سے زیادہ یاد آتے تھے نہ کہ اس میں شرعی ضرورت کا اعتقاد یا عمل تھا۔ سو مدت کے بعد اب کے سال پھر اسی یاد سے جوش تازہ ہوا اس لئے جی چاہا کہ اسی سال کچھ فضائل نبویہ معہودہ پھر بیان کروں تا کہ جیسا ذکر کا التزام نہیں ہوا اسی طرح ترک ذکر کا بھی صورۃ التزام نہ ہو۔ اس وقت میرا یہ حال ہے جس کو غالباً مولانا فرماتے ہیں۔

باز دیوانہ شدم من اے طبیب　　باز سودائی شدم من اے حبیب
باز آمد آب من در جوئے من　　باز آمد شاہ من در کوئے من

باز گو از نجد وا ز یاران نجد　　تا در و دیوار را آری بوجد

(اے طبیب پھر میں سودائی بنا اے طبیب پھر میں سودائی بنا۔ پھر میرے دریائے محبت میں پانی آ گیا میرا بادشاہ میرے کوچہ میں پھر آ گیا۔ نجد اور یاران نجد کا حال پھر بیان کرتا کہ در و دیوار بھی وجد میں آ ئیں۔)

اس تقاضا کی وجہ سے جی میں کئی روز سے تھا کہ مختصر سا بیان کروں گا۔ کیونکہ مطول کی تو اب ہمت نہیں رہی اور منہ میٹھا کرنے کو مصری کی ایک ڈلی ہی کافی ہے۔ اختصار کا تو پہلے ہی سے خیال تھا مگر اب رات سے کچھ طبیعت کسل مند ہے۔ بخار کا سا اثر ہے اس لئے اب اور بھی اختصار ہوگا۔ (مگر پھر بھی ماشاء اللہ پورے چار گھنٹہ بیان ہوا۔) خیال تو بیان کا چند روز سے ہو رہا تھا مگر اب ایک سبب یہ بھی داعی ہوا کہ آج کل کچھ عزیز[1] مہمان مجتمع ہیں جو گو عدداً قلیل ہیں مگر چونکہ ان میں ایک کیفیت شوقیہ ہے اور دین کے ساتھ تعلق ہے اس لئے میں ان کو کیفیۃً کثیر ہی سمجھتا ہوں بقول متنبی۔

ثقال اذا لاقوا خفاف اذا دعوا　　قلیل اذا عدوا کثیر اذا شدوا

دشمن سے وہ لوگ ملاقات (جنگ) کے وقت بھاری ہیں کہ (ہٹائے نہ ہٹیں) اور جب امداد کے وقت پکارے جائیں تو اتنے ہلکے ہیں کہ اڑ کر آ جائیں۔

اس سے اور بھی اس خیال کو حرکت ہوئی۔ یہ وجہ ہوئی اس وقت کے بیان کی اور حاصل بیان

---

[1] خواجہ عزیز الحسن صاحب وغیرہ ۱۲ جامع

متقارب الفاظ میں پہلے ہی بتلا چکا ہوں اب ذرا اس کو صریح طور پر بتلاتا ہوں۔

عوام کی غلطی

اس سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دی گئی ہے آپ کی وفات شریفہ کے قریب ہونے کی جیسا کہ اور نصوص میں بھی بکثرت اس کی خبر دی ہے۔

مثلاً اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ اور وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نرے رسول ہی تو ہیں سو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو جائے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہید بھی ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے۔

مگر ان میں مطلق وفات کی خبر ہے اور اس سورت میں اس کے قرب کی بھی خبر ہے جس میں بعض علامات کا ذکر کر کے ان علامات کے ظہور پر اس وقت کو بتلایا گیا ہے وہ علامات یہ ہیں کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (یعنی جب مدد الٰہی پہنچ جائے) اور مکہ فتح ہو جائے۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (یعنی آپ لوگوں کو جوق جوق اسلام میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں) اور ایک تفسیر پر جب کہ اذا ماضی کے لئے ہو یہ معنی ہوں گے (کہ چونکہ نصرت و فتح معہود و رویت دخول افواج ہو چکی) چونکہ احادیث میں ہے کہ اس سورت میں آپ کو قرب اجل کی خبر دی گئی ہے اور احادیث میں ان علامات کے علاوہ دوسری علامات بھی مذکور ہیں۔ مثلاً اخیر سال میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ماہ رمضان میں قرآن کا دو مرتبہ عرض کرنا (یعنی دور کرنا) وغیرہ وغیرہ ان واقعات کے ظہور پر آگے آپ کو تیاری آخرت کی تاکید کی گئی ہے کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی حمد و تسبیح اور استغفار میں مشغول ہو جیے۔ یہ حاصل ہے بیان کا۔

اس جگہ یہ بات قابل تنبیہ ہے کہ بعض عشاق کا مشورہ یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل متعلقہ ولادت بیان کئے جائیں تو ان میں وفات شریفہ کے واقعات مذکور نہ ہوں۔ تو اس پر سوال ہوتا ہے کہ تم نے اوپر کہا ہے کہ اس وقت فضائل معہودہ یعنی متعلقہ ولادت بیان کئے جاویں گے۔ پھر ذکر اختیار کیا ہے خالص وفات کا۔ اس میں اس مشورہ کی مخالفت ہے سو حقیقت یہ ہے کہ یہ مشورہ محض عشقیہ ہے جو محبت سے ناشی ہے۔ منشاء اس کا یہ ہے کہ یہ موقع تو فرح و سرور کا تھا اس کے ساتھ یہ سانحہ روح فرسا کیوں جمع کیا جاوے؟

اول تو میں کہہ چکا ہوں کہ جذبات محبت پر عمل اس وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ شریعت ان کے

مزاحم نہ ہو۔ اور یہاں شریعت اس مشورہ کی کوئی نفسہ مزاحم نہ تھی لیکن اس میں جو غلو ہو گیا ہے اس اعتبار سے اب مزاحمت ہو گئی۔ نیز تکویناً اسی ماہ میں ولادت و وفات دونوں کا وقوع دونوں ذکروں کے تساوی کی فطری دلیل ہے میں اس مشورہ پر عمل نہ کروں گا۔

دوسری یہ بات ہے کہ یہ مشورہ غیر محقق عشاق کا ہے۔ ان کی نظر صرف اپنے ہی جذبہ تک رہی کہ وفات کے ذکر سے طبعاً عاشق کو رنج ہوا کرتا ہے حقیقت تک نظر نہیں پہنچی اور ان میں جو محقق ہے یا محبین محققین کا متبع ہے وہ ذکر وفات کو منافی سرور نہ سمجھے گا کیونکہ وہ صرف ایک پہلو پر نہیں نظر کرے گا محبت و عشق کے پہلو پر بھی نظر کرے گا اور حقیقت کے پہلو پر بھی۔ چنانچہ بحمد اللہ برکت اتباع محققین کے میری نظر دوسرے پہلو پر بھی پہنچ گئی۔ گو خود محقق نہیں ہوں مگر محققوں کی صحبت تو نصیب ہے ان محققین نے حقیقت کو سمجھا ہے اور اس کی دو تقریریں ہیں۔

ایک یہ کہ ولادت شریفہ کی حقیقت کمالیہ میں غور کرنا چاہئے کہ ولادت شریفہ آیا محض اپنے مفہوم لغوی کے اعتبار سے کمال ہے یا اپنی غایات کے اعتبار سے جن کے لئے ولادت شریفہ مقدمہ ہے سو عند التامل اس کی حقیقت وہ کمالات ہی ہیں اور جن کمالات کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم سے ممتاز ہیں جیسے معراج و غزوات و حالات وفات اور حضور کے اقوال و افعال وغیرہ سب اس میں داخل ہیں اور وہ صرف ولادت عرفیہ کے واقعات ہی میں محصور نہیں۔

یہ میں نے اس واسطے ظاہر کر دیا کہ اس وقت ذکر ولادت کے ساتھ یہ کمالات ذہن میں نہیں آتے بلکہ صرف واقعات پیدائش مذکور ہوتے ہیں اس میں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر کرنا چاہتا ہوں جن کی عادت یہ ہے کہ ذکر ولادت میں صرف واقعات ولادت ہی کا ذکر کرتے ہیں گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ولادت عرفیہ بھی بڑی نعمت ہے مگر زیادہ تر وجہ نعمت ہونے کی اس میں یہ ہے کہ وہ مقدمہ ہے کمالات عظیمۃ الشان کا عظیمہ جن کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور وہ کمالات یہ ہیں کہ حضور نے ابواب سعادت کو کھول دیا اور ان پر جو قفل پڑے ہوئے تھے ان کو توڑ دیا۔

قفلہائے ناکشادہ ماندہ بود از کف انا فتحنا برکشود

(بہت سے تالے بند پڑے ہیں جن کو انا فتحنا کے ہاتھ کھول دیا)

حقیقی کمالات

ظاہر ہے کہ ابواب سعادت زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے بعد نبوت ہی کے مفتوح ہوئے تو اصلی اور مقصود کمالات وہ ہیں جو بعد از نبوت ظاہر ہوئے ہیں اور قبل نبوت کے کمالات ان کے لئے مقدمات ہیں مگر اہل موالید کی عجیب حالت ہے کہ وہ صرف حالات قبل نبوت ہی کو بیان کرتے ہیں اور بعد کے حالات میں سے صرف معراج شریف کو تو البتہ بیان کر دیتے ہیں

حالانکہ حضور کے اصلی کمالات یہ دو کمالات ہیں۔

ایک قال کذا وامر بکذا و نہی عن کذا

اور یوں کہا اور یوں کہا اور اس کا حکم دیا اور اس سے منع کیا۔

یعنی آپ کی تعلیم واحکام علمیہ وعملیہ۔

دوسرے حق تعالیٰ نے جو قرب ومنزلت آپ کو عطا کی ہے۔ پس ان کمالات کا ذکر یہ ہے آپ کی ولادت کا حقیقی ذکر

دیکھیے! اگر کوئی مورخ کسی بادشاہ کی سوانح لکھے اور اس میں صرف سن ولادت اور حالات طفولیت لکھ دے کہ فلاں میں پیدا ہوا اور فلاں دائیوں اور کھلائیوں نے اسے پرورش کیا اور فلاں گاؤں میں بچپن گزارا تو اس کو دیکھ کر ہر شخص یہ کہے گا کہ یہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے سوانح نہیں کیونکہ اس میں صرف قبل از سلطنت کے حالات ہیں جس وقت بادشاہ بادشاہ نہ تھا بادشاہ کی سوانح وہ ہو سکتی ہے جس سے سطوت سلطنت ظاہر ہو کہ اس نے غنیموں کو یوں شکست دی ملک کا اس طرح خوبی سے انتظام کیا۔ ایسے ایسے عمدہ احکام وقوانین جاری کیے یوں تمدن وامن قائم کیا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ہیں۔ وہ حالات وکمالات زیادہ بیان کرنے چاہئیں جو بعد از نبوت ظاہر ہوئے ہیں کیونکہ انہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا اور سردار عالم ہونا ظاہر ہو سکتا ہے۔ نیز ان کے ذکر سے حضور کا اتباع بھی ہو سکتا ہے باقی جو حالات قبل از نبوت ہیں ان میں اتباع نہیں ہو سکتا۔

مثلاً آپ کی ولادت کے وقت، ایوان کسریٰ میں زلزلہ آ گیا تھا یا ستارے زمین کی طرف جھک آئے تھے اس میں کوئی اتباع کیوں کر کر سکتا ہے یہ کس کے اختیار میں ہے کہ اپنی پیدائش کے وقت بادشاہوں کے ایوان کو ہلا دیا کرے۔

دوسرے حالات قبل از نبوت میں اکثر ضعاف ہیں حسان بھی کم ہیں اور صحاح تو بہت ہی کم تو ان سے مخالفین کو اور شبہ ہو سکتا ہے کہ بس ان کے نبی کے کمالات ایسے ہی روایات سے ثابت ہیں پھر ان سے کیا عظمت ثابت ہو سکتی ہے حالانکہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ کمالات بیان کر سکتے ہیں جو متواتر اور مشہور اور صحیح روایات سے اس طرح ثابت ہیں اور جن سے اکاسرہ وقیاصرہ کی گردنیں ٹوٹ گئیں اور جن سے سب نے آپ کے سامنے گردنیں جھکا دیں اور وہ کمالات حضور کی تعلیم وافعال واقوال واحکام ومعجزات ہیں۔

الغرض حقیقی کمالات آپ کے وہ ہیں جو بعد از نبوت ہیں اور انہی کمالات میں آپ کا سفر آخرت بھی ہے چنانچہ آپ کے وہ فضائل جو سفر آخرت کے بعد ظاہر ہوں گے۔ احادیث میں نہایت تفصیل سے وارد ہیں۔ پس سفر آخرت بھی منجملہ اور کمالات عظیمہ کے حضور کا ایک بڑا کمال ہوا۔ جب یہ بات ہے تو اب واقعات سفر آخرت کا بیان کرنا منافی سرور کیوں ہو گا؟ جب کہ وہ بھی سب متعلق ولادت ہی کے ہیں اور جب کہ ان سے حضور کے کمالات کا ثبوت ہوتا ہے جو کہ اصل سرمایہ سرور ہے۔

لفظی تہذیب

البتہ طبعی آثار پر نظر کر کے اب میں وفات کا لفظ نہ کہوں گا بلکہ سفر آخرت کا لفظ کہوں گا کیونکہ یہ لفظ طبعاً روح فرسا ہے اور اس سے غم بڑھتا ہے اور گو حقیقت پر نظر کرنے سے یہ غم افزا نہ ہونا چاہیے مگر ہم کو تو حقیقت پر نظر کے ساتھ جذبات عشق پر بھی نظر ہے اور اس نظر سے یہ ضرور غم افزا ہے اور گو سفر آخرت کا حاصل بھی وہی ہے جو وفات کا حاصل ہے مگر دونوں میں عرفاً وہ فرق ہے جو کھا لیجئے نوش فرما لیجئے اور ٹھونس لیجئے میں فرق ہے مطلب سب کا ایک ہے مگر تہذیب اس میں ہے کہ نوش فرما لیجئے کہا جائے اسی طرح سفر آخرت میں زیادہ تہذیب ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے مگر اس تہذیب کی مطلوبیت و رعایت اسی وقت تک درست ہے جب تک کہ اس سے خلاف مقصود کا ایہام نہ ہو اور اگر خلاف مقصود کا ایہام ہونے لگے اور مقام تصریح کو مقتضی ہو تو وہاں تہذیب یہی ہے کہ تصریح سے کہے صاف صاف کہے مگر آج کل اسی کو تہذیب سمجھا جاتا ہے کہ ہمیشہ گول مول بات کہے گو مخاطب مقصود کو بھی نہ سمجھے سو یہ تو محض لغو ہے اس سے دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے۔

جیسے یہاں بعض لوگ آتے ہیں اور یہ نہیں بتلاتے کہ کس غرض سے آئے ہیں اور بار بار پوچھنے پر بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ زیارت کے لئے آئے ہیں مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس کا خوب جواب دیا کرتے تھے کہ میاں زیارت تو ہو چکی اب اصلی بات کہو اور میں یہ کہہ دیتا ہوں کہ دیکھو کئی بار کے پوچھنے پر بھی تم نے یہی جواب دیا تو بہت اچھا اگر صرف زیرت کو آئے ہو تو پھر کچھ کہو گے تو میں نہ سنوں گا اب میں اپنے کام میں لگتا ہوں اگر کچھ اور کہنا ہو تو اب بھی کہہ لو اس کے بعد وہ کہنا شروع کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف زیارت مطلوب نہ تھی اور اگر کوئی اس وقت بھی نہ بتلائے تو بعض اوقات میں پھر نہیں سنتا ہوں کہنے سے روک دیتا ہوں اس پر لوگ کہتے ہیں کہ بہت روکھے ہیں میں کہتا ہوں کہ تم بہت سوکھے ہو کہ سالن بغل میں دبا رکھا ہے تر تو جب ہوتے کہ روٹی کے ساتھ سالن سامنے رکھ دیتے پھر اس کے بعد بھی جب اصلی بات کہتے ہیں تو اس میں بھی کنایات ہی سے کام لیتے ہیں کوئی کہتا ہے مجھے اپنے دامن میں لے لیجئے یہ نہایت گول بات ہے کوئی کہتا ہے مجھے خادم بنا لیجئے یا غلامی میں لے لیجئے پہلے تو یہ لفظ ارادہ بیعت کے لئے کافی تھا مگر اب تجربہ ہوا کہ نا کافی ہے۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھی سے کہا کہ مجھے اپنی غلامی میں لے لیجئے میں نے اس سے شرائط بیعت بیان کیں تو کہنے لگا کہ مرید تو میں دوسرے بزرگ سے ہوں میرا یہ مطلب نہیں۔ اس وقت سے مجھے احتیاط ہو گئی کہ اس لفظ پر بھی کفایت نہ کرنا چاہیے اس وقت میں اس قدر شرمندہ ہوا جس کی حد نہیں کہ یہ شخص اپنے دل میں یوں کہے گا کہ لوگوں کو لپٹتے ہی پھرتے ہیں مان نہ مان میں تیرا مہمان خواہ مخواہ پیر بننے کو تیار ہو گئے سب کو اپنا ہی مرید کرنا چاہتے ہیں چاہے وہ مرید ہونے کا ارادہ کرے یا نہ کرے (یہ بھی غنیمت ہوا کہ میرے یہاں بیعت کی کچھ شرائط ہیں۔ میں فوراً کسی کو بیعت نہیں کرتا اگر کسی کے یہاں شرائط نہ ہوں وہ تو اس لفظ کے بعد بیعت ہی کرنا شروع کر دیتا)

پس قرائن سے مطلب نکالنا ٹھیک نہیں کیونکہ محاورات مشترک ہیں سب کا محاورہ ایک نہیں دوسرے اگر ہم قرائن سے معنی سوچا کریں تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ بیعت کرنے میں بھی ہم خادم بنیں کہ مرید تو متن بولا کرے ہم اس کی شرح سوچا کریں کیوں؟ وہی صاف صاف کیوں نہ کہے غرض جہاں ابہام غیر مقصود کا ہوتا ہو وہاں بدوں تصریح کے عمل نہ کرنا چاہئے اور ایسے موقع میں متکلم کے لئے بھی تہذیب یہی ہے کہ صاف صاف کہے۔

چنانچہ اہل علم جانتے ہیں کہ عدالت السلامی میں اقرار بالزنا کے لئے صاف صاف اقرار کی ضرورت ہے کنایات معتبر نہیں کیونکہ کنایات محتمل دوسرے وجوہ کو بھی ہوتے ہیں اس لئے اگر کوئی جامعتہا کہے یا باشرتھا کہے یا وطئتہا کہے جس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس سے ملا یا اس کو استعمال کیا تو اس کی شنوائی نہ ہوگی مقدمہ خارج ہو جائے گا ہاں اگر نکتہا کہے جس کے معنی اردو میں بہت بری گالی ہے اس وقت قاضی متوجہ ہوگا پھر ایک دفعہ کہنا بھی کافی نہیں بلکہ اسی طرح چار دفعہ اقرار کرے تو پھر قاضی سزا کا حکم دے گا اگر کنوارا ہے تو اس کی سزا سو درے ہیں اور اگر بیاہا ہوا ہے تو اس کی سزا رجم ہے کہ پتھروں سے مار کر قتل کر دیا جائے۔ (بشرطیکہ وہ اخیر تک پتھر کھاتا رہے اور بدستور اقرار پر جما رہے اور اگر درمیان میں بھاگ جائے یا اقرار سے رجوع کرے تو پھر اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں بدوں تصریح کے مقصود حاصل نہ ہو وہاں تصریح کے ساتھ کلام کرنا ہی تہذیب ہے وہاں لفظی تہذیب کی اجازت نہیں اور جہاں بدوں اس کے بھی مقصود حاصل ہو جائے وہاں لفظی تہذیب کی رعایت ضروری ہے چنانچہ قرآن مجید میں ایسی لفظی تہذیب کی نہایت رعایت ہے۔

مہذب کلام

قرآن مجید نہایت مہذب کلام ہے اس میں الفاظ کی تہذیب بھی ایسی اعلیٰ درجہ کی ہے کہ کسی بلیغ کا کلام اس کے برابر مہذب نہیں ہو سکتا مگر اللہ بچائے جہل سے آج کل جہلا کی ایک جماعت ایسی نکلی ہے جو علم کی حقیقت محض ترجمہ قرآن پڑھ لینے اور دیکھنے کو سمجھتے ہیں ایسی ہی جہلا کا قرآن پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں تہذیب کی رعایت نہیں سبحان اللہ! اگر قرآن میں ایک لفظ بھی خلاف تہذیب ہوتا تو کیا بلغاء عرب مسلمانوں کو چین بھی لینے دیتے وہ تو آسمان سر پر اٹھا لیتے کہ قرآن میں جس کے اعجاز کا دعویٰ کیا جاتا ہے فلاں لفظ خلاف تہذیب ہے مگر تاریخ شاہد ہے کہ بلغاء عرب میں سے کسی نے بھی قرآن پر حرف گیری نہیں کی بلکہ اس کی بلاغت کے سامنے سب کی گردنیں جھک گئیں اور کسی نے قرآن پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ اس میں ایک لفظ بھی تہذیب کے خلاف ہے مگر اب اس چودھویں صدی میں ایسے ایسے بلغاء نکلے ہیں جن کو عربیت سے تو خاک بھی مس نہیں اور قرآن پر اعتراض کرنے کی جرات ہے۔

صاحبو! یہ ظاہر ہے کہ قرآن عربی کلام ہے تو اس کی بلاغت اور فصاحت اور اس کے معانی و

مطلب کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو عربیت کا پورا ماہر ہو اور عربی زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو جس کی فصاحت و بلاغت کو اہل زبان نے تسلیم کر لیا ہو پھر جن لوگوں کی مادری زبان اردو یا ہندی یا انگریزی ہو اور عربیت سے خاک بھی مس نہ ہو ان کو قرآن مجید پر اعتراض کرنے یا اپنی طرف سے اس کی کسی آیت کا مطلب بیان کر کے اسے خلاف تہذیب کہنے کا کیا حق ہے مگر آج کل حیرت ہے کہ ایسے ہی جاہل قرآن پر لب کشائی کرتے ہیں اور وہ محض ترجمہ پڑھ کر عالم ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔

بس ترجمہ سے وہ ایسے عالم ہو جاتے ہیں جیسے ریاست رام پور میں ایک مجلس میں ایک انگریز تقریر کر رہا تھا کہ تمہارے کران (قرآن) میں آیا ہے کہ طاعون ایک سے دوسرے کو لگتا ہے میں متحیر تھا کہ یا اللہ قرآن میں یہ مسئلہ کہاں آیا ہے پھر وہ بولا کہ دیکھو کران میں آیا ہے کہ طاعون سے بھاگنا ممنوع ہے حالانکہ یہ مضمون قرآن میں نہیں بلکہ حدیث میں آیا ہے پھر کہا کہ اس کی وجہ تو یہی ہے کہ جہاں تم جاؤ گے وہاں پھیل جائے گا۔ یہ استنباط ہوا۔

اس شخص نے اول تو روایت میں غلطی کی کہ حدیث کو قرآن بنا دیا پھر روایت میں غلطی کی کہ ممانعت فرار کی وجہ اپنی طرف سے تراشی کہ اس کا منشا طاعون کا لگنا ہے بھلا کوئی اس سے پوچھے کہ حدیث میں یہ وجہ کہاں مذکور ہے اگر کہو کہ ہم نے یہی وجہ سمجھی ہے تو تمہاری فہم مسلمانوں پر کیا حجت ہے تم حدیث و قرآن کو کیا سمجھو۔ اور اگر کہو کہ اس کے سوا کچھ وجہ ہو ہی نہیں سکتی تو یہ بھی غلط ہے علماء اسلام سے دریافت کرو وہ اس کی وجوہ کس قدر بیان کرتے ہیں۔

غرض اس کا دعویٰ اور دلیل سب ایسا ہی بے تکا تھا مگر وہاں ایسے احمق لوگ ہمارے ہی بھائی جمع تھے کہ اس تقریر پر حضور بجا اور حق کہہ رہے تھے میں اس لئے نہ بولا کہ مجھ سے کسی نے سوال نہ کیا تھا دوسرے میں مسافر تھا مجھے یہ خیال ہوا کہ اس کو تو لوگ حضور حضور کہہ رہے ہیں اگر تو بولا تو تجھے لوگ مجوری ہی بنا دیں گے۔ ہاں مجھ سے کوئی پوچھتا تو میں بتانے کو موجود تھا باقی جہاں کوئی پوچھے ہی نہیں اور اپنے کو علماء سے مستغنی سمجھے وہاں بولنا ٹھیک نہیں ورنہ وہی مثل ہوگی کہ احمق لے دوڑی صحنک غرض ایسے علماء آج کل رہ گئے ہیں۔

ابھی ایام تحریکات میں ایک بڑا ہندو جیل خانہ میں گیا تھا پھر اخباروں میں مشہور ہوا کہ وہ جیل خانہ سے جہل خانہ میں بھی پہنچ گیا یعنی وہ قرآن کا مطالعہ کر رہا ہے گویا وہ بھی قرآن سمجھنے کے قابل اور استنباط احکام کا اہل ہو گیا اور صاحب ایک ہندو کا عالم ہو جانا کیا تعجب ہے جب کہ اس کے لئے نبوت تک کی تجویزیں ہو رہی تھیں تو مولویت کا درجہ تو کم ہی ہے چنانچہ ایک ایسے شخص کا مقولہ اخبار میں شائع ہوا تھا جو دوسرے لیڈروں کی طرح آزاد بھی نہیں بلکہ تہجد گزار پابند صوم و صلوٰۃ ہیں جن کی داڑھی بہت لمبی ہے اور پائجامہ بھی بہت اونچا رہتا ہے ان کا اس ہندو کے متعلق یہ مقولہ ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو یہ شخص مستحق نبوت ہوتا اللہ خیر کرے اگر یہی ترقی ہے تو شاید کل یہ کہیں گے کہ اگر یہ بشر نہ ہوتا تو

مستحق خدائی ہوتا۔ نعوذ باللہ! کیونکہ دونوں میں کچھ بھی فرق نہیں نہ یہاں استلزام ہے نہ وہاں اگر محض قضیہ شرطیہ کے ساتھ کافر کو باوجود مانع کفر کے مستحق نبوت کہنا کفر نہیں تو پھر کفر نہ ہونا چاہئے افسوس کیا انتہا ہے اس اندھیر کا گویا نبوت کے لئے ایمان کی بھی شرط نہیں رہی تقویٰ اور ورع تو الگ رہا۔

غرض وہ ہندو جیل خانہ میں بیٹھا ہوا قرآن سے استنباط احکام کر رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اس نے جیل خانہ سے نکلتے ہی یہ فتویٰ دیا کہ مرتد کی سزا قتل ایک وحشیانہ قانون ہے جس کو بدل دینا چاہئے اے لیجئے! یا تو وہ مسلمانوں کو قرآن کے مطالب سمجھانے کے لئے مطالعہ کر رہا تھا یا اولیاء اسلام ہی پر ہاتھ صاف کرنے اور اس کے قوانین پر اعتراض کرنے لگا اور تماشا یہ کہ بعضے جاہل مسلمان بھی اس فتویٰ میں اس کے ہم زبان و ہم خیال ہو کر احکام اسلام میں تحریف کرنے لگے۔

مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ جہل بالکل غالب ہو گیا اب ایک انگریز اور ہندو بھی ان کے نزدیک عالم ہو سکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے ترجمہ قرآن پڑھ لینے کو علم سمجھ لیا ہے بس جو کوئی قرآن کا ترجمہ ان کے سامنے بیان کر دے اور شرارت کی راہ سے قرآن پر اعتراض کرنے لگے تو یہ لوگ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے میں ہمیشہ سے کہا کرتا ہوں کہ ترجمہ سے حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا اور اسی لئے میں اپنے ناخواندہ احباب کو ترجمہ دیکھنے سے منع کیا کرتا ہوں کیونکہ اس سے اشکالات پیش آتے ہیں اور ان کے جوابات سمجھنے میں الجھن و پریشانی ہوتی ہے کیونکہ اشکال کا منشا جہل عن الحقیقت ہوتا ہے۔ وہ تو جاہل کے ذہن میں بھی جلدی آ جاتا ہے اور جواب کا منشا علم ہے اس کو صاحب علم ہی سمجھ سکتا ہے جاہل کے ذہن میں چونکہ جواب کے لئے مقدمات و مبادی نہیں ہوتے اس لئے وہ بعض اوقات جواب کو کما حقہ نہیں سمجھتا جس سے خواہ مخواہ عمر بھر خلجان میں رہتا ہے اور کسی سہل عنوان سے جواب کا ذہن میں آ جانا یہ اتفاقی بات ہے۔

ضال کے معنیٰ

چنانچہ اسی قصبہ میں ہمارے ہی محلہ کے ایک صاحب تھے وہ ترجمہ قرآن دیکھا کرتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس آئے اور کہا قرآن میں ایک جگہ کچھ شبہ ہے۔ انہوں نے شر کی راہ سے شبہ پیش نہ کیا تھا۔ بلکہ واقعی شبہ ہی ہو گیا تھا میں نے کہا فرمائیے کہاں شبہ ہے۔ کہنے لگے پہلے تم اس آیت کا ترجمہ کر دو۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى میں سمجھ گیا کہ ان کو ترجمہ قرآن دیکھ کر اشکال ہوا ہے کیونکہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور اس کا ترجمہ بعض تراجم میں اس طرح کیا گیا ہے کہ پایا آپ کو گمراہ پھر ہدایت کر دی۔ اس سے ظاہر میں بہت وحشت ہوتی ہے کہ حضور کو گمراہ کہہ دیا۔ میں نے کہا سنئے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ پایا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ناواقف بس واقف بنا دیا۔ اب وہ میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے کہا

کہئے کیا شبہ ہے؟ کہنے لگے اب تو کچھ بھی نہیں۔ میں نے کہا اللہ کے واسطے آپ ترجمہ دیکھنا چھوڑ دیں۔

تو خرابی یہ تھی کہ بعض تراجم میں ناواقف کی جگہ گمراہ لکھا ہوا ہے اس سے ان کو وحشت ہوئی جس کا منشاء حقیقت سے بے خبری تھی۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ فارسی میں گمراہ اور عربی میں ضال کا استعمال مختلف موقعوں میں آتا ہے۔ ضال اور گمراہ اس کو بھی کہتے ہیں جو ہدایت پہنچنے کے بعد ہدایت سے اعراض کرے۔ اس معنی کے اعتبار سے کسی کو ضال و گمراہ کہنا مذمت کے لئے ہے اور کبھی اس کو بھی ضال و گمراہ کہتے ہیں جس کو ابھی تک حقیقت کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ اس معنی کر کسی کو گمراہ و ضال کہنا مذمت نہیں مگر آج کل اردو میں محاورہ بدل گیا کہ گمراہ کا استعمال پہلے ہی معنی میں ہوتا ہے دوسرے موقع میں ناواقف اور بے خبر کہا جاتا ہے پس ووجدک ضالا فھدی کا وہ مطلب ہے جس کو دوسرے مقام میں حق تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ
وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ
لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(اور اسی طرح جیسا کہ اوپر بشر کے ساتھ ہمکلام ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے) ہم نے آپ کے پاس بھی وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (چنانچہ اس سے پہلے آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب اللہ کیا چیز ہے اور نہ (مفصلا) یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے ولیکن ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کر دیتے ہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آپ (اس قرآن وحی کے ذریعہ) ایک سیدھے راستے کی ہدایت کرتے ہیں (من بیان القرآن ملخصا)

سو یہاں حق تعالیٰ نے مَا كُنْتَ تَدْرِىْ فرمایا ہے جس کا ترجمہ بے خبری اور ناواقفی ہی سے کیا جاتا ہے یہی معنی ہیں ووجدک ضالا کے مگر ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ضالا یا گمراہ کا استعمال کس کس معنی میں آتا ہے اس لئے ان کو وحشت نہیں ہو سکتی اور جاہل کے ذہن میں گمراہ کے ایک ہی معنی ہیں اس لئے اس کو خلجان پیش آئے گا۔ اس لئے ایسے لوگوں کو ترجمہ دیکھنا جائز نہیں۔

فطرت سلیمہ کا تقاضا

اب میں استطرادا ایک اشکال کا اور جواب دینا چاہتا ہوں جو دوسری آیت مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ پر واقع ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ کو کچھ خبر نہ تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کیا چیز ہے۔ جس سے بظاہر ایمان کی نفی ہوتی ہے۔ سو سمجھ لینا چاہئے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نعوذ باللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی زمانہ ایسا بھی گزرا جس میں آپ کو ایمان حاصل نہ تھا۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو نفس ایمان ہر وقت نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے جس سے مراد

صانع عالم کا اعتقاد اور توحید کا قائل ہونا ہے کہ اس سے کوئی نبی کسی وقت بھی خالی نہیں ہوسکتا کیونکہ وجود صانع اور توحید صانع کا علم فی نفسہ فطری ہے اگر ایک بچہ کو الگ مکان میں پرورش کیا جائے جہاں اس کے سامنے کسی مذہب کا تذکرہ اثباتاً یا نفیاً نہ کیا جائے پھر جب وہ بلوغ کو پہنچ جائے اس وقت اس سے جنگل میں کھڑا کر کے پوچھا جائے کہ آسمان وزمین کس طرح پیدا ہوئے تو وہ ضرور کہے گا کہ ان کا بنانے والا کوئی ضرور ہے اور وہ واحد ہے فطرت سلیمہ وجود و توحید صانع کا انکار نہیں کر سکتی۔ اور انبیاء علیہم السلام کی فطرت سب سے زیادہ سلیم ہوتی ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ توحید کے قائل نہ ہوں۔ یہ علم ان کے لئے ضروریات سے ہے۔ استدلال کی بھی حاجت نہیں الا للتقویۃ۔ پس مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ کا یہ مطلب نہیں کہ کسی وقت آپ کو ایمان حاصل نہ تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ایمان کو جانتے نہ تھے اور عدم درایت عدم وجود کو مستلزم نہیں کیونکہ بعض دفعہ ایک آدمی کے پاس کوئی چیز موجود ہوتی ہے مگر اس کو خبر نہیں ہوتی کہ میرے پاس یہ چیز موجود ہے۔

مثلاً ایک ناواقف کے ہاتھ کہیں سے یاقوت یا زمرد کا ٹکڑا لگ جائے تو اس وقت یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو یاقوت وزمرد کی خبر نہیں۔ اسی طرح سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا کوئی وقت نہیں گزرا جس میں آپ ایمان سے مشرف نہ ہوں۔ نبوت سے پہلے آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ ایمان اسی کیفیت کا نام ہے جو میرے اندر موجود ہے جیسے احکام ناسوتیہ میں حکماء اس کے قائل ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے۔ اسی وقت سے اس میں عقل وشعور وغیرہ سب کچھ ہوتا ہے مگر اس وقت مرتبہ استعداد میں یہ امور ہوتے ہیں اس وقت بچہ کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ میرے اندر کیا کیا جواہرات ہیں۔ پھر بالغ ہونے کے بعد اس کی عقل وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے اور اس وقت اس کو بھی علم ہو جاتا ہے کہ ہاں میرے اندر عقل وفہم موجود ہے۔

ایمان اور نبوت

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان نبوت سے پہلے بھی حاصل تھا۔ آپ کے اندر اور کمالات کا مادہ بھی سب موجود تھا۔ آپ ابتداء ہی سے معرفت وانوار کے جامع تھے مگر آپ کو اس کی خبر نہ تھی۔ بعد نبوت کے حق تعالیٰ نے ان کمالات سے واقف کر دیا' تب معلوم ہوا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی دولت دے رکھی ہے اور اب خبر ہوئی کہ جو کیفیت میرے اندر ابتداء سے موجود ہے اس کا نام ایمان ومعرفت وغیرہ وغیرہ ہے۔

خوب سمجھ لو کہ ماتدری سے خبر کی نفی ہوتی ہے حصول کی نفی نہیں اور یہ بے خبری کچھ نقص نہیں بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت وعنایت زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ پہلے آپ بے خبر تھے پھر دفعۃً علوم کا دریا بہا دیا۔ اگر آپ پہلے سے باخبر ہوتے تو وحی نازل ہوتی تو آپ کو حق تعالیٰ کی محبت وعنایت کا کیا پتہ چلتا۔ اس صورت میں محبت حق کی کوئی دلیل نمایاں طور پر

نہ ہوتی اور جب پہلے آپ بے خبر تھے تو دفعۃً تمام عالم سے زیادہ علوم آپ کو عطا کر دیئے گئے۔ اب آپ کے پاس عنایت و محبت حق کی نمایاں دلیل ہو گئی کہ واقعی حق تعالیٰ مجھے بہت ہی چاہتے ہیں۔

دونوں صورتوں کا فرق ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً ایک تو وہ آدمی ہے جس کے گھر میں سونا چاندی بھرا ہوا ہے جو بادشاہ نے اس کے بزرگوں کو دیا تھا اور اس کو میراث میں پہنچا۔ بادشاہ اس کو بلا کر یہ کہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ہمارا ہی دیا ہوا ہے مگر تم کو خبر نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ میرا موروثی سرمایہ ہے اور میرے بزرگوں کا کمایا ہوا ہے اور ایک وہ آدمی ہے جس کو بادشاہ نے گھر دیا جس میں سونا چاندی مدفون ہے مگر اس کو خبر نہیں اس کو بلا کر بادشاہ نے اسی دفینہ پر مطلع کر دیا اور اس کے نکالنے اور برتنے کی اجازت دے دی۔ بتلایئے ان دونوں میں سے عنایت سلطانی کا زیادہ احساس کس کو ہو گا۔ یقیناً اس دوسرے کو پہلے شخص سے زیادہ احساس ہو گا۔ معلوم ہوا کہ بے خبری کے بعد جو دولت کی خبر ہوتی ہے اس سے محسن کی محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کی شفقت زیادہ واضح ہوئی۔

روح اور مادہ

یہاں سے آریہ سماج کی حماقت معلوم ہو گئی جو خدا تعالیٰ کو مخلوق پر شفقت فرمانے سے بالکل خالی مانتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ روح بھی قدیم ہے اور مادہ بھی قدیم ہے اور قدیم بھی مثل حق تعالیٰ کے قدیم بالذات کہ ان کو خدا نے پیدا نہیں کیا۔ نہ اختیاراً جیسا اہل ملل سماویہ کا مذہب ہے نہ ایجاباً و اضطراراً جیسا کہ فلاسفہ کا مذہب ہے مگر اس میں فلاسفہ نے ان کو مستغنی عن الواجب تو نہیں مانا اور آریہ تو ان کو بالکل مستغنی مانتے ہیں کہ مادہ و روح اپنی اپنی صفات کے ساتھ بلا ایجاد و بلا ایجاب قدیم سے مستقلاً موجود تھے۔ خدا کا کام صرف اتنا ہے کہ ان دونوں کو باہم جوڑ دیا۔ نعوذ باللہ! وہی مثال ہوئی کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی کا کنبہ جوڑا۔ تو ایجاد کا تو ان پر کوئی احسان نہیں ہوا۔ رہا ترکیب کا احسان سو وہ بھی اس لئے نہیں کہ قبل ترکیب تو روح امن و راحت میں تھی۔ ان دونوں کو جوڑ کر گویا نعوذ باللہ اللہ میاں نے اور شور برپا کر دیا اور روح کو مصیبت میں پھنسا دیا۔ جیسا ایک مغلوب الحال کا شعر ہے۔

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

انہوں نے تو تنگ ہو کر وجدی حالت میں کہا ہو گا مگر آریہ کے قول پر تو سچ مچ یہی ہوا کہ روح الگ تھی مادہ الگ تھا۔ نہ وہ شرارت کر سکتی تھی نہ یہ۔ کیونکہ روح میں بدوں مادہ کے شر کی قابلیت نہیں اور مادہ میں بدوں روح کے شعور نہیں۔ اللہ میاں نے دونوں کو باہم ملا کر دنیا میں ایک آفت برپا کر دی۔ کمالات تو دینے سے رہے اور روح کے کمالات بھی ملیامیٹ کر دیئے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی کیا ظاہر ہوئی اور ان کو مخلوق پر کیا حق ہوا اور کس بنا پر ان پر حکومت کی جاتی ہے کیونکہ وجود تو

مخلوق کو پہلے سے حاصل تھا۔ روح موجود تھی مادہ موجود تھا۔ اللہ میاں نے یہی کیا کہ دونوں کو جوڑ دیا۔ جیسے معمار اینٹوں کو جوڑ دیا کرتا ہے بلکہ اس پر تو مخلوق کہہ سکتی ہے کہ ہم تو الگ الگ ہی اچھے خاصے تھے ہمیں اس حال میں چین سے بیٹھے رہنے دیا ہوتا۔

بخلاف اسلامی تعلیم کے اس سے اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت مخلوق پر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ کوئی چیز پہلے سے کسی حالت میں بھی موجود نہ تھی سب معدوم محض تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا کیا۔ اسی سے حق تعالیٰ کا خاص احسان ظاہر ہوتا ہے کہ عدم کے بعد مخلوق کو وجود دیا۔ اس لئے ان کو مخلوق پر ہر طرح حکومت کرنے کا اور احکام کو نہ ماننے والے کو سزا دینے کا پورا حق ہے اور اس پر تماشا یہ ہے کہ آریہ سماج توحید کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ میں کہتا ہوں کہ بت پرست ہندو شرک میں ان سے کم ہیں کیونکہ وہ بتوں کی تعظیم کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کے برابر تو کسی کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک قدیم بالذات اور مستغنی من الصانع سوائے خدا کے کوئی نہیں۔ ہاں اتنی حماقت ان کی بھی ہے کہ وہ مخلوق میں خدا تعالیٰ کا حلول جائز سمجھتے ہیں مگر خدا کے برابر تو قدیم کسی کو نہیں کہتے۔ سب کا خالق خدا تعالیٰ کو مانتے ہیں روح کا بھی اور مادہ کا بھی۔

اسی طرح حکماء یونان کا شرک بھی آریوں سے کم ہے کیونکہ انہوں نے گو مادہ و صورت کو قدیم کہا ہے مگر قدیم بالذات وہ بھی نہیں کہتے صرف قدیم بالزمان کہتے ہیں۔ تو یہ بھی کفر ہے مگر پھر بھی ان کا کفر آریہ سماج کے کفر سے کم ہے۔ دونوں میں ایسا فرق ہے کہ ایک پاخانہ ہے ایک پیشاب ہے۔

اسی طرح نصاریٰ بھی ان سے کم ہیں۔ گو وہ تین خدا مانتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے برابر کسی کو نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اور روح القدس اور مسیح کو اسی نے بنایا مگر بنا کر ان کے ساتھ متحد ہو گیا اور ہے یہ بھی کفر پھر بھی آریہ کے کفر کے برابر نہیں ان جاہلوں نے تو خدا تعالیٰ کو سب کو بگاڑنے کے واسطے خدا مانا ہے۔

جیسے ہمارے استاد علیہ رحمتہ غصہ میں ظرافت سے فرمایا کرتے تھے کہ میرے ولی ہونے میں تو شک نہیں مگر سنوارنے کا ولی نہیں۔ بگاڑنے کا ولی ہوں اور واقعی بددعا کے لہجہ میں مولانا نے جس کو جو کہہ دیا ہے وہی ہو گیا باقی سنوارنے کی نفی فرمانا یہ تواضعاً کہہ دیا ورنہ ہزاروں کو سنوار بھی دیا۔ یا اس کی یہ وجہ ہو کہ مولانا نے نقائص کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور خیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف جو سنوارا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے سنوارا ہے میرا اس میں دخل نہیں اور بگاڑنے کو اپنی طرف ادباً" منسوب کیا۔

مگر آریہ سماج تو سچ مچ اللہ تعالیٰ کو بگاڑنے ہی کا خدا مانتے ہیں کہ سوڈا اور ٹاٹری کو باہم ملا دیا جس سے ایک شورش پیدا ہو گئی۔ اس کے سوا اللہ میاں کا کچھ کام ہی نہیں یہ تو اس مذہب کا مبدا ہے۔ یہ لوگ صفت وجوب و قدیم میں مادہ و روح کو حق تعالیٰ کا شریک مانتے ہیں اور میرے نزدیک اس مذہب کے لچر

ہونے کے لیے بھی ایک بات کافی ہے۔ ہر ہر مسئلہ کے رد تفصیلی کی کچھ ضرورت نہیں۔ کیونکہ جس مذہب کا خدا کے ساتھ یہ اعتقاد ہو اس کے فروع کے بطلان میں کیا شک ہو سکتا ہے گو مجھے اپنے مضمون کے مقصود میں اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی۔ مگر استطرادا اس کو اس لئے بیان کر دیا کہ شاید کسی مسلمان کو آریہ کے دعویٰ توحید سے دھوکہ ہو جائے کہ وہ بھی موحد ہیں اور دوسرے ہندوؤں سے اقرب الی الاسلام ہیں تو وہ اس سے دھوکا نہ کھائیں بلکہ سمجھ لیں کہ یہ لوگ سب سے بڑھ کر کافر ہیں۔ اسی لئے میں نے بقدر ضرورت اس دعویٰ اشدیت فی الکفر کے مقدمات بھی بیان کر دیئے۔

مبداء و معاد

اب اس فائدہ استطرادیہ کی تتمیم کے لئے اس کے ساتھ ایک اور مضمون عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ تمام مذاہب کی حسن و قبح کا اصل مدار مبداء و معاد کی نوعیت پر ہے سو اس مذہب کے مبداء کا حال تو سن لیا اب میں اس کے معاد کا حال بھی بتلاتا ہوں تا کہ مبداء و معاد کے بطلان سے اس مذہب کا بطلان اچھی طرح واضح ہو جائے۔

سو اس کے معاد کا یہ حال ہے کہ یہ لوگ نجات ابدی کے منکر ہیں دائمی نجات ان کے یہاں کسی کے لئے ہے ہی نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس مذہب میں معاد کا یہ حال ہو اس مذہب کو آدمی کس بھروسہ پر قبول کرے کیونکہ مذہب کی اخیر غایت نجات ہے جب نجات ہی چند روزہ ہے تو اس مذہب کے اختیار کا کیا نتیجہ جب عبث ٹھہرا تو حق کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی دو قسم کے ہیں۔ ایک بداعمال ایک نیک اعمال بداعمال کے لئے دو سزا ہے جس کی صورت تناسخ ہے کہ وہ دوسرے برے برے جنموں میں پیدا کیا جاتا ہے اور اس طرح سے اس کو سزا دی جاتی ہے مثلاً کوئی گدھے کے جنم میں آتا ہے کوئی سور کی کوئی کتے کی کوئی درخت بن جاتا ہے کوئی گھاس وغیرہ مگر یہ اچھی سزا ہوئی جس میں عامل کو یہ بھی خبر نہیں کہ مجھے اعمال بد کی سزا دی جا رہی ہے۔ جس سے آئندہ وہ جرائم سے رکے کیونکہ گدھے کتے کو عقل نہیں ہوتی اور درخت وغیرہ تو بالکل ہی بے خبر ہیں۔ گو آریہ نے درختوں کے لئے بھی ایک قسم کی روح مانی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان میں سوتی ہوئی روح ہے جس کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے۔ کاٹتے ہوئے بیدار ہو نہ چیرتے ہوئے۔

مگر پھر معلوم نہیں جب بے حسی کے ساتھ کسی چیز میں روح ہو سکتی ہے تو پھر جمادات میں بھی سوئی ہوئی روح کے قائل کیوں نہیں ہوئے وجہ کچھ بھی نہیں منہ کے آگے آڑ نہیں جھاڑ نہیں جو چاہا بک دیا خیر یہ مطالبہ فرق کا تو فرعی بات تھی مگر اصلی بات یہ ہے کہ اس صورت میں سزا کا لغو ہونا لازم آتا ہے کیونکہ سزا سے مقصود انزجار ہے جو اس صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ حیوانات یا نباتات کو یہ نہیں معلوم ہوتا نہ اجمالاً نہ تفصیلاً کہ ہم پہلے کس حال میں تھے اور ہم نے کیسے عمل کئے تھے جن کی سزا

میں ہم کو یہ جنم دیا گیا ہے (اور اگر کوئی دعویٰ کرے کہ حیوانات کو اس کا علم ہوتا ہے تو ذرا براہ مہربانی وہ کسی دلیل سے اس کو ثابت کردیں۔ انشاء اللہ قیامت تک ثابت نہ کرسکیں گے۔

یہ تو ان کا قول بدعملوں کے بارہ میں ہے اور جن کے اعمال نیک ہیں جنہوں نے اچھے کام کیے ان کی نسبت کہتے ہیں کہ ان کو مکتی ہوگی یعنی نجات۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسی سب روحیں خلاء مجرد میں گھومتی پھریں گی جس کو انہوں نے عالم ارواح مانا ہے مگر خلاء مجرد میں بھی ارواح کا قیام ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ اس کی مدت متعین کی ہے اور گو مدت بہت طویل مقرر کی ہے جو لاکھوں کروڑوں برس بیان کی جاتی ہے مگر پھر بھی ایک مدت کے بعد یہ نجات منقطع ہوجائے گی اور ان ارواح کو دوبارہ مادہ کے ساتھ ملا کر پھر عالم اجسام میں بشکل انسان بھیجا جائے گا اور ان کے ساتھ پھر وہی برتاؤ ہوگا جو پہلے ہوا تھا اگر اچھے کام کیے تو ایک خاص مدت کے لئے پھر خلاء مجرد میں پہنچ جائیں گے اور برے کام کیے تو کسی دوسرے برے جنم میں پیدا کیے جائیں گے۔ اسی طرح ابدالآباد تک ہوتا رہے گا یہ سلسلہ ان کے نزدیک کبھی منقطع نہ ہوگا جس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں محض بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔

وہ بناء فاسد یہ ہے کہ ان لوگوں نے عالم کی عمر کو تو غیر محدود مانا اور ارواح کو محدود تو یہ نیک اعمال کرنے والی روحیں پھر اس عالم میں واپس نہ آئیں تو ایک مدت کے بعد سب روحیں عالم ارواح میں پہنچ جائیں گی اور عالم اجسام خالی رہ جائے گا اور اس کا بیکار پڑا رہنا حکمت کے خلاف ہے۔ اس لئے خاص مدت کے بعد پھر روحوں کو اسی عالم میں واپس کیا جائے گا۔

سبحان اللہ! کیا دلیل ہے کہ محض خانہ پری کرنے کو یہاں بھیجا جائے گا اول تو یہ غلط کہ اس عالم کی عمر غیر محدود ہے۔ اس پر دلیل قائم کرنا چاہئے اس کے بعد ارواح کی واپسی کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہئے گو ارواح کو محدود ہم بھی کہتے ہیں مگر ہم اس عالم کو بھی محدود کہتے ہیں جو ایک دن فنا ہوجائے گا۔ (پھر قیامت میں جو زمین و آسمان کا اعادہ ہوگا تو ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ اس کی خانہ پری کے لئے پہلی ارواح واپس کی جائیں بلکہ وہ تو جنت یا نار میں ہی رہیں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اور زمین و آسمان کو یا تو دوبارہ پھر فنا کردیا جائے گا یا ان کے لئے کوئی مخلوق پیدا ہوجائے گی یا خالی پڑے رہیں گے سب صورتیں ممکن ہیں کوئی محال نہیں۔

جب بناء کا فاسد ہونا معلوم ہوگیا تو اب ان سے سوال یہ ہے کہ تم نے جو وجہ بیان کی ہے وہ تو نہایت لغو ہے کوئی اور وجہ معقول بتلاؤ کہ جن ارواح نے نیک کام کیے تھے اور اس کے صلہ میں وہ عالم مادی سے عالم ارواح کی طرف بھیج دی گئی تھیں ایک خاص مدت بعد ان کو وہاں سے کیوں نکالا جاتا ہے آخر اس کی وجہ کیا؟

ان کے ایک مقتداء نے اس کا عجیب جواب دیا ہے کہ وہ بھی محض بناء الفاسد علی الفاسد ہے کہ اگر نجات ابدی ہو تو عمل محدود پر جزاء غیر محدود کا ملنا لازم آئے گا اور محدود اعمال پر غیر محدود انعام دینا

تکلیف پہنچاتا ہے۔ جیسے ہم کسی آدمی کے اوپر دس ہزار روپے لاد دیں تو اس کا کو بچ نکل جائے گا یا کسی آدمی کی خوراک تو چار روٹی ہو اس کو پچاس روٹیاں کھلا دیں تو اس کو ہیضہ ہو جائے گا۔

ماشاء اللہ! کیا عقل ہے اور کیا نفیس دلیل ہے کہ ہر عمل محدود پر جزائے غیر محدود مرتب کرنا تکلیف دیتا ہے حالانکہ ہر بے وقوف سے بے وقوف بھی جانتا ہے کہ جزائے دائمی اور انعام غیر محدود عنایت کرم کی دلیل ہے رہی یہ بات کہ کسی پر دس ہزار روپے لاد دیں تو اس کا کو بچ نکل جائے گا تو انعام دینے کا یہ طریقہ تمہارے ہی یہاں ہوگا کہ اس کے اوپر لادا کریں آخر لادنے کی ضرورت کیا پڑی ہے اس انعام کے استعمال کا جو طریقہ ہے اس طریق سے اس کو منتفع کیا جائے گا کچھ نہیں بس جو جی میں آیا بک دیا محض بے تکی باتیں ہیں جن کا سر نہ پاؤں میں کہتا ہوں کہ اگر کسی آدمی کو ذرا سے عمل پر معاوضہ میں ہمیشہ کے لئے لاکھوں روپے سالانہ یا ماہوار دے دیئے جائیں تو کیا اس کو اس سے تکلیف ہوگی یا وہ دعائیں دے گا ہر شخص جانتا ہے کہ اس کو عنایت کرم سمجھا جائے گا۔

رہا یہ کہ جس کی خوراک چار روٹی ہے اس کو پچاس کھلانے سے تخمہ ہو جائے گا تو یہ جب ہے کہ ایک وقت میں اتنی روٹیاں کھلا دی جائیں اور اگر متفرق کھلائی جائیں تو کبھی تکلیف نہ ہوگی بلکہ لذت و راحت ہوگی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ہم اپنی ساری عمر میں نہ معلوم کتنے ہزار روٹیاں کھا جاتے ہیں تو کیا سب کو ہیضہ ہی ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب جزاء غیر محدود ہوگی تو اس کے لئے وقت بھی تو غیر محدود ہوگا پھر جزاء غیر محدود زمانہ غیر محدود میں تکلیف کا سبب کیونکر ہو سکتی ہے حتیٰ کہ لادنے کی مثال میں بھی اگر تم ایک آدمی کے اوپر کروڑوں روپیہ لاد دو مگر ایک دم سے نہیں بلکہ اس طرح کہ اس کو ہر روز دس روپیہ دیا کرو مثلاً جب وہ ختم ہو جاویں اگلے دن اور دس روپیہ دے دو۔ بتلاؤ اس طرح اسے کیا تکلیف ہوگی کچھ بھی نہیں۔

تو اس شخص کی عقل نہ معلوم کہاں ہے کہ جزاء غیر محدود کے لئے بلا دلیل وقت کو محدود مان کر بے تکی باتیں ہانک رہا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ جو شخص جزاء غیر محدود کا قائل ہوگا وہ اس کے لئے زمانہ کو محدود کیوں مانے گا ماشاء اللہ یہ حالت ہے اس شخص کے عقل کی جس کو پیشوا مانا جاتا ہے۔ واللہ! مسلمانوں میں ادنیٰ طالب علم کی عقل بھی اس کی عقل سے اچھی ہوگی یہ ہیں اہل باطل کے مقتدا جن کو موٹی بات سمجھنے کی عقل نہیں۔

ایک اور وجہ عالم ارواح سے نکالے جانے کی بیان کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ نور بھری ہے وہ یہ کہ اگر نجات ابدی ہو اور سب روحیں ایک جگہ ہی رہیں تو عالم ارواح میں بھیڑ ہو جائے گی۔ سبحان اللہ! یہ عقل ہے وہی مثل ہوگئی کہ دروغ گو را حافظہ نباشد (جھوٹے کی یادداشت کمزور ہوتی ہے) حالانکہ وہ یہ بھی مانتا ہے کہ خلاء مجرد و غیر محدود اور غیر متناہی ہے پھر یہ بھی کہتا ہے کہ سب روحوں کے اجتماع سے وہاں بھیڑ ہو جائے گی اور تماشا یہ ہے کہ اس خلاء مجرد کو غیر محدود بھی مانا جاتا ہے کیوں صاحب! جب خلاء مجرد و غیر محدود ہے تو پھر وہاں بھیڑ کیوں ہوگی بلکہ سب اوپر کو غیر نہایت تک

چڑھتی چلی جائیں گی میری سمجھ میں نہیں کہ اس شخص کو کس نے عاقل کہہ دیا جس کی باتیں ایسی بے تکی ہوں اس کو عاقل کون کہہ سکتا ہے ہاں یوں کہئے کہ آکل ہے۔

غرض یہ حشر ہے ان کی معاد کا کہ اول تو نجات ایسی خوبصورت ہے کہ بس خلا مجرد میں بھرتے چلے جاؤ اور کچھ نہیں پھر وہ بھی دائمی نہیں منقطع ہونے والی ہے اب کس امید پر کوئی عمل کی کوشش کرے جب کہ پھر اسی چکر میں دوبارہ آنا ہے اور برے عملوں سے کوئی بچے تو کس خوف سے جب کہ سزا ایسی ہوگی جس میں کسی کو سزا کی خبر ہی نہ ہوگی جس مذہب میں اعمال صالحہ پر تو نجات کی یہ گت ہو اور اعمال قبیحہ پر سزا ایسی خوبصورت ہو (جس کو بہت لوگ دنیوی حیثیت سے انسانی زندگی سے افضل سمجھتے ہیں کیونکہ جانوروں کے برابر بے فکری انسانوں کو کہاں نصیب) تو اس مذہب کے پیرو جتنی بھی شرارتیں کریں تھوڑی ہیں اور مبداء کا حال پہلے معلوم ہو چکا کہ خدا تعالیٰ کا کام روح اور مادہ کے جوڑنے سے زیادہ کچھ نہیں نہ وہ حیات دیں نہ کمالات عطا کریں کیونکہ وہ کمالات تو بقول ان کے سب کچھ روح کو پہلے سے حاصل ہیں پھر اس صورت میں حق تعالیٰ کی نہ کچھ عنایت ظاہر ہوتی ہے نہ شفقت پس اسی مبداء و معاد سے مذہب کا حال معلوم کرلو۔

ماشاء اللہ! ایک اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ نجات میں ابدیت کے قائل اور توحید میں سب مخلوقات کے احتیاج الی الصانع کے قائل جس سے حق تعالیٰ کی مخلوقات پر غایت عنایت و شفقت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ ہمارے نزدیک جو کچھ ہے روح ہو یا مادہ رزق ہو یا علم کمال ہو یا جمال سب حق تعالیٰ کا بنایا اور عطا کیا ہوا ہے جس کا یہ اعتقاد ہو ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ اس کو کس قدر تعلق ہوگا کیونکہ الانسان عبد الاحسان انسان تو احسان کا بندہ ہے۔

اردو عربی محاورہ کا فرق

اسی بناء پر میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر سب علوم سے اول ہی سے باخبر ہوتے تو آپ کو حق تعالیٰ کی عنایات کا اپنے اوپر ویسا مشاہدہ نہ ہوتا جیسا کہ اب ہوا کہ پہلے بے خبر تھے پھر حق تعالیٰ نے باخبر بنا دیا یہ ہے حقیقت وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کی جس پر کوئی اشکال نہیں مگر چونکہ آج ترجمہ ہی پر علم کا مدار رہ گیا ہے اس لئے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا سے بعض لوگوں کو وحشت ہو جاتی ہے ورنہ اس میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غایت شفقت کا بیان ہے۔ اور اسی ترجمہ میں علم کو محصور سمجھ جانے سے قرآن مجید میں خلاف تہذیب الفاظ ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے جس کو اول بیان کر رہا تھا اس کی حقیقت بھی یہی ہے کہ بعض الفاظ لغت عربی میں کسی معنی خاص میں صریح نہیں ہیں مگر اردو محاورہ میں وہ اس معنی میں صریح ہو گئے ہیں۔ اب ان الفاظ کو قرآن میں دیکھ کر بعض جاہلوں کو قرآن پر اشکال ہوتا ہے کہ اس میں تو غیر مہذب الفاظ ہیں۔

مثلاً ذکر عربی میں نر کو کہتے ہیں جو انثیٰ کا مقابل ہے پس ذکر و انثیٰ عربی میں نر و مادہ کو کہتے ہیں اور کبھی کنایۃً خاص عضو کو بھی کہتے ہیں یہ تو عربی کا استعمال ہے مگر اردو میں ذکر کا استعمال عضو ہی کے لئے ہونے لگا ہے اب اگر قرآن میں لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے) دیکھ کر اعتراض کرنے لگے کہ اس میں تو غیر مہذب الفاظ ہیں یہ[1] اس کی حماقت ہوگی کیونکہ جو لفظ تمہارے محاورہ میں غیر مہذب ہے وہ عربی میں اس معنی کے لئے موضوع ہی نہیں علیٰ ہذا قرآن میں ہے وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ اور اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا بعض جہلاء اس لفظ کو غیر مہذب سمجھتے ہیں یہ بھی حماقت ہے کیونکہ عربی میں لفظ فرج شرمگاہ عورت کے لئے موضوع نہیں بلکہ اس کے اصل معنی شگاف کے ہیں کنایۃً کبھی شرمگاہ کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے لیکن اصل معنی کے اعتبار سے اس کا استعمال چاک گریبان پر بھی ہوتا ہے چنانچہ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کا ترجمہ یہ ہے کہ مریم علیہا السلام اپنے گریبان کو دست اندازی غیر سے بچانے والی تھیں۔ جس کا مترادف یہ ہے کہ پاکدامن تھیں یہ کتنا نفیس عنوان ہے جس میں بتلایئے کون سا لفظ غیر مہذب ہے اور فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے گریبان میں دم کر دیا۔ جس سے وہ حاملہ ہوگئیں بتلایئے اس میں کیا اشکال ہے کچھ بھی نہیں۔

محض ترجمہ پڑھنا کافی نہیں

مگر محض ترجمہ دیکھنے سے یہ باتیں تھوڑا ہی معلوم ہو سکتی ہیں ترجمہ دیکھنے والے تو بناء الفاسد علی الفاسد کریں گے کہ ایک لفظ کا ترجمہ اپنے محاورہ کے موافق کر لیا پھر قرآن پر اشکال کرنے لگے میں یہ نہیں کہتا کہ تراجم قرآن بیکار ہیں اور ان کا پڑھنا جائز نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ترجمہ پڑھنے سے علم قرآن حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ترجمہ دان عالم ہو جاتا ہے بلکہ عالم وہ ہے جو قرآن کو اسی زبان میں سمجھتا ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور یہ کچھ قرآن ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر کتاب کا علم جبھی حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اس کو اسی کتاب کی زبان میں حاصل کیا جائے[2] محض ترجمہ دیکھنے سے کسی کتاب کا بھی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

نرے ترجمہ دیکھنے سے نتیجہ یہ ہوتا ہے جیسے ایک صاحب گلستان کا ترجمہ پڑھے ہوئے تھے۔ ایک دن

---

[1] بلکہ عربی میں مرد کے عضو خاص کو ایر کہتے ہیں۔ اسی طرح عورت کی شرمگاہ کو کس و بظر کہتے ہیں اس کے لئے لفظ فرج موضوع نہیں ہے۔ بلکہ فرج کا استعمال کنایۃً ہوتا ہے علیٰ ہذا دبر و مقعد بھی عضو مشترک کے لئے موضوع نہیں بلکہ اس کے لئے لفظ ... ہے دبر و مقعد کا استعمال بطور کنایہ کے ہے اور اصل معنی ان کے غیر مہذب نہیں۔ اسی طرح مکر کے معنی عربی میں فریب کے لئے خاص نہیں بلکہ تدبیر خفی کو بھی کہتے ہیں۔ خوب سمجھ لو ۱۲ ظ

[2] اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ جن کتابوں کی اصل زبان مفقود ہے محض تراجم ہی موجود ہیں ان کا وجود کالعدم ہے جیسے توراۃ و انجیل و وید وغیرہ کیونکہ محض ترجمہ سے مراد متکلم اور حقیقت کلام معلوم نہیں ہو سکتی بلکہ صرف مترجم کی مراد واضح ہوگی جو کسی پر حجت نہیں۔ اسی لئے شریعت نے قرآن کا محض ترجمہ شائع کرنا حرام کر دیا ہے تاکہ اس طرح رفتہ رفتہ اصل کتاب ضائع نہ ہو جائے۔ ۱۲ ظ

انہوں نے اپنے دوست کو پٹتے ہوئے اور پیٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ آپ نے دوڑ کر دوست کے ہاتھ پکڑ لئے۔ دشمن نے اچھی طرح دل کھول کر مرمت کی کیونکہ پہلے تو مقابل بھی کچھ جواب دے رہا تھا اور اب وہ بے دست ہو چکا تھا۔ جب وہ خوب پٹ چکے تو ان حضرت سے پوچھا گیا کہ یہ کیا حرکت تھی۔ چاہئے تھا کہ میری مدد کرتے نہ کہ بے دست وپا کر دیا کہنے لگے۔ میں نے سعدی کے اس قول پر عمل کیا تھا۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست   در پریشان حالی و درماندگی

دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا پریشانی و عاجزی کی حالت میں ہاتھ پکڑ لے اس لئے میں نے تمہارے ہاتھ پکڑ لئے۔ چونکہ وہ ترجمہ ہی پڑھا ہوا تھا محاورہ کلام سے واقف نہ تھا کہ دست گرفتن سے مراد امداد کردن ہے نہ کہ ہاتھ پکڑ لینا اس لئے اس سے یہ غلطی واقع ہوئی اور غنیمت ہے کہ اس نے یہ نہیں سمجھا کہ دوست وہ ہے جو دوست کے دست اٹھایا کرے مگر یہ سمجھتا تو خیر مقصود کے کچھ قریب ہوتا کیونکہ اس صورت میں بھنگی کے دو پیسے یا دو روٹیاں ہی بچاتے جس سے دوست کی کچھ امداد ہوتی غرض صرف ترجمہ پڑھنے کا بعض دفعہ یہ نتیجہ ہوتا ہے اسی سے سمجھ لیجئے کہ قرآن کا علم ترجمہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

تہذیب کی رعایت

اسی طرح اور اشکالات بھی محض ترجمہ کی بدولت پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک اشکال پچھلے دنوں بہت مشہور ہوا تھا۔ وہ یہ کہ اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل ہیں اور اخباروں کو آج کل ایسا سمجھتے ہیں جیسے وحی آسمانی چاہئے تو یہ تھا کہ اس خبر میں اشکال کیا جاتا مگر وہ اخباری خبر تھی غلط کیسے ہو سکتی تھی۔ بعض مسلمانوں کو اس خبر سے قرآن پر اشکال ہو گیا کہ قرآن میں جو آیا ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ

یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

کہ حق تعالیٰ نے کسی آدمی کے دو دل نہیں بنائے۔ یہ آیت اس خبر کے معارض ہے تو اس آیت کا کیا مطلب ہے۔ ہمارے بعض لکھے پڑھے لوگ بھی اس اعتراض سے متاثر ہو گئے۔ چنانچہ مجھ سے بھی ایک صاحب نے سوال کیا۔ میں نے کہا کہ قرآن میں ماجعل صیغہ ماضی آیا ہے جس سے زمانہ ماضی میں کسی کے دو دل ہونے کی نفی ہے زمانہ مستقبل میں ایسا ہونے کی نفی نہیں۔ سو نزول قرآن کے وقت تک تو کسی کے دو دل نہیں ہوئے اس لئے قرآن پر اشکال جب ہو گا جب کہ نزول قرآن کے وقت یا اس سے پہلے کسی کے دو دل ہوئے ہوں۔ سو اس کا جواب ہم اس وقت دیں گے جب کہ پہلے کسی معتبر دلیل سے آپ اس کو ثابت کر دیں۔ ابھی ہمارے ذمہ جواب ہی نہیں۔ بس اس جواب کے بعد کوئی آگے نہیں چل سکا۔

ایسے جاہلوں کو مختصر رستہ سے لے جانا چاہئے۔ علمی تدقیقات سے یہ لوگ نہیں سمجھتے (جیسا کہ بعض نے کہا ہے حق تعالیٰ نے جوف میں دو قلب ہونے کی نفی کی ہے تو اس شخص کے جوف میں دو قلب نہیں ہوں گے بلکہ ایک جوف میں ہو گا دوسرا دماغ وغیرہ میں ہو گا۔ اس جواب سے معترض

ساکت نہیں ہو سکتا) اور ما جعل کو صیغہ ماضی کہہ کر جواب دیا گیا ہے۔ یہ مسکت بھی ہے اور صحیح بھی ہے اور اس کی ضرورت بھی بعد تسلیم خبر کے ہے ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ خبر ہی غلط تھی کیونکہ اس شخص کے دل کو کسی نے دیکھا تھا یا دل دو ہی ہوں گے مگر مدرک ایک ہو تو دل وہی ہو گا۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ محض ترجمہ سے کام نہیں چلتا بلکہ علم قرآن کے لئے بہت سے مبادی و مقدمات جاننے کی ضرورت ہے۔ صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ تفسیر قرآن کے لئے علوم میں تبحر ہونا ضروری ہے جن میں یہ علوم بھی ہیں۔ لغت صرف نحو منطق بقدر ضرورت وغیرہ وغیرہ مگر منطق سے فلسفہ مراد نہیں وہ تو محض لغو ہے ہاں قواعد منطقیہ جاننے کی آج کل بے شک ضرورت ہے کیونکہ عقول سلیمہ آج کل بہت کم ہیں۔ اگر عقل سلیم ہو تو نتیجہ نکالنے کا طریقہ اور اس کی غلطیاں خود معلوم ہو جاتی ہیں۔ مگر جب عقل سلیم نہ ہو تو قواعد منطقیہ کی ضرورت ہے اس سے صحت استدلال اور نتیجہ کا صحیح و غلط ہونا معلوم ہو جاتا ہے بدوں اس کے قرآن میں بعض جگہ غلطی ہو جانے کا اندیشہ ہے مثلاً ایک آیت میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

اور یہ اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے تو انکو سننے کی توفیق دیتے اور اگر انکو سنا دیں تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے۔

یہاں اشکال پڑتا ہے کہ ان دونوں مقدموں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ اور اس کا بطلان ظاہر ہے۔ اس اشکال کا جواب معقول دان جلدی دے سکتا ہے کہ یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کیونکہ صحت نتیجہ تکرار حد اوسط پر موقوف ہے اور یہاں حد اوسط نہیں کیونکہ مطلب یہ ہے۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ سماع قبول وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ
سماع عدم قبول لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ

اور اس پر کوئی اشکال نہیں اس لئے بقدر ضرورت معقول کی بھی ضرورت ہے۔ نیز بلاغت اور علم حدیث ناسخ و منسوخ اور محاورات اور امثال عرب وغیرہ کا جاننا بھی ضروری ہے اسی طرح اور بہت سے علوم ہیں جن کو صاحب کشاف نے گنا ہے۔

اب لوگ نرا ترجمہ دیکھ دیکھ کر قرآن دان ہو گئے۔ صاحبو! یا تو علوم مذکورہ میں تبحر ہو کر قرآن کے سمجھنے کی کوشش کرو ورنہ پھر یہ ضروری ہے کہ نہ ترجمہ دیکھو نہ تفسیر کیونکہ جہل بسیط جہل مرکب سے اچھا ہے۔ جہل بسیط میں جاہل کو اپنی فہم پر اعتماد ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے کو عالم سمجھتا ہے حالانکہ واقع میں جاہل ہے۔ البتہ اگر کسی متبحر عالم سے ترجمہ سبقاً سبقاً پڑھ لو تو ان شاء اللہ تعالیٰ ان خرابیوں سے حفاظت رہے گی۔

غرض علوم قرآنیہ کے نہ جاننے سے قرآن پر غیر مہذب الفاظ کے استعمال کرنے کا اعتراض کیا گیا ہے یہ معترضین محض جاہل ہیں جو لغات عربیہ کو نہیں جانتے ورنہ قرآن مجید میں تہذیب کی بے حد رعایت ہے حتیٰ کہ جہاں ضرورت مجوزہ بھی تھی وہاں بھی قرآن میں تہذیب کی رعایت کی گئی ہے چنانچہ عورت سے ہم بستری

کرنے کے لئے خاص احکام جہاں بیان کئے گئے ہیں مثلاً غسل وتیمم وغیرہ۔ وہاں اگر تصریح بھی کردی جاتی تو بوجہ ضرورت کے بلاشبہ جائز تھا۔ مگر حق تعالیٰ نے وہاں بھی کنایہ سے کام لیا اور کنایہ بھی ایسا جو صراحت کے قریب نہ ہو۔ چنانچہ گو اس کے لئے لفظ مجامعت بھی کنایہ ہے اور اس کا استعمال تہذیب کے خلاف نہیں مگر پھر بھی یہ صراحت کے قریب تھا۔ اس لئے قرآن میں اس کی بجائے لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ وارد ہے اور ایہام غیر مقصود کا ارتفاع قواعد شرعیہ سے مجتہدین کی طرف موکول فرمادیا گیا کہ ان کو بھی اجتہاد کا اجر ہو (علیٰ ہذا عضو رجال کے لئے لفظ ذکر صریح نہیں بلکہ کنایہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا مگر حق تعالیٰ نے اس کو جلودھم سے تعبیر فرمایا ہے)

جب ضرورت کے مقام پر بھی قرآن میں اس درجہ لفظی تہذیب کی رعایت ہے تو بلا ضرورت تو لفظی تہذیب کو اس میں کیوں ہی چھوڑا جاتا اور یہی تو وجہ ہے کہ بلغاء عرب میں سے آج تک کسی نے قرآن پر غیر مہذب الفاظ لانے کا اعتراض نہیں کیا۔ پھر جہلا عجم کا کیا منہ ہے۔

غرض جب تہذیب ایسا امر مطلوب ہے کہ قرآن مجید میں بھی اس کی رعایت کی گئی ہے تو میں بلا ضرورت تہذیب کو کیوں ترک کروں اس لئے میں سفر آخرت کا لفظ اختیار کرتا ہوں کہ یہ بہ نسبت لفظ وفات کے عاشقانہ تہذیب کو زیادہ لئے ہوئے ہے۔ اوپر بیان میں اسی پر گفتگو ہوئی تھی کہ وفات کا لفظ روح فرسا ہے اس لئے میں اس کو چھوڑ کر سفر آخرت کا لفظ اختیار کروں گا گو حاصل دونوں کا ایک ہی ہے مگر اس لفظ میں تہذیب کی رعایت زیادہ ہے ایک تقریر تو مولد میں ذکر وفات شریف کی یہ تھی جس کا حاصل یہ ہے کہ وفات شریف بھی مظہر کمالات ہے اور ظہور کمالات ہی مقصود بالولادت ہے۔

ولادت ملکوتیہ

دوسری تقریر یہ ہے کہ اگر نظر تحقیق سے دیکھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر آخرت بھی آپ کی ایک قسم کی ولادت ہی ہے۔ پھر اس بناء پر تو ذکر وفات کو کچھ بھی تباین ذکر ولادت سے نہ ہوا بلکہ وہ بھی عین ذکر ولادت ہی ہے اور اس لئے اب میں سفر آخرت کا لفظ بھی اختیار نہ کروں گا بلکہ اس کو بھی ولادت سے تعبیر کروں گا۔

وہ تحقیق یہ ہے کہ ولادت کی ایک حقیقت صوریہ ہے اور ایک حقیقت معنویہ حقیقت صوریہ تو یہ ہے کہ مرد وعورت ہم بستر ہوں اور حمل قرار پائے۔ پھر ایک مدت معتد کے بعد بچہ ماں کے پیٹ سے نکلے۔ اور لغوی حقیقت بھی ولادت کی یہی ہے اور حقیقت معنویہ جو کہ ولادت صوریہ کی روح ہے یہ ہے کہ وہ ابتداء ہے حیات کی اور چونکہ حیات برزخیہ بھی ایک حیات ہے تو اس کی ابتداء بھی ولادت میں معنیً داخل ہوگی۔ اور اس کو وفات کہنا ولادت صوریہ کے اعتبار سے ہے۔ یعنی جس حیات کی ابتداء ولادت صوریہ سے ہوئی تھی اس وقت اس کا انقطاع ہو جاتا ہے لیکن دوسری حیات کے اعتبار سے یہ بھی ولادت ہوگی جیسا اوپر ذکر ہوا۔ تو وفات میں دو حیثیتیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ منتہی ہے ایک حیات کا اور وہ حیات ناسوتیہ ہے اس حیثیت سے وہ بے شک واقعہ غم ہے اور یہی بناء ہے بعض عشاق کے اس مشورہ کی کہ ولادت کے ذکر میں وفات کا ذکر نہ کرے اور طبعاً

اس کا بھی اثر بھی ہے کہ وہ موجب غم ہو۔ چنانچہ یہ اثر عقلاء میں بھی ہوتا ہے حتی کہ حضرات صحابہ جیسے مستقل اور حکیم اور عارف جماعت پر بھی ہوا۔ چنانچہ احادیث میں ایسے ایسے غم کے قصے مذکور ہیں جن کی نظیر نہیں مگر ساتھ ہی خلاف صبر ان کا ایک قول یا فعل بھی منقول نہیں۔ پس ایک حیثیت تو وفات کی یہ ہے۔

دوسری حیثیت یہ ہے کہ مبداء ہے ایک حیات کا اور وہ حیات ملکوتیہ ہے اور اس حیثیت سے وہ بھی معنی ولادت میں داخل ہے اور اس کا ذکر عین ذکر ولادت ہے اور اس مشورہ عشقیہ کے بھی خلاف نہیں۔ تو اب اگر کوئی شخص حضور کے سفر آخرت کے حالات بیان کرے تو وہ بھی حقیقت میں مولد پڑھ رہا ہے کیونکہ وہ بھی ایک قسم کی ولادت کا بیان کر رہا ہے۔

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ یہ ولادت ملکوتیہ ولادت ناسوتیہ سے اہم و اعظم ہے حقیقت کے اعتبار سے بھی اور آثار کے اعتبار سے بھی۔ حقیقت کے اعتبار سے تو اس لئے کہ جس حیات کی یہ ابتداء ہے یعنی حیات ملکوتیہ وہ بہ نسبت اس حیات کے جس کی وہ ولادت ابتداء ہے یعنی حیات ناسوتیہ اقوی و اجلی و اصفی و اکمل ہے چنانچہ وہ اقوی تو اس طرح ہے کہ جو تصرفات و افعال انسان سے اس حیات میں صادر ہوتے ہیں وہ حیات ناسوتیہ میں صادر نہیں ہوتے چنانچہ حدیث میں ہے۔

ارواح الشهداء فی حواصل طیر خضر تسرح فی الجنة حیث شاء ت ثم تاوی الی قنادیل تحت العرش (ارواح الشهداء فی طیر خضر' المعجم الکبیر للطبرانی ۲۶۲:۱۹ و مسند الإمام احمد ۳۸۶:۶)

یعنی شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے حواصل میں جنت میں جہاں چاہتی ہیں کھاتی پھرتی ہیں۔ پھر عرش کے نیچے قندیلوں میں آ کر قرار پکڑتی ہیں۔ بھلا یہ قوت طیران یہاں کہاں!

ایک حدیث میں ہے کہ مومنین کی روحیں سبز پرندوں کے حواصل میں جہاں چاہتی ہیں کھاتی پھرتی ہیں (اخرجہ الطبرانی) اور اسی سے اصفی ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ کیونکہ اتنی راحت اور بے فکری یہاں کہاں۔

با مشقت زندگی

غرض دنیا میں نہ اتنی قوت انسان میں ہوتی ہے نہ اتنی راحت و بے فکری بلکہ یہاں تو مشقت و محنت اور تکلیف کا ہی حصہ غالب ہے چنانچہ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ کبد کے معنی تعب و مشقت کے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو بڑی تعب میں پیدا کیا ہے واقعی اگر دیکھا جائے تو حیوانات اپنے اسباب معیشت میں انسان سے زیادہ آزاد ہیں۔ جانوروں کا بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی کھانا پینا چلنا پھرنا شروع کر دیتا ہے اور انسان کا بچہ عاجز و محتاج ہوتا ہے۔ پھر جانوروں کو نہ لباس کی ضرورت ہے نہ غذا کے لئے سامان کرنے کی ضرورت اور انسان ایک دن کی غذا بھی بدوں ہزاروں مخلوق کی امداد کے حاصل نہیں کر سکتا اور دوسرے افکار اس کے علاوہ رہے۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ اور حق تعالیٰ سے زیادہ مخلوق کا حال کون

جان سکتا ہے چنانچہ ایک مقام پر خود ہی فرماتے ہیں اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا جس نے پیدا کیا وہ اپنی مخلوق کو نہ جانے گا) یقیناً ان سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔

لفظ کبد پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا وہ یہ کہ ہم نے اہل عرب کو ایک دفعہ کبڈی کھیلتے ہوئے دیکھا تو جیسے یہاں کبڈی کبڈی کہتے ہیں وہ کبد کبد کہہ رہے تھے میں نے سوچا کہ یہ کبد کبد کیسا؟ پھر خیال ہوا کہ شاید اس کے معنی مشقت کے ہیں جیسے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ میں یہی معنی ہیں چونکہ اس کھیل میں مشقت ہوتی ہے شاید اسی لئے کبد کبد کہتے ہیں پھر یہ خیال ہوا کہ کہیں اہل ہند نے اسی سے تو کبڈی نہیں بنالی۔ جیسے ہمارے ایک دوست قوم کے تگہ ہیں میں نے ان سے مزاح میں کہا کہ میاں کہیں فرعون تمہیں میں سے تو نہ تھا کیونکہ وہ بھی طغیٰ تھا۔ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی سرکشی اختیار کی) یہ قوم ہوتی ہے دماغ دار میرا مطلب یہ نہ تھا کہ طغیٰ تگہ کا معرب ہے بلکہ مطلب یہ تھا کہ شاید طغیٰ کا مہند ہو اس لئے تحریف کا شبہ نہ کیا جاوے تو ایسے ہی خیال ہوا کہ کہیں اہل ہند نے کبد ہی کو کبڈی نہ بنالیا ہو۔

خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا مقصود یہ تھا کہ اس زندگی میں بندہ کو بہت مشقت ہے کوئی انسان خواہ کیسا ہی عیش و آرام میں ہو مشقت و فکر سے خالی نہیں۔ پھر اگر کسی درجہ میں کسی کو یہاں کم مشقت ہے تو وہ صرف اہل اللہ ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ اہل اللہ پر بلائیں نہیں آتیں بلائیں تو ان پر اوروں سے زیادہ آتی ہیں چنانچہ حدیث میں ہے۔

اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل (کنز العمال: ۳۲۵۳، ۳۲۵۵، ۶۷۸۳، إتحاف السادة المتقين ۵:۱۱۶، ۸:۱۴۱، ۵۶۰، ۹:۵۲۳)

سب سے زیادہ امتحان میں انبیاء علیہم السلام کو مبتلا کیا جاتا ہے پھر درجہ بدرجہ دوسرے نیک لوگوں پر۔

مگر ان میں اور دوسروں میں فرق یہ ہے کہ ان پر جزع و فزع غالب نہیں ہوتا وہ مصائب میں از جارفتہ و پریشان نہیں ہوتے وجہ کیا کہ ان کے پاس ایسی چیز ہے جو عصائے موسیٰ کے مشابہ ہے کہ سب سانپوں کو ایک دم سے نگل گیا تھا جب ساحران موسیٰ نے سحر کیا تو سب کو ہزاروں سانپ چلتے ہوئے نظر آتے تھے جس سے لوگ ڈر گئے حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی طبعاً ڈر لگا مگر ان میں اور دوسروں میں فرق یہ تھا کہ ان کے پاس عصا تھا۔

فَاَلْقٰی مُوْسٰی عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ

انہوں نے فوراً اپنا عصا ڈال دیا جو اژدھا بن کر سب کو نگل گیا۔ اسی طرح اہل اللہ کے پاس بھی سانپ آتے ہیں مگر ان کے پاس عصائے موسیٰ کے مشابہ ایک چیز ہے جو سب سانپوں کو نگل جاتی ہے اس لئے کسی کا اثر غالب نہیں ہونے پاتا۔ وہ عصائے موسیٰ کیا ہے فکر آخرت یا مشغولی بحق یہ وہ فکر اور شغل ہے جس نے دنیا کے سب فکروں کو ان کی نظر سے غائب کر دیا۔ لوگ ان کو ظاہر میں اپنے سے

اچھا دیکھ کر یوں سمجھتے ہیں کہ یہ بالکل بے فکر ہیں۔ انہیں کچھ غم نہیں ہاں دنیا کا تو واقعی غم نہیں ہوتا مگر آخرت کا فکر اور رضائے محبوب کا فکر ان کو ایسا ہوتا ہے جو کمر توڑ دیتا ہے۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم ان لوگوں کی حالت کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے۔)

جس کے پیر میں کانٹا بھی نہ لگا ہو وہ تلوار کے زخم کی حقیقت کیا جانے میں سچ کہتا ہوں کہ جس کو صرف فکر دنیا ہے وہ اہل اللہ کے اس فکر کی حقیقت کیا جانے ان پر جو کچھ گزرتی ہے اس کو وہی جانتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

کشتگان خنجر تسلیم را　　ہر زماں از غیب جان دیگرست

(تسلیم و رضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے۔)

وہ نہ معلوم کتنی دفعہ مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہے۔

خوشا وقت شوریدگان غمش　　اگر ریش بینند دگر مرہمش

گدایانے از پادشاہی نفور　　بامیدش اندر گدائی صبور

دمادم شراب الم در کشند　　وگر تلخ بینند دم در کشند

(اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اس کے زخموں پر۔ وہ لوگ تو ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہی سے نفرت ہے اور اس کی امید میں گدائی پر صبر کئے ہوئے ہیں۔ دمادم رنج کی شراب پیتے ہیں اگر تلخ دیکھتے ہیں خاموش ہو جاتے ہیں۔)

غرض مشقت و مصیبت سے خالی تو اہل اللہ بھی نہیں مگر یہ ضرور ہے کہ ان کو دوسروں سے مشقت کم ہے۔ شاید اس پر شبہ ہو کہ جب ان کو ایسا سخت فکر ہے جس کے سامنے اہل دنیا کے فکروں کی کوئی ہستی نہیں تو ان کو مشقت کم کیوں کر ہو سکتی ہے؟

جواب یہ ہے کہ واقعی یہ تو فکر ایسا ہی ہے جس کے سامنے سب فکر ہیچ ہیں مگر مشقت کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ جو فکر ان پر غالب ہے اس میں مشقت کے ساتھ ایک عظیم لذت بھی ہے اور افکار دنیا محض مصیبت ہی مصیبت ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اہل دنیا افکار دنیویہ سے خلاصی کے طالب ہوتے ہیں اور اہل اللہ اپنے اس فکر سے خلاصی کے بھی طالب نہیں ہوتے وہ تو اس کو آب حیات سمجھ کر یوں کہتے ہیں۔

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات　　ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی

اس آب حیات سے سیری حاصل ہونے میں میری مصلحت نہیں اللہ تعالیٰ اس آب حیات سے بھی میری پیاس بڑھاتا ہے۔ اور یوں کہتے ہیں۔

اسیرت نخواہد رہائی زبند　　شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی کا خواہشمند نہیں تیرا شکار جال سے خلاصی کا خواہشمند نہیں۔)

ان کے لئے یہ فکر گویا قید زلف محبوب ہے جس سے عاشق کبھی خلاصی نہیں چاہتا بلکہ یوں کہتا ہے۔

گردو صد زنجیر آری بگسلم　　غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دو سو زنجیریں ہوں تو توڑ دوں سوائے اپنے محبوب کی زلف کی بندش کے یعنی سوائے اپنے محبوب کے کسی اور کا گرفتار ہونا برداشت نہیں کر سکتا۔)

اس وجہ سے ان کو دوسروں سے مشقت کم ہے غرض اس حیات میں تو غم اور مشقت ہی ہے۔ کسی کو کسی رنگ سے کسی کو کسی رنگ سے اور اس حیات میں غم کا نام ہی نہیں۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ اور اکمل۔

ارواح کی حالت

اس طرح کہ ولادت ناسوتیہ میں آثار حیات یعنی کمالات متصلاً فوراً ظاہر نہیں ہوتے۔ چنانچہ بچہ نہ کچھ افعال کر سکتا ہے نہ چلتا پھرتا ہے۔ نہ خود کھاتا پیتا ہے نہ بولتا ہے بلکہ جمادات کے ساتھ ملحق ہوتا ہے۔ حیوانات سے بھی زیادہ بیکار ہوتا ہے۔ کیونکہ جانوروں کے بچے پیدا ہوتے ہیں اچھلنے کودنے پھرنے لگتے ہیں اور آدمی کا بچہ سوائے ٹیں ٹیں کے کچھ نہیں کر سکتا اور مرنے کے بعد جو ولادت ملکوتیہ ہوتی ہے اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں کہ روح پھر سے ادھر اڑ گئی جیسا اوپر مذکور ہوا اور وہاں یعنی اوپر بچہ کا بیکار ہونا اور ارواح کا طیران حیات ناسوتیہ کے غیر اقوی و غیر انفع ہونے کی حیثیت سے بیان کیا گیا تھا۔ یہاں دوسری حیثیت سے مذکور ہے۔

اس پھر کے اوپر ایک ظرافت کی حکایت یاد آ گئی۔ ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ نوکروں سے روزانہ دن بھر کے افعال کا حساب لیا کرتا تھا کہ بتلاؤ آج تم نے کیا کیا۔ وہ حساب بتلایا کرتے کہ صبح کو اٹھے منہ دھویا پھر یہ کام کیا۔ وہ کہتا پھر؟ اس پر وہ اور کوئی کام بتلا دیتا۔ وہ کہتا پھر؟ غرض شام اور رات تک کے افعال کی فہرست بتلا دی جاتی مگر وہ یہی کہتا رہتا کہ پھر؟ پھر اگر نوکر عذر بھی کرتا کہ حضور بس اور کچھ نہیں تب بھی وہ اصرار کرتا رہتا کہ نہیں سوچو بتاؤ؟ نوکر اس سے پریشان ہو کر بھاگ جاتا۔ کوئی اس کے پاس نہ جمتا۔

ایک ظریف نے کہا کہ میں اسے ٹھیک بناؤں گا۔ وہ اس کے پاس گیا کہ مجھے نوکری کی ضرورت ہے اس نے کہا اچھا مگر کچھ شرائط ہیں۔ کہا بتلایئے اس نے اول تو کام بتلا دیئے کہ دن بھر میں تم کو اتنے کام کرنے ہوں گے۔ پھر کہا اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ دن بھر کے کاموں کا حساب دینا پڑے گا۔ اس نے کہا یہ بھی سہی۔ سب منظور ہے۔ اگلا دن ہوا اور آقا نے پوچھا کہ آج تم نے صبح سے شام تک کیا کیا کہا حضور میں صبح کو جنگل میں قضاء حاجت کے لئے گیا۔ کہا پھر؟ وہ بولا کہ میں نے وہیں ایک جال لگا دیا۔ کہنے لگا پھر؟ بولا کہ اس جال میں دنیا بھر کی چڑیاں پھنس گئیں کہا پھر؟ بولا کہ میں نے ایک طرف سے ذرا سا منہ کھول دیا۔ کہنے لگا پھر؟ بولا کہ اس میں سے ایک چڑیا نکلی پھر سے اڑ گئی۔ کہا پھر؟ بولا

دوسری پھر سے اڑ گئی۔ کہا پھر؟ بولا تیسری پھر سے بولا پھر؟ غرض وہ پھر کہتا تھا اور یہ پھر کہتا تھا۔ بڑی دیر ہو گئی۔ آقا بولا ارے اور کام بتلا۔ کہنے لگا حضور! ابھی تو دنیا بھر کی چڑیوں کا نکلنا ختم کر دوں پھر آگے چلوں گا۔ بڑا زچ ہو گیا۔ تب نوکر نے کہا حضور اب تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس پھر پھر سے دوسرے کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ کہا اچھا بھائی آئندہ سے توبہ کرتے ہیں کسی سے حساب نہ لیں گے۔

خیر یہ تو پھر پھر کا ایک قصہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد ارواح کی یہ حالت دلیل ہے حیات ملکوتیہ کے اکمل ہونے کی اور یہ حیات ملکوتیہ الٰہی اس طرح ہے کہ اس کے لئے فنا نہیں ہے اور حیات ناسوتیہ کے لئے فنا لازم۔ یہاں کی صبح کے لئے تو شام بھی ہے وہاں ایسی صبح ہو گی جس کی شام ہی نہیں۔ اس پر شاید یہ اشکال ہو کہ ایک عاشق تو یوں فرماتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما

یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی زندگی حاصل ہو گئی تو اس کو مر جانے کے بعد بھی زندہ سمجھنا چاہئے۔

ہرگز نمیرد سے معلوم ہوتا ہے کہ عشاق کی یہ زندگی بھی فنا نہیں ہوتی۔ سو سمجھ لیجئے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندہ دلان عشق کو موت نہیں آتی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصلی حیات تو آخرت کی حیات ہے مگر یہاں کی زندگی جب آخرت کی معین ہو گی اور اس کے انقطاع کے متصل ہی وہ حیات شروع ہو گئی۔ پس گویا یہ موت ہی نہیں جس سے گھبراہٹ اور پریشانی ہو۔ بلکہ موت شیریں اور خوشگوار ہو جاتی ہے کیونکہ عاشق جانتا ہے کہ اس موت سے وہ موانع وصال ممکن مرتفع ہو جائیں گے جو حیات ناسوتیہ میں قرب خاص سے مانع تھے۔ پس وہ موت کو حیات اور یہاں کے فنا کو بقا سمجھتا ہے۔ پھر مرنے کے بعد حیات حاصل ہو گی وہ تو باقی ہے ہی کیونکہ اس کے بعد پھر موت نہیں ہو گی۔

راز فنا

اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ بعض نصوص سے تو اس حیات کا بھی منقطع ہونا معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ

(جتنے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے سوائے اس کے پروردگار کی ذات کے جو کہ عظمت اور احسان والا ہے۔)

اور ایک جگہ ارشاد ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

(سب چیزیں ہلاک ہونے والی ہیں سوائے اس کی ذات کے)

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ صور کے وقت ارواح بھی فنا ہو جائیں گی تو پھر حیات ملکوتیہ بھی باقی نہ ہوئی۔

اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ ایک آیت میں استثناء بھی وارد ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ

کہ جب نفخ صور ہو گا تو آسمان اور زمین والے سب بے ہوش ہو جائیں گے۔ یہاں صعقہ سے

صعقہ موت مراد ہے اس کے بعد استثناء ہے۔ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کہ جس کو حق تعالیٰ چاہیں گے وہ اس صعقہ سے مستثنیٰ بھی ہوگا۔ پس ارواح إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ میں داخل ہیں۔ ان کو موت نہ آئیگی۔

مگر ہم اس جواب پر مجبور و مضطر نہیں ہیں بلکہ ہم تسلیم کے بعد دوسرا جواب دیتے ہیں کہ اگر نفخ صور کے وقت ارواح بھی فنا ہو جائیں تب بھی اس سے انقطاع حیات لازم نہیں آتا کیونکہ وہ فنا تھوڑی دیر کیلئے ہوگا۔ ممتد نہ ہوگا اور امور عادیہ میں زمان لطیف کا انقطاع مانع استمرار نہیں۔ موٹی بات ہے کہ اگر ایک شخص پانچ گھنٹہ تک تقریر کرے اور درمیان درمیان میں سیکنڈ سیکنڈ سکوت کرے تو یہ سکوت مانع استمرار تقریر نہیں۔ بلکہ محاورہ میں یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے پانچ گھنٹہ تک مسلسل تقریر کی۔ اس پر اگر کوئی کہنے بھی لگے کہ واہ صاحب اس نے درمیان دس دس پانچ پانچ سیکنڈ سکوت بھی تو کیا تھا۔ پانچ گھنٹہ مسلسل تقریر کہاں کی تو ہر شخص یہ کہے گا کہ تم احمق ہو کہیں دس دس سیکنڈ کے سکوت کا بھی اعتبار ہوا ہے۔

اسی طرح جب آپ چلتے ہیں تو حرکت کے ساتھ درمیان میں ایک زمان لطیف کا سکون ہوتا ہے کیونکہ ایک پیر کی حرکت کے بعد بدوں اس کے سکون کے دوسرے پیر کو حرکت نہیں ہوسکتی مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتا بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہم مسلسل بارہ کوس تک چلتے رہے۔

غرض احکام عرفیہ عادیہ میں استمرار و دوام کے لئے زمان لطیف کا تخیل مخل نہیں ہوتا تو نفخ صور کے وقت ارواح کا فنا تھوڑی دیر کے لئے یا ایک لمحہ کے لئے ہوگا۔ محض تحلہ قسم کے طور پر جیسے قرآن میں ہے وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا کہ ہر شخص کو جہنم کا ورود ضرور ہوگا۔ ورود بمعنی مرور بھی آتا ہے۔ اس پر تو کچھ سوال بھی نہیں اور بمعنی دخول بھی ہے۔ اس پر سوال ہوتا ہے کہ بعض تو دخول سے محفوظ رہیں گے۔ تو اس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ بعضوں کا ورود اگر بمعنی دخول بھی ہو محض تحلہ قسم کیلئے ہوگا جس کی صورت یہ ہوگی کہ جہنم کی پشت پر پل صراط بچھایا جائے گا جس پر ہو کر سب مسلمان گزریں گے۔ بعض تو کٹ کر جہنم میں ہی گریں گے۔ یہ تو حقیقتاً وارد ہوں گے اور بعض مثل برق خاطف کے گزر جائیں گے۔ ان کو خبر بھی نہ ہوگی کہ جہنم کدھر کو تھی ان کا ورود تحلہ قسم کے لئے ہوگا کہ بس جہنم کی پشت پر سے گزر گئے اور راستہ میں جہنم پڑ گئی گو ان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جیسے کوئی جلدی سے آگ کے اندر ہاتھ کو گزار دے۔ اسی طرح تحلہ قسم کے لئے ارواح کا فنا بھی ایک آن کے لئے ہو جائے تو یہ مانع بقاء نہ ہوگا۔

یہ جواب محققین کا ہے اور بالخصوص فلاسفہ کے مذہب پر تو یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک زمانہ آنات سے مرکب نہیں بلکہ آن طرف زمان ہے۔ تو اب یہ کہنا سہل ہے کہ ارواح کا بقا تو زمانی ہے اور فناء آنی ہے اور بقاء زمانی کا انقطاع فناء زمانی ہی سے ہوسکتا ہے نہ کہ فنا آنی سے۔ اس تقدیر پر حقیقت میں بھی انقطاع بقاء نہ ہوگا۔

ترکیب اجسام

البتہ متکلمین کے مذہب پر اشکال وارد ہوگا کیونکہ وہ زمانہ کو آنات سے مرکب مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک فنا آنی سے بھی بقاء کا انقطاع ہو سکتا ہے۔ سو اس صورت میں جواب یہ ہوگا کہ گو حقیقت میں انقطاع ہوگیا مگر عرفاً انقطاع نہیں ہوا۔ کیونکہ عرفاً امور عادیہ میں فنا آنی مانع استمرار نہیں ہوتی لیکن اس مسئلہ میں کہ زمانہ آنات سے مرکب ہے یا نہیں ہم کو متکلمین کا مذہب ماننا ضروری نہیں۔ اگر ہم حکماء کے مذہب کو لے لیں تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ شریعت نے اس مسئلہ سے سکوت کیا ہے۔ محض عقلی مسئلہ ہے جس کا مبنی ایک دوسرا مسئلہ ہے۔

وہ یہ کہ حکماء اجسام کی ترکیب ہیولی وصورت سے مانتے ہیں اور جسم کو متصل واحد مانتے ہیں۔ اور متکلمین اس کو اجزاء لاتتجزی سے مرکب مانتے ہیں جیسا اس وقت اہل سائنس بھی ذرات سے مرکب مانتے ہیں۔ پس جب ایک زمانہ میں کسی مسافت پر حرکت ہوتی ہے تو وہ حرکت اور زمانہ مسافت ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں۔ حکماء کے نزدیک جب مسافت متصل واحد ہے تو زمانہ اور حرکت سب متصل واحد ہیں اور متکلمین کے پاس خود اجزاء لاتتجزی کے وجود کی کوئی دلیل نہیں۔ صرف انہوں نے ہیولی وصورت کے مسئلہ میں حکماء کی مخالفت کر کے یہ ایک احتمال بطور مانع کے نکال کر اس کو مذہب قرار دے دیا۔

مخالفت کی وجہ یہ ہوئی کہ اگر ہیولی وصورت سے مرکب مانیں گے تو اس کے قدم کا قائل ہونا پڑے گا۔ اور قدم شرعاً و نصاً باطل ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ قدم ہیولی وصورت کے لوازم ذات سے نہیں بلکہ اس پر وہ مستقل دلائل قائم کرتے ہیں جو محض باطل ہیں۔ پس اگر کوئی ہیولی وصورت کو مان کر ان کے قدم کا انکار کر دے تو اس میں کوئی محذور نہیں (مگر متکلمین نے شاید خدہ بالموت حتي يرضي بالحمى پر عمل کیا کہ سرے سے ہیولی وصورت ہی کا انکار کر دیا جس کی شرعاً کوئی ضرورت نہیں تھی ١٢)

غرض شرعاً یہ بھی جائز ہے کہ ہم ہیولی وصورت کے وجود کو مان لیں اور ان کے قدم کو باطل کر دیں اور میرے نزدیک یہی اچھا ہے کیونکہ اجزاء لاتتجزی کے دلائل جو کچھ بیان کیے جاتے ہیں وہ بہت کمزور ہیں اور ثبوت ہیولی وصورت کے دلائل قوی ہیں البتہ حکماء نے جو ان کے قدم پر دلائل قائم کیے ہیں وہ محض لچر ہیں۔ تو ہمارے نزدیک اقوی یہ ہے کہ اجسام کا ترکب تو ہیولی وصورت سے ہے مگر یہ دونوں حادث بالذات اور حادث بالزماں ہیں۔ نہ ان میں سے کسی کا قدم بالذات ثابت ہے (یہ تو حکماء بھی مانتے ہیں) نہ قدم بالزماں چنانچہ اہل علم جانتے ہیں کہ جتنے دلائل ان کے قدم بالزمان پر قائم کیے گئے ہیں سب لغو ہیں۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ قول تو ملفق ہو گیا کہ نہ متکلمین کا قول ہوا نہ حکماء کا اور قول ملفق باطل ہے۔

جواب یہ ہے کہ اول تو قول ملفق شرعیات میں باطل ہے نہ عقلیات میں کیونکہ قول ملفق میں اجماع کا

ترک لازم ہوتا ہے تو شرعیات میں تو اجماع کا ترک جائز نہیں اور عقلیات میں جائز بلکہ بعض اوقات واجب ہے اور اوپر عرض کر چکا ہوں کہ شریعت ہیولی وصورت واجزاء لاتجزی دونوں سے ساکت ہے۔

دوسرے اگر مقصود پر نظر کی جاوے تو یہ قول متکلمین کے بھی خلاف نہیں کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ متکلمین کا مقصود اصلی قدم عالم کا ابطال ہے جو ہیولی وصورت کو قدیم ماننے سے لازم آتا ہے اور اگر کوئی شخص ان کو حادث بالذات وبالزمان مان کر اجسام کو ان سے مرکب کہے تو متکلمین اس کے درپے نہ ہوں گے اور اس کی تغلیط نہ کریں گے پس جب جسم کو متصل واحد مان کر زمانہ کو بھی متصل واحد مان لیا جائے تو فناء آنی ہے قائل ہونے سے اشکال بہت سہولت سے رفع ہو جائے گا۔ یعنی ارواح کا بقاء زمانی ہے اور فناء آنی کے تو استمرار وبقاء حقیقتاً بھی منقطع نہ ہوئے اور حیات ملکوتیہ کے اکمل ہونے پر جو شبہ تھا وہ رفع ہو گیا اور اس کے اکمل ہونے کا دعویٰ بحالہ باقی رہا۔

عقل اور استعداد

اور اس کے قبل جو حیات ملکوتیہ کا اکمل ہونا مذکور ہو چکا ہے اس کا تتمہ کچھ اور بھی ہے وہ یہ کہ حیات ناسوتیہ کے ابتداء کے وقت کامل انسان بھی کمالات سے خالی ہوتا ہے اور حیات ملکوتیہ کی ابتداء میں مکمل حالت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ موت کے بعد عقل وغیرہ سب کامل ہوتی ہے۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حضور نے پوچھا کہ اے عمر! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب کہ قبر میں تمہارے پاس دو فرشتے گرجتے کڑکتے آئیں گے اور تم کو ہلا ڈالیں گے اور حاکمانہ گفتگو کریں گے۔ حضرت عمر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس وقت ہماری عقل بھی درست ہوگی یا نہیں۔ حضور نے فرمایا نعم **کھیئتکم الیوم**۔ یعنی اس وقت ایسی عقل ہوگی جو آج ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ بس کام چلا لوں گا (اخرجہ احمد والطبرانی)

اور ولادت ناسوتیہ کے وقت متصلاً بدیہیات اولیہ تک کا بھی نہیں ادراک ہوتا۔ چنانچہ حکماء کا قول ہے کہ اس وقت عقل بالکل نہیں ہوتی۔ محض استعداد ہوتی ہے جس کا نام عقل ہیولانی ہے۔

یہاں میں ایک اشکال بھی جواب دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ منجملہ کمالات کے اسلام بھی ہے تو تقریر مذکور پر لازم آتا ہے کہ بچہ اسلام سے بھی خالی ہو۔ حالانکہ یہ اس حدیث کے خلاف ہے **کل مولود یولد علی الفطرہ**۔ (۱) مسند الامام احمد ۲:۷۲ ،مجمع الزوائد ۳:۴۷، الدر المنثور ۳:۸۲ (۲) الصحیح للبخاری ۲: ۱۲۵، سنن أبی داود: ۴۷۱۴، مجمع الزوائد للهیثمی ۷:۲۱۸، مسند الامام أحمد ۲:۲۳۳، ۲۷۵، ۲۸۲، ۳۹۳، ۴۱۰، ۴۸۱، ۳:۳۵۳، لتفسیر ابن کثیر ۲:۳۶۸)

اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں اشکال کا منشاء یہ ہے کہ فطرت کو بمعنی اسلام لیا گیا ہے اس لئے یہ ترجمہ کیا گیا ہے کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے حالانکہ یہ خلاف واقع ہے کیونکہ اسلام نام ہے خاص عقیدوں کے قائل ہونے کا اور بچہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو نہیں سکتا ورنہ اس کو عاقل ماننا پڑے گا اور جب عاقل نہیں تو مسلم کیسے ہو سکتا ہے۔ پس یہاں حدیث میں فطرت بمعنی اسلام نہیں بلکہ بمعنی استعداد ہے اور الفطرہ میں لام مضاف الیہ کا عوض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ **کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام**۔ یعنی ہر بچہ میں اسلام کی استعداد ہوتی ہے اور استعداد بھی قریب۔

اب یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ استعداد تو کافر میں بھی ہوتی ہے پھر مولود کی کیا تخصیص ہے کیونکہ کافر میں فساد کے سبب استعداد قریب نہیں رہی۔ یعنی اگر عوارض و موانع نہ ہوں تو ہر بچہ ہوش سنبھالنے پر خود بخود اسلام کو قبول کرے گا البتہ یہ شرط ہے کہ عوارض و موانع نہ ہوں خواہ دواعی بھی نہ ہوں یعنی اس کو چاہے اسلام کی بھی تعلیم نہ دی جائے مگر کفر کی بھی تعلیم نہ دی جائے تب بھی جس وقت وہ ہوش سنبھالے گا اس وقت وہ اسلام کے عقائد پر ہوگا یعنی خدا کا قائل ہوگا کہ عالم کا کوئی صانع ضرور ہے اور وہ ایک ہے۔ بس اس سے زیادہ کا قائل ہونا صحت معنی حدیث کے لئے ضروری نہیں کیونکہ عقائد اسلام دو قسم کے ہیں ایک معقول ایک منقول سو منقول کا علم تو بدوں نقل کے نہ ہوگا جیسے عقیدہ محمد رسول اللہ اور قیامت کا آنا' حساب ہونا وغیرہ۔ یہ امور بدوں سماع کے محض عقل سے معلوم نہیں ہوتے۔ باقی خدا کا وجود یہ عقلی ہے اسی طرح توحید بھی عقلی ہے یہ خود بخود بندہ کی عقل میں ہوش سنبھالتے ہی آ جاتے ہیں اور یہ ایسا امر عقلی ہے کہ مشرک بھی اضطراراً اس کا قائل ہوتا ہے چنانچہ تمام مشرکین اپنے موحد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں گو ان کا دعویٰ محض زبانی ہو اور عمل اس کے خلاف ہو مگر شرک کا مذموم ہونا ان کو بھی مسلم ہے بلکہ یہ ایسا امر عقلی ہے کہ دہری بھی دل سے اس کا قائل ہے گو زبان سے انکار کرے۔

چنانچہ ایک دہری کا قول میں نے پڑھا کہ میں ایک عرصہ تک خدا کا منکر رہا اور انکار صانع پر برسوں لیکچر دیتا رہا مگر حالت یہ تھی کہ میں زبان سے تو صانع کا انکار کرتا تھا اور میرا ضمیر میری تکذیب کرتا تھا۔ دل اندر سے یہ کہتا تھا کہ صانع ضرور ہے۔ آخر کار مجھے اپنے ضمیر کا اتباع کرنا پڑا اور میں خدا کا قائل ہو گیا۔

فطرت اور توحید

اسی طرح توحید بھی امر فطری ہے اور اس کا فطری ہونا یہاں تک بدیہی ہے کہ گنوار تک بھی اس کو سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک بہت بڑے فلسفی عالم کا قصہ ہے کہ انہوں نے ایک رسالہ لکھا جس میں توحید پر بہت سے دلائل قائم کئے اور اس میں یہاں تک جوش بڑھا کہ جو شخص ملتا اس سے توحید کی دلیل پوچھتے۔ ایک دفعہ کسی گاؤں میں گزر ہوا۔ وہاں ایک گنوار مویشی چرا رہا تھا۔ اس سے پوچھا کہ بتلا خدا

کے واحد ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اس نے فوراً لٹھ سیدھا کیا اور کہا' کھڑا تو رہ میں تجھے دلیل بتاؤں۔ یہ وہاں سے بھاگے۔ گنوار کا مطلب یہ تھا کہ توحید صانع بدیہیات سے ہے اور بدیہیات کے لئے دلیل مانگنا مکابرہ ہے جس کی سزا لٹھ ہے۔

ایک اعرابی نے وجود صانع کے متعلق کیا خوب کہا ہے۔

البعرة تدل علی البعیر والاثر یدل علی المسیر فالسماء ذات الابراج والارض ذات الفجاج کیف لاتدلان علی اللطیف الخبیر

(یعنی اونٹ کی مینگنیاں یہ بتلا دیتی ہیں کہ یہاں سے اونٹ گیا ہے اور نشانات قدم چلنے والے کا پتہ بتلاتے ہیں۔ ادنیٰ ادنیٰ چیز اپنے موثر کا پتہ دیتی ہے تو یہ بڑے بڑے ستاروں والا آسمان اور وسیع راستوں والی زمین کیا لطیف خبیر جل مجدہ کا پتہ نہ دے گی۔)

یہ ایک گنوار کا قول ہے۔ دیکھئے اس نے کیسی عمدگی سے اس عقیدہ کا فطری ہونا بتلایا ہے۔ ایک دلیل وجود صانع کی ہمارے چھوٹے ماموں صاحب نے ایک دہری کے سامنے بڑے مزے کی بیان کی۔ ماموں صاحب ایک سرکاری اسکول میں فارسی ریاضی کے مدرس تھے۔ ایک دفعہ انسپکٹر ممتحن آیا۔ جو دہری تھا۔ خدا تعالیٰ کے وجود کا منکر تھا۔ اس نے طلباء سے سوال کیا کہ بتلاؤ وجود صانع کی کیا دلیل ہے۔ بچے خاموش ہوگئے۔ ماموں صاحب نے کہا' صاحب! یہ مضامین ان بچوں کو بتلائے کب گئے ہیں۔ تو یہ جواب کیسے دے سکتے ہیں اور نہ یہ مضمون کورس کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اگر آپ کو ایسا ہی شوق ہے تو مجھ سے پوچھئے میں بتلاؤں گا۔

اس نے غصہ سے کہا' اچھا آپ ہی بتلایئے۔ فرمایا' خدا وہ ہے جس نے آپ کو معدوم سے موجود کیا۔ کہنے لگا ہم کو تو ہمارے ماں باپ نے بنایا ہے۔ 'فرمایا' اچھا خدا وہ ہے جس نے آپ کے ماں باپ کو پیدا کیا ہے کہنے لگا کہ ان کو ان کے ماں باپ نے بنایا تھا۔ فرمایا اچھا! ان کے ماں باپ کو پیدا کیا ہے کہنے لگا کہ ان کو ان کے ماں باپ نے بنایا تھا۔ فرمایا اچھا! ان کے ماں باپ کو جس نے بنایا وہ خدا ہے۔ کہنے لگا کہ ان کو ان کے ماں باپ نے پیدا کیا تھا۔ ماموں صاحب نے فرمایا کہ اگر یہ سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں تب تو تسلسل لازم آتا ہے جو کہ محال ہے اور اگر کہیں ختم ہوتا ہے تو بس اس ملجا کو جس نے بنایا وہی خدا ہے۔ کہنے لگا کہ یہ منطقی دلیلیں ہم نہیں جانتے۔ ہم تو سیدھی بات یہ جانتے ہیں کہ اگر خدا کوئی چیز ہے تو ہماری ایک آنکھ اندھی ہوگئی ہے اس کو درست کر دے (یہ انسپکٹر یک چشم تھا) ماموں صاحب بڑے ظریف تھے۔ فرمایا' اچھا میں خدا تعالیٰ سے عرض کرتا ہوں۔ پھر آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر لبوں کو حرکت دی جیسے خدا سے کچھ کہہ رہے ہوں۔ پھر آسمان کی طرف کان لگائے گویا جواب سن رہے ہیں۔ غرض اچھا خاصا ممتحن کا مذاق اڑایا۔ پھر فرمانے لگے کہ میں نے خدا تعالیٰ سے عرض کیا تھا

وہ فرماتے ہیں کہ اس سے کہہ دو کہ ہم نے تو اس کی دونوں آنکھیں بنائی تھیں مگر اس نے کفر کیا اور ہمارے وجود کا انکار کیا۔ اس لئے ہم نے غصہ میں آکر اس کی ایک آنکھ پھوڑ دی۔ میں ہرگز نہ بناؤں گا۔ اب اس سے کہو کہ اس آنکھ کو اپنی ماں باپ سے بنوا لے جنہوں نے اس سارے کو بنایا ہے۔ واقعی جواب اعلیٰ درجہ کا علمی جواب تھا۔ معقول بات تھی (کہ جب تیرے ماں باپ میں اتنی قدرت ہے کہ انہوں نے تجھے سارے کو بنا دیا تو اب وہ تیری آنکھ کو کیوں نہیں بنا دیتے اور اگر نہیں بنا سکتے تو اس سے ثابت ہوا کہ وہ پیدا کرنے والے نہیں کیونکہ قادر علی الکل قادر علی البعض بھی ضرور ہونا چاہیے ۱۲)

یہ جواب سن کر وہ انسپکٹر جھلا ہی تو گیا مگر کرتا کیا بس اس کے قبضہ میں اتنی بات تھی کہ اس نے ماموں صاحب کے اسکول کا معائنہ بہت خراب لکھا جس سے ان کے تنزل کا خطرہ ہو گیا۔ یہ خبر ماموں صاحب کے بڑے بھائی کو پہنچی وہ صاحب دل آدمی تھے ان کو سخت غصہ اور صدمہ ہوا اور انہوں نے بددعا کی کہ الٰہی اس کم بخت نے آپ کی شان میں گستاخی کی۔ اور میرے بھائی کا دل دکھایا۔ الٰہی ان دونوں باتوں پر صبر نہیں ہو سکتا بہت جلد اس سے انتقام لیجئے۔ چنانچہ غالباً ایک ہفتہ نہیں گزرا کہ اس کے گردہ میں یا کہیں اور دفعتاً درد اٹھا اور فوراً مر گیا اس پر مجھے مولانا رومی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ایں نہ آں شیر ست کز وے جاں بری
باز پنجہ قہر او ایماں بری

(یہ وہ شیر نہیں جس سے تو جان بچا سکے یا اس کے پنجہ ظلم سے ایمان بچا سکے۔)

چنانچہ اس دہری کا ایمان تو گیا ہی تھا، جان بھی گئی۔ غرض حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی استعداد قریب ہر بچہ میں فطرت سے ہوتی ہے اور یہ معنی نہیں کہ بچہ ابتداء سے مسلمان ہوتا ہے کیونکہ اسلام ایک وجودی شے ہے جس کیلئے خاص عقائد کا معتقد ہونا شرط ہے جن کا وجود بچہ میں نہیں ہوتا۔

موازنہ موت وحیات

اسی طرح اس ولادت ناسوتیہ کے وقت اور کوئی کمال بھی نہیں ہوتا تو یہ ولادت ایسی ناقص ہوئی کہ اس کے ساتھ متصلاً کمالات حاصل نہیں ہوتے اور ولادت ملکوتیہ کے متصل ہی آدمی جامع کمالات ہوتا ہے غرض حیات ملکوتیہ ناسوتیہ سے ادوم بھی ہے اور اتم بھی اور اقویٰ بھی اور ابقیٰ بھی اور اصفیٰ بھی ہے اور ازکیٰ بھی اور اسنیٰ بھی انفع بھی ہے اور ارفع بھی اور اوسع بھی اعلیٰ بھی ہے اور اشہیٰ بھی اور احظیٰ بھی۔ جی چاہتا ہے اور بیسیوں قافیے گھڑ ڈالوں جو شاید سوچنے سے نکل بھی آئیں مگر اس وقت مجھے مولانا کا قول یاد آ گیا۔

قافیہ اندیشم و دلدار من
گویدم مندیش جز دیدار من

(میں شعر کا قافیہ سوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے سوا کچھ نہ سوچ۔)

مولانا بعض مقامات پر ترک قافیہ کی وجہ بتلاتے ہیں کہ بعض جگہ مثنوی میں قافیہ کی رعایت اس لئے نہیں ہے کہ جب میں قافیہ سوچنے کا قصد کرتا ہوں تو محبوب فرماتے ہیں کہ ہمارے سوا کسی کو نہ

سوچو۔ پس بے تکلف قافیہ آ جاتا ہے تو کہہ دیتا ہوں ورنہ سوچتا نہیں ہوں۔ اس لئے میں بھی اس وقت قافیہ کو چھوڑتا ہوں اور ان کے ذکر میں لگتا ہوں کیونکہ ان کے حبیب کا ذکر انہی کا ذکر ہے۔ جب حیات ملکوتیہ حیات ناسوتیہ سے اعظم ہے تو ولادت ملکوتیہ یعنی حیات ملکوتیہ کی ابتداء کا سفر آخرت یا وفات ہے ولادت ناسوتیہ یعنی حیات ناسوتیہ کی ابتداء سے کہ ولادت متعارفہ ہے، نیز اہم و اعظم ہوگی اور اس سے زیادہ قابل ذکر ہوگی۔ پھر جب حضور کی ولادت ناسوتیہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپ کی ولادت ملکوتیہ کا (گو اس کا نام لغوی وفات ہی ہے) کیوں نہ ذکر کیا جاوے۔

بہر حال میں نے حضور کے سفر آخرت کا ذکر اس حیثیت سے اختیار نہیں کیا کہ وہ سفر آخرت ہے بلکہ اس حیثیت سے اختیار کیا ہے کہ وہ بھی حضور کی ایک حیات کی ابتداء کا ذکر ہے۔ پس جیسا ولادت ناسوتیہ کا ذکر مولد ہے اسی طرح ولادت ملکوتیہ کا ذکر بھی مولد ہی ہے بلکہ اس ولادت ملکوتیہ کے اقویٰ و افضل ہونے کے سبب یہ مولد کی اعلیٰ قسم ہے۔

دونوں حیات کے تفاوت کے مضمون پر مجھ کو ایک مستقل مسئلہ یاد آ گیا۔ اس مسئلہ پر بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ موت و حیات میں افضل کون ہے۔ حیات افضل ہے یا موت۔ اس میں دو قول ہیں۔ بعض نے حیات کو ترجیح دی ہے اور بعض نے موت کو۔ دلائل حیات میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ طول حیات میں تکثیر اعمال ہے جس سے ثواب بڑھتا ہے اور موت سے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے حیات من حیث ھی حیات کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی بلکہ ایک عارض کی وجہ سے فضیلت ثابت ہوئی اور وہ عارض بھی عند التامل راجع ہے فضیلت موت ہی کی طرف۔ کیونکہ اعمال کا ثمرہ موت ہی کے بعد ملے گا۔ تو اس میں خود اقرار ہے فضیلت موت کا اور موت کی فضیلت ذاتی ہے جس کی صریح دلیل نص ہے کہ حدیث میں آیا ہے۔ تحفة المؤمن الموت (اخرجه ابن المبارک و ابن ابی الدنیا والطبرانی والحاکم) کہ موت مومن کے لئے تحفہ ہے۔ پس مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے جو چیز بطور تحفہ کے ملتی ہے وہ موت ہی ہے۔ حیات کو کہیں تحفہ نہیں کہا گیا اور ذاتی فضیلت کے علاوہ موت کے لئے عارضی ترجیح بھی ثابت ہے۔ چنانچہ میں نے ثابت کر دیا ہے کہ موت کے بعد جو حیات حاصل ہوتی ہے وہ اس حیات سے افضل و اکمل و اتقیٰ و ادوم ہے جب ہر طرح حیات ملکوتیہ کا حیات ناسوتیہ سے اکمل ہونا ثابت ہو گیا تو میرا دعویٰ اس سے لزوماً ثابت ہو گیا کہ ولادت ملکوتیہ ولادت ناسوتیہ سے اہم و اعظم ہے اور اس اہمیت کی نسبت میں نے کہا تھا کہ یہ اہمیت باعتبار حقیقت کے بھی ہے اور باعتبار آثار کے بھی۔ یہاں تک تو حقیقت کی حیثیت کا بیان مقصود تھا۔

حیات ناسوتی

باقی آثار کی حیثیت سے اہمیت اس لئے ہے کہ ولادت ناسوتیہ جن منافع کا مقدمہ ہے حیات ملکوتیہ

ان منافع سے افضل واکمل منافع کا مقدمہ ہے۔ عام مومنین کی موت بھی جس کا بیان بضمن اہمیت باعتبار حقیقت کے اسطر ادا آ بھی چکا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی۔ پھر وہ بھی دو اعتبار سے عام مومنین کے منافع کے اعتبار سے بھی اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے بھی۔ اس کا بیان عنقریب ہوگا۔ اہمیت من حیث الآ ثار کی شق کا انتظار رفع کرنے کیلئے اتنی تنبیہ کردی گئی بیان کا منتظر رہنا چاہیئے۔

اب میں مضمون متصل کی طرف رجوع کرتا ہوں اور حیات وموت کے متعلق ایک لطیف نکتہ عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اب تک تو میں نے موت کا حیات ہونا ثابت کیا تھا۔ اب حیات کو موت بتاتا ہوں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ موت کی حقیقت معنویہ انتقال من عالم الی عالم اخر ہے۔ یعنی ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کو موت کہتے ہیں تو جس طرح حیات ناسوتی کا انقطاع یعنی ولادت ملکوتیہ موت اس لئے ہے کہ اس سے عالم ملکوت کی طرف انتقال ہوتا ہے اسی طرح ولادت ناسوتیہ بھی اس لئے ایک قسم کی موت ہے کہ اس وقت اس شخص کا عالم ارواح سے عالم اجسام کی طرف انتقال ہوا ہے بلکہ اس کو موت کہنا زیادہ زیبا ہے کیونکہ موت صوری سے تو وطن اصلی کی طرف انتقال ہوتا ہے اور ولادت ناسوتیہ کے وطن اصلی سے وطن عارضی کی طرف انتقال ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وطن اصلی کی طرف جانا تو مطلوب ہوتا ہے اس کو موت کہنا محض عرف کی بناء پر ہے اصل موت تو یہی ہے کہ وطن اصلی کو چھوڑ کر وطن عارضی میں آ جائے۔ مگر چونکہ عام طور پر لوگ وطن اصلی سے غافل ہیں اور اسی عالم ناسوت کو وطن اصلی سمجھے ہوئے ہیں اس لئے وہ حیات ناسوتیہ ہی کے انقطاع کو موت کہتے ہیں اور ولادت ناسوتیہ کو موت نہیں کہتے اور جس کی نظر وطن اصلی پر ہے وہ اس کا عکس سمجھتا ہے۔

جیسے آج کل ہم لوگ تھانہ بھون میں رہتے ہیں اور اسی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں لیکن جو تاریخ کا محقق ہے وہ جانتا ہے کہ یہ ہمارا وطن اصلی نہیں ہے بلکہ ہم تو اصل میں عرب کے رہنے والے ہیں۔ وہاں سے آ کر یہاں بس گئے۔ یہ شخص یہاں رہ کر بھی عرب کو یاد کرے گا۔ اسی طرح محققین دنیا میں آ کر اپنے وطن اصلی کو یاد کرتے ہیں اور وہاں سے جدا ہونے پر تاسف کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا جامی اسی وطن اصلی کا پتہ دیتے ہیں اور وہاں سے مفارقت پر رنج ظاہر کرتے ہیں۔

دلاتا کے دریں کاخ مجازی   کنی مانند طفلاں خاکبازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ   کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چہ ازاں آشیاں بیگانہ گشتی   چودوناں چغد ایں ویرانہ گشتی

بھلا فانی جہاں میں کب تک اے دل..... رہے گا کھیل تیرا آب اور گل..... تو ہی ہے لاڈ کا پلنا وہ
طائر..... قفس سے آشیاں تیرا ہے ظاہر..... ہوا اس آشیاں سے کیوں تو محروم... بنا ہے اس بیاباں کا کیوں تو

صاحبو! وہ تھا ہمارا وطن اصلی یعنی عالم ارواح جس کے سامنے یہ عالم ناسوت ویرنہ ہے اس کی

جدائی پر حزن ہونا چاہیئے نہ کہ یہاں سے جدا ہونے پر چنانچہ مولانا اس کو یاد کر کے فرماتے ہیں۔

بشنو از نے چوں حکایت میکند   وز جدائیہا شکایت میکند

روح انسانی کو عالم ارواح سے جدا کر دیا گیا ہے وہ اس جدائی کی شکایت کر رہی ہے۔

نے سے مراد روح ہے۔

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مجھ کو نیستان (عالم ارواح) سے جدا کر دیا گیا ہے تو اس درجہ شورشوں میں مبتلا ہوا۔ سننے دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔

نیستان سے مراد عالم ارواح ہے جس سے جدا ہو کر روح نالہ و فریاد کر رہی ہے۔

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق   تا بگوید شرح دارد اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش   باز جوید روزگار وصل خویش
من بہر جمعیتے نالاں شدم   جفت خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من   وز درون من نجست اسرار من
سر من از نالۂ من دستور نیست   لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن زجات وجاں زتن مستور نیست   لیک کس را دید جاں دستور نیست

میں فراق محبوب سے چاک چاک ہو جانے کا خواہش مند ہوں تا کہ درد اشتیاق کی کیفیت کو وہ اچھی طرح بیان کر سکے جو شخص اپنی اصل سے دور رہ کر اپنے اصل سے ملنے کے ذرائع تلاش کرے۔ میں ہر جماعت سے نالاں رہا خوش حال اور بد حال لوگوں کے ساتھ رہا۔ ہر شخص اپنے گمان سے میرا ساتھی بنا اور اندر سے میرے باطنی اسرار کا طلبگار نہ ہوا۔ میرے باطنی کمالات میرے نالہ سے دور نہیں لیکن ہر شخص کے پاس اسرار باطن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان نہیں۔ روح سے بدن اور بدن سے روح چھپی ہوئی نہیں لیکن کسی کو روح دیکھنے کا ملکہ نہیں۔ اخیر میں فرماتے ہیں۔

آتش است ایں بانگ نای و نیست باد   ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

روح کا نالہ و فریاد ایک آگ ہے جس کو یہ آگ حاصل نہ ہو وہ فنا ہو جائے۔

یعنی روح کا عالم ارواح کی طرف اشتیاق واقعی ہے بناوٹی بات نہیں جس میں یہ اشتیاق نہ ہو وہ نیست ہو جائے۔ پس وہ ہے حقیقت میں وطن جس کے فراق میں روح آہ و نالہ کر رہی ہے جس کو معاد و عالم ارواح کہتے ہیں جب اس وطن سے دوسرے عالم میں آئے تو بتائیے یہ حقیقی موت ہے یا نہیں۔ سو یقینا ہے تو اگر غیر محقق عاشق کو ہمارے ذکر وفات شریف پر وحشت ہے تو اس کو اپنے ذکر ولادت شریف پر بھی وحشت ہونا چاہیئے۔ کہ وہ بھی ایک قسم کی وفات ہے بلکہ صوری وفات سے بڑھ کر ہے جیسا بیان ہوا۔

مقصد حیات

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب یہ حیات بھی موت ہی ہے اور ہم اصل میں عالم ارواح میں تھے تو پھر وہاں سے نکال کر ہم کو یہاں کیوں بھیجا گیا۔ اگر وہیں رکھا جاتا تو اچھا کیونکہ وہ اصلی وطن بھی تھا اور وہاں کی حیات یہاں سے افضل بھی تھی اور وہاں یہاں سے زیادہ قرب بھی تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اعمال کے لئے بھیجا گیا ہے اور اسی عارض اعمال کی وجہ سے اس حیات موجودہ کو اس حیات ماضیہ پر ترجیح ہے جو کہ یہاں آنے سے پہلے ہم کو حاصل تھی۔ اس کو محققین نے سمجھا ہے ورنہ مغلوب الحال تو یہی چاہتے ہیں کہ عالم ارواح ہی میں رہتے تو اچھا تھا کیونکہ بظاہر وہاں آرام تھا اور قرب بھی تھا۔ چنانچہ اسی کو ایک عاشق کہتے ہیں۔

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

وجہ یہ کہ خیال عادۃً فراق میں ہوتا ہے نہ کہ وصال و قرب میں اور حضرت عارف جامی نے بھی مثنوی کے ابتدائی اشعار کی شرح میں اس مضمون کو ایک خاص عنوان سے ادا کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

حبذا روزیکہ پیش از روز و شب　　فارغ از اندوہ و آزارو از طلب
متحد بودیم باشاہ وجود　　حکم غیریت بکلی محو بلود
نے بلوح علم شاں نقش ثبوت　　نے زفیض خوان ہستی خوردہ قوت
نے زحق ممتاز و نے از یک دگر　　غرق در دریائے وحدت سربسر
امتیاز علمی آمد درمیاں　　بے نشانے را نشاں باشد عیاں
واجب و ممکن زہم ممتاز شد　　رسم و آئیں دوئی آغاز شد

اس دن رات سے پہلے دن بھی کیا ہی اچھا تھا کہ جب غم فراق اور وصال کی خواہش سے آزاد تھی۔ ہم بادشاہ وجود (خالق) کے ساتھ متحد تھے جہاں غیریت کا بالکل نام نہ تھا۔

نہ تو ان کی لوح علمی پر ہمارے ثبوت (وجود) کا کوئی نقش تھا اور نہ خوان ہستی کے فیض سے کوئی غذا حاصل تھی۔ نہ ہم حق سے جدا کوئی شئی تھی نہ باہم ایک دوسرے سے ممتاز دریائے وحدت میں پوری طرح غرق تھے۔

علمی امتیاز بھی درجہ بیان و تفصیل میں پیدا ہوا بے نشانی کا نشان ظاہر ہوا۔ واجب اور ممکن ایک دوسرے سے ممتاز ہوئے اس کے بعد کوئی اور یگانگت کا رسم و رواج ہوا۔

ان کا وہی حاصل ہے جو مثنوی کے اشعار ابتدائیہ کا حاصل ہے کہ اس عالم کی تمنا کی ہے اور یہاں

آنے پر تاسف ہے مگر یہ غلبہ حال ہے تحقیق نہیں ہے کیونکہ سمجھنے کی بات ہے کہ اس عالم کی تمنا کیوں ہے۔ اسی لئے وہاں تو قرب تھا اور قرب کی حالت یہ ہے کہ اس کی کچھ حد نہیں۔ غیر متناہی ہے۔ چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود غایت قرب کے امر ہے۔ **قل رب زدنی علما** آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما۔ معلوم ہوا کہ قرب کی انتہا کسی درجہ پر نہیں۔ ہر درجہ سے آگے بھی درجات ہیں اور ظاہر ہے کہ قرب طبعاً محبوب ہے تو اس کا ہر درجہ محبوب ہے۔ خصوصاً عشاق کو کہ وہ تو اگر یہ جان لیں کہ قرب کے اور بھی درجات ہیں تو ان کو حالت موجودہ پر کبھی صبر نہیں ہو سکتا۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

دلا رام در بر جو لب از تشنگی خشک و برطرف جو
نگویم کہ برآب قادر نیند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

محبوب سے ہمکنار اور محبوب کی تلاش پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلب گار میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار توز داماں گلہ دارد

نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول کثرت سے ہیں (اس لئے) تیری بہار حسن کا گلچیں (اپنے) دامن کی تنگی) کا گلہ رکھتا ہے کہ اس کا دامن اتنا تنگ کیوں ملا۔

غرض زیادت قرب سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھئے کہ اس عالم میں قرب تو تھا مگر وہ حد خاص پر متوقف تھا بڑھتا نہیں تھا کیونکہ عادت یہ ہے کہ قرب بڑھتا ہے جانبین کے تعلق سے اور حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ اس کو بندہ کے ساتھ تعلق اس وقت بڑھتا ہے جب ادھر سے طلب ہو۔ گو طلب کی توفیق بھی اول ادھر ہی سے ہوتی ہے مگر ترقی بعد طلب ہی کے عطا ہوتی ہے۔ ان کی عادت یہی ہے کہ اول طلب پیدا کرتے ہیں پھر قرب کو بڑھاتے ہیں اور طلب کی حقیقت ہے عمل اور وہاں عمل تھا نہیں۔ اس لئے قرب نہ بڑھتا تھا۔ اس لئے عالم ارواح سے عالم اجسام میں بھیجا تا کہ طلب سے عمل ہو اور اس سے ترقی کا باب مفتوح ہو۔ چنانچہ حدیث قدسی میں خود فرماتے ہیں۔

من تقرب الی شبرا تقربت الیه ذراعا و من تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا و من اتانی یمشی اتیته هرولة او کما قال. (کنز العمال:۹:۱۷۹، مسند الامام احمد ۲:۳۱۳، ۳:۴۰، الترغیب والترهیب ۴:۱۰۳، مجمع الزوائد:۱۰: ۱۹۶)

کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں ایک باع یعنی دو پھیلے ہوئے کھلے ہوئے ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

سبحان اللہ! کس قدر عنایت ہے کہ وہ بندہ کی ذرا سی طلب پر کس قدر توجہ فرماتے ہیں اور واقعی

یہ راستہ بندہ کے چلنے سے تھوڑا ہی طے ہو سکتا تھا وہ اس قدر غیر محدود مسافت ہے جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتی اس کی تو یہ حالت ہے۔

نہ گردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدن ہا　　　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدن ہا

(راہ عشق دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا بلکہ تاک کی طرح قطع کرنے سے اور زیادہ بڑھتا ہے۔)

یہ تو ان ہی کے قطع کرنے سے طے ہو سکتی ہے جس کی صورت یہ ہے کہ اول بندہ کچھ چلنا شروع کرتا ہے پھر وہ دوڑ کر اس کے پاس خود چلے آتے ہیں۔

غرض مزید قرب کے لئے طلب اور طلب کے بعد سعی کی ضرورت ہے کیونکہ حق تعالیٰ جسم تو ہیں نہیں جو نعوذ باللہ کسی مکان میں ہوں یا کسی چیز میں حلول کیے ہوں کہ انتقال مکانی سے دوڑ کر مسافت کو طے کر لیا جائے اور اللہ میاں کی گود میں جا بیٹھیں۔ خدا تعالیٰ اس سے منزہ ہیں۔ ان کے ساتھ قرب حاصل کرنا یہی ہے کہ ان کی رضا حاصل کی جائے ان کو اپنے سے خوش کیا جائے اور ان کی عنایات و توجہ کو اپنی طرف مائل کیا جائے۔ بس یہ ہے قرب حق کا حاصل اور حق تعالیٰ کی رضا و توجہ صرف ایک چیز پر منحصر ہے۔ وہ کیا ہے اعمال صالحہ جب بندہ اعمال صالحہ اختیار کرتا ہے اس وقت حق تعالیٰ کی توجہ اس پر منعطف ہوتی ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ
اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝

(بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے وہ لوگ بہترین خلائق ہیں ان کا صلہ ان کے پروردگار کے یہاں ہمیشہ رہنے کی بہشتیں ہیں اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔)

اس میں رضا و قرب کو ایمان و اعمال صالحہ پر مرتب فرمایا ہے۔

رضا و قرب

جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا کہ قرب کے معنی رضا ہیں اور رضا اعمال صالحہ پر موقوف ہے تو اب سمجھئے کہ اعمال صالحہ کی دو قسمیں ہیں ایک اعمال قلبیہ دوسرے اعمال قالبیہ جو کہ جوارح سے متعلق ہیں۔ پھر اعمال قلبیہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک مکسوبہ ایک موہوبہ۔ مثلاً اصل محبت اصل خشیت اصل شوق وغیرہ۔ یہ اعمال قلبیہ موہوبہ ہیں اور ان چیزوں کو بڑھانا اور ذکر اور مراقبات و ریاضات وغیرہ سے یہ اعمال قلبیہ مکسوبہ ہیں اور ظاہر ہے کہ اصل اعمال قلبیہ وہی ہیں جن میں اکتساب و اختیار کو دخل ہے۔ موہوبہ کو اعمال کہنا مجاز ہے اور قرب بھی جس کی تحصیل قصد سے ہو سکتی ہے انہیں اعمال سے ہوتا

ہے جو اختیاری ہیں۔ پس عالم ارواح میں اعمال قالبیہ سے تو مطلقاً حرمان تھا اور اعمال قلبیہ میں سے جو منسوب ہیں ان سے بھی حرمان تھا کیونکہ وہاں آلات اکتساب ہی موجود نہ تھے۔ اس لئے قرب تو وہاں بے شک تھا مگر ایک حد پر تھا کہ اس سے آگے ترقی نہ ہو سکتی تھی کیونکہ وہاں اعمال پر قدرت ہی نہ تھی۔ سو محقق کو تو عالم ارواح کے تصور سے بھی بے چینی ہوتی ہے کہ وہاں کیا خاک چین تھا۔ آرام و راحت تو یہاں ہے کہ رات دن جتنی ترقی چاہو اعمال کے ذریعہ سے کر سکتے ہو کوئی اس کے لئے حد ہی نہیں۔ کسی درجہ بھی پہنچ کر ترقی بند نہیں ہوتی عاشق کو بھلا اس پر کہاں چین آ سکتا ہے کہ محبوب سامنے ہو اور وہ یہ کہہ دے کہ خبردار آگے نہ بڑھنا مجھ سے دو گز دور رہو۔ عاشق کو محبوب کے سامنے اس بعد پر کیونکر صبر آ سکتا ہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ محبوب سے لپٹ جاؤں بلکہ اس سے زیادہ یہ چاہتا ہے کہ وہ مجھے لپٹ جائے عشاق اس کو جانتے ہیں مگر عشاق میں جو فساق ہیں ان کے معاملات کا تصور مت کرنا بلکہ اس کو اپنی بیویوں ہی میں سوچ لینا کہ تم بیوی کو لپٹو اس میں زیادہ لطف ہے۔ یا بیوی تم کو لپٹے اس میں زیادہ لطف ہے ظاہر ہے کہ بیوی کے لپٹنے میں اور زیادہ لطف ہے۔ لیجئے میں نے فساق کی مثال چھوڑ کر اتقیاء کی مثال اختیار کر لی۔ اس کے تصور میں تو کوئی مانع نہیں غرض عاشق کو محبوب کے سامنے فصل پر چین نہیں آ سکتا۔ اگر اس کا مکلف بھی کیا جاوے تو اس کی تو وہی حالت ہو جاوے گی۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ　　باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

(درمیان میں تختہ ڈال کر باندھ دیا پھر کہتے ہو کہ خبردار دامن تر نہ ہو۔)

تو صاحب! عالم ارواح میں تو ایسا ہی قرب تھا کہ بس دور سے جھرمٹی دیکھتے رہو۔ پاس آنے کی اجازت نہیں۔

فضیلت فقہاء

تو حضور وہاں کہاں چین تھا۔ بس وہ حالت تھی جیسے ایک صاحب کا سوال آج نکل آیا ہے۔ ہمارے یہاں عجیب عجیب سوالات آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص کسی عورت پر عاشق تھا۔ عورت شریف خاندان کی تھی اور یہ عاشق صاحب گھٹیا خاندان کے تھے۔ اس کے کفو نہ تھے۔ جب آپ نے نکاح کا پیغام دیا تو اس نے عدم کفائت کا عذر کیا کہ تیرے نکاح سے میری نسل بگڑے گی۔ عاشق صاحب نے کہا کہ میں تو نکاح کر کے صرف دیدار چاہتا ہوں اور کچھ نہ کروں گا۔ چنانچہ وہ اس شرط پر نکاح کرنے کو آمادہ ہو گئی کہ مجھ سے مقاربت نہ کرنا۔ عورت بھی بڑی ہمت کی تھی۔ اور اسی شرط پر نکاح ہو گیا کچھ دنوں تو عاشق نے صبر کیا مگر پاس لیٹ کر پھر صبر کس سے ہو۔ اب میاں کی جان پر بنی تو استفتاء کیا ہے کہ اگر میں صحبت کر لوں تو خلاف شرط ہونے کے سبب نکاح میں تو خلل نہ آئے گا اور یہ بھی لکھا کہ وہ راضی نہیں ہے۔

میں نے لکھا پاگل ہے جو اس شرط کی رعایت کرتا ہے۔ یہ شرط فاسد ہے اور نکاح صحیح ہو گیا اور عورت کی ناراضی کی کچھ پرواہ نہیں تم کو پورے اختیارات ہیں۔ کیا تم عورت ہو جو ایک عورت پر قابو

یا فتنہ نہ ہو سکو۔ اگر فقہاء نہ ہوتے اور آج کل کے محدث ہوتے جن کو محدث (بے وضو) کہنا چاہیے۔ تو وہ کہتے کہ نکاح ہی صحیح نہیں ہوا کیونکہ حدیث میں ہے نہی عن بیع و شرط۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔ اسی لئے بیع میں شرط کرنے سے بیع بھی فاسد ہو جاتی ہے اور شرط بھی اور نکاح بھی مثل بیع کے ایک معاملہ مالیہ ہے کیونکہ اس میں منافع عورت کو مہر کے معاوضہ میں لیا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں بھی نکاح اور شرط دونوں فاسد ہونے چاہئیں۔

حضرت اگر فقہاء کا وجود نہ ہوتا تو یہ لوگ بیع اور مشروط بشرط فاسد کی طرح تمام عقود کو فاسد کہتے۔ مگر خدا جزائے خیر دے حضرات فقہاء کو کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس ہیں۔ وہ حضور کے لب ولہجہ کو پہچانتے ہیں۔

مزاج شناسی پر مجھے علی حزیں شاعر کا قصہ یاد آ گیا۔ یہ ایران کے شہزادوں سے ہے بڑا نازک مزاج تھا۔ اس لئے کوئی شخص اس کی خدمت گاری نہ کر سکتا تھا۔ صرف ایک خادم رمضانی اس کا مزاج شناس تھا وہی اس کی خدمت کرتا تھا۔ اور وہ رمضانی ایسا نوکر تھا کہ علی حزیں کے ساتھ اشعار میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ علی حزیں کھانا کھا رہا تھا مکھیوں نے پریشان کیا تو کہنے لگا۔

رمضانی مگساں می آیند

رمضانی مکھیاں کہاں سے آتی ہیں۔

اس نے فوراً جواب دیا

ناکساں پیش کساں می آیند

اسی طرح ایک دفعہ رات کو آنکھ کھل گئی تو رمضانی سے پوچھا۔

از شب چہ قدر رسیدہ باشد

رات کس قدر باقی ہے۔

اس نے آسمان کو دیکھ کر فوراً جواب دیا۔

زلفش بہ کمر رسیدہ باشد

یعنی آدھی رات ہوگئی ہے۔ ایسے ہی بہت سے لطیفے رمضانی کے منقول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض نوکر نہ تھا بلکہ یار آشنا اور ہم مذاق دوست تھا۔ جو محض محبت کی وجہ سے شاہزادہ کی خدمت کرتا تھا بلا تکلم خطابات کا علم دونوں کو سینہ بسینہ تھا۔ در سفینہ نہ تھا۔ اشاروں میں باتیں ہوتی تھیں اور رمضانی ہی کا دماغ تھا جو ان اشاروں کو سمجھتا تھا۔

چنانچہ علی حزیں جب ہندوستان آیا تو اس نے شاہ دہلی سے درخواست کی کہ میرے پاس صرف ایک خادم رمضانی ہے اور کام زیادہ ہے غریب کو راحت کا وقت نہیں ملتا۔ اس لئے ایک اور خادم تجویز

کیا جائے تا کہ رمضانی کو کچھ راحت مل جائے۔ اس کی نزاکت تو مشہور تھی ہی۔ شاہ دہلی نے اپنا خادم خاص جو نہایت تعلیم یافتہ ہوشیار و عقلمند تھا بھیج دیا۔ دو تین ہی دن گزرے تھے کہ علی حزیں شطرنج کھیلنے بیٹھا اور نئے خادم کو حکم دیا کہ باغ کے دروازے پر جس میں سکونت تھی بیٹھ کر دربانی کی خدمت انجام دے اور جو کوئی آوے اس کو اطلاع کرے وہ دروازے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک شخص کسی کا رقعہ لے کر آیا اور دربان سے کہا شاہزادے کو یہ رقعہ پہنچا دو اور جواب لے آؤ۔ یہ رقعہ لے کر پہنچا۔ علی حزیں نے اس کو دیکھا اور دیکھ کر ناک بھوں چڑھا کر رقعہ واپس کر دیا۔

اب یہ خادم بڑا حیران کہ میں کیا کروں۔ رقعہ لے کر واپس کروں یا رکھ لوں۔ اور واپس کروں تو قاصد کو کیا جواب دوں۔ اتنی ہمت کہاں تھی کہ علی حزیں سے پوچھتا کہ حضور اس کا کیا جواب دیا جائے۔ ہیبت کے مارے کچھ نہ پوچھ سکا کیونکہ نزاکت مزاج تو مشہور تھی۔ آخر کار دوڑا رمضانی کے پاس آیا اور کہا بھائی! میں تو مصیبت میں پھنس گیا ذرا بتلاؤ تو میں کیا کروں۔ شہزادہ نے تو ناک بھوں چڑھا کر رقعہ پھینک دیا اور زبان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ رمضانی نے رقعہ کا مضمون دیکھا تو کسی دوست نے لیموں ترش کی فرمائش کی تھی کہ اپنے باغ سے دے دیئے جائیں۔ رمضانی نے کہا کہ شہزادہ نے ترش رو ہو کر اس رقعہ کا جواب دیا ہے۔ جس میں لیموں ترش دینے کی اجازت دی ہے۔

شاہ دہلی کے خادم نے جو یہ مطلب سنا تو سناٹے میں آ گیا اور اپنا بوریہ بستر باندھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا اور رمضانی سے کہا بھائی! علی حزیں کے پاس رہنے کی ہمت تجھی کو ہے دوسرے کا یہاں کام نہیں۔ پھر یہ شاہ دہلی کے پاس پہنچا اور بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور چاہے مجھے پھانسی دے دیں یہ منظور ہے مگر علی حزیں کے پاس رہنا منظور نہیں۔ اس کے پاس آدمیوں کا کام نہیں وہاں تو فرشتوں کا کام ہے جن کو ہر وقت الہام ہوتا رہے وہ تو ایسے اشاروں میں باتیں کرتے ہیں جن کو سمجھنے کے لئے عقل کافی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو نام ہی کے علی حزیں ہیں مگر ان کے پاس رہنے والا سچ مچ ہی حزیں ہو جاتا ہے کہ ہر وقت اسی فکر و غم میں رہے کہ دیکھئے اب سرکار کیا اشارہ کرتے ہیں۔

علی حزیں مسخرہ بھی بہت تھا۔ ایک بار دہلی میں کسی رئیس کا مکان کرایہ پر لیا۔ اس مکان کی دہلیز میں ایک مدار یا فقیر رہتا تھا جو نہ نماز کا نہ روزہ کا مگر صبح ہی اٹھ کر شجرہ بڑی زور زور سے پڑھا کرتا تھا۔ ایک بار مالک مکان نے آ کر علی حزیں سے پوچھا آپ کو اس مکان میں کوئی تکلیف تو نہیں۔ کہنے لگا اور تو کوئی تکلیف نہیں مگر اس تذکرۃ الاولیاء سے کہہ دو کہ ذرا آہستہ پڑھا کرے۔ تو ظالم نے اسے کیا لقب دیا ہے تذکرۃ الاولیاء کیونکہ شجرہ میں بزرگوں کے بہت سے نام ہوا کرتے ہیں۔

تو بلا تشبیہ حضرات فقہاء دربار نبوی کے رمضانی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لب و لہجہ سے مطلب نکال لیتے ہیں اشاروں کو سمجھتے ہیں اور دوسرے لوگ شاہ دہلی کے اس خادم کے مشابہ ہیں جو

بدوں صاف صاف کہے مطلب نہیں سمجھتا تھا اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ فقہاء اور صوفیا حکماء اسلام ہیں۔ ان کا وجود امت کے لئے رحمت ہے۔ یہ حضرات اسرار شریعت کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

اب سمجھئے کہ فقہاء نے بیع کو تو شرط سے فاسد کہا اور نکاح کو اور اسی طرح ہبہ وصدقہ وغیرہ کو شرط فاسد سے فاسد نہیں کہا بلکہ خود شرط ہی کو باطل و کالعدم وغیر موثر قرار دیا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے یہ فرق کہاں سے سمجھا اس کے لئے فقہاء کے پاؤں دھوؤ تب اس فرق کی سمجھ پیدا ہو۔ سو وہ فرق کو اس طرح سمجھے ہیں کہ انہوں نے یہ سوچا کہ نہی عن بیع و شرط کی علت کیا ہے کیونکہ احکام بالاستثناء احکام تعدیہ کے کسی علت سے معلل ہوتے ہیں۔ فقہاء اس علت پر نظر کر کے احکام منصوص سے غیر منصوص کی طرف متعدی کر لیتے ہیں۔ مگر مکرر تنبیہ کرتا ہوں کہ تعلیل کی اجازت وہیں ہے جہاں حکم تعبدی محض نہ ہو کیونکہ احکام تعبدیہ کا تعدیہ نہیں ہوتا بلکہ جو احکام تعبدی نہ ہوں ان کا تعدیہ ہوتا ہے اور وہیں تعلیل بھی جائز ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ کوئی عقلمند سب احکام میں تعلیل نہ کرنے لگیں کہ نماز پانچ وقت فرض ہونے کی یہ علت ہے اور روزہ فرض ہونے کی یہ علت ہے وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہاں تعبدیہ ہی نہیں لہذا تعلیل بھی جائز نہیں۔

بہر حال فقہاء نے نہی عن بیع و شرط کی علت کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بیع میں شرط اس لئے ممنوع ہے کہ اس میں معنی ربوا کے ہیں کیوں کہ ثمن تو مبیع کے مقابلہ میں ہو گیا اور مبیع ثمن کے مقابلہ میں اور شرط کسی کے مقابلہ میں بھی نہیں اور احد العاقدین کو شرط سے نفع پہنچنا معلوم۔ تو یہ نفع کس چیز کے عوض میں لیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کے عوض میں بھی نہیں۔ اس لئے یہ ربوا ہے لیکن یہ لزوم ربوا عقود معاوضہ میں تو ہوگا جیسے بیع و اجارہ وغیرہ اور نکاح میں نہیں ہوگا کیونکہ نکاح عقد معاوضہ ہی نہیں ہے گو صورۃ یہاں بھی معاوضہ ہے مگر اس کا معاوضہ بنانا مقصود نہیں ورنہ بدوں ذکر مہر کے نکاح ہی صحیح نہ ہوتا حالانکہ صحیح ہے خود نص میں موجود ہے۔

لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً

(تم پر کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے۔)

اس لئے یہاں شرط سے ربوا لازم نہ آئے گا۔ پس نکاح شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوگا بلکہ خود شرط ہی جو کہ منافی عقد ہو باطل ہو جائے گی چنانچہ اس مسئلہ میں عدم مطابقت کی شرط منافی عقد تھی اس واسطے باطل ہو گئی اور اس کی مخالفت سے شوہر پر نہ گناہ ہوگا نہ ضمان ہوگا۔ ذرا لائیں تو آج کل کے محدثین یہ علوم۔ ہرگز نہیں! یہ کام فقہاء ہی کا ہے۔ الفاظ یاد کر لینے سے یہ علوم حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے لئے مزاج شناس نبوت ہونے کی ضرورت ہے۔

لطف جنت

تو صاحبو! اگر عالم ارواح ہی میں ہم رہتے ہیں تو ہمارا تو حال ہوتا جو اس شخص کا قبل استقطاء ہوا کہ نکاح کر کے بھی زیادت قرب سے محروم ہے۔ اسی طرح ہم بھی ایک حد پر رہتے۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکتے۔ اس کو سوچ کر عالم ارواح کا تصور کیا جائے تو وہاں کی زندگی وبال جان ہو جاتی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ یہاں بھیج کر اعمال سے زیادت قرب کا موقع دیا۔ ہاتھ پاؤں بھی دیئے جن سے نماز روزہ ادا کر کے خدا تعالیٰ کی رضا اور محبت وقرب میں ترقی کر سکتے ہیں جس کی نہ کوئی حد ہے نہ کچھ روک ٹوک۔

شاید آپ کہیں کہ عاشق کی تمنا کا اوپر ذکر ہوا ہے کہ وہ چاہتا ہے میں محبوب کو اور وہ مجھ کو لپٹے۔ سو یہ قرب جو اعمال سے ہوا تو ادھر سے لپٹنا ہوا مگر خدا کا لپٹنا کیسے ہوا؟

تو سمجھئے کہ لپٹنے میں ہوتا کیا ہے۔ یہی تو ہوتا ہے کہ محبوب عاشق کو غایت قرب کے ساتھ اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے سو قرب تو اوپر ثابت ہوا۔ باقی احاطہ سو وہ بھی موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو محیط ہے) یہ بڑی تسلی کی بات ہے اگر یہ نہ ہوتی تو عشاق کا دم ہی نکل جاتا۔ ان جذبات کو اہل عشق خوب سمجھتے ہیں۔ گو عشاق مجازی ہی ہوں نیز تقرب الیہ بھی اس معنی پر دال ہے بلکہ آیت سے بھی زیادہ دال ہے کیونکہ وہ احاطہ تکوینی کو بھی شامل ہے اور حدیث رضا میں نص ہے کیونکہ قرب بھی رضا ہے۔ گو اس میں احاطہ کی تصریح نہیں تو آیت سے احاطہ لیا جاوے اور حدیث سے رضا تو مجموعہ مدعا میں نص ہو گیا۔ بہر حال حق تعالیٰ آپ کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ اس قرب میں تو پہلے ہی سے قریب ہیں اور اعمال ذکر وغیرہ کے بعد پھر دوسرا قرب بھی میسر ہو جاتا ہے جس کا ادراک ذاتی طور پر آپ کو بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو ادھر سے تعلق ہوا اور آپ کی طرف سے تعلق یہ ہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(محبوب حقیقی سے تھوڑی دیر بھی غفلت میں مت گزار۔ شاید وہ کسی وقت بھی نظر کرم کریں اور تو بے خبر ہو)

یعنی ہمیشہ احکام الٰہی پر نظر رکھی جائے اور ان کی یاد سے غافل نہ ہو۔ پھر جانبین سے قرب کی وہ کیفیت ہو گی جس کو اردو کا شاعر کہتا ہے۔

آرزو یہ ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے　　تم ہمارے سامنے ہو ہم تمہارے سامنے

البتہ ظہور تام اس قرب کا اور اس سے تمتع کامل آخرت ہی میں ہو گا یعنی یہ قرب درمیان عبد وحق کے دنیا میں اگر ہو جاتا ہے جس میں باوجود اس کے کہ عالم ارواح سے بیشی ہے تاہم یہ کمی رہتی ہے کہ اس قرب سے تسلی کامل نہیں ہوتی اور آخرت میں اس سے پوری تسلی ہو جائے گی۔ یعنی ہر شخص کو اس کی تمنا کے موافق انکشاف میسر ہو گا کیونکہ تمنا کے موافق تحمل عطا ہو گا مگر یہ ضرور ہے کہ تمنا استعداد سے زیادہ نہ ہو

گی اور یہی راز ہوگا تفاوت درجات قرب میں جس کی استعداد کا جتنا مقتضا ہوگا اس قدر قرب اس کو عطا ہو جائے گا اور اسی وجہ سے ہر شخص کو تسلی ہو جائے گی۔ اور دنیا میں بوجہ حجب کے کچھ استتار رہتا ہے جس سے تمنا کے موافق انکشاف نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے تسلی میں کمی رہتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ

(تا کہ ان کو ان کی اجرتیں دے دیں اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دیں۔)

توفیہ و زیادت اس معنی پر دلالت کے لئے کافی ہیں۔ نیز بلسان اہل جنت ارشاد ہے۔

لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ

(اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی اور نہ تکان۔)

نصب اور لغوب کی نفی بے چینی کی نفی کے لئے کافی ہے اور یہاں سے بعض اہل کشف کی ایک علمی غلطی معلوم ہوگئی ہوگی۔ گو عشاق کی غلطی بھی معاف ہے۔

گر خطا گوید و را خاطی مگوی　　ور شود پر خوں شہید آنراں مشوی
خون شہیداں راز آب اولی ترست　　ایں خطا از صد ثواب اولی ترست

(اگر کوئی غلطی کرے تو اس کو خطاوار ... نہ کہو اور اگر شہید خون میں نہا جائے تو اس کو غسل مت دو۔)

شہید کا خون پانی سے بہت بہتر ہے اور یہ خطا سو ثوابوں سے بہتر ہے۔

اس لئے ان پر ملامت نہ کرنا چاہئے گو درجائز ہے۔ وہ غلطی یہ ہے کہ بعض عشاق نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

ان فی الجنان جنہ لیس فیہا حور و لا قصور ولکن فیہا ارنی ارنی

جنتوں میں سے ایک جنت ایسی ہے جس میں نہ حور ہے نہ محلات لیکن اس میں صرف ایسے لوگ آباد ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے اپنا دیدار کرا دیجئے مجھے اپنا دیدار کرا دیجئے اے اللہ رب العزت۔

اور اصل میں یہ ان کی کشفی غلطی ہے کہ ان کو اس سے آگے مکشوف نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ وہاں بعض عشاق کی یہ حالت کسی وقت ہو مگر بہت جلد تجلی سے ان کی تسلی کر دی جائے گی۔ لوگ اس کو حدیث سمجھتے ہیں کیونکہ عربی عبارت ہے۔ بس آج کل جو مضمون عربی میں موجود ہو وہ حدیث ہی ہوتی ہے۔ ایک ظریف عالم نے خوب کہا کہ بس تو عرب میں حدیثیں ہی حدیثیں ہوتی ہوں گی۔ کیونکہ وہاں تو ہر بات عربی میں ہے ان لوگوں کو اس تجلی سے تسلی کی اطلاع نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ سمجھ لیا کہ جنت میں جا کر بھی بے تابی ختم نہ ہوگی۔ پھر اس غلطی کی تائید ایک قیاس سے ہوگئی کہ انہوں نے جنت کی حالت کو یہاں کی حالت پر قیاس کر لیا۔ سو یہاں کی تو حالت یہ ہے کہ محبوب کا حسن تو بالفعل غیر متناہی ہے ہی مگر ہمارا عشق بھی غیر متناہی بمعنی لا یقف عند حد ہے کہ کسی درجہ پر بھی طلب ختم نہیں ہوتی۔ بس وہ حال رہتا ہے۔

نہ آیا وصل میں بھی چین ہم کو　　گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی

کنار بوس سے دونا ہوا عشق   مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

تو اب یہ لوگ سمجھے کہ محبوب کا حسن تو آخرت میں بھی غیر متناہی ہوگا۔ اور ہمارا عشق بھی لایقف عند حد ہے تو پھر وہاں چین کیسے آئے گا۔ میں کہتا ہوں کہ وہاں اس طرح چین آجائے گا کہ محبوب کا حسن تو غیر متناہی رہے گا مگر تمہارا عشق متناہی ہوجائے گا۔ یعنی جنت میں جا کر ایک حد پر ٹھہر جائے گا۔ اور جتنا قرب تمہارے استعداد کا مقتضا ہے وہ میسر ہوجائے گا اس لئے ہر شخص کو سیری اور آسودگی ہو جائے گی۔ تو یہ ایک مقدمہ ان کی نظر سے غائب رہا کہ جنت میں ہمارا عشق غیر متناہی بمعنی لایقف عند حد نہیں رہے گا۔ اس لئے ان کو جنت میں بھی چین اور اضطراب کا شبہ ہوا۔ سو خوب سمجھ لو کہ جنت میں بے چینی ہرگز نہ ہوگی۔ وہاں سب کو چین آجائے گا۔ یہ بے چینی یہیں تک ہے۔

مفارقت دائمہ

بہر حال دنیا میں ہم کو اس لئے بھیجا گیا تا کہ اعمال کے ذریعہ قرب میں ترقی حاصل کریں ورنہ اصلی وطن ہمارا عالم ارواح ہے تو تعجب کی بات ہے کہ وطن غیر اصلی سے وطن اصلی کو جانا موت ہو اور وطن اصلی سے غیر اصلی کو آنا موت نہ ہو حالانکہ یہ معنی اس سے بڑھ کر موت ہے۔ تو ثابت ہوگیا کہ یہ ولادت ناسوتیہ معنی موت ہے۔ پھر ولادت کا ذکر اس کو موت سمجھ کر کیوں نہیں چھوڑتا اور وفات کا ذکر اس کو ولادت سمجھ کر کیوں نہیں کیا جاتا۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ اگر حیات موت ہے تو چاہیے کہ جب کوئی روح عالم ارواح سے دنیا میں آتی ہوگی تو شاید ارواح بھی روتی ہوں گی کہ ہائے ایک عدد کم ہوگیا۔ جیسے یہاں سے کوئی جاتا ہے تو ہم لوگ روتے ہیں۔

اس کے چند جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں کے ادراکات اور وہاں کے ادراکات میں فرق ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مرنے کے وقت جو ہم روتے ہیں تو موت سبب بکاء کا نہیں بلکہ وہ ظرف بکاء ہے یعنی سبب بکاء اور موت زمانا مقترن ہوگئے ہیں۔ سبب بکاء کا دوسری چیز ہے اور وہ مفارقت دائمہ کا گمان ہے اور دائمہ کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس عالم میں عود نہ کرے گا کیونکہ مطلق مفارقت سبب بکاء نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اگر کوئی ہمارا عزیز جلال آباد چلا جائے تو اس پر کوئی نہیں روتا۔ کیونکہ جانتے ہیں کہ ایک گھنٹہ میں واپس آجائے گا۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تو لوگ روئے مگر معراج کے وقت کوئی نہیں رویا حالانکہ وہاں بھی مفارقت کے ساتھ انتقال الی الآخرت موجود تھا۔ کیونکہ آخرت کے دو جزو ہیں ایک زمان آخرت تو وہ بعد قیامت کے شروع ہوگا اور ایک مکان آخرت، وہ ابھی موجود ہے یعنی سموات۔ یہ شیخ ابن عربی کی تحقیق ہے۔

اس تحقیق سے انہوں نے ایک اشکال کا جواب بھی دیا ہے وہ یہ کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں رویت حق تعالیٰ ہوئی ہے۔ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ آخرت سے قبل رویت باری تعالیٰ کی ممتنع عادی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے ہوئی۔

اس اشکال نے علماء کے دانت کھٹے کر دیئے۔ کوئی اس کا جواب ایسا شافی نہیں دے سکا جیسا شیخ اکبر نے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور کو دنیا میں رویت نہیں ہوئی بلکہ آخرت میں ہوئی ہے اور آخرت کا جیسا ایک جزو زمان آخرت ہے ایک جزو اس کا مکان آخرت بھی ہے جو اس مکان دنیا سے مافوق ہے۔ معراج کے وقت آپ مکاناً آخرت میں تھے۔ اس سے ساری گتھڑیاں کھل گئیں۔

بہرحال معراج میں باوجود انتقال الی الآخرت کے مفارقت کا کسی کو رنج نہیں ہوا کیونکہ مفارقت دائمہ نہ تھی۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ معراج تو ایسے وقت ہوئی تھی کہ صحابہ میں سے کسی کو بھی اس مفارقت کا علم نہیں ہوا۔ اگر علم ہوتا تو شاید رنج بھی ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معراج کی جب خبر ہوئی تھی اس وقت تو اس کے تصور سے رنج ہوتا۔ جیسے اگر کوئی مسکوت ہو کر پھر تندرست ہو جائے تو جن عزیزوں کو بعد صحت کے اس مرض کی اطلاع ہوگی ضرور اس کے تصور سے صدمہ ہوگا۔ اگر صحابہ کو ایسا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا کیونکہ یہ سرسری بات نہ تھی اور رنج میں صرف مفارقت دائمہ کا موثر ہونا اور موت کا موثر ہونا اس سے بھی متاید ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سچ مچ وصال ہو گیا تو منافقوں بددینوں میں کھچڑی پکنے لگی اور وہ باہم چپکے چپکے خوشیاں منانے لگے۔ حالانکہ خوشی کا کیا موقع تھا۔ بھلا اگر سلطان کسی منتظم کو اپنے پاس بلالے تو دوسرا منتظم بھیج دیا جاوے گا جو اشرار کی سرکوبی کے لئے کافی ہوگا۔ گو رتبہ میں کم ہو۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت تلوار نکال کر سب کو دھمکایا خبردار کوئی شخص زبان سے یہ لفظ نہ نکالے کہ حضور کی وفات ہوگئی بلکہ آپ پر غشی طاری ہوگئی اور درگاہ قرب میں روحانی طور پر تشریف لے گئے ہیں۔ ابھی واپس آ کر منافقوں کو قتل کریں گے۔ حضور کی وفات ابھی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسلام کی تکمیل نہ ہو جائے۔

یہ کوئی پالیسی نہیں تھی جیسا کہ بعض اہل ظاہر کا خیال ہے بلکہ واقعی اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال ہی یہ تھا کہ یہ حالت جو حضور پر طاری ہے موت نہیں ہے بلکہ آپ کو معراج روحانی ہوئی ہے۔ اگر ان کو یہ شبہ ہوتا کہ یہ حالت موت ہے ان کو اپنے ہوش بھی نہ رہتے۔ چہ جائیکہ پالیسی اور تدبیر سوچتے۔ چنانچہ جس وقت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی زبان سے ان کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ حضور کا وصال ہو چکا ہے اس وقت ان سے کھڑا بھی نہ ہوا گیا۔ قدم لڑکھڑا گئے۔ اور سکتہ کی حالت میں رہ گئے بھلا عاشق کو محبوب کی مفارقت کے وقت کہیں پالیسی کی سوجھتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ حقیقۃً ان کا خیال یہ تھا کہ حضور دین کی تکمیل فرما کر دنیا سے تشریف لے جائیں گے۔

اس پر شاید اہل علم کو یہ شبہ ہو کہ دین کی تکمیل تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو چکی تھی۔ چنانچہ حج وداع میں آیت۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ
لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

(آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور میں نے تم پر انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔)

نازل ہو چکی تھی۔ پھر حضرت عمرؓ کو کس تکمیل کا انتظار تھا۔

جواب یہ ہے کہ آیت میں جس تکمیل کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ احکام کے اصول وقواعد ہر بات میں مکمل ہو چکے، ایسے ایسے قاعدے بتلا دیئے گئے کہ اب قیامت تک کے واقعات کا حکم انہیں سے معلوم ہو سکتا ہے اور حقیقی تکمیل اسلام یہی ہے بھی مگر حضرت عمر کا خیال یہ تھا کہ فروعی تکمیل بھی حضور ہی کے ہاتھوں سے ہوگی جس کے بعد کسی کے اجتہاد کی ضرورت نہ رہے گی۔ جیسا مسئلہ ربوا میں تبیین کامل منصوص کی تمنا ان سے منقول ہے۔ یا اشاعت اسلام کی تکمیل بھی آپ ہی کے ہاتھوں ہوگی۔ جس کی صورت یہ ہے کہ تمام عالم کی فتوحات آپ کے سامنے ہوں۔ جیسا ان کا قول وارد ہے کہ جب تک منافقین کے ہاتھ پاؤں نہ کاٹیں گے آپ کی وفات نہ ہوگی۔ گو اصولاً یہ تکمیل بھی ہو چکی تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نقشہ بھی صحابہ کو بتلا دیا تھا کہ اول شام کی طرف پیش قدمی کرنا، پھر فارس کی طرف۔ چنانچہ مرض وفات ہی میں جیش اسامہ کو تیار فرما کر شام کی طرف جانے کا حکم فرمایا تھا اور کنوز کسریٰ وخزائن فارس کے فتح ہونے کی پیشین گوئی صحابہ سے کئی بار فرمائی۔ تو اصولاً فتوحات کی بھی تکمیل آپ فرما چکے تھے۔ صرف اتنی دیر تھی جیسے انجینئر اعظم نہر کھدا کر لیول درست کر دے اور تمام مقامات سے اس کو ہموار کر کے چلا جائے کہ اب صرف اتنا کام باقی ہے کہ اس میں پانی چھوڑ دیا جائے۔ سو یہ کچھ کمی نہیں محض ظاہری کمی ہے۔ حقیقت میں تو نہر کا کام ختم ہو گیا اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتوحات کا کام بھی حقیقت میں ختم فرما چکے تھے۔ نقشہ سب تیار ہو چکا تھا صرف فوجوں کا اس پر چلانا باقی تھا۔ سو یہ کچھ کمی نہیں تھی، مگر حضرت عمر کا خیال یہ تھا کہ یہ ظاہری کمی بھی حضور ہی کے سامنے پوری ہوگی (یہ خبر نہ تھی کہ یہ کام میرے ہی ہاتھوں سے خدا تعالیٰ کو لینا منظور ہے اور مجھے فاتح اعظم اسلام کا لقب دینا ہے)

غرض جب تک حضرت عمرؓ کا یہ خیال رہا کہ آپ کو معراج روحانی ہوئی ہے اس وقت سنبھلے رہے۔ نہ رونا آیا نہ رنج وفکر ہوا بلکہ دلیری کے ساتھ منافقوں کو دھمکاتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کی اطلاع ہوئی۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں تھے۔ کیونکہ

صبح کی نماز کے وقت وہ حضور کو اچھا دیکھ گئے تھے کہ نماز کے وقت آپ بستر سے اٹھ کر دروازہ مکان تک بھی تشریف لائے جس سے صحابہ کو گمان ہوا کہ شاید آپ نماز کے لئے تشریف لانا چاہتے ہیں اور اس خوشی میں قریب تھا کہ نماز درہم برہم ہو جائے کہ حضور پردہ چھوڑ کر بستر پر تشریف لے آئے۔ اس حالت کو دیکھ کر گمان نہ ہوتا تھا کہ آپ کا آج ہی وصال ہو جائے گا۔ اس لئے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بے فکر ہو کر کسی ضرورت سے مکان پر چلے گئے کہ پیچھے آپ پر حالت نزع طاری ہو گئی اور وصال ہو گیا)

یہ خبر سن کر حضرت صدیق جلدی سے تشریف لائے تو مسجد میں صحابہ کو حیران و پریشان اور حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ خبردار! حضور کی نسبت وفات کا لفظ کسی کی زبان سے نہ نکلنے پائے ورنہ اس تلوار سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ حضرت صدیق نے کسی کی بات پر التفات نہ کیا اور سیدھے حجرہ عائشہ صدیقہ میں تشریف لے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اطہر سے چادر مبارک کھول کر حضور کو دیکھا تو دیکھتے ہی یقین آ گیا کہ حضور کا وصال ہو گیا۔ اس وقت سب سے زیادہ حضرت صدیق مضبوط رہے کہ وفات کا یقین ہو جانے کے بعد اتنا تو منہ سے نکلا۔

والخليلاه و احبيباه طبت حيا و ميتا والله لا يجمعن الله عليه موتين ابدا اما الموته التى كتب عليك مقدمتها

واہ خلیل، واہ حبیب آپ کی حیات و ممات دونوں احسن ہیں اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ کبھی بھی دو موتیں آپ پر جمع نہیں کرے گا ایک موت جو آنی تھی وہ آ چکی۔

اس کے بعد نہایت ضبط کے ساتھ حجرہ سے باہر آئے۔ اس وقت صحابہ کی عجیب حالت تھی کہ سب حضرت صدیق کے منہ کو تکتے تھے کہ دیکھئے ان کے منہ سے کیا نکلتا ہے۔ حضرت صدیق نے اول تو حضرت عمر کو پکار کر فرمایا علی رسلک یا رجل۔ اے شخص ٹھہر جا خاموش ہو جا۔ مگر حضرت عمر جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ خاموش نہ ہوئے۔ تو حضرت صدیق سیدھے ممبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ پڑھا۔ اس وقت سب صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تو آپ نے حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا۔ **اما بعد۔ فمن كان يعبد محمدا فان محمدا قدمات و من كان يعبدالله فان الله حيى لايموت** (الصحیح للبخاری ۱: ۲۶، ۵: ۳، مسند الإمام أحمد ۳: ۱۸، کنز العمال: ۳۲۵۹۰، فتح الباری لابن حجر: ۱: ۵۵۸، ۷: ۱۲.)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ
اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ
فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝
اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝

یعنی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود سمجھتا ہو وہ سن لے کہ حضور کا تو وصال ہو چکا اور جو خدا کی عبادت کرتا ہو (اور یہی سمجھ کر اسلام لایا ہو) تو حق تعالیٰ زندہ ہیں وہ کبھی نہ مریں گے۔ اس میں بتلا دیا کہ تکمیل اسلام کے لئے حق تعالیٰ کا حی لایموت ہونا کافی ہے۔ حضور کے زندہ رہنے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ سن کر حضرت عمر بالکل ٹھنڈے ہو گئے اور اب اتنی بھی طاقت نہ رہی کہ کھڑے رہ سکیں۔ ایک آہ بھر کر تلوار کے سہارے سے بیٹھ گئے۔

سو بتلائیے! حضرت عمر کو یہ صدمہ پہلے کیوں نہ ہوا۔ حالانکہ معراج روحانی میں بھی مفارقت موجود تھی اور وہ بھی بالکل مشابہ موت کے تھی۔ اب کیوں صدمہ ہوا تو بات یہ ہے کہ پہلے تو یہ خیال تھا کہ مفارقت دائمہ نہیں۔ تھوڑی دیر کی ہے ابھی حضور تشریف لے آئیں گے۔ اور اب یقین ہو گیا کہ حضور اس دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔ جو کہ بمنزلہ مفارقت دائمہ کے ہے۔ اس لئے رنج ہوا پس ثابت ہو گیا کہ اصل سبب رنج کا موت نہیں بلکہ مفارقت دائمہ ہے۔

سرکار دو جہاں کی پسند

ورنہ موت تو اصل میں معنی حیات ہی ہے اور اس سبب کی تعیین سے یہ شبہ بھی دفع ہو گیا کہ جب تمہارے قول کے مطابق موت بھی حیات ہی ہے اور فی نفسہ موت کو حیات پر ترجیح ہے تو پھر صحابہ کو آپ کے وصال سے رنج کیوں ہوا۔ خوش ہونا چاہئے تھا کہ حضور کو افضل حالت نصیب ہوئی۔ وجہ دفع کی اوپر کی تقریر سے ظاہر ہے کہ صحابہ کو رنج اس لئے ہوا تھا کہ وہ حضور کے وصال کو حیات سے افضل نہ سمجھتے تھے اس کی تو صحابہ سے تصریح ہے جو عنقریب آتی ہے بلکہ رنج اس کا تھا کہ حضور ہم سے جدا ہو گئے اور آپ کی برکات ہم سے منقطع ہو گئیں۔ چنانچہ (مسلم میں ہے) ایک بار حضرات شیخین حضور کے وصال کے قریب ہی حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کو گئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلانے پلانے والی تھیں۔ حضور اکرم بھی ان کے ملنے کو گاہے گاہے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اسی سنت کے مطابق حضرات شیخین بھی تشریف لے گئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کر کے رونے لگیں۔ حضرات شیخین نے فرمایا اے ام ایمن! کیوں روتی ہو! کیا تم کو معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ کے پاس کی نعمتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے (دنیا سے) بہتر ہیں (یہ فرمانا کیا تم کو معلوم نہیں اپنے فرمان سے بتلا رہا ہے کہ یہ صحابہ کے نزدیک اولیت و مسلمات میں سے تھا) اس پر انہوں نے فرمایا یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔

ولکن الوحی انقطع عنا۔ لیکن حضور کے تشریف لے جانے سے نزول وحی منقطع ہو گیا اس لئے روتی ہوں۔ یہ وہی بات تھی کہ رنج اس کا ہے کہ ہم حضور سے جدا ہو گئے اور حضور ہم سے جدا ہو گئے اور وہ برکات نبوت منقطع ہو گئیں۔ فبکیٰ لذالک الشیخان۔ یہ سن کر حضرات شیخین بھی رونے لگے۔

یہاں اہل ظاہر کو شبہ ہو گا کہ یہ حضرات کیوں رونے لگے۔ یا تو ان کو بھی رونے سے منع کرتے تھے یا خود بھی رونے لگے۔

صاحبو! یہ رونا بھی ان کے محقق ہونے کی دلیل ہے۔ حضرات صحابہ عارف تھے اور عارف بھی کامل۔ اور عارف کامل کا قاعدہ ہے کہ وہ ہر چیز کا حق ادا کرتا ہے عقل کا بھی طبع کا بھی۔ تو حضرات شیخین نے اول تو عقل کا حق ادا کیا کہ عقلاً عاشق کو محبوب کے لئے وہی بات پسند کرنا چاہئے جس کو محبوب خود پسند کرتا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت ہی محبوب ہے چنانچہ (حدیث متفق علیہ میں ہے کہ) وصال سے پہلے ایک بار حضور نے فرمایا۔

ان اللہ خیر عبدا بین الدنیا و بین ماعندہ فاختار ما عنداللہ فبکی ابوبکر وقال نفدیک باباننا و امھاتنا یا رسول اللہ. (١- المعجم الکبیر للطبرانی ٣:١٤٠، إتحاف السادة المتقین ١٠:٢٩٤، ٢٩٦.)

یعنی حق تعالیٰ نے ایک بندہ کو اختیار دیا ہے کہ چاہے دنیا میں رہیں یا خدا تعالیٰ کے پاس جائیں تو اس بندہ نے خدا تعالیٰ کے پاس جانا پسند کیا۔ حضرات صحابہ اس کا مطلب نہ سمجھے۔ یہ خیال کیا کہ حضور کسی اور شخص کا قصہ بیان فرما رہے ہیں مگر حضرت ابوبکر صدیق سمجھ گئے کہ حضور اپنا ہی واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ وہ رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں صحابہ اس قصہ میں فرماتے ہیں فکان ابوبکر اعلمنا ابوبکر ہم میں سب سے زیادہ عالم تھے کہ وہ مطلب سمجھ گئے۔

اس سے صراحۃً معلوم ہوا کہ حضور کو آخرت پسند تھی۔ اس کے علاوہ وہ اور بھی احادیث ہیں جن میں یہ امر مصرح ہے۔ چنانچہ بیہقی کی حدیث میں ہے جب وقت وصال کا وقت قریب آیا تو حضرت عزرائیل علیہ السلام ملک الموت نے عرض کیا کہ مجھے حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ بدوں آپ کی اجازت کے کچھ نہ کروں۔

فنظر الی جبرئیل فقال یا محمد ان اللہ قداشتاق الی لقائک فقال امض ما امرت بہ. (٢-الصحیح للبخاری ٦:١٨، ٩:١٩، ٨:٩٣، ١٣٣، الصحیح لمسلم ١٨٩٣، مسند الإمام احمد ٦:٨٩، المغنی عن حمل الأسفار للعراقی ٤:١٥٨، إتحاف السادة المتقین ٩:٢١٠، ١٠:٢٨٨)

یعنی اس وقت حضور نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف نظر کی (کہ بتلاؤ میں کونسی حالت اختیار کروں) انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! حق تعالیٰ آپ کے ملنے کے مشتاق ہیں۔ اس کے معنی میں بیہقی نے کہا ہے۔

قد اراد لقائک بان یردک من دنیاک الی معادک زیادته فی قربک

تو آپ نے فرمایا بسم اللہ! اے عزرائیل! اپنا کام شروع کرو (کہ مجھے بھی اپنے پروردگار کے لقاء کا اشتیاق ہے) نیز عین وصال کے وقت آپ یہ فرما رہے تھے۔

اللھم الرفیق الاعلی ۔ اور یہ بھی فرما رہے تھے۔

مع الذین انعمت علیھم من النبین والصدیقین والشھداء والصالحین

یعنی اے اللہ! میں رفیق اعلیٰ کو تلاش کرتا ہوں جہاں ان لوگوں کا ساتھ ہوگا۔ جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ سن کر میں نے سمجھ لیا کہ حضور کو اس وقت اختیار دیا گیا تھا اور آپ نے رفیق اعلیٰ کو پسند فرمایا۔ فاذا لایختارنا بس اب ہمارے پاس رہنا آپ کو منظور نہیں۔

طبعی تقاضا

یہاں سے موت کی ایک وجہ ترجیح علاوہ وجہ مذکورہ بالا یہ بھی نکل آئی کہ حضور کو یہ حالت محبوب تھی۔ اگر حیات کو ترجیح ہوتی تو حضور راجح کو اختیار فرماتے۔ اور جب آپ کو یہ حالت محبوب تھی تو عاشق حقیقی بھی عقلاً آپ کے سفر آخرت کو محبوب سمجھے گا اس لئے اول تو شیخین نے ام ایمن سے یہی فرمایا کہ۔

ماعندالله خیر لرسول الله صلی الله علیه وسلم

خدا تعالیٰ کے پاس نعمتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دنیا سے بہتر ہیں۔

پھر جب انہوں نے اپنے بکا کی یہ وجہ بیان کی کہ ہم سے وحی منقطع ہوگئی جس کا حاصل مفارقت پر صدمہ ہے خواہ مفارقت ذات کہو یا مفارقت برکات دونوں کا ایک ہی حاصل ہے کیونکہ برکات بھی تو ذات ہی کے ساتھ ہیں۔ تو یہ حضرات بھی رونے لگے تو اب طبیعت کا حق ادا کیا کیونکہ طبعی اقتضاء یہ ہے کہ اس مفارقت دائمہ ظاہرہ سے جو حقیقت میں غیر دائمہ ہے کچھ آنسو ٹپک پڑیں عارف کامل سب حقائق کا حق ادا کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ ایک بار بیمار تھے کسی نے مزاج پوچھا۔ فرمایا طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس نے عرض کیا اے امیر المومنین! کیا آپ شکایت کرتے ہیں؟ فرمایا سبحان اللہ! تو کیا میں خدا کے سامنے بہادر بنوں کہ وہ تو مجھے بیمار کریں اور میں کہوں نہیں میں تو تندرست اچھا خاصا ہوں۔

آج کل لوگ بزرگ اسی کو سمجھتے ہیں کہ اس پر چاہے کچھ ہی گزر جائے مگر زبان سے یوں ہی کہتا رہے کہ ہم اچھے ہیں۔ یہ غلطی ہے عارف وہ ہے کہ جب حق تعالیٰ اس کو ناتوانی دیں تو اپنا عجز ظاہر کرے جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک بار وہ بیٹھے رو رہے تھے۔ کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا بھوک لگ رہی ہے اس نے کہا آپ کیا بچے ہیں جو بچوں کی طرح بھوک سے رونے لگے۔ فرمایا ارے بے وقوف اور اگر محبوب نے مجھے بھوک اسی واسطے لگائی ہو کہ مرا رونا دیکھیں تو پھر کیوں نہ روؤں۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھو کہ حق تعالیٰ نے جو اپنے بندوں کو حقائق دیئے ہیں ان میں جہاں ایک عقل دی ہے وہاں ایک اور چیز بھی دی ہے جس کا نام طبیعت ہے اور ہر چیز کے جدا مقتضیات ہیں۔ عقل کا تو مقتضا یہ ہے کہ محبوب کو جو چیز پسند ہو ہم بھی اس کو پسند کریں اور طبیعت کا مقتضا یہ ہے کہ اس مفارقت عارضہ سے جو بشکل مفارقت دائمہ کے ہے کچھ دو چار آنسو بھی بہ جائیں۔

یہ جو قید لگائی بشکل مفارقت دائمہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مفارقت عارضہ تو ایسی ہے جو حقیقت میں بھی عارضہ ہے اور شکل میں بھی عارضہ ہے جیسے کوئی جلال آباد چلا جائے اور ایک مفارقت عارضہ وہ ہے جو شکلاً دائمہ ہو وہ موت ہے۔ اس کا مقتضا طبعی یہی ہے کہ کچھ حزن عارضی ہو اور میں نے دائمہ کی تفسیر اوپر کی تھی کہ اس کے عود کرنے سے مایوسی ہو۔

اس سے ایک شبہ کا رفع کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ گو میت تو ہمارے پاس نہیں آتی مگر ہم تو مر کر اس عالم میں جانے والے ہیں پھر مفارقت دائمہ کہاں ہوئی خصوص حضرات صحابہ اور ان میں سے خصوص مبشرین بالجنہ کہ ان کا اجتماع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یقینی ہے پھر ان کو کیوں رنج ہوا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صاحبزادی کی وفات پر کیوں رنج ہوا؟

سو اس قید سے جواب نکل آیا کہ اللہ تعالیٰ نے طبیعت کی ایسی ہی خاصیت بنائی ہے کہ باوجود تیقن اجتماع کے جب عدم عود الی ہذا العالم معلوم ہو جائے ضرور حزن ہوتا ہے اور یہ ایسا امر طبعی ہے کہ اگر کوئی دوسری کیفیت اس پر غالب آ جاوے تو خیر ورنہ یہ اپنا اثر ضرور کرتی ہے۔

جیسا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ حدیث میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور کے مرض وفات میں مزاج پرسی کے لئے تشریف لائیں۔

فسارها فبكت فلما راى حزنها سارها الثانية فضحكت

یعنی حضور نے خفیہ طور سے کوئی بات ان سے کہی تو وہ رونے لگیں۔ پھر دوبارہ کوئی بات چپکے سے فرمائی تو ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں مجھ کو تعجب ہوا کہ ایک ہی جلسہ میں روتی بھی ہیں ہنستی بھی ہیں۔ ان کو کیا ہو گیا اور فرماتی ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ میں تو فاطمہ کو ایک بڑی عاقلہ جانتی تھی یہ تو معمولی عورت نکلیں۔ پھر دوسرے وقت اس کا سبب پوچھا کہ تم ایک ہی جلسہ میں روتی اور ہنستی کیوں تھیں۔ تو انہوں نے فرمایا یہ حضور کا ایک راز ہے جس کو میں ظاہر نہیں کر سکتی۔ حضرت عائشہ نے حضورؐ کے وصال کے بعد پھر دریافت فرمایا تو حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ ہاں اب بتلانے میں کوئی عذر نہیں۔ بات یہ ہے کہ حضور نے اول تو مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام ہر رمضان میں مجھ سے ایک بار قرآن کا دور کرتے تھے۔ اس سال دو مرتبہ کیا ہے۔ اس کو میں سمجھتا ہوں کہ میرا وقت قریب آ

گیا ہے۔ یہ سن کر تو میں رونے لگی۔ اس پر دوسری دفعہ آپ نے فرمایا کہ اے فاطمہ میرے متعلقین میں سب سے پہلے تم میرے پاس آؤ گی یہ سن کر میں ہنسنے لگی۔

سو اول مفارقت دائمہ سے رونا آیا گو یہ معلوم تھا کہ مفارقت دائمہ اس معنی کو نہیں ہے کہ میں اس عالم میں بھی جمع نہ ہوں گی۔ مگر پھر بھی رنج ہوا مگر جب حضرت فاطمہ کو معلوم ہو گیا کہ سب سے پہلے آپ کے پاس میں پہنچوں گی تو اس وقت کا ایسا غلبہ ہوا کہ باوجود بقاء مقتضی غم کے سارا غم ڈھل گیا اور اس لایعودالینا ہمارے پاس واپس نہ آئیں گے پر نعودالیہ ہم ان کے پاس لوٹیں گے غالب آ گیا۔ نیز ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی پا کر کہ آپ غم کو زائل کرنا چاہتے ہیں قصداً مسرت ظاہر کی ہو کیونکہ حضور نے یہ دوسری خبر اس واسطے سنائی تھی تا کہ ان کا غم زائل ہو اور خوش ہوں۔ پھر اس پر خوشی کیوں کر ظاہر نہ کرتیں اور یہ ان کے بڑے عاشق ہونے کی دلیل ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں محققین۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں   خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(اگر بادشاہ دیں ہی طمع کے خواہشمند ہوں تو پھر قناعت کے سر پر خاک۔)

اور اس طرح دلیل ہے کہ باوجود طبیعت پر خبر اول سے غم طاری ہونے کے فوراً ہی دوسری خبر کا بھی حق ادا کیا اور یہ سمجھا کہ حضور نے اس خبر سے مجھے مسرور کرنا چاہا ہے تو مجھے مسرت ظاہر کرنا چاہیے تا کہ حضور کا مدعا حاصل ہو جائے اور آپ کو اطمینان ہو جائے کہ لخت جگر کا غم ٹل گیا)

خلاصہ یہ ہے مفارقت عارضہ بشکل مفارقت دائمہ کا طبعی مقتضی یہ ہے کہ اس پر کچھ حزن ضرور ہو۔ خدا تعالیٰ نے ہر چیز میں ایک خاصیت رکھی ہے۔ اس مفارقت دائمہ میں یہی خاصیت ہے کہ اس سے آدمی بے چین ہو جائے اور دو چار آنسو نکل پڑیں۔ پس عارف وہ ہے جو اس کا بھی اثر لے اور عقل کا بھی یعنی بواسطہ عقل کے تو راضی رہے اور طبیعت سے رنجیدہ ہو۔

عارفین کی حالت

اس لیے کہتے ہیں کہ محقق جامع اضداد ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ اضداد صوریہ کو جمع کر دیتا ہے۔ اضداد حقیقیہ مراد نہیں۔ اسی کو کہتے ہیں۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختین

(ایک ہاتھ میں شریعت کا دوسرے میں عشق کا جام ہو ہوسناک دونوں کے ساتھ بیک وقت نمٹنا نہیں جانتا)

عارف کی حالت اس وقت یہ ہوتی ہے کہ آنکھ رو رہی ہے اور قلب ہنس رہا ہے۔ کوئی ہے جو ایسا کر سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کر کے دکھا دیا اور آپ کے وارثوں نے بھی اس پر عمل کیا ہے۔ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا وصال ہونے لگا تو آپ کی

آنکھ سے آنسو جاری تھے اور زبان سے بھی حزن کا اظہار فرما رہے تھے۔ دل غمگین بھی تھا اور ساتھ ہی راضی بقضاء اللہ بھی تھے۔ چنانچہ حدیث میں حضور کے یہ الفاظ وارد ہیں۔

العین تدمع و القلب یحزن و لانقول الا مایرضی ربنا و انا بفراقک یاابراهیم لمحزونون (کنز العمال: ۳۲۲۸۳، ۳۲۸۹۸، تلخیص الحبیر لابن حجر ۱۳۹:۲، الطبقات الکبری لابن سعد ۸۹:۱:۱)

یعنی گو دل غمگین ہے اور آنکھ بہ رہی ہے مگر ہم کہیں گے وہی بات جو حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ اب بھی بعضے اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں جو دونوں کا حق ادا کرتے ہیں۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کا مکان گر پڑا۔ رنج بھی ہوا۔ پھر قہقہہ مار کر ہنسے کہ اب ہم کہاں رہیں گے۔ اس میں خدا تعالیٰ کے فعل پر رضا کا اظہار تھا کہ وہ پریشان کر کے تھوڑی دیر نچانا چاہتے ہیں تو ہم کو اس پر بھی راضی رہنا چاہئے۔ یہ تو اہل مقام حضرات ہیں اور بعضے اہل حال ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے کسی عزیز کی موت پر مطلق نہیں روئے بلکہ ہنس دیئے مگر وہ ہمارے مدرسہ سلوک کے مڈل پاس ہیں۔ بی اے نہیں۔

گو آپ تو شاید یہی کہیں گے کہ بڑا کامل ہے مگر حقیقت میں وہ بڑا کامل ہے کہ رویا بھی نہیں۔ ارے جب حق تعالیٰ رلانا چاہتے ہیں تو دو آنسو بہانا چاہئیں تھے وہ حال کے زوال کے بعد بھی اپنی رائے سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک کا تو حق ادا کریں یعنی محبت حق کا کہ خدا کے فعل پر راضی رہے۔ اب اگر طبیعت کا حق بھی ادا کریں اور رونے لگیں تو اس سے دوسرا حق فوت ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ غلطی ہے دونوں کا حق ساتھ ساتھ ادا ہو سکتا ہے۔ اس طرح کہ طبعاً رنج کرو اور عقلاً راضی رہو۔ اس میں خدا تعالیٰ کی محبت اور مخلوق کی محبت کہ اس محبت کا حق خدا تعالیٰ ہی نے بتایا بھی ہے۔ دونوں کا حق ادا ہو گیا یہ حالت کامل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے واقعہ میں روئے ہیں اور حضرات صحابہ بھی روئے ہیں جو انبیاء کے بعد اکمل الناس ہیں۔

جب ثابت ہو گیا کہ یہ اثر حزن وغیرہ مفارقت دائمہ بالتفسیر السابق کا ہے تو یہاں سے اس اعتراض کے اس جواب کی تفصیل بھی ہو گئی جو ذرا اوپر مذکور ہوا تھا کہ اگر ولادت صورۃً موت ہے عالم ارواح کے اعتبار سے تو چاہئے جب کوئی روح دنیا میں آوے تو عالم ارواح میں شور و شیون برپا ہو جاوے۔ وجہ جواب ظاہر ہے کہ یہاں کی موت کے وقت تو ہمارا یہ ادراک ہے کہ لا یعود الینا۔ اور وہاں یعود الینا یعنی پھر ہمارے پاس آ جاوے گا اس لئے ان کو رنج نہیں ہوتا۔ مگر باوجود اس کے چونکہ یہ بھی احتمال ہے کہ شاید ہمارے پاس نہ آوے اس احتمال کے غم میں اتنا اثر ہوتا ہے کہ جب کوئی روح بعد موت اس عالم میں بخیریت پہنچتی ہے تو ارواح بے حد مسرور ہوتی ہیں۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے تو یہ فرحت بتلا رہی ہے کہ اس کے قبل کچھ کلفت تھی۔ یہ اثر تو احتمال کا تھا اور اگر کبھی یہ احتمال واقع اور محقق ہو جاتا ہے تو پھر وہ کلفت ظاہر ہو جاتی ہے۔

چنانچہ حدیثوں میں ہے کہ آنے والی روح سے اگر کسی کا مرنا سنتی ہیں جو ان کے پاس نہیں پہنچا تو افسوس کرتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے دوزخ میں گیا۔ البتہ اس افسوس میں یہاں کا سا رنج نہیں ہوتا یعنی عالم ارواح میں مفارقت کا رنج اتنا نہیں ہوتا جتنا یہاں کی موت سے مفارقت کا رنج ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ عالم ارواح میں طبیعت حاکم نہیں' یہاں طبیعت حاکم ہے اور یہ دوسرا جواب ہے اس شبہ کا اگر حیات موت ہے تو چاہئے کہ جب کوئی روح دنیا میں آتی ہوگی' تو شاید یہ ارواح بھی روتی ہوں گی ۔جیسے یہاں سے کسی کے مرنے پر ہم لوگ روتے ہیں۔

بہر حال اس تقریر سے سب شبہات رفع ہو گئے اور مدعا ثابت ہو گیا کہ یہ حیات دنیویہ معنی موت ہے تو پھر یہاں کی موت وہاں کی حیات ہے گو یہاں کی موت پر طبعاً حزن بھی ہوتا ہے اور کاملین کو بھی ہوتا ہے تو وہ مقتضا طبع کا ہے جیسا فرح مقتضا عقل کا ہے اور گو وہ حضرات اپنی قوت عقلی سے اس مقتضیات طبع کو روک بھی سکتے ہیں مگر اس حزن و بکاء میں وہ حکمتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اس لئے وہ امر طبعی کو روکتے نہیں۔ چنانچہ اس حکمت کا بیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادہ کے واقعہ وفات میں ارشاد بھی فرمایا۔ انما ھذہ رحمۃ الخ پس اس کلیہ کی بنا پر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر وفات میں بھی جہاں طبعاً حزن ہے وہاں عقلاً حضور کی فرح سے فرح بھی ہونی چاہئے۔

رحمۃ للعالمین

میں وفات سے فرح کرنے کو نہ کہوں گا بلکہ بیچ میں ایک واسطہ بڑھاتا ہوں کہ حضور کی فرح سے عقلاً فرح بھی ہونا چاہئے اور حضور کے لئے اس واقعہ کا موجب فرح ہونا حدیثوں سے معلوم' قرآن سے معلوم' اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ احادیث تو بعض گزر چکی ہیں۔ قرآن میں ہے۔

وللاخرۃ خیرلک من الاولیٰ اور آخرت آپ کے لئے دنیا سے بہت بہتر ہے۔

چنانچہ نشر الطیب میں ہے کہ طبرانی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ جب سورہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ نازل کی گئی تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ مجھ کو میری موت کی خبر اشارہ سنائی گئی ہے تو جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ تو آیت کا شامل ہونا اس واقعہ کو صریح معلوم ہوا اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جس کو خیر فرمادے وہ آپ کو محبوب کیوں نہ ہوگا اور جب محبوب ہے تو پھر اس پر حضور کو فرح کیوں نہ ہوگا تو ہم کو بھی عقلاً اس پر فرح ہونا چاہئے کہ حضور کو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے وہ برکات و درجات آخرت میں عطا فرمائے جن کو آپ چاہتے تھے اولاً و بالذات آپ کو اور ثانیاً و بالعرض آپ کی امت کو اور یہاں سے حضور کی شان رحمۃ للعالمین ہونے کی ظاہر ہوتی ہے کہ واقعی آپ مجسم رحمت ہیں اور آپ کی ہر بات میں رحمت ہے اور ایسی رحمت ہے کہ آپ کا یہ واقعہ فاجعہ ہائلہ بھی موجب رحمت و برکت ہو گیا اور جب امت کے لئے واسطہ

رحمت ہوگیا۔ تو آپ کے لئے کیسا کچھ ہوگا۔ جس کا بیان عنقریب آتا ہے مگر اس سے پہلے یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہے اس کو حل کرتا چلوں۔

وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب رحمۃ للعالمین ہیں تو ابو جہل پر بھی کچھ رحمت ہونا چاہئے۔ کیونکہ عالمین میں تو وہ بھی داخل ہے اور کوئی قید یہاں ہے نہیں تو ابو جہل پر کیا رحمت ہوگی؟ کیا آخرت میں بخشا جائے گا یہ تو نصوص کے خلاف ہے یا کچھ عذاب کم ہوگا تو اس کی کوئی دلیل نہیں۔

ابو طالب کے لئے تو حدیث میں تخفیف عذاب کی خبر ہے گو یہ نہ ہوا کہ جیل خانہ سے بالکل نکال دیئے گئے ہوں حالانکہ حضور کے رشتہ دار تھے۔ جاں نثار مددگار بھی تھے مگر ایمان نہ تھا۔ بس اتنی رعایت کر دی گئی اور واقعی بڑی رعایت ہے کہ سب سے کم عذاب ابو طالب کو ہے۔ مگر ہاں رشتہ داریوں اور خدمت گزاریوں سے کام نہیں چلتا وہاں تو ایمان سے کام چلتا ہے۔ اس سے حق تعالیٰ نے گو یہ بتلا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندے ہیں رشتہ دار نہیں۔ اگر رشتہ دار ہوتے تو آپ کا رشتہ دار خدا تعالیٰ کا بھی رشتہ دار ہوتا۔ خدا تعالیٰ اپنے رشتہ دار کو تھوڑا ہی عذاب کرتے ضرور نجات دے دیتے۔ کیا حق تعالیٰ کو نعوذ باللہ یہ قدرت نہیں ہے کہ بالکل نجات دے دیتے مگر یہ بتلا دیا کہ ہم ایسے قادر ہیں کہ اتنے بڑے معزز و مقرب رسول کے چچا کی بھی پروا نہیں کرتے۔

سلاطین دنیا ایسے موقع پر ضرور دب جاتے ہیں جب کہ وزیر اعظم کا کوئی عزیز جرم کا ارتکاب کرے تو اس کو بے تکلف سزا نہیں دے سکتے کیونکہ وزیر اعظم کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جس سے سلطنت پر خطرہ ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ کو نہ کسی کا خطرہ نہ ان کے مقرب ایسے جو مرضی حق کے خلاف کا قصد کریں۔ تو اس سے یہ بتلا دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے بندے اور رسول ہیں رشتہ دار نہیں ورنہ ان کا چچا ہمارا بھی چچا یا بھتیجا کچھ تو ہوتا۔ پھر اس کا عذاب کرنا سہل نہ ہوتا۔ وہ ضرور مقابلہ کرتا۔ بس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا یا خدا کا رشتہ دار نہ بناؤ بلکہ بندہ ہی سمجھو۔ مگر ایسے بندہ ہیں جیسے ایک بزرگ کا مقولہ ہے۔

بشر لا کالبشر بل کالیا قوت بین الحجر

یعنی ہیں تو بشر مگر ایسے بشر ہیں۔ جیسے پتھروں میں یاقوت کہ وہ بھی پتھر ہی ہوتا ہے مگر سب سے ممتاز۔ جن لوگوں نے حضور کو الوہیت تک پہنچایا ہے۔ اس واقعہ سے ان کی آنکھیں کھلنی چاہئیں۔

غرض سوال یہ ہے کہ ابو جہل پر آپ کی رحمت کا کیا اثر ہوا۔

اس کا ایک جواب تو تکلف کا یہی ہے کہ ممکن ہے کہ جتنی سزا جہنم میں اس کو استحقاقاً ملتی حضور کی برکت سے اس میں کچھ کمی ہوگئی ہو مگر یہ تکلف کا جواب ہے۔ طالب حقیقت کو اس سے تسلی نہیں ہوسکتی گو مناظرہ میں خصم کو بند کرنے کے لئے کافی ہے کیونکہ قواعد علمیہ میں معترض کے مقابلہ میں احتمالات نکال دینا کافی ہے جس کا حاصل منع ہے۔

الحمدللہ! کئی مہینے ہوئے اس اشکال کا ایک اور جواب میرے دل میں آیا ہے۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ ہادم بناء اشکال ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ یہاں رحمت سے مراد رحمت تبلیغ وارسال ہے نجات وآخرت کے اعتبار سے رحمت مراد نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ الا رحمۃ اس جگہ ارسال کی غایت ہے۔ یہ اس کا قرینہ ہے کہ یہاں رحمت سے وہی مراد ہے جو ارسال پر مرتب ہوتی ہے۔ نیز اس سے پہلے ارشاد ہے۔

اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ

بے شک اس میں کافی مضمون ان لوگوں کے لئے جو بندگی کرنے والے ہیں۔

یہ بھی اس کا قرینہ ہے کہ یہاں تبلیغ کی برکات کا ذکر ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ ہم نے جو آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے تو اس سے اہل عالم پر مہربانی کرنا منظور ہے کہ آپ کے ذریعہ سے لوگوں کی طرف وحی پہنچائیں اور ان کو فلاح کے طریقے بتلائیں تاکہ ان کو ہدایت کے راستے معلوم ہوں۔ خدا تک پہنچنے اور اس کو راضی کرنے کا طریقہ واضح ہو جائے۔ یہاں یہ خاص مہربانی ورحمت مراد ہے اور ظاہر ہے کہ یہ رحمت تمام عالم کو عام ہے کوئی فرد بشر اس سے محروم نہیں رہا چاہے کوئی ہدایت قبول کرے یا نہ کرے یہ اس کا فعل ہے مگر حق تعالیٰ کی طرف سے تو رحمت میں کمی نہیں ہوئی۔

شاگرد پر استاد کی عنایت یہی ہوتی ہے کہ وہ اس کو سبق پڑھا دے اور شفقت سے سمجھا دے۔ اب شاگرد توجہ نہ کرے اور سر اسمجھانے سے بھی سمجھنے کا قصد نہ کرے تو استاد کی شفقت میں اس سے کیا کمی ہو سکتی ہے کچھ بھی نہیں۔

پس یہاں یہ رحمت مراد ہے کہ ہم نے مکلفین کے حال پر رحم کر کے قرب ونجات کے طریقے کھول دیئے ورنہ ان کو خود اپنی عقل سے خدا تعالیٰ کے راضی کرنے کا طریقہ دریافت کرنا پڑتا اور اس میں جو مصیبت تھی ظاہر ہے اور مصیبت جھیلنے کے بعد بھی اطمینان نہ ہوتا کہ خدا تعالیٰ اس فعل سے واقع میں راضی ہیں یا نہیں اور اب کوئی خلجان نہیں وحی نے سب باتیں صاف صاف بیان کر دیں۔ اب ذرا مہربانی کر کے اس جواب پر تو کچھ اشکال کیجئے بحمد اللہ تعالیٰ اس پر کوئی اشکال وارد نہ ہوگا اور ثابت ہو گیا کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لئے رحمت ہیں۔ یہ جواب ہے جس سے سارے اشکالات کی جڑیں اکھڑ گئیں اور جواب کا لطف یہی ہے کہ سلیس بھی ہو اور نفیس ہو۔ سو اس جواب میں دونوں باتیں موجود ہیں۔ یہ تو آپ کی شان رحمت عامہ کے متعلق کلام تھا۔

فتح مکہ

باقی اگر رحمت خاصہ کے اعتبار سے دیکھا جاوے تو اس کو مدلول اس آیت کا نہ کہیں گے۔ اس لئے کوئی اشکال ہی متوجہ نہ ہوگا اور آپ کی ہر حالت اور ہر واقعہ کا موجب رحمت ہونا حتیٰ کہ واقعہ سفر

آخرت کا بھی۔ خود آپ کے لئے بھی اور آپ کی امت کے لئے بھی بلا غبار ثابت رہے گا۔

اب وقت آ گیا کہ حسب وعدہ قریبہ ان برکات کا بیان کیا جاوے جن کا ظہور اس واقعہ سے ہوا۔ آپ کے لئے اولاً و بالذات اور امت کے لئے ثانیاً و بالعرض۔ اور اس جلسہ سے یہی بیان مقصود ہے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس واقعہ کے برکات ان برکات سے بہت زیادہ ہیں جن اک ظہور ولادت شریفہ سے ہوا ہے کیونکہ ولادت شریفہ ان برکات کا افتتاح ہے اور یہ واقعہ ان کا مکمل اور ابتداء اور انتہا میں فرق ظاہر ہے اس کو خاص کرنا اور اس کو چھوڑنا کوئی معنی نہیں۔ اور برکات کے ساتھ لفظ ظہور اس لئے کہا گیا کہ حصول تو پہلے سے تھا صرف ظہور خاص وقت میں ہو گیا۔

جیسے کسی کو تحصیلدار بنا دیا جاوے تو عہدہ حاصل اسی وقت ہو گیا مگر ظہور اس وقت ہو گا جب کسی تحصیل کا کام سپرد کر دیا جائے گا۔

اب سب سے اول ان برکات کا بیان کرتا ہوں جو سورت میں صراحۃ یا اشارتاً مذکور ہیں۔ اس کے بعد بقیہ برکات کا احادیث سے بیان کیا جاوے گا۔ اس لئے میں اس سورت کا ترجمہ کرتا ہوں جس میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جو سفر آخرت کے متعلق آپ پر کی گئی ہیں۔ حاصل ترجمہ یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی نصرت سے فتح مکہ ہو جائے اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں اس وقت تسبیح میں حمد کے ساتھ مشغول ہو جیے اور استغفار کیجئے اور یوں سمجھئے کہ ارسال کی جو غرض تھی وہ پوری ہو چکی اب دنیا میں رہنا ختم ہوا۔ آخرت کی تیاری کیجئے اور اللہ اللہ کیجئے کیونکہ تبلیغ کا کام ختم ہوا۔ اب خدا کے پاس جانے کی تیاری کیجئے۔

یہ تو ترجمہ کا حاصل ہے اور یہ اس وقت ہے جب کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے مانا جاوے کیونکہ اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا ہے اور اس کے نازل ہونے کے بعد حضور دو برس اور زندہ رہے نزول کے وقت نہ مکہ فتح ہوا تھا نہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوں گے کا ظہور ہوا تھا۔ اس سورت میں ان آیات میں پیشین گوئی ہے کہ ایسا ہونے والا ہے۔ اس وقت سمجھ لیجئے گا کہ تبلیغ کا مقصود ختم ہو گیا اور فتح مکہ پر اس مقصود کی تکمیل اس لئے موقوف تھی کہ عام لوگ اسلام لانے میں اہل مکہ کے اسلام کے منتظر تھے کہ دیکھئے نبی کی قوم بھی ان کی اطاعت کرتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ عوام کی یہ طبعی بات ہے عقلاء کی تو نہیں کہ وہ کسی شخص کے معتقد بننے میں یہ دیکھا کرتے ہیں کہ اس شخص کے خاندان اور بستی والے کیا چتھا جانتے ہیں۔ وہ ایسے ویسے شخص کے معتقد نہیں ہوا کرتے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ سچے آدمی کے بھی معتقد نہ ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ جھوٹے آدمی کے معتقد ہو جائیں۔ خصوصاً خاندان والے تو بہت دیر میں معتقد ہوتے ہیں کیونکہ ان میں کوئی تو اس شخص کا چچا ہے کوئی ماموں ہے کوئی بھائی بھتیجا ہے جن کو مساوات کا یا ناز کا دعویٰ ہوتا ہے یا بزرگی کا۔ وہ اپنے سے

چھوٹے یا برابر کی اطاعت جبھی کر سکتے ہیں جبکہ کھلم کھلا کوئی ایسی بات دیکھ لیں جو ان کی اطاعت پر مجبور کر دے۔ مگر اس پر عوام ہی کی نظر ہوتی ہے کہ خاندان والوں کا کیا خیال ہے۔ باقی عقلاء کو کسی کے اعتقاد اور عدم اعتقاد پر نظر نہیں ہوتی بلکہ وہ تو کمالات کو دیکھتے ہیں۔ اگر ایک شخص میں کمالات موجود ہوں چاہے خاندان اور بستی ہی کیا ساری دنیا بھی اس کی مخالفت کرتی ہو۔ تب بھی معتقد ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ عقلاء صحابہؓ نے ایسا ہی کیا کہ انہوں نے اہل مکہ یا حضور کے قرابتداروں کی اطاعت کا مطلق انتظار نہیں کیا۔ بعض تو ایسے وقت اسلام لائے تھے کہ حضور کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا اور بعض نے ایسے وقت اطاعت اختیار کی کہ آپ کے ساتھ دو چار ہی آدمی تھے البتہ عام لوگ اس کو دیکھتے ہیں کہ خاص بستی والے اور خاندان والے کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ کیونکہ عوام کی نظر کمالات تک نہیں پہنچتی۔ اس لئے وہ ایسے ایسے قرائن کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق عام طور پر اہل عرب کو اہل مکہ کے اسلام کا انتظار تھا کیونکہ وہاں آپ کی برادری تھی اور اسی لئے کم لوگ مسلمان ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں غالب ہو کر داخل ہوئے تو اس وقت بہت سے اہل مکہ مسلمان ہو گئے اور بعض نے غور و تامل کے لئے مہلت مانگی تو ان کو چار مہینے یا اس سے زائد کی مہلت دی گئی کہ اس مدت میں یا اسلام لے آئیں یا مکہ سے نکل جائیں اس وقت مکہ دار الاسلام ہو گیا اور چند روز میں وہاں ایک بھی کافر نہ رہا اس وقت عام طور پر اہل عرب جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ پہلے تو ایک دو آدمی ہی روزانہ اسلام لاتے تھے اور فتح مکہ کے بعد دیہات اور ایک ایک دن میں ایک ایک ہزار دو دو ہزار اسلام لانے لگے اور جب یہ خبر اچھی طرح پھیل گئی کہ مکہ والے مسلمان ہو گئے ہیں تو پھر قبائل عرب ایک دم سے اُمڈ پڑے اور جو لوگ بعد مسافت کی وجہ سے سب کے سب نہ آ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے وفود بھیجے کہ حضور کو جا کر ہمارے اسلام کی اطلاع کر دو اور وہاں سے احکام دریافت کر کے آؤ۔ چنانچہ اسی لئے ۹ھ کو سنۃ الوفود کہتے ہیں اور اسی لئے آپ ۹ھ میں حج کو تشریف نہیں لے جا سکے حالانکہ فتح مکہ کے بعد حج فرض ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس سال آپ وفود کی تبلیغ و تکمیل میں مشغول تھے۔ پھر ۱۰ھ میں آپ نے حج ادا کیا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ کے بعد ہوا اور ایک روایت یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں اس کا نزول ہوا ہے۔ ان سب روایتوں میں جمع اس طرح ہو سکتا ہے کہ نزول تو فتح مکہ سے پہلے ہوا ہو مگر حضور نے فتح مکہ کے بعد یا حج وداع میں کثرت تسبیح و تحمید کی وجہ بیان فرماتے ہوئے اس سورت کو تلاوت فرمایا ہو۔ راوی نے یہ سمجھ کہ ابھی نزول ہوا ہے مگر جن راویوں نے اس کا نزول فتح مکہ کے بعد متصل یا حج وداع میں مانا ہے۔ ان پر یہ اشکال وارد ہو گا کہ اس میں لفظ اذا ہے جو مستقبل کے لئے آتا ہے۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ نزول کے وقت فتح مکہ و دخول الناس افواجا کا وقوع نہ ہوا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اذا کبھی ماضی کے واسطے بھی آتا ہے جیسے قرآن میں دوسری جگہ ہے حَتّٰٓی اِذَا جَعَلَہٗ نَارًا اور حَتّٰٓی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ۔ تو پہلی تقدیر پر تو ترجمہ یہ تھا کہ جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح مکہ ہو جائے اور آپ لوگوں کو جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو تسبیح وتحمید میں مشغول ہو جیے اور دوسری تقدیر پر ترجمہ یوں ہوگا کہ جب اللہ کی مدد آ چکی ہو اور لوگوں کو اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا آپ نے دیکھ لیا ہو تو اب آخرت کی تیاری کیجئے۔

بالکل شروع وعظ میں بھی اس کا کچھ ذکر ہوا ہے۔ یہ تو ترجمہ اور توجیہ تھی اقوال مفسرین کی۔ اب میں وہ نعمتیں بتلاتا ہوں جو حضور کو یا بتبعا امت کو سفر آخرت کی وجہ سے عطا ہوئیں اور اس سورت میں ان پر دلالت ہے۔

بشارت تکمیل دین

سو اس پر تو سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سورت کا نزول سفر آخرت کی تیاری کے لئے ہوا ہے اور اس کو متعلق کیا گیا ہے چند علامات پر جو اس جگہ مذکور ہیں یعنی نصر و فتح مکہ و رویت دخول الناس فی الدین تو ایک نعمت تو یہ ہوئی کہ آپ کا سفر آخرت سبب ہو گیا شیوع اسلام کا۔ گو ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیوع اسلام آپ کے سفر آخرت کا سبب ہوا کیونکہ سلاطین کی عادت بھی یہی ہے کہ کسی افسر کو کسی کام کی تکمیل کے لئے بھیجتے ہیں۔ کام پورا ہونے کے بعد اس کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں اور دلالت لفظ سے بھی یہی متبادر ہے۔ چنانچہ یہاں لفظ اذا یہی بتلا رہا ہے کیونکہ اذا تعلیق کے لئے ہے تو مجئی نصر فتح مکہ وغیرہ معلق علیہ ہے اور تیاری آخرت معلق۔ اور ظاہر ہے کہ معلق علیہ سبب ہوا کرتا ہے معلق کا۔ لیکن اگر نظر کو گہرا کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ واقع میں یہاں معلق سبب ہے معلق علیہ کا آگے اس کی دلیل آتی ہے سو اس بناء پر یہاں معلق علیہ محض علامات کے درجہ میں ہوگا۔ اس کو معلق کے ساتھ سببیت یا علیت کا تعلق نہیں ہوگا۔

بس اس کی مثال بالکل ایسی ہے (جیسے ہم کسی کو کہیں بھیج کر اس سے کہہ دیں کہ جس وقت ہم جھنڈی ہلا دیں اس وقت واپس چلے آنا۔ تو ظاہر میں تو جھنڈی کے ہلنے کو دخل ہے اس شخص کی واپسی میں مگر حقیقت میں اس کی واپسی کو جو کہ اصل مقصود ہے دخل ہے جھنڈی کے ہلنے میں اور اس کی دوسری مثال یہ ہے ۱۲)

جیسے کوئی بادشاہ ایک انجینئر کو جو کہ اس کا محبوب و مقرب ہے کسی جگہ بھیجے کہ وہاں جا کر ایک نہر کھدواؤ جس سے تمام ملک کو سیرابی حاصل ہو۔ وہ گیا اور وہاں جا کر اس نے اپنے عملہ کے ساتھ کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ چند روز کے بعد بادشاہ کو اس کا اپنے پاس جلدی بلانا مقصود ہوا۔ اس لئے ایک بہت بڑا عملہ اس کام کی تکمیل میں اس کی امداد کے لئے اس کی ماتحتی میں بھیج دیا جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں نہر کو کھود کر اور انجینئر کے حکم اور نقشہ کے مطابق بنا سنوار کر درست کر دیا اور اس نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ حضور کا کام پورا ہو گیا وہاں سے حکم ہوا کہ اچھا اب تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ تو ظاہر

میں تو تکمیل نہر کی اس کے بلانے کا سبب ہوا مگر حقیقت میں بادشاہ کا اس کو بلانا تکمیل نہر کا سبب ہوا۔ اگر وہ اس کو جلدی بلانا نہ چاہتا تو دوسرا عملہ کیوں بھیجتا۔

اب اس کی تحقیق باقی ہے کہ جب تعلیق میں دونوں صورتیں ہوتی ہیں تو یہاں دونوں احتمال ہوئے ایک کی تعیین کی کیا دلیل؟

جواب یہ ہے کہ قرائن سے تعیین ہو جاتی ہے۔ یہاں آپ کی محبوبیت قرینہ مرجحہ ہے اس احتمال کا۔ چنانچہ اوپر بیہقی کی حدیث میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقولہ **یا محمد ان اللہ قد اشتاق الی لقائک** اس پر صریح دال ہے کہ بلانے کا سبب اشتیاق ہے۔ تو بلانا جن اسباب پر موقوف تھا ان کی تکمیل بھی اس اشتیاق کے سبب فرمائی۔ تو سبب ہوا بلانا اور تکمیل دین مسبب ہوا۔ پس اس پر تعلیق علامت پر تعلیق ہوئی نہ کہ سبب پر۔ یعنی حق تعالیٰ نے حضور کو بلانا چاہا اور کام پورا ہوا نہ تھا اس لئے حق تعالیٰ نے اس کا یہ سامان فرمایا کہ ایک دم سے ملائکہ کو حکم دیا کہ مجاہد مسلمانوں پر سکینہ نازل کرو اور کفار کے دل میں رعب ڈال دو۔ اس سے تو مکہ فتح ہو گیا۔ پھر ملائکہ کے دوسرے عملہ کو حکم دیا کہ لوگوں کے قلب میں اسلام کی طرف میلان پیدا کرو۔ اس سے جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں حضور کے سامنے ہی جزیرہ عرب سب مسلمان ہو گیا اور صحابہ کو جابجا اشاعت اسلام و فصل حکومت و قضا کے لئے بھیج دیا۔ اب آپ کو بھی اطمینان ہو گیا کہ آئندہ کے لئے یہ لوگ اشاعت اسلام کا کام کرنے کے لئے کافی ہیں اور اتنے آدمی مسلمان ہو گئے ہیں جو تمام عالم میں اسلام کو پھیلا سکتے ہیں اس وقت حضور کو اطمینان کی حالت میں بلا لیا گیا۔ اس برکت کا اثر حضور پر بھی ہے یعنی تکمیل اجر تبلیغ اور امت پر بھی ہے۔ یعنی تکمیل عقائد و اعمال اور یہ نعمت تکمیل دین کی اس سے زیادہ صریح الفاظ میں اس آیت میں مذکور ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

(آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔)

اور یہ آیت بھی آپ کی اخیر عمر ہی میں نازل ہوئی۔ پس یہ سورت اور یہ آیت بشارت تکمیل دین میں گویا مترادف ہیں۔

ارتفاع حجاب

دوسری برکت حضور کی سفر آخرت کی یہاں اور بھی مذکور ہے گو صراحۃً نہیں لیکن اشارۃً ہے وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے۔

انہ لیغان علی قلبی و انی لاستغفر اللہ فی الیوم سبعین مرۃ، رواہ مسلم ۱۲۳)

(الصحیح لمسلم کتاب الذکر: ۴۱، سنن أبی داود: ۱۵۱۵، مسند الإمام أحمد ۴، ۲۱۱، ۲۶۰، مشکوۃ المصابیح: ۲۳۲۴، الدر المنثور ۶: ۶۳، کنز العمال: ۲۰۷)

یعنی حضور فرماتے ہیں کہ کبھی میرے دل پر بھی غین طاری ہو جاتا ہے۔ جس کے معنی لغتاً غبار کے ہیں۔ لغوی ترجمہ یہ ہوا کہ کبھی میرے دل پر بھی غبار آ جاتا ہے اور میں اس کے تدارک کے لئے دن میں ستر دفعہ (یا سو دفعہ) استغفار کرتا ہوں۔

اس حدیث کی شرح میں علما چکرا گئے ہیں کیونکہ یہ کس کی مجال ہے جو حضور کے دل پر غبار آنا مان لے۔ آپ کا دل تو آئینہ مصفا ہے۔ اگر آپ کے دل پر غبار آ سکتا ہے تو پھر ہمارا تو کہاں ٹھکانہ رہے گا۔ پھر یہ کس کی مجال ہے جو اس حدیث کی حقیقت بیان کر سکے کہ حضور کی مراد غین سے کیا ہے۔ آخر کار بعض نے تو تنگ آ کر یہ کہہ دیا کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے۔ اس کی تفسیر کرنا اور اس میں غور کرنا نہیں چاہئے اور واقعی بہت اچھا کہا۔ ادب کی بات یہی ہے کہ جس بات کی حقیقت معلوم نہ ہو وہاں ذہن کے گھوڑے نہ دوڑائے اور جس مقام پر آدمی پہنچے نہیں وہاں عقلی خیالات دوڑانا محض فضول ہے۔

ایک عارف سے کسی نے پوچھا تھا کہ معراج میں حضور کے ساتھ حق تعالیٰ نے کیا باتیں کیں۔ انہوں نے جواب دیا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں   بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

اب کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا۔

اسی طرح ایک مجذوب سے کسی نے ایک واقعہ کی نسبت دریافت کیا کہ اس کا کیا انجام ہو گا۔ تو وہ بہت خفا ہوئے۔ کہا مجھے کیا خبر انجام کیا ہو گا۔ کیا میں اللہ میاں کا سررشتہ دار ہوں یا ممبر کمیٹی ہوں کہ مجھ سے پوچھ پوچھ کر وہ کام کرتے ہیں۔

واقعی آج کل تو لوگ مجذوبوں کو اللہ میاں کا رشتہ دار ہی سمجھتے ہیں کہ ان کو سب خبر ہے۔ سو یہ تو غلط ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ لوگ تخمینے بہت لگاتے ہیں کوئی بات انہیں معلوم ہو جاتی ہے تو پیٹ کے ہلکے ایسے ہوتے ہیں کہ فوراً بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں۔ اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

راز درون پردہ زرندان مست پرس   کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

پردہ کے اندر کا راز رندوں سے مت پوچھو یہ اونچا مرتبہ صوفیوں پر روشن نہیں ہے۔

یہ مطلب نہیں کہ محقق کو کچھ معلوم نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ محقق صاحب مقام ہوتا ہے صاحب حال نہیں ہوتا جس سے مغلوب ہو جاوے اس لئے وہ کبھی ان امور کو ظاہر نہ کرے گا پتہ بھی نہ دے گا بہر حال بہت سوں نے اس حدیث کو متشابہ کہہ دیا۔ مگر صوفیہ چونکہ بہ نسبت اوروں کے حقیقت شناس ہوتے ہیں اور ذوق سے مطمئن بھی ہو جاتے ہیں اس لئے انہوں نے اس کو متشابہ نہیں کہا بلکہ مطلب بیان کیا ہے چونکہ قواعد شرعیہ

کے خلاف نہیں اس لئے نہایت لطیف مضمون ہے اور اگر کسی کو اس سے قناعت ہو جائے تو علم عظیم ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ یہ غین وہ نہیں جو عام قلوب پر گناہوں کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ اس سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منزہ و ارفع و اعلیٰ ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی مذاق توجہ الی اللہ بلا واسطہ ہے اور یہ مذاق حضور کا طبعی ہے حتیٰ کہ قبل وحی اس کا ظہور غار حرا کا خلوت سے ہوتا تھا۔ غرض مذاق تو یہ تھا اور آپ کے سپرد ہوا کام تبلیغ کا جس میں توجہ الی اللہ بواسطہ تھی اہل ظاہر تو اس کو توجہ الی الخلق کہیں گے مگر محقق کبھی ایسا نہ کہے گا بلکہ وہ اس کو بھی توجہ الی الحق کہتا ہے مگر بواسطہ خلق۔

جیسے کوئی شخص آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے ہو تو ایک ناواقف ہو جس کو عینک کی خاصیت معلوم نہیں کہ نگاہ اس میں سے نفوذ کر جاتی ہے یہ سمجھے گا کہ یہ شخص عینک کو دیکھ رہا ہے۔ مگر واقف کہے گا کہ یہ ناظر اشیاء بواسطہ عینک ہے۔

اسی طرح کوئی شخص آئینہ میں کسی محبوب کی صورت دیکھ رہا ہے تو ناواقف یوں کہے گا کہ آئینہ کو دیکھ رہا ہے اور محقق جس کو معلوم ہے کہ آئینہ میں محبوب کی صورت کا عکس پڑ رہا ہے یہ کہے گا کہ ناظر محبوب بواسطہ آئینہ ہے۔ اور عارفین کی خصوصاً انبیاء علیہم السلام کی حالت یہ ہے کہ

ما رایت شیئا الا رایت الله فیه بل رایت الله قبله

(کہ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں اس کے اندر بلکہ اس سے پہلے خدا کو دیکھتے ہیں۔)

یہاں سے ایک آیت کی ایک جدید توجیہ سمجھ میں آ جائے گی جو گو کہ تفسیر نہیں ہے مگر لطیفہ تصوفیہ خوب ہے۔ وہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ اثبات توحید کے لئے جو گفتگو کی اس میں کواکب و قمر و شمس وغیرہ کی ھذا ربی فرمانا بھی ان آیات میں مذکور ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝
فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ
مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ
قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ

مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ یہ ارخاء عنان بطور الزام ہے کہ ستاروں کو دیکھ کر فرمایا ہاں بھائی ہاں لو یہ خدا ہے۔ پھر جب وہ غروب ہو گئے تو ان کے نقائص کو ظاہر کر کے توحید کو ثابت کیا کہ خدا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی عالی کبھی سافل۔

مگر ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کو کوکب میں اول ظاہر پر نظر پڑی۔ اس کی نسبت فرمایا۔ ھذا ربی (یہ میرا رب ہے) پھر مظہر کی طرف التفات ہوا اس کی نسبت فرمایا لا احب الافلین۔ مطلب یہ تھا کہ اس کوکب کے اندر جو مجھے نظر آ رہا ہے وہ میرا خدا ہے اور تم جو کوکب کی پرستش کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔

غرض عارفین مخلوق کو مراۃ سمجھتے ہیں سو دوسرے لوگ تو اول مراۃ کو دیکھتے ہیں اور عارفین اول مراۃ کے اندر محبوب کو دیکھتے ہیں تبعاً مراۃ پر بھی نظر پڑ جاتی ہے اس لئے حضور کے لئے تبلیغ کو توجہ الی الخلق نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ توجہ الی الحق ہی ہے مگر بواسطہ خلق ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ آپ کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ بلاواسطہ محبوب کو دیکھوں چونکہ طبعی مذاق یہ تھا۔ اس لئے تبلیغ میں توجہ بواسطہ سے طبعاً تنگی اور کدورت ہوتی تھی۔ اسی نفی واسطہ کی مطلوبیت کو کہتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ محبوب کے رخ انور کو نہ دیکھنے دوں اور نہ کانوں کو اس کی باتیں سننے دوں۔)

جس کو اپنا حجاب بھی گراں ہو اس کو دوسری مخلوق کا واسطہ کیوں گراں نہ ہوگا۔ اس کو آپ نے غین سے تعبیر فرمایا۔ اور گو عقلاً آپ اس میں بھی ہر طرح راضی اور خوش تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ محبوب کو بے حجاب دیکھنے میں اور مراۃ میں دیکھنے میں طبعاً تو فرق ہوتا ہے اور امور طبعیہ اختیار سے باہر ہیں۔ اس لئے یہ تنگی خلاف رضا نہیں مگر طبعاً پھر بھی آپ اس سے استغفار فرماتے تھے باقی یہ کہ استغفار کیوں فرماتے تھے تاکہ اس سے توجہ بلاواسطہ سے توجہ بواسطہ کا تدارک ہو جاوے اور گو یہ تدارک ہر ذکر سے ہو سکتا تھا مگر یہ آپ کا ادب تھا کہ آپ نے سمجھا کہ رفع غین قلب کے لئے حق تعالیٰ نے استغفار ہی کو مشروع فرمایا ہے اور یہ بھی غین ہے گو دوسری نوع ہے تو اس کے لئے بھی تمام اذکار میں سے استغفار ہی مناسب ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھئے کہ اس سورت فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے مغفرت کی درخواست کیجئے) کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی رؤیت بلاحجاب میں مشغول رہنے کی اجازت ہے اور مشغولی بھی فراغ کے ساتھ۔ چونکہ تبلیغ سے فراغ ہو گیا ہائے! حضور تو اس کو سن کر جی اٹھے ہوں گے کہ الحمد للہ اب راحت کا وقت آیا ساری عمر تو تبلیغ میں حجاب کے ساتھ رویت تھی اب تبلیغ کا کام ختم ہو گیا اب بلاحجاب رویت میں مشغول ہوں گے۔

بے حجابانہ در آ از در کاشانہ ما کہ کسے نیست بجز تو درد در خانہ ما

(بے دھڑک اندر آ جا میرے اس کاشانہ (دل) میں تیرے سوا اور کوئی موجود نہیں۔) اور

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم

یہ آنکھ بیچ میں کہاں سے آ گئی۔ بھلا آنکھ اور تجھے دیکھے۔ یہ بھی غیر ہے۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز از حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ انکو محبوب کے رُخِ انور کو نہ دیکھنے دوں اور نہ کانوں کو اسکی باتیں سننے دوں۔) بس اب محبوب ہوں گے اور ہم ہوں گے۔

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا اس کا وقت ہے اور کیسی اچھی زندگی ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست کی ملاقات سے لذت حاصل کرتے۔) اور

چہ خوش ست با تو بزمے بہفتہ ساز کردن — در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیسا لذیذ ہے تیرے ساتھ تنہائی میں ساتھ رہنا تمام تعلقات سے یکسو ہو جانا اور ترقی میں سرشار رہنا۔)

آپ کے تو بال بال میں اس کو سن کر جان آ گئی ہو گی کہ اب رویت بلا حجاب کی اجازت ہو گئی۔ جیسے ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم — جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وقت اب وہ وقت آ گیا کہ میں عُریاں ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں۔)

عریاں سے مراد بے حجاب ہو جانا ہے مگر وہی حجابات جو ہماری استعداد کے اعتبار سے مرتفع ہو سکتے ہیں نہ کہ کل حجابات' یہ مرتبہ تو جنت میں بھی میسر نہ ہو گا۔ وہاں سب سے زیادہ بے حجابی ہو گی مگر اس بے حجابی کے بعد بھی رداء کبریا کا حجاب باقی رہے گا جیسا حدیث میں مصرح ہے البتہ وہ رویت سے مانع نہ ہو گا گو ادراک کنہ سے مانع ہو

بہر حال اس جملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارتفاع حجاب کی بشارت دی گئی ہے کہ رویت بواسطہ خلق کا زمانہ ختم ہوا اب ہم کو بلاواسطہ دیکھو۔ سب حجابات رفع کر دیئے گئے۔ صرف ایک حجاب ناسوتی باقی رہ گیا ہے۔ وہ تو ایک تجلی سے مرتفع ہو جائے۔ جیسے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ غالباً بوعلی قلندر ہیں۔

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد — تا نہ بینم روح تو روح رمیدن ندہم

(اگر میری جان نکالنے کیلئے ملک الموت آ جائے تو جب تک تیرا پر تو نہ دیکھ لوں جان نہ نکالنے دوں)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تجلی روح رمیدن میں دخیل ہے۔

آغاز اجتہاد

حدیث میں آیا ہے کہ آپ اخیر عمر میں ان کلمات کی بہت کثرت فرماتے تھے۔ **سبحانک اللھم اغفرلی** (اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے اے اللہ مجھے بخش دے) اور یہ بھی آیا ہے بتاویل القرآن یعنی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (پس آپ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے استغفار کیجئے) میں جو امر ہے اس کی تعمیل میں یہ الفاظ بکثرت پڑھا کرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ ہے یحییٰ علیہ السلام کے قرب ولادت کی علامت تسبیح زکریا علیہ السلام کی۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسبیح کی تعلیم فرمائی گئی۔ جس سے اشارہ ہے کہ آپ کی ولادت (یعنی ملکوتیہ) قریب ہے۔

پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کو کفارۃ المجلس بھی فرمایا ہے کہ مجلس سے اٹھنے کے وقت ان کو کہہ لیا کرے تو اس مجلس میں جو لغویات اور فضولیات اور غفلت ہو گئی تھی اس کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ یعنی ان کلمات میں یہ خاصیت ہے کہ ان سے حجاب مرتفع ہو جاتے ہیں۔

پس حق تعالیٰ نے تو یہ کلمات حضور کے لئے تجویز فرمائے اور حضور نے اپنے فیض میں امت کو بھی شریک فرمالیا اور ان کے لئے بھی یہ فیض چھوڑ دیا کہ اس کو کفارہ مجلس بنا دیا۔ تو دوسری یہ برکت ہے حضور کے اس سفر آخرت کی۔ جو اس سورت میں مذکور ہے۔ یعنی مشاہدہ بلا حجاب اور آپ کے لئے تو اس کا موجب برکت ہونا ظاہر ہے لیکن بواسطہ اس میں امت کے لئے بھی برکت تھی۔ وہ واسطہ یہ کہ آپ کو اس تیاری کا حکم بسبب آپ کے بلانے کے ہے اور آپ کا بلانا سبب ہے تکمیل اسلام کا۔ جیسا اوپر مذکور ہوا اور تکمیل اسلام کا امت کے لئے موجب برکات ہونا ظاہر ہے۔ (المستدرک للحاکم ۱ : ۵۰۲)

ایک نعمت اس واقعہ میں آپ کی امت کے لئے اور ہے جو متفرع ہے نعمت تکمیل دین پر۔ چونکہ ملزوم کا ذکر لازم کا ذکر ہے اس اعتبار سے گویا وہ بھی اس سورت میں مذکور ہے اور اسی طرح آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا) الخ میں اس نعمت کو مذکور قرار دیا جائے گا اور وہ نعمت یہ ہے کہ اس میں امت کو اجتہاد کی اجازت ہوگی۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ تکمیل دین (جو کہ مدلول ہے سورہ نصر اور آیت اکملت کا) باین معنی تو ہے نہیں کہ تمام جزئیات صریحاً مذکور ہیں بلکہ کچھ فروع ہیں اور کچھ اصول ہیں جن سے فروع حادثہ کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے اجتہاد کون کرتا اور ضرورت ہی کیا ہوتی۔ پھر اجتہاد کے ذریعہ سے ائمہ مجتہدین کے جو کہ حضور کے خلفاء اور وارثان رسول ہیں جو درجات بلند ہوئے وہ کہاں ہوتے اور عام امت کو اختلافات مجتہد ہی سبب توسع ہوا ہے وہ کہاں ہوتا۔ یہ سب برکات آپ کے سفر آخرت سے مسبب ہیں۔

برکات سفر آخرت

یہ تو وہ ہیں جو سورت کے مدلول ہیں صراحتاً یا اشارتاً۔ اب اس کے بعد حسب وعدہ بقیہ برکات کا بلا کسی ترتیب کے احادیث سے بیان کرتا ہوں جو حضور کے سفر آخرت کے متعلق ہیں۔ آپ کے لئے بھی اور امت کے لئے بھی۔ اول مختصراً حدیث لاتا ہوں پھر اس کے ذیل میں وہ برکات و فضائل جو اس حدیث کا مدلول ہیں۔

پہلی حدیث:۔ ارشاد نبوی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امت پر رحمت فرمانا چاہتے ہیں تو اس امت کے پیغمبر کو امت سے پہلے وفات دے دیتے ہیں اور اس پیغمبر کو اس امت کے لئے بطور سامان میر اور سلف کے آگے بھیج دیتے ہیں اور جب کسی امت کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو پیغمبر کے زندہ رہتے ہوئے اس کو سزا دیتے ہیں اور ہلاک کر دیتے ہیں اور وہ پیغمبر دیکھتا ہوتا ہے (رواہ مسلم) اس سے آپ کے سفر آخرت کا امت کے حق میں علامت رحمت ہونا معلوم ہوا۔

دوسری حدیث:۔ آپ ان لوگوں کا ثواب بیان فرما رہے ہیں جن کی اولاد بچپن میں مر جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ جس کا کوئی بچہ آگے نہ گیا ہو۔ آپ نے فرمایا اپنی امت کے لئے میں آگے جاتا ہوں کیونکہ میری وفات کے برابر ان پر کوئی مصیبت نہ ہوئی ہوگی۔ (رواہ مسلم) امت کے لئے آپ کی وفات کی ایک حکمت معلوم ہوئی کہ اس پر صبر کرنے سے ثواب عظیم کے مستحق ہوئے۔

تیسری حدیث:۔ حضور نے فرمایا کہ جس پر کوئی مصیبت پڑے وہ میرے وفات کے واقعہ مصیبت کو یاد کر کے تسلی حاصل کرے (رواہ ابن ماجہ) اس میں ثواب کے علاوہ حکمت تسلی کی معلوم ہوئی۔ (الکامل فی الضعفاء لابن عدی: ۲:۳۹۹۶.)

چوتھی حدیث:۔ قیس بن سعد نے آپ کے سامنے سجدہ کرنے کی آپ سے اجازت چاہی آپ نے فرمایا اچھا اگر تم میری قبر پر گزرو تو کیا اس کو بھی سجدہ کرو گے۔ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو بس ایسا مت کرو (رواہ ابوداؤد) اس سے بھی ایک حکمت وفات کی مستنبط ہوئی کہ آپ ہمیشہ ظاہر میں زندہ رہتے تو تعجب نہیں ہزاروں نادانوں کو آپ پر شبہ الوہیت کا ہو جاتا اور حفاظت ایمان امت کے لئے یہ بڑی رحمت ہے۔

پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں حدیثیں (یہاں سے چھبیسویں حدیث تک سب روایات نشر الطیب سے لی ہیں) جن سے برزخ میں آپ کے یہ فضائل ثابت ہوتے ہیں۔

۵۔ اعمال امت کا ملاحظہ فرمانا یہ حیات میں استیعاب کے ساتھ نہ تھا۔

۶۔ آپ کے جسد مبارک کا زمین پر حرام ہونا حیات میں اسباب طبعیہ سے تاثر ہوتا تھا۔

۷۔ قبر میں نماز پڑھنا یہ حیات میں ہر وقت نہ تھا۔

۸۔ درود پڑھنے والوں کا آپ کو درود پہنچانا یہ حیات میں غائبین کے لئے نہ تھا۔

۹۔ خاص قبر شریف کا درود خود سننا۔ حیات میں بعض مشاغل سماع قریب سے مانع بھی ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ آپ کے مزار شریف پر ستر ہزار فرشتوں کا روزانہ حاضر ہونا۔ یہ حیات میں منقول نہیں۔

گیارہویں حدیث:۔ قیامت میں آپ کی سیادت عامہ اور شفاعت اولیاء ظاہر ہوگی۔ (رواہ مسلم)

بارھویں حدیث:۔ آپ کی امت کی کثرت کا قیامت میں ظاہر ہونا اور سب سے اول جنت کا دروازہ کھلوانا (رواہ مسلم)

تیرھویں حدیث:۔ قیامت میں بالتخصیص آپ کا براق پر سوار ہونا (رواہ ابن زنجویہ)

چودھویں حدیث:۔ شفاعت کبریٰ آپ کو عطا ہونا (رواہ الشیخان)

پندرھویں حدیث:۔ لواء الحمد کا قیامت کے روز آپ کے ہاتھ میں ہونا۔ (رواہ الترمذی)

سولھویں حدیث:۔ سب سے پہلے قبر شریف سے مبعوث ہونا اور اس وقت ستر ہزار فرشتوں کا آپ کے جلو میں ہونا (رواہ الترمذی والدارمی)

سترہویں حدیث: ۔ بعد انشقاق قبر کے سب سے اول آپ کو جوڑا پہنایا جانا (رواہ الترمذی)

اٹھارہویں حدیث: ۔ پل صراط پر اپنی امت کو لے کر سب سے پہلے گزرنا (رواہ الشیخان)

انیسویں حدیث: ۔ سب سے زیادہ آپ کی امت کا حوض کوثر پر مجتمع ہونا (رواہ الترمذی)

بیسویں حدیث: ۔ شفاعت کے مضمون میں آپ کے ذہن میں ایسے مضامین وارد ہونا جواب تک کسی کے ذہن میں نہیں آئے۔

اکیسویں حدیث اور بائیسویں: ۔ مقام محمود اور وسیلہ آپ کو عطا ہونا۔

تیئیسویں حدیث: ۔ آپ کو جنت میں ایک ہزار محل ملنا۔

چوبیسویں اور پچیسویں حدیث: ۔ آپ کی امت میں سے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا بعد انبیاء کے تمام کہول اہل جنت کا سردار ہونا اور حضرت فاطمہ کا سب بیبیوں کا سردار ہونا اور حسنین کا سب جوانوں کا سردار ہونا (رواہ الترمذی) یہ بھی آپ کی فضیلت مختصہ ہے کہ آپ کے آل و اصحاب کی یہ فضیلت ظاہر ہوئی۔

ظاہر ہے کہ یہ سب برکات بعد وفات ہی کے ظاہر ہوئے اس مختصر فہرست برکات سے کہ سب کا مقدمہ وفات شریف ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں آپ کی توجہ ملاء اعلیٰ کی نعمت ہونے کے وجوہ اور نیز امت کے حق میں اس کی رحمت ہونے کے وجوہ ثابت ہوتے ہیں۔

جان گزاری و دلنوازی

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ واقعہ کسی حیثیت سے بھی مصیبت نہیں۔ اول تو خود روایات بالا میں بعض حکمتیں خود مصیبت ہونے ہی پر متفرع ہیں۔ دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو بعد انبیاء علیہم السلام کے اکمل البشر ہیں۔ علما بھی عملاً بھی حالاً بھی ان سے اضطراب کے اقوال و افعال صادر نہ ہوتے اور وہ تو بشر تھے ملائکہ تک سے تاسف اور بکاء ثابت ہے۔

چنانچہ بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپ کے اخیر وقت میں جبرئیل علیہ السلام نے کہا۔ ھذا اخر موطئی فی الارض۔ یعنی یہ میرا آخری آنا ہے زمین پر یعنی وحی لے کر۔ اس کے سیاق سے تاسف ظاہر ہے اور ابو نعیم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب آپ کی روح قبض ہوئی تو ملک الموت روتے ہوئے آسمان کو چڑھے اور میں نے آسمان سے آواز سنی۔ واہ محمداہ۔ اس سے بکاء عزرائیل علیہ السلام کا ثابت ہے۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت انس سے آپ کی وفات کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کا تعزیت کے لئے اصحاب کے پاس آنا اور ان کا رونا روایت کیا ہے۔ اگر خضر علیہ السلام پیغمبر ہوں اور اہل حق کے نزدیک پیغمبر ملائکہ سے افضل ہوتے ہیں تو ان کا رونا ملائکہ کے رونے سے بھی زیادہ عجیب ہے اور دلیل ہے اس کے مصیبت ہونے کی۔

تیسرے روایات میں مصیبت ہونے کی وجوہ کی تصریح ہے بھی۔ چنانچہ مرفوع حدیث میں مسلم نے ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے اصحاب کے لئے سبب امن ہوں۔ جب میں چلا جاؤں گا تو موعودہ بلائیں (حروب وفتن) ان پر آویں گی اور میرے اصحاب میری امت کے لئے امن ہیں جب میرے اصحاب چلے جائیں گے تو موعودہ بلائیں (بدعات و شرور) امت پر آویں گے۔ اوپر کی ایک روایت میں ام ایمن کا قول کہ آسمان سے وحی منقطع ہوگئی۔ جس نے حضرت ابوبکر و عمر کو بھی رلایا۔ آچکا ہے۔ تینوں امر اس کے مصیبت ہونے پر صریح دلیل ہیں۔

ایک واقعہ کا مختلف حیثیتوں سے مختلف اوصاف سے موصوف ہونا کوئی امر غریب نہیں۔ پس مصیبت ہونے کی حیثیت سے دلگداز ہے اور رحمت ہونے کی حیثیت سے جاں نواز ہے۔ اس کی مثال حیات میں عروس کا رخصت کرنا ہے کہ متعلقین کے قلب میں دو حیثیتوں سے سرور اور قلق کس طرح جمع ہوتا ہے۔ عشاق غیر محققین نے وصف اول (یعنی دلگدازی) پر نظر کر کے مولد میں اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس وصف کو مانع قرار دیا اور محققین نے وصف ثانی (یعنی جاں نوازی) پر نظر کر کے مولد میں بھی بجائے مولد کے اس کو بیان کرنے کے لئے اس وصف کو مقتضی قرار دیا۔ چنانچہ میں نے اس وقت محققین ہی کی تقلید کی ہے۔

اب اس میں دو مرتبے اور رہ گئے۔ تتمیماً للفائدہ ان کا حکم بھی معلوم کرنا چاہئے۔ ایک مرتبہ یہ کہ بیان تو کیا جاوے وصف اول کی حیثیت سے مگر مقصود صرف آپ کی یاد ہو۔ یہاں نہ وصف اول مانع ہے نہ وصف ثانی مقتضی کیونکہ وصف ثانی پر نظر ہی نہیں۔

دوسرا مرتبہ یہ کہ بیان تو کیا جاوے وصف اول کی حیثیت سے اور مقصود بھی جلب غم ہو۔ یہاں وصف اول بانضمام اس قصد کے مطلقاً مانع ہو جاوے گا۔ خواہ ذکر مولد کے ساتھ ہو خواہ مستقلاً۔ کیونکہ قصداً کسی واقعہ کو یاد کر کے جلب غم کرنا شریعت میں ماتم ہے جو منہی عنہ ہے جیسا ایام محرم میں یا دوسرے زمانہ میں شہادت حضرات حسنین کا اس قصد سے تذکرہ کرنا بتصریح فقہاء بدعت و ناجائز ہے۔ جیسا عوام میں وفات نامہ کے نام سے رسالے مروج ہیں اور اس میں قصداً اس واقعہ پر حزن و بکاء کے فضائل مذکور ہیں اور عوام اس کے معتقد اور عامل ہیں مجھ کو ایک وفات نامہ کا ایک شعر یاد آیا۔

محمد کے غم میں جو آنسو چلیں ۔۔۔ وہ آنکھیں نہ دوزخ میں ہرگز جلیں

سو یہ محض غلط ہے اور قصداً غم کے لئے رونا تو کیا ثواب ہوتا بلا قصد غم میں رونا بھی محض مباح ہی ہے فضیلت اس کی بھی نہیں البتہ حق تعالیٰ کی محبت یا خشیت سے رونا خواہ قصداً جو تباکی کہلاتا ہے خواہ بلا قصد جو بکاء کہلاتا ہے۔ اس کی فضیلت البتہ وارد ہے۔

بہر حال اس وقت وصف ثانی پر نظر کر کے اس ذکر شریف کو اختیار کیا گیا ہے اور الحمد للہ بعجہ

احسن بہتر پیرایہ میں بیان ہو گیا۔ اس لئے اب اس کو ختم کرتا ہوں مگر اس وقت اثنائے وعظ کے دو مضمون کے متعلق ایک تتمہ یاد آیا جو موقعہ پر ذہن سے نکل گیا تھا ختم سے پہلے ان کو بیان کرتا ہوں۔

رفع اشکالات

ایک مضمون تو یہ ہے کہ میں نے یہاں کی موت کو ولادت ثابت کیا تھا۔ دوسرا مضمون یہ ہے کہ یہاں کی ولادت کو موت ثابت کیا تھا اور یہی دو مضمون گویا روح ہیں تمام بیان کی۔

مضمون اول کا تتمہ یہ ہے کہ اس کی مزید تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو حکیم ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ دنیا سے آدمی کے انتقال کرنے کو بس اس مثال کے مشابہ پاتا ہوں جیسے بچہ ماں کے پیٹ سے یعنی اس تنگی و تاریکی سے دنیا کی کشادگی میں آتا ہے آہ یعنی آنے کے قبل اس کو بڑی راحت کی جگہ سمجھتا تھا مگر دنیا کی راحت و لذت دیکھ کر پھر رحم میں جانا نہیں چاہتا۔ اسی طرح دنیا میں رہ کر آخرت سے گھبراتا ہے مگر وہاں جا کر پھر یہاں آنا پسند نہیں کرے گا۔ یہ تفسیر خود ایک حدیث میں آئی ہے۔ اخرجہ ابن ابی الدنیا مرفوعا۔ اس سے تائید اس دعویٰ کی ظاہر ہے کہ سفر آخرت بھی ولادت ہے اور واقعی اگر زندگی فطرت یعنی شرع کے موافق ہو کہ دین تو فطری ہے پھر تو مرنا ویسی ہی حیات ہے جیسا ولادت کہ وہ بھی فطرت پر ہوتی ہے ورنہ پھر وہ زندگی حیات کہنے کے قابل نہیں وہ تو موت سے بدتر ہے کسی بزرگ کا اس کے متعلق خوب لطیف ہے۔ فرماتے ہیں۔

یاد داری کہ وقت زادن تو　　ہمہ خنداں بدند و تو گریاں

(تجھے اپنی پیدائش کا منظر معلوم ہے تیرے رشتہ دار ہنس رہے تھے اور تو روتا تھا۔)

پیدائش کے وقت سب تو ہنس رہے تھے اور تم رو رہے تھے۔ تو یہ لوگ بڑے بے درد تھے جو تمہارے رونے کے وقت ہنس رہے تھے۔ اب تم بھی ان سے اس طرح بدلہ لو کہ۔

آنچناں زی کہ وقت مردن تو　　ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

(دنیا میں تو اس طرح رہ کہ تیری موت پر سب روئیں اور تو ہنستا ہوا جائے۔)

تم اس طرح جیو کہ مرتے ہوئے اور تو روئیں اور تم ہنسو کہ باولے کیوں رو رہے ہیں میں تو اب پہلے سے زیادہ راحت میں جا رہا ہوں۔ یہ تو تتمہ تھا مضمون اول کا۔

دوسرے مضمون کا تتمہ یہ ہے کہ میں نے اس میں یہ کہا تھا کہ یہاں کی ولادت اس عالم سے انتقال ہے تو اس اعتبار سے وہاں کی موت ہوئی۔ پھر اس پر سوال کیا تھا کہ پھر چاہئے کہ اس وقت عالم ارواح میں شور و شیون ہو جائے۔ اس کا ایک جواب یہ دیا تھا کہ وہاں کے ادراکات اور ہیں یہاں کے اور۔ وہ ارواح

جانتے ہیں اور ان کو مشاہدہ بھی ہوا ہے کہ دنیا میں جا کر پھر عود کر آوے گا۔ اس لئے ان کو غم نہیں ہوتا۔ بخلاف دنیا والوں کے کہ ان کا یہ ادراک ہے کہ یہ شخص پھر عود نہ کرے گا اس لئے رنج ہوتا ہے اور یہ بھی بتلا دیا گیا تھا کہ اگر ارواح کو کسی روح کا عدم موتقا یا موبدا معلوم ہو جاتا ہے یعنی جہنم میں کسی مردہ کا چلا جانا تو وہ اس وقت غم کرتی ہیں کیونکہ اب ان کا ادراک خاص اعتبار سے اہل دنیا کے ادراک کے مثل ہوگا اور اگر ان کے ادراک کے موافق وقوع ہو گیا یعنی روح ان کے پاس آ گئی تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ اس کا تتمہ یہ ہے کہ یہاں شبہ ہوتا ہے کہ ظاہر ہے ارواح تو امور طبعیہ سے ساذج ہوں گی کیا ان میں بھی یہ مادہ فرح وغم کا جو کہ امور طبعیہ ہیں موجود ہے؟ جواب یہ ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو ارواح اس کی روح کا استقبال کرتی ہیں اور ایسی خوش ہوتی ہیں جیسے تم اپنے عزیز کے سفر سے واپسی پر خوش ہوا کرتے ہو۔ اور پھر یہ بھی ابن ابی الدنیا اور طبرانی نے مرفوعا روایت کیا ہے کہ زندوں کے اعمال مردوں پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر اچھی بات معلوم ہوتی ہے تو خوش ہوتے ہیں اور اس کے لئے تکمیل عمل کی دعا کرتے ہیں اور بری بات معلوم ہوتی ہے تو (رنجیدہ ہو کر) توفیق عمل کی دعا کرتے ہیں۔ نیز حدیث میں ان کا فرح اور ان کا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کہنا جو کہ دلیل حزن ہے وارد ہے تو پھر اس میں کیا شبہ رہا کہ ان میں بھی مادہ فرح وغم کا ہے تو ان میں طبیعت کا اثر تو ہے مگر درجہ حکومت وغلبہ تک نہیں۔

جواب ثانی میں اس کی طرف اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے البتہ دوقا معلوم ہوتا ہے کہ جو ارواح ابھی دنیا میں نہیں آئیں ان میں ان امور سے محض سنداحت ہے اور راز اس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور طبعیہ موقوف ہیں۔ تلبس طبیعت پر اور وہ موقوف ہے تلبس جسد پر کیونکہ جسد ارواح کو اعمال کے لئے عطا ہوا ہے اور اعمال سے ابتلا مقصود ہے اور ابتلا بدوں جذبات طبعیہ کے ہوتا نہیں اور ان اعمال کا اثر بعد موت بھی رہتا ہے اسی پر جزا و سزا ہے۔ پس بعد مفارقت اجساد بھی فرح وحزن اپنے اعمال پر رہنا ضروری ہے اور جب یہ مادہ ان میں موجود ہے تو دوسری کے احوال و اعمال سے بھی کبھی متعلق ہو جاتا ہے اور یہ امر ارواح منزہ عن الجسد میں متحقق نہیں۔ لہٰذا وہ فرح وحزن سے بھی مبرا ہیں۔ واللہ اعلم۔

نیز قرآن مجید میں شہداء کی نسبت احیاء منتظرین کے متعلق يَسْتَبْشِرُوْنَ (وہ خوش ہوتے ہیں) وارد ہے۔ نیز مومن کی شان میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ہے (نہ انہیں خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے) اور خوف وحزن کا عدم منجملہ اعدام ملکات ہے۔ نیز کفار کا خوف وحزن مصرح ہے نہ انہیں خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور یہ سب ارواح ہی کے لئے ثابت ہیں۔

ثابت ہو گیا کہ ارواح میں یہ مواد موجود ہیں۔

یہاں سے ایک لطیفہ کی تائید ہو گئی جو حضرت استاد علیہ الرحمۃ نے آدم علیہ السلام کے اکل شجرہ و نزول من الجنۃ کے متعلق بیان فرمایا تھا اور اس سے معلوم ہوگا کہ مولانا کے علوم کیسے لطیف تھے۔ فرمایا کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی حکمت ہوئی کہ انہوں نے اس درخت منہی عنہا کو کھا لیا اور جنت سے زمین پر آ

گئے۔ اگر آدم علیہ السلام ضبط کر لیتے اور نہ کھاتے تو ساری اولاد مصیبت ہوتی کیونکہ مثل آدم علیہ السلام کے ظاہر التجسد و مکلف امر و نہی کے وہ بھی ہوتے ہیں اور جذبہ طبعیہ کے غلبہ سے ضبط نہ ہو سکتا اس لئے یہ لوگ ضرور کھاتے پھر جنت سے نکالے جاتے کیونکہ اس درخت کی خاصیت ہے کہ اس کے کھانے والا جنت میں نہیں رہ سکتا یا تو اس لئے کہ اسے کھا کر قضاء حاجت کی ضرورت ہوتی ہے اور جنت میں بم پس نہیں ہے جیسا کہ بعض عارفین نے یہی وجہ بیان کی ہے یا کوئی اور وجہ ہو۔ بہر حال جو اسے کھاتا وہ جنت سے نکالا جاتا اور اس وقت اس حال میں نکلتے کہ جنت میں کسی کی ماں ہے کسی کا باپ ہے کسی کی بہن ہے کسی کی اولاد ہے تو ایک کے نکلنے سے جنت میں کہرام مچ جاتا تو دوزخ بن جاتی کیونکہ ارواح میں تلبس الاجساد کے اثر سے مادہ حزن و غم کا موجود ہی تھا۔ پھر ایک کے نکلنے کے بعد ہر دم ہر شخص پر بھی احتمال رہتا تو عیش منغص ہو جاتا۔ اور اب آدم علیہ السلام کے اترنے میں ہمارا تو یہ فائدہ ہو گیا کہ اس مفارقت اہل و اولاد کے غم سے بچے رہے (اور گو دنیا میں اس مفارقت کا صدمہ پہنچتا ہے مگر یہاں صدمہ سے کم ہے یہاں محض طبعی رنج ہوتا ہے حزن عقلی نہیں ہوتا کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ مرنے والا دار الحزن سے دار النعیم میں جا رہا ہے اور وہاں مفارقت سے حزن طبعی بھی ہوتا عقلی بھی کیونکہ جنت سے دنیا میں آنا راحت سے تکلیف میں آنا ہوتا پھر یہ بھی خطرہ لگا رہتا کہ دیکھئے یہ شخص جا کر جنت میں واپس آتا ہے یا جہنم میں جاتا ہے۔ اس سے حزن عقلی کو اور ترقی ہوتی اور دنیا سے جب کوئی جاتا ہے تو چونکہ آخرت کا حال ہم کو معلوم نہیں اس لئے ہر شخص اپنی میت کے ساتھ اچھا ہی گمان رکھتا ہے اس لئے یہاں حزن عقلی نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت کوئی بدحالی قطعی نہیں اس لئے عود الی الجنۃ کا احتمال غالب رہتا ہے اور جنت سے نکلنا قطعی بدحالی تھی اسی کا اثر غالب رہتا اور عود الی الجنۃ کا احتمال مغلوب ۱۲) اور آدم علیہ السلام کا کچھ نقصان نہیں ہوا کیونکہ وہ تو مرتے ہی راحت میں پہنچ گئے ہیں اور جنت برزخیہ میں تو فی الحال ہی داخل ہو گئے اور ایک دن جنت معہودہ میں بھی پہنچ ہی جائیں گے ان کی تو بچھڑی ہوئی جنت جلد ہی مل جائے گی اور اس چند روز یعنی مدت بقاء فی الدنیا میں مفارقت جنت سے گو ان کو طبعاً رنج ہوا مگر عقلاً رنج نہیں ہوا کیونکہ ان کو بوجہ عطا نبوت و قبول توبہ اس مفارقت کا عارضی ہونا متیقن تھا۔ دوسرے دنیا میں آنا ان کے لئے موجب ترقی باطنی ہوا جیسا ابھی مذکور ہوتا ہے تو ان کے نزدیک یہ ایسا تھا جیسا کہ آپ اپنی اولاد کو کبھی لندن یا جامعہ ازہر بھیج دیتے ہیں کیوں؟ ترقی درجات کے لئے تو کیا اس مفارقت سے رنج عقلی ہوتا ہے۔

باقی یہ کہ یہ نزول ترقی کیسے تھا اس کو حضرت حاجی صاحب نے اس طرح تحقیق فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی معرفت جنت میں بھی حاصل تو تھی مگر ایسی کامل نہ تھی جیسی دنیا میں آ کر کامل ہو گئی کیونکہ پہلے تو وہ حق تعالیٰ کی صفات منعم معطی محسن و امثالہا کو تو عین الیقین سے جانتے تھے کیونکہ ان صفات کے آثار ان پر وارد تھے۔ مگر صفات غفور و تواب و منتقم کو صرف علم الیقین کے درجے میں جانتے ہوئے تھے عین الیقین کے درجہ میں ان کا پورا انکشاف نہ ہوا تھا اکل شجرہ و خروج عن الجنۃ سے ان صفات کا کامل مشاہدہ ہو گیا۔ کما قیل

گناہ من ارنا مدے در شمار   ترا نام کے بودے آمرزگار
(اگر میرے گناہ گنتی میں نہ آتے تو آپ کا نام غفور کیسے ہوتا۔)

یعنی کے ظہور او بودے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ جنت سے آدم علیہ السلام ہی کا اترنا اس لئے اچھا ہوا کہ ان کا کچھ نقصان نہیں ہوا اور ہمارا فائدہ ہوگیا۔ یہاں بحمد اللہ دونوں تتے بھی ختم ہوئے جس سے مضمون مقصود ختم ہوا۔

نعمت موت

اب اس مضمون پر ایک تفریع اور باقی ہے کہ اس میں اقتداء ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کے اس واقعہ ولادت ملکوتیہ میں۔ بس پھر بالکل تقریر اس کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(تمہارے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ بہترین نمونہ ہے۔)

اور یہاں کوئی قید ہے نہیں تو یہ اپنے اطلاق سے اس پر دال ہے کہ حضور کی ہر حالت قابل اقتداء ہے اور ایک حالت آپ کی یہ بھی ہے جس کا اس وقت مفصل بیان ہوا یعنی سفر آخرت کا آپ کے لئے نعمت و رحمت ہونا۔ تو اس میں بھی ہم کو اقتداء کرنا چاہئے اور وہ اقتداء یہ ہے کہ ہم اپنی حالت ایسی درست کریں کہ موت ہمارے لئے بھی نعمت و رحمت ہو جاوے اور اس لئے وہ ہم کو حیات سے زیادہ مرغوب و محبوب و موجب راحت و لذت ہو جائے اور اس کی کراہت و وحشت عقلیہ باقی نہ رہے اور اس کا طریق مرکب ہے دو جزو سے۔ ایک جزو اعمال و عقائد کا درست کرنا ہے دوسرا جزو اس بیان کئے ہوئے مضمون کا بار بار مستحضر کرنا اور اس کا مراقبہ کرنا ہے تاکہ دنیا میں جو ہمارا دل لگا ہوا ہے اس میں کچھ کمی ہو اور موت سے وحشت کم ہو۔ کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ مسلمان کو موت کے بعد جو حیات حاصل ہوتی ہے وہ اس حیات سے بدرجہا افضل و اکمل و اقوی و ادوم ہے اور جس کو تم موت کہتے ہو حقیقت میں وہ بھی ایک قسم کی ولادت ہے جو اس ولادت ناسوتیہ سے بہتر ہے۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی جب مرجاتا ہے تو بس ایک گڑھے میں اس کو دفن کر دیتے ہیں اور وہ وہیں پڑا رہتا ہے اور چند روز میں گل سڑ کر خاک ہو جاتا ہے اسی خیال نے لوگوں کو موت سے متوحش کر رکھا ہے۔ صاحبو! انسان جسم کا نام نہیں ہے۔ یہ حال جو تم بیان کرتے ہو جسم کا ہوتا ہے روح کا یہ حال نہیں ہوتا۔ وہ تو عالم ارواح میں اور دار النعیم میں پہنچتی ہے اور انسان اسی روح سے انسان ہے وہی اصل چیز ہے اسی سے انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس جسد کا جو احترام کیا جاتا ہے حیات میں بھی اور بعد موت کے تحسین کفن و توسیع قبر و استعمال حنوط و حمل علی الاعناق و صلوٰۃ جنازہ سے بھی یہ سب روح کی ہی وجہ سے ہے۔ اگر روح قابل احترام ہے تو جسد بھی قابل احترام ہے ورنہ بے شمشیر کا نیام ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

کشتن و مردن کہ بر نقش تن ست   چوں انار و سیب را بشکستن ست

(قتل کرنا اور مرنا جو نقش جسم پر طاری ہوتا ہے انار و سیب کو توڑنے کی طرح ہے۔)

(کچھ اور اشعار بھی ہیں جو وقت تبیض کے لکھوادوں گا۔ چنانچہ اب لکھے جاتے ہیں)

آنچہ شیریں ست آں شد یار دانگ   وانچہ پوشیدہ ست نبود غیر بانگ
آنچہ پر مغز ست چوں مشک ست پاک   وانچہ پوشید ست نبود غیر خاک
آنچہ با معنی ست خوش پیدا شود   آنچہ بے معنی ست خود رسوا شود
تا غلاف اندر بود باقیمت است   چوں بروں شد سوختن را آلت است

(جو میٹھا ہے وہ قیمت کے لائق ہے اور جس کا حال معلوم نہیں وہ آواز کی آواز ہے جو پر مغز ہے وہ مشک کی طرح پاک ہے اور جو پوشیدہ ہے وہ خاک جیسا ہے۔

جو با معنی ہے وہ اچھا معلوم ہوگا اور جو بے معنی ہے وہ خود رسوا ہوگا اس جسم میں بے معنی جان بے اختلاف ایسی ہے جیسے لکڑی کی تلوار غلاف میں جب تک غلاف میں ہے باقیمت ہے اور باہر آتے ہی جلانے کے قابل ہے۔

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو عام لوگوں میں مشہور ہے کہ قبر کے تختے اونچے رکھے جائیں کہ آدمی قبر میں بیٹھے تو تختے سر کو نہ لگیں تا کہ بیٹھنے میں میت کو تنگی نہ ہو۔ یہ بے اصل بات ہے کیونکہ مردہ کا جلوس وقعود جو احادیث میں وارد ہے وہ اور قسم کا ہے۔ یعنی برزخی ہے اس کے لئے یہ تختے مانع نہیں ہوسکتے بلکہ یہ توسیع وغیرہ جیسا کہ بیان کیا گیا اکرام ہے جسد مسلم کا اس کی روح کے سبب سے۔ پس اصل چیز انسان میں بھی روح ہے۔ سو ہم کو اس کی درستی کی کوشش کرنا چاہئے۔ جس کا طریقہ اوپر بتلا چکا ہوں یعنی اعمال صالحہ و عقائد صحیحہ و استحضار منافع موت اگر یہ درستی ہم نے کرلی تو یہ موت ہمارے لئے حیات طیبہ کا مقدمہ ہے اور اگر یہ درستی نہ کی تو پھر یہاں کی حیات بھی ہمارے لئے موت ہے کیونکہ موت حقیقیہ کا مقدمہ ہے اسی لئے حدیث میں غافل عن الذکر کو میت سے تشبیہ دی ہے۔ ولنعم ما قیل

لیس من مات فاستراح بمیت   انما المیت میت الاحیاء

جس نے مر کر آرام پالیا وہ مردہ نہیں ہے مردہ وہ ہے جو زندوں میں مردہ ہو۔

یہ تھی وہ تفریع جو اس وعظ کے مضمون پر مقصود تھی۔ اب میں بالکل ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام المورد الفرخی فی المولد البرزخی رکھتا ہوں۔ اصل میں میں نے اس کا نام المولد البرزخی رکھنا چاہا تھا کیونکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت برزخیہ کا ذکر ہوا ہے۔ پھر جی چاہا کہ اس کا کوئی قافیہ بھی مل جائے تو مولد کا قافیہ تو مورد ملا جو ملا علی قاری کے مولد کے نام سے اخذ کیا۔ انہوں نے اپنے مولد کا نام المولد الروی فی المولد النبوی رکھا ہے۔ اس سے میں نے مورد و مولد اول کے دو لفظ اخذ کر لئے۔ پھر مضمون کے اعتبار سے مولد کے ساتھ برزخی کے وزن پر کوئی لفظ بڑھایا جاوے اس کے لئے مجھے قاموس دیکھنا پڑی کیونکہ برزخی کا کوئی قافیہ ذہن

میں نہ تھا۔ قاموس میں لفظ فرخ کے حاصل معنے وسیع لکھے ہیں اور یہ بیان بھی خلاف امید وسیع ہو گیا۔ دوسرے جس عالم کی ولادت کا اس میں بیان کیا ہے یعنی برزخی وہ بھی وسیع ہے۔ اس لئے اس کا نام المورد الفرخی فی المولد البرزخی مناسب معلوم ہوا (والیاء الاولیٰ للمبالغہ والثانیہ للنسبہ)

اب دعا کیجئے حضور کے واسطے تو دعا کرنا خلاف ادب ہے مگر نہیں درود شریف پڑھنا مشروع ہے اور وہ بھی دعا ہے۔ حضور کی شان کے مناسب یہی دعا ہے کہ آپ پر درود سلام بھیجا جائے۔ تو آپ کے لئے تو اس طرح دعا کیجئے اور اپنے لئے اس طرح دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ یہ برکات ہم کو عطا فرمائے جو حضور کے سفر آخرت میں امت کے واسطے رکھی ہوئی ہیں اور اس واقعہ خاصہ میں ہم کو آپ کی اقتداء کی جس کی میں نے ابھی تقریر کی ہے توفیق بخشے اور قبر میں اور قیامت میں ہم کو حضور اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب و معیت نصیب فرماوے۔ آمین۔

والحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا
و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین ابدالابدین و دھر
الداھرین ثم والحمد للہ الذی بنعمتہ و جلالہ تتم الصالحات

راس الربیعین

ماہ ربیع الاول وربیع الثانی کے متعلق یہ وعظ بروز جمعہ ۳۰ ربیع الاول ۱۳۳۴ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا جو ۲ گھنٹہ ۴۰ منٹ میں ختم ہوا حاضری قریباً ۱۰۰ کی تھی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّابَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿١٤﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿١٥﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿١٦﴾

جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز سب لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔ مگر جو لوگ ایمان والے اور انہوں نے اچھے کام کیے تھے وہ تو باغ میں مسرور ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

تمہید

یہ آیتیں جو میں نے پڑھی ہیں ان میں الفاظ کا مدلول تو صرف اعمال صالحہ وعقائد صالحہ کا ثمرہ ثواب جنت ہونا اور اعمال غیر صالحہ وعقائد باطلہ کا ثمرہ عذاب جہنم ہونا ہے اور عجب نہیں کہ سننے والے اس ظاہری مدلول سے یہی سمجھے ہوں گے کہ اس وقت مقصود اعمال صالحہ کی ترغیب اور اعمال غیر صالحہ سے ترہیب کا بیان کرنا ہے۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے مگر مجھے اس وقت اس پر اکتفا کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور دوسری باتیں اور بعضے خاص مسائل بھی بیان کرنا مد نظر ہیں جن کی وجہ خصوصیت ایام ہے۔

یہ بات اکثر احباب کو معلوم ہے کہ ان ہی ایام ربیع الاول سے پہلے اور کبھی خاص اسی مہینے میں

چند سالوں سے میرا یہ معمول ہو گیا ہے کہ اعمال و عقائد کی بابت کچھ بیان کیا کرتا ہوں جو ان ایام میں اکثر لوگ آج کل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد میں چند وعظ النور الظہور وغیرہ شائع بھی ہو چکے ہیں۔ پارسال بھی ایک مضمون السرور کے نام سے بیان ہوا تھا۔ اس وقت آئندہ سال سے لئے یہ نیت تھی کہ اس مضمون کو بعنوان دیگر بیان کر دیا جاوے گا مگر بزرگوں کا مقولہ ہے۔

عرفت ربی بفسخ العزائم (میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا)

یہ نیت بعد میں بدل گئی چونکہ مضامین جدیدہ ذہن میں تھے نہیں اور اعادہ کو جی نہ چاہا اس لئے ارادہ امسال فسخ ہو چکا تھا۔ چنانچہ مہینہ ختم ہونے کو بھی آ گیا اور اب تک اسی لئے کہ مضمون جدید ذہن میں نہ تھا کوئی بیان ان امور مروجہ کے متعلق نہیں ہوا۔ مگر حق تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس ارادہ کا پھر وہی حشر ہوا چونکہ وہ ارادہ پہلے موجود ہوا تھا پھر فنا ہو گیا۔ پھر اب موجود ہے اس لئے یہ گویا اس کا حشر ہوا۔ حشر کے معنی ہیں مردہ کا زندہ ہو جانا۔ یہ مضمون اگرچہ پہلے ہفتہ میں ذہن میں آ چکا تھا مگر اس وقت ایک دوسرے مضمون کو مقدم کرنا مناسب معلوم ہوا۔

وہ یہ کہ اس وقت قحط سالی کی عام طور پر شکایت ہو رہی ہے تو اس میں بتلایا گیا تھا کہ اس کا اصلی سبب کیا ہے پھر یہ خیال ہوا کہ جس طرح اس ارض ظاہری کی حیات کا سبب بیان کیا گیا ہے تو ارض باطنی جو کہ قلب ہے اس کی حیات کا طریقہ اور راز بھی کیوں نہ بیان کیا جائے ان دونوں مضمونوں کو پہلے ہفتہ میں الگ الگ بیان کر کے مجموعہ کا نام اساس الربیعین رکھ دیا گیا اور چونکہ وہ دونوں مضمون الگ الگ طور پر مستقل تھے اس لئے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ لقب حیات الجدوب و حیات القلوب بھی مقرر کر دیا۔ لفظ جدوب کے معنی میں نے لغت میں تلاش کئے تو جدب کی جمع معلوم ہوئی جس کے معنی قحط کے ہیں جیسے کہ قلوب قلب کی جمع ہے۔

اب چونکہ وہ مضمون جس کا مقدم کرنا مناسب تھا بیان ہو چکا تو اس ہفتہ میں اس معمول کو پورا کرنے کا خیال پیدا ہوا کیونکہ مانع بھی مرتفع ہو گیا اس لئے اس سال بھی اس معمول کو پورا کیا گیا اور اس کا نام پارسال ہی ذہن میں الحبور آ چکا تھا۔

اس میں یہ بیان کیا جاوے گا کہ ایمان اور اعمال صالحہ آپ کی بعثت کی اصل غایت ہے۔ جس کا ثمرہ جنت کی راحت ہے لہٰذا حضور کی بعثت قابل فرح در اصل اس لئے ہے کہ آپ کی بدولت اعمال صالحہ اور ایمان کی نعمت ہم کو نصیب ہوئی یہ مضمون تو گذشتہ مضامین کی مانند ہے جو آیت کے دو جملوں سے سمجھ میں آ گیا ہو گا۔ اگرچہ اس کی تفصیل بہت کچھ کی جا سکتی ہے مگر اس وقت کا بیان زیادہ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ایک دوسرا مضمون بھی ذہن میں آ گیا جو زیادہ تر اس وعظ میں مذکور ہو گا اور پہلا مضمون بقدر ضرورت و اختصار ذکر ہو گا زیادہ حصہ دوسرے ہی مضمون کا ہو گا اور وہ مضمون ہر سال ذہن میں آتا تھا مگر

بیان سے رہ جاتا تھا کیونکہ ہمیشہ بعد وقت گزر جانے کے اس کا خیال آتا تھا اب بھی وہ مضمون وقت کے بعد ہی ذہن میں آیا کیونکہ مہینہ بالکل قریب ختم آ گیا ہے اور اس ضرورت کا موقع اوائل ماہ ہے مگر اس سال پھر بھی اس کو بیان کرنا ضروری معلوم ہوا تا کہ رہ نہ جاوے اور آئندہ ایسے ہی موقع پر کام آوے۔

وہ مضمون تبرکات کا ہے جس کو حضور کی ذات سے اس لئے تعلق ظاہر ہے کہ آپ تمام تبرکات کے سردار اور سب کی اصل ہیں اور اسی لئے اس وقت صرف ان ہی تبرکات کا بیان نہ ہوگا جن کو حضور کی ذات سے تعلق ہے بلکہ عموماً تمام تبرکات کے متعلق بیان کیا جاوے گا خواہ وہ تبرکات انبیاء کے ہوں یا تبرکات اولیاء کے خصوصیت وقت و مقام یہ ہے کہ ہمارے قصبہ کے قریب ایک تبرک بھی موجود ہے اور وہ جبہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کی سند مثل احادیث کے تو متصل نہیں مگر ہمارے بزرگوں نے اس کا انکار نہیں کیا اور جی کو بھی یہ بات لگتی ہے کہ وہ صحیح ہے اور اس کی زیارت اسی ماہ ربیع الاول میں ہوتی ہے۔ اس لئے اس ماہ سے بھی اس مضمون کو تعلق ہے مگر چونکہ ہم لوگ عرس وغیرہ کرتے نہیں اس لئے مثل اہل عرس کے کبھی وقت پر یہ مضمون خیال میں نہ آتا۔ کیونکہ آج کل ایک جماعت درویشوں کی ہے جو صرف عرسوں ہی میں شریک ہونے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ جس وقت دیکھئے ان کا بستر کسی نہ کسی عرس کے لئے بندھا رہتا ہے۔ اور یہ ان کے نزدیک بڑا سرمایہ آخرت ہے۔ یہ اللہ کے بندے گھبراتے بھی تو نہیں نہ معلوم روز کے روز ان سے سفر کیسے ہوتا ہے ہمیں تو ذرا سے دور کے سفر سے بھی پریشانی ہوتی ہے۔ اب یا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ لوگ بڑے باہمت ہیں اور ہم لوگ کم ہمت ہیں یا یہ کہ وہ لوگ نکمے ہیں اور ہم لوگ کام کے ہیں۔ خیر وہ اپنے آپ کو باہمت سمجھتے رہیں اور ہم لوگ اپنے کو باکار سمجھتے رہیں۔ غرض ایسے لوگوں کو عرسوں کی تاریخیں خوب یاد رہتی ہیں مگر ہم لوگوں کو اس واسطے یاد نہیں رہتیں کہ اس کا ہمارے یہاں کسی قسم کا چرچا نہیں ہوتا۔ نیز زیادہ چرچا ان باتوں کا بچوں میں بھی ہوا کرتا ہے ہمارے یہاں ان باتوں کے لئے مدرسہ میں بچوں کو تعطیل ہی نہیں ہوتی اور نہ طلباء کو اس میں شریک ہونے کی اجازت ہے بلکہ سخت ممانعت ہے۔

ان وجوہ سے اس مرتبہ بھی یہ مضمون وقت پر ذہن میں نہیں آیا بلکہ اس وقت اس کا خیال آیا مگر احکام شرعیہ کے لئے وقت ہی کیا جب یاد آ جاوے وہی وقت ہے اور چونکہ یہ مضمون اخیر وقت میں ذہن میں آیا اس لئے ایک دوسرا مضمون بھی اس کے ساتھ بیان کرنا مناسب ہو گیا۔ یہ دن چونکہ ربیع الاول و ربیع الثانی کے وسط میں ہے کہ یا تو آج ربیع الاول کی ۳۰ تاریخ ہے یا ربیع الثانی کی پہلی ہے۔ اس لئے ربیع الثانی کے متعلق گیارہویں کا مضمون بھی ذہن میں آ گیا۔

تو اب اس وعظ کے بھی دو جز ہو جائیں گے۔ ایک جزو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کے متعلق جو کہ اصل ہے اور دوسرا گیارہویں اور تبرکات کے متعلق یہ سب مضامین الگ الگ بیان کروں گا۔ ہر چند کہ ان تینوں جزوؤں کے متعلق جو مضمون ہے اس کے لئے ایک حدیث ذہن میں ہے جس

کا تعلق اس مضمون سے بے تکلف واضح طور پر ہے اور سارا بیان قریب قریب اسی حدیث پر متفرع ہوگا چونکہ آیت شریفہ اول ذہن میں آ چکی تھی۔ اس لئے اس کے چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ نیز وہ حدیث اس آیت کی شرح ہے۔ اس لئے آیت کو حدیث کا اصل قرار دیا گیا اور حدیث کو تمام وعظ کی اصل۔ پس حدیث آیت پر متفرع ہے اور وعظ حدیث کی فرع ہے۔ اس طرح اس بیان کو حدیث اور آیت دونوں سے تعلق ہوگا۔

ایک قدیم مرض

اول آپ آیت کا مطلب سنئے۔ حق تعالیٰ شانہ اس مقام پر قیامت کا ذکر فرما رہے ہیں۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ
وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ ۝ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ ۝

جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن مجرم ناامید ہوں گے۔ پھر اس آیت کے بعد یوم تقوم الساعۃ کا اعادہ فرماتے ہیں وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔ اس لفظ کے اعادہ میں نکتہ زیادت تہویل ہے۔ چنانچہ اردو محاورہ میں بھی ایسے موقع پر اسی طرح کلام کیا جاتا ہے کہ فلاں روز یوں واقعہ ہوا۔ اس روز اس طرح حادثہ پیش آیا۔ اس روز کے لفظ کو بار بار اعادہ کرتے ہیں۔

نیز اس طرز کلام سے حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمت صاف صاف ٹپکتی ہے کہ جس روز کے ساتھ قیامت کے متعلق کفار کا حال ابلاس بیان فرمایا عین اسی بیان ابلاس میں جو کہ ظاہراً اس کے مقابل کی طرف توجہ کے ضعف کا سبب متوہم ہوتا تھا اسی روز کے ساتھ مومنوں کی حالت بھی بیان فرمائی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت لوگ رحمت خداوندی سے مایوس ہو جاتے کیونکہ جن کو حق تعالیٰ نے اپنے کلام کا فہم اور اثر عطا فرمایا ہے جب وہ نہایت بلاغت و فصاحت اور شد و مد کے ساتھ یہ مضامین وعید و تہدید کے کفار کی بابت سنتے تو ان پر غلبہ خوف کی وجہ سے وہی حالت طاری ہو جاتی جو حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کے اثر میں بیان فرمائی ہے۔

لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ

کہ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو اللہ کے خوف سے پست اور پھٹنے والا دیکھتے۔ اگر قرآن میں وعید کے ساتھ ساتھ بشارت نہ ہوتی تو بہت سے قلوب مارے خوف کے شکستہ ہو جاتے۔

سو اس طرز سے حق تعالیٰ شانہٗ نے یہ ظاہر فرما دیا کہ ہم کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو کہ غصہ کے وقت رحمت نہ ہو سکے جیسا کہ انسان اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ غصہ کے وقت اگر کوئی دوست سامنے آ جائے تو اس سے بھی اسی تختی کے لہجہ میں گفتگو کی جاتی ہے انسان سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ عین شدت غضب میں اگر کوئی دوست سامنے آ

جائے تو لہجہ بالکل بدل جائے اور دل میں سکون ہو جائے۔ چہرہ کی حالت بالکل بدل جائے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اوپر جب کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو ہم اس سے مغلوب ہو جاتے ہیں اگر اس وقت دوسری حالت کے اسباب پیدا بھی ہو جائیں تو دفعۃً حالت کا بدلنا قریب محال ہے۔ تو شاید کوئی شخص آیات وعید کو شد و مد کے ساتھ قرآن میں دیکھ کر خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگتا کہ ایسے غصہ کے وقت اگر کسی کو مطیع بندے کا خیال آ گیا تو کہیں اس پر بھی سختی نہ ہونے لگے کیونکہ لوگوں نے ہمیشہ حق تعالیٰ شانہ کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں تین شخصوں کا واقعہ آتا ہے کہ وہ تینوں اس بات میں مشورہ کرنے بیٹھے کہ حق تعالیٰ ہماری باتوں کو سنتے ہیں یا نہیں۔ ایک صاحب بولے کہ جب ہم زور سے بولتے ہیں تو سنتے ہیں آہستہ بولتے ہیں تو نہیں سنتے۔ دوسرے صاحب بولے کہ نہ زور سے بولنے میں سنتے ہیں نہ آہستہ بولنے میں۔ یہ سمجھے کہ جس قدر بعد ہے اس نسبت سے آواز بلند نہیں ہے۔ تیسرے صاحب بولے جو ان میں ذرا عقلمند اور بوجھ بجھکوے تھے کہ اگر سنتے ہیں تو ہر طرح کی بات سنتے ہیں آہستہ کی بھی اور زور کی بھی اور جو نہیں سنتے تو کوئی سی بھی نہیں سنتے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ سے ہم اس قدر دور ہیں کہ اتنی دوری میں زور کی آواز بھی آہستہ ہی کے حکم میں ہے۔ چنانچہ ہم یہاں بیٹھے ہوئے کس قدر آواز سے باتیں کرتے ہیں مگر جو لوگ دور ہیں۔ جیسے کلکتہ والے وہ ہمارے اس آواز کو نہیں سن سکتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ
وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ
ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

اس اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ پر ایک قصہ یاد آیا۔ منگور میں ایک حافظ صاحب نے یہ آیت نماز میں پڑھی۔ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ان کے پیچھے ایک نیم ملا بھی تھے انہوں نے حافظ کو لقمہ دیا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ حافظ صاحب نے پھر آیت کا اعادہ کیا چونکہ ان کو اچھی طرح لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ یاد تھا۔ انہوں نے پھر یہی پڑھا اور ان مولوی صاحب کے لقمہ کی پرواہ نہ کی بعد نماز کے مولوی صاحب نے حافظ صاحب سے سخت لہجہ میں کہا کہ ہم نے تم کو لقمہ دیا تم نے لیا کیوں نہیں۔ سب کی نماز خراب کی۔ حافظ صاحب کو چونکہ خوب یاد تھا اس لئے صاف کہہ دیا کہ قرآن میں لا یعلم ہی ہے دیکھ لیا جاوے۔ قرآن کو دیکھا تو واقعی اس میں بھی لَا يَعْلَمُ نکلا۔ اب تو مولوی صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عدم علم تو محال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب سے غلطی ہو گئی۔ ایک عالم بھی وہاں موجود تھے انہوں نے سمجھایا کہ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ہی صحیح ہے اور یہ تو ظن کفار کا معمول ہے کہ تم یوں گمان کرتے ہو

کہ خدا کو ہمارے بہت سے اعمال کی بھی خبر نہیں تو اِنَّ اللّٰہَ لَا یَعْلَمُ ظَنَنْتُمْ کے تحت میں داخل ہے جب ان نیم ملا صاحب کی حیرت ختم ہوئی اور سمجھے کہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی کہ ظَنَنْتُمْ پر خیال نہ کیا۔

دوسرے اس بھلے مانس کو یہ بھی خیال نہ ہوا کہ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَعْلَمُ کَثِیْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ میں کثیرا کی قید کے کیا معنے ہوں گے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بہت اعمال کو جانتے ہیں۔ یعنی سب کو نہیں جانتے مگر خیر چونکہ بیچارے کسی قدر ذی علم تھے اس لئے تنبیہ سے سمجھ گئے شاید کوئی یہ کہے کہ نیم ملا ہونا تو برا ہے پھر اسے اچھا کیوں کہا گیا کہ ذی علم تھے۔ بات یہ ہے کہ نیم ملا ہونا اس وقت برا ہے جب کہ وہ اپنے کو مستقل سمجھے اور جو نیم ملا محقق کا تابع ہو کر رہے تو ایسا نیم ملا تو اچھا ہے۔ یہ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَعْلَمُ کَثِیْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ کے متعلق ایک لطیفہ تھا۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک واقعہ تو حدیث کا بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ مرض لوگوں میں قدیم سے ہے آج کل بھی ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں خود ہمارے اسی قصبہ میں ہمارے محلہ کی ایک بوڑھی عورت میرے پاس آئیں اب تو اس بیچاری کا انتقال ہو چکا مگر ان کی اولاد موجود ہے آ کر کہنے لگی کہ مولوی جی! میں پوچھوں کہ اللہ میاں زندہ ہیں ان کی اس بات پر گھر میں جو مستورات تھیں سب ہنسنے لگیں میں نے منع کیا کہ ہنسو مت اس کو اس کی فہم کے مطابق جواب دو تاکہ یہ سمجھ جائے غنیمت ہوا کہ اس نے یہ اعتقاد قائم نہیں کیا تھا کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ زندہ نہیں بلکہ کم فہمی کی وجہ سے ہی تردد میں رہی میں نے اس کی سمجھ کے موافق اس سے کلام کیا اور یہ پوچھا کہ بڑی بی آخر تم دیکھتی ہو کہ لوگ پیدا ہوتے ہیں مرتے ہیں دنیا میں اولاد ہوتی ہے تو یہ کام کون کرتا ہے کہنے لگی کہ اللہ میاں میں نے کہا کہ اچھا بارش کون برساتا ہے۔ کہنے لگی کہ اللہ میاں۔ میں نے کہا جب یہ سارے کام حق تعالیٰ کرتے ہیں اور یہ سب کام بدستور جاری ہیں تو اس سے تو خود معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ زندہ ہیں زندہ نہ ہوتے تو یہ کام کیسے ہوتے کہنے لگیں کہ اب سمجھ میں آ گیا تو اس بے چاری بڑھیا نے بھی حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا کہ اتنے زمانہ طویل سے موجود ہیں۔ معاذ اللہ بوڑھے ہو گئے ہوں گے نہ معلوم زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

یہ حکایت تو محلہ محات کی ہے ایک قصہ محلہ نوگانوے کا ہے کہ وہاں سے ایک بڑی بی آئیں اور مجھ سے کچھ اپنے فقر و فاقہ کی شکایت کی پھر کہنے لگیں کہ مولوی جی میں زیادہ کہتی بھی نہیں کہیں اللہ میاں خفا ہوں کہ میرے عیب کھولتی پھرتی ہے۔

ایک قصہ بنت کا ہے کہ وہاں ایک بڑی بی کہنے لگیں کہ میں یوں کہوں جب قیامت میں سب مر جائیں گے تو اللہ میاں کا اکیلے جی نہ گھبرائے گا اب اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی عادت ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے۔ خدا کو بھی لوگ اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔

ایک قصہ کانپور میں پیش آیا۔ وہاں ایک صاحب پوچھنے آئے تھے کہ تو بتو یہ حق تعالیٰ کے والدین کس

جزیرہ میں رہتے ہیں؟ میں نے اس سوال کو سن کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے سائل طالب ہے مگر جاہل ہے بے چارہ کو حق تعالیٰ کے والدین کی سکونت دریافت کرنے کا خیال اس لئے پیدا ہوا کہ اللہ میاں کے دربار میں مغفرت کے لئے ان کا وسیلہ پکڑے جب کہ حق تعالیٰ نے بندوں کو والدین کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو خود بھی ضرور اس پر عمل کریں گے اور اپنے والدین کے حکم کے خلاف ہرگز نہ کریں گے تو اس خیال کا منشا تو محض محبت ہے مگر بوجہ جہالت کے حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا اور یہ نہ سمجھا کہ حق تعالیٰ والدین سے پاک ہے۔ حافظ عبداللہ صاحب مہتمم مدرسہ نے اس سوال کے جواب میں سورہ اخلاص کا ترجمہ سنا دیا۔ مگر یہ باتیں ان جاہلوں کی اس لئے بری نہیں معلوم ہوتیں کہ محبت سے کہی گئی ہیں۔ محبت کے ساتھ سب باتیں پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ شبان موسیٰ علیہ السلام کی سب باتیں حق تعالیٰ کو پسند ہوئیں کیونکہ سب کا منشاء محبت تھی اس نے بھی خدا کو اپنے اوپر قیاس کیا تھا۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ انسان خدا کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے تو شاید آیات وعید کو دیکھ کر جہلاء حق تعالیٰ کے غصہ کو اپنے غصہ پر قیاس کرتے جس سے ضعفاء کے دل ٹوٹ جاتے۔

عظمت مشیت اور قدرت

اس لئے حق تعالیٰ نے یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ فرما کر ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا و یوم یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ۔ یعنی کو جس دن قیامت ہوگی اس دن مجرم ناامید ہو جائیں گے مگر سب کا یکساں حال نہ ہوگا جس دن قیامت آئے گی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے جو لوگ ایمان والے ہیں اور انہوں نے اچھے عمل کئے ہیں وہ ایک بڑے باغ میں خوش کئے جائیں گے۔

یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ کے بعد یومئذ پھر زیادت تہویل کے لئے مکرر لایا گیا فِیْ رَوْضَةٍ میں تنوین تعظیم کے لئے ہے یعنی بڑے باغ میں خوش کئے جائیں گے۔ يُحْبَرُوْنَ حبار سے ہے جو باب افعال کا مصدر ہے بمعنی سر جس کے بے تکلف معنی اردو محاورہ کے موافق یہ ہوئے کہ وہ بڑے باغ میں مسرور ہوں گے کیونکہ سر بھی لازمی نہیں متعدی ہے دیکھئے حق تعالیٰ نے اس مقام پر یفرحون نہیں فرمایا کیونکہ فرح لازم ہے اس کے معنی یہ ہوتے کہ ایمان والے جنت میں خوش ہوں گے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر طبعی خوشی انسان کو ہو سکتی ہے اس قدر ان کو خوشی حاصل ہوگی سو یفرحون سے طبعی خوشی پر زیادتی سمجھ میں نہ آتی۔ یحبرون سے یہ بات بتلا دی گئی کہ ان کو طبعی خوشی سے بہت زیادہ خوشی حاصل ہوگی کیونکہ ان کو خوش کیا جائے گا یعنی ان کو خوش کرنے کا اہتمام ہوگا۔ کوئی خوش کرنے والا ان کو خوش کرے گا۔

جیسا کہ علماء نے یہی نکتہ مطہرۃ میں بیان فرمایا ہے کہ ازواج مطہرہ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو پاک کیا ہے صرف یہی نہیں کہ وہ خود بخود پاک ہیں کیونکہ جو پاکی خود بخود حاصل ہوتی ہے وہ کم ہوتی ہے دیکھئے اگر ایک کپڑے کو دن رات نہر میں ڈالے رکھیں تو وہ خود بخود پاک ہو جائے گا مگر جو

خوبی اس وقت حاصل ہوگی کہ اس کو کسی شخص کے سپرد کیا جائے اور وہ پانی میں ڈال کر تختہ پر اسے کوٹ پیٹ کر صاف کرے وہ صرف نہر میں ڈالے رکھنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہی نکتہ یجرون میں ہوسکتا ہے یعنی یہی صرف نہیں کہ وہ خوش ہوں گے بلکہ خوش کئے جائیں گے اور ان کو حق تعالیٰ شانہ خوش کریں گے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کتنے بڑے ہیں۔ ان کی عظمت کے موافق ان کی دی ہوئی خوشی بھی عظیم ہوگی اتنا فرق ہوگا کہ حق تعالیٰ شانہ کی عظمت تو بالفعل بھی غیر متناہی ہے اور اہل جنت کی خوشی اگر بالفعل متناہی ہوگی مگر لا تقف عند حد کے اعتبار سے وہ بھی ایک طرح غیر متناہی ہوگی اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عظمت الٰہی داخل مشیت نہیں اور عظمت و سرور اہل جنت داخل مشیت ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کے ارادہ و اختیار کو اس میں دخل ہے اور حادث کی لا متناہی بالفعل محال اور لا تقف عند حد جائز غرض غیر متناہی دونوں ہیں ایک غیر متناہی بالفعل دوسرا غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے الا ماشاء ربک کی تفسیر بھی یہی لکھی ہے کہ خلود اہل جنت و اہل نار داخل تحت القدرت ہے۔ اگرچہ منقطع کوئی بھی نہ ہوگا۔ ورنہ بدوں اس توجیہ کے بظاہر اس استثناء پر شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت و اہل جہنم کے خلود کے ساتھ ماشاء اللہ ربک کیا معنی؟ کیونکہ بظاہر اس کا یہ ترجمہ ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ جنت اور دوزخ میں رہیں گے مگر جب کہ چاہیں حق تعالیٰ تو اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید کبھی نکالے بھی جائیں گے سو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب تفسیر فرمائی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے مگر خدا جب چاہے تو ان کو نکالنے پر بھی قادر ہے مگر ایسا کیا کبھی نہ جائے گا۔ تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ اہل جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے مگر خدا تعالیٰ اس پر مجبور نہیں بلکہ یہ سب اسی کی مشیت سے ہوگا و علی ہذا اہل نار بھی۔

پس جس طرح کہ اہل جنت و اہل نار کا خلود بوجہ داخل تحت القدرت ہونے کے غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد ہے اسی طرح اہل جنت کی خوشی بھی غیر متناہی اسی معنی کے لحاظ سے ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس دقیق مضمون کو اپنی تفسیر میں نہایت ہی سلیس الفاظ میں بیان فرمایا ہے جس سے ہر شخص کا ذہن اس معنی کی طرف منتقل بھی نہیں ہوتا اور ظاہر میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی بڑے اشکال کا جواب ہے البتہ جو لوگ مدرس ہیں اور مواقع اشکالات سے واقف ہیں وہ اس کی قدر کرسکتے ہیں اور یہ شاہ صاحب کا اور بھی بڑا کمال ہے کہ ایسے دقیق مضمون کو معمولی لفظوں سے تعبیر فرما دیتے ہیں۔ اس کی قدر بھی پڑھانے والے ہی جانتے ہیں کہ کم فہم لوگوں کے لئے مضمون کے سہل کرنے میں کس قدر تعب برداشت کرنا پڑتا ہے۔

فضل و رحمت

غرض اس تقریر سے یہ معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں ایمان و اعمال صالحہ کا ثمرہ مذکور ہے کہ ایمان

اور اعمال صالحہ والے جنت میں خوش ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ بغیر انبیاء علیہم السلام کے نہیں معلوم ہو سکتے اسی لئے حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تا کہ لوگوں کو ایمان و اعمال صالحہ کا رستہ بتلا دیں اور اس وقت اول تو کسی اور نبی کی شریعت موجود نہیں اور اگر پہلے انبیاء میں سے کسی کی کوئی شریعت ہے بھی تو محرف ہے جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے پھر اگر غیر محرف بھی ہوتی تو منسوخ تھی۔ اس لئے اس وقت ایمان اور اعمال صالحہ کی دولت صرف ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر حضور تشریف نہ لاتے تو ہم اس دولت سے بالکل محروم رہتے۔ حق تعالیٰ شانہ کا بہت بڑا احسان ہمارے اوپر ہوا کہ آپ کی برکت سے ہم کو اس دولت سے سرفراز فرمایا۔ اسی کو حق تعالیٰ شانہ نے بطریق امتنان احسان جتلا کر جابجا قرآن شریف میں ذکر فرمایا ہے کہیں فرماتے ہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

(اور اگر اللہ تعالیٰ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے) سے اپنا فضل و رحمت نہ فرماتے تو تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے سوائے تھوڑے لوگوں کے۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

(اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و رحم نہ ہوتا تو ضرور تم تباہ ہو جاتے۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان مواقع میں فضل اللہ و رحمتہ کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر خدا تعالیٰ تم پر اپنا فضل و رحمتہ نہ فرماتے تو تم ناکام اور محروم رہتے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعثت محمدیہ سے تم پر رحم و کرم نہ فرماتے تو تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے۔

اس جگہ ایک اشکال طالب علمی ہو سکتا ہے کہ الا قلیلا کے بڑھا دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بدوں بعثت محمدیہ کے بھی راہ مستقیم پا لیتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ اتباع سے مراد اتباع مطلق ہے نہ کہ مطلق اتباع پس معنی یہ ہوئے کہ تم شیطان کے پورے متبع ہوا کرتے۔ صرف بعضے لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عقل کامل و سلیم عطا فرمائی ہے وہ البتہ کامل اتباع شیطان کا نہ کرتے یعنی ایسے امور میں جن میں عقل کام دے سکتی ہے صرف ان میں اتباع شیطان کا خاص ایسے لوگ نہ کرتے گو مطلق اتباع شیطان سے یہ بھی نہ بچتے کیونکہ جن میں عقل کام نہیں دیتی ان میں کوئی مانع اتباع شیطان سے نہ تھی۔

تفصیل امور مذکورہ کی یہ ہے کہ بعض احکام شریعت کے بدیہی اور ظاہر بھی ہیں جن کا حسن و قبح

عقل سے بھی معلوم ہو سکتا ہے تو ایسی باتوں میں عقل سلیم سے راہ راست معلوم ہو سکتی ہے مثلاً ظلم کا قبیح ہونا انصاف کا پسندیدہ ہونا زنا کی برائی عفت و پارسائی کی خوبی ان باتوں میں بعض لوگ راہ مستقیم پر چل سکتے اور شیطان کے اتباع سے بچ سکتے تھے گو تفصیلی احکام بدوں نبوت کے ان کو بھی نصیب نہ ہوتے مگر خیر کسی قدر اتباع شیطان سے ان باتوں میں محفوظ رہ سکتے تھے مگر چونکہ ایسی باتیں بہت تھوڑی ہیں ان کے معلوم کر لینے ہی سے کیا کام چلتا بہت سی باتیں عبادت الٰہی کے متعلق ایسی ہیں جن کو عقل کبھی دریافت نہیں کر سکتی تھی بالخصوص صفات و ذات باری تعالیٰ و امور معاد کا تو بدوں بعثت محمدیہ کے کچھ بھی پتہ نہ چلتا اور نہ معلوم خدا تعالیٰ کے متعلق ہے کیا اعتقاد قائم کر لیتے جیسا کہ کفار نے کر لئے ہیں پھر خود وہ عقل بھی بدولت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عطا ہوئی کیونکہ حضور واسطہ ہیں تمام کائنات کے پس آپ کے وجود کو اس وقت بھی سلوک صراط عقل میں دخل رہتا۔

بہر حال اصل فضل و رحمت جو قابل مسرت و خوشی ہے وہ یہ امر ہے کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کی برکت سے ایمان و اعمال صالحہ کی توفیق ہوئی اور یہ عظیم نعمت حاصل ہوئی جس سے ہماری دنیا و آخرت سنور گئی اور انشاء اللہ اس کی برکت سے ہم جنت میں خوشیاں منائیں گے۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس آیت کے مضمون کو مقصود کے ساتھ پورا تعلق ہے۔

برکات نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

اس آیت میں ایمان اور اعمال کا ثمرہ مذکور ہے اور ایمان و اعمال صالحہ وجود باجود محمدیؐ کے ثمرات ہیں۔ تو یہ ثمرات بھی جو اس آیت میں مذکور ہیں حقیقت میں حضورؐ ہی کے وجود باجود نور حزبور السرور کے ثمرات ہیں۔ تو یہ ثمرات تو ان کو دوسرے دلائل کے ساتھ منضم کرنے سے حضورؐ کے نور مبارک کی برکات دو قسم پر معلوم ہوئیں ایک صوری جو کہ اشیاء کے وجود و ظہور کے متعلق ہیں۔

دوسرے معنوی جو ان اشیاء میں سے خاص اہل ایمان کے صدور کے متعلق ہیں۔

ظہور کے متعلق تو آپ کے نور مبارک کی برکت یہ ہے کہ تمام عالم کا وجود آپ کے نور سے ہوا اور لوگ اسی کو آج کل زیادہ بیان کرتے ہیں۔ صدور کے متعلق آپ کی برکات یہ ہیں کہ ایمان و معرفت الٰہی سب کو حضور ہی کے واسطہ سے حاصل ہوئی ان برکات کو لوگ آج کل بیان ہی نہیں کرتے بالکل ہی چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ زیادہ ضرورت اسی کے بیان کرنے کی ہے کیونکہ جو اثر آپ کے نور کا ظہور کے متعلق ہے اس کے آثار تو محسوس ہیں اور جو اثر صدور کے متعلق ہے اس کے آثار یعنی خاص ثمرات مقصودہ وہ قیامت و جنت میں معلوم ہوں گے اور یہاں ان سے ذہول ہے نیز وہ رتبہ میں بھی اعظم ہیں اسی لئے زیادہ ضرورت اسی کے بیان کرنے کی ہے اور اعظم ہونے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ ظہور پر تو صرف اسی قدر

اثر ہوا کہ ہم موجود ہو گئے مگر صرف موجود ہو جانے سے کچھ زیادہ فضیلت نہیں حاصل ہو سکتی۔ پوری فضیلت ایمان و معرفت الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کو حیوانات پر شرف ہے۔

تیسرے یہ جو اثرات نور مبارک کے ظہور پر ہوئے وہ متناہی اور محدود ہیں کیونکہ موجودات اپنی ذات کے اعتبار سے متناہی ہیں اور صدور پر جو اثر ہوا وہ غیر متناہی ہے کیونکہ معرفت الٰہی کے مراتب اور ان کے ثمرات غیر متناہی ہیں جو ہم کو جنت میں نصیب ہوں گے۔ بس آپ کے نور مبارک کے وہ برکات زیادہ بیان کرنے کے قابل ہیں جو صدور پر متجلی ہیں۔ اس آیت شریفہ میں انہیں ثمرات کا ذکر ہے مگر یہ ثمرات اس آیت کے آخر میں مذکور ہیں۔ اور ایک ثمرہ آپ کے تبرکات متعلقہ صدور کا اس آیت کے شروع ہی میں مذکور ہے جو عجیب ثمرہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ

قیامت جب قائم ہوگی تو لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔ یہ جدا جدا ہونا بھی حضور ہی کے نور مبارک کا ایک ثمرہ ہے کیونکہ ایمان و معرفت و اعمال صالحہ کا حصول آپ کی برکت سے ہوا اور ایمان و اعمال صالحہ ہی کی وجہ سے مخلوق کے دو فرقے ہو گئے بعض مومن بعض کافر تو اس تفریق کا اصل منشا بھی نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی تفریق کے ظاہر کرنے کے لئے قیامت قائم ہوگی تو در اصل حقیقی قیامت آپ ہی کی ذات ہے اور عرفی قیامت اس کا ایک اثر اور ثمرہ اسی کو مولانا نے مثنوی میں ایک جگہ بیان فرمایا ہے۔

صد قیامت بود احمد در جہاں

(احمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود دنیا میں سو قیامت کا باعث ہے)

حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ محمد فرق بین الناس۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرق (یعنی حق و باطل کا) کو واضح کیا۔ (مسند الإمام احمد ۲: ۳۶۷، المصنف لابن ابی شیبة ۲: ۳۷۵، ۳: ۳۳۵، مجمع الزوائد ۳: ۴)

قرآن شریف کا لقب بھی فرقان اسی وجہ سے ہے کہ وہ فارق ہے۔ غرض قیامت قائم ہونیکا سبب بھی تفریق ہے اور یہ تفریق قیامت تابع ہے تفریق محمدی کے۔ اسی کے اظہار کے لئے قیامت قائم کی جائے گی۔ غرض اصل سروران برکات محمدیہ سے یہ ہے کہ ہم اطاعت و معرفت الٰہی کی دولت حاصل کریں جس کے ثمرات قیامت و جنت میں حاصل ہوں گے نہ وہ باتیں جو آج کل ہم لوگ خود بخود گھڑتے ہیں۔

بدعت و ضلالت

یعنی عید میلاد وغیرہ کیونکہ حضور نے ہم کو ان باتوں کی تعلیم نہیں دی بلکہ صراحۃً منع فرمایا ہے اور عید میلاد کے متعلق گو بہت دفعہ بیان ہو چکا ہے اور اصول شریعت سے جتلا دیا گیا ہے کہ یہ فعل بالکل ناجائز اور

بدعت ضلالت ہے مگر اس دفعہ مجھے ایک حدیث اس کے متعلق بہت صریح ملی ہے جس سے صاف صاف اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے وہ حدیث یہ ہے۔ لاتتخذوا قبری عیدا (میری قبر کو عید نہ بناؤ) اس حدیث سے عید میلاد کی نفی نہایت واضح ہے اور میرے لئے یہ حدیث بالکل تسلی بخش ہوگئی میں دوسروں کے لئے بھی تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کرتا ہوں کہ اس حدیث سے عید میلاد النبی کی نفی کیونکر ہوگئی۔

حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میری قبر کو عید نہ بناؤ اول بطور مقدمہ کے جاننے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لئے بہت کچھ شرف حاصل ہے کیونکہ جسد اطہر اس کے اندر موجود ہے بلکہ حضور خود یعنی جسد مع تلبس الروح اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں قریب قریب تمام اہل حق اس پر متفق ہیں صحابہ کا بھی یہی اعتقاد ہے حدیث میں بھی نص ہے۔ ان نبی اللہ حی فی قبرہ یرزق۔ کہ آپ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق بھی پہنچتا ہے مگر یہ یاد رہے اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو حیات برزخیہ کہتے ہیں۔

درجات حیات برزخیہ

باقی یہ کہ برزخیہ تو سب کو حاصل ہے پھر اس میں نبی کی کیا تخصیص ہے تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے مختلف مراتب ہیں۔ ایک مرتبہ تو تمام جماعت مومنین کو حاصل ہے جس کے ذریعہ سے نعیم قبر کی ہر مسلمان کو حس ہوگی۔

دوسری حیات شہداء کی ہے یہ عام مومنین کی حیات برزخیہ سے اقوی ہوگی۔ عام مومنین کی حیات برزخیہ بہ نسبت شہید کے کمزور ہوتی ہے اگرچہ اس حیات ناسوتیہ سے وہ بدرجہا اعلیٰ ہو۔ پس یہ کوئی نہ سمجھے کہ عام مومنین کی حیات برزخیہ اس حیات دنیوی سے بھی کمزور ہوگی اور حیات شہید کے اقوی ہونے کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ زمین اس کی لاش کو نہیں کھاتی۔ اور یہ نہ کھانا ایک اثر ہے حیات کا پس شہید میں اس اثر کا ظاہر ہونا اور عام مومنین کا ہونا یہ دلیل ہے شہید کی حیات کے اقوی ہونے کی بہ نسبت عام کی حیات کے۔

بعض لوگوں نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہوا ہے مگر یہ کوئی انکار کی وجہ نہیں بن سکتی کیونکہ جس طرح اس کے خلاف مشاہدہ ہوا ہے اس کے موافق بھی مشاہدہ ہوا ہے جب دونوں طرح مشاہدہ موجود ہے تو سرے سے اس کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے بہت یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قاعدہ کلی نہیں اکثری ہے اور نصوص کا محمل بھی اسی کو کہا جاوے گا۔ باقی مطلقاً انکار تو صحیح نہیں ہوسکتا۔

یہ تو جواب تسلیمی ہے اس تقدیر پر جب کہ ہم مان لیں کہ جہاں تم نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید ہی تھا مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شہید ہی نہ ہو کیونکہ شہادت صرف اسی کا نام نہیں کہ معرکہ میں قتل ہو جائے بلکہ حقیقی شہادت کے لئے کچھ باطنی شرائط بھی ہیں مثلاً نیت کا خالص ہونا لوجہ اللہ جس کی خبر سوائے

خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس کو آپ نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید حقیقی نہ تھا صرف شہید احکام تھا اور یہ حیات کا قوی درجہ صرف شہید حقیقی کے ساتھ خاص ہوگا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ حقیقی شہید تھا تو ممکن ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے کہ اس کی لاش گل گئی۔ مثلاً اس جگہ کی مٹی تیز ہو۔ ہم نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ شہید کی حیات ایسی ہوتی ہے کہ اگر جلاؤ بھی تو اس کی لاش نہ جلے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اگر شہید کو موافق عادت کے دفن کر دیا جائے جیسا کہ عموماً مردے دفن ہوتے ہیں کہ اس کی قبر میں کوئی خاص عارض دوسروں سے زیادہ مثل شوریت زمین وغیرہ کی نہ ہو تو اس کی لاش مثل دوسرے مردوں کے نہیں گلے گی۔ بعینہ محفوظ رہے گی۔

تیسرا درجہ جو سب سے قوی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخیہ کا ہے کہ وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو شہید کے لئے ہے کہ ان کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھا سکتی۔ حدیث میں ہے۔

حرم الله اجساد الانبياء على الارض (۱-تهذيب تاريخ دمشق لابن عساكر ۳:۱۵۷)

(اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجساد کو کھانا حرام کر دیا ہے)۔

اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں مگر منصوص ہے اور وہ حرمت نکاح ازواج انبیاء علیہم السلام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج مطہرات سے بعد ان کے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں۔ نیز انبیاء علیہم السلام کی میراث ورثہ میں تقسیم نہیں ہوتی۔

نحن معاشر الانبياء لانورث ماتركنا صدقة (۲-فتح الباری لابن حجر ۱۲:۸، تفسیر زادالمسیر لابن الجوزی ۵:۲۰۹)

(ہم حضرات انبیاء علیہم السلام کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا ہے ہمارا سارا ترکہ صدقہ ہے۔)

انبیاء علیہم السلام کا تمام ترکہ صدقہ ہوتا ہے یہ باتیں شہید کے لئے شریعت نے مشروع نہیں کیں۔ تو اگرچہ شریعت نے اس کا خاص کوئی راز نہیں بیان کیا۔ مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں اس کا راز قوت حیات انبیاء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے ان دونوں امروں سے اور گو ازواج نبی سے بعد وفات نبی کے نکاح حرام ہونا تمام انبیاء کے بارہ میں منقول نہیں ہوا صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ خصوصیت قرآن میں ذکر کی گئی ہے مگر علماء حکم میراث پر قیاس کر کے اس حکم کو بھی عام جملہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے لئے سمجھتے ہیں اور میراث کا تقسیم نہ ہونا حدیث سے جملہ انبیاء علیہم السلام کے لئے عام طور پر معلوم ہو چکا ہے تو ان امتیازات سے حیات برزخیہ انبیاء کا شہداء اور عام مومنین سے قوی ہونا ثابت ہوا۔ بہر حال خاص بات

باتفاق امت ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں اور خاص ہمارے حضور کے بارہ میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں۔ ان کو بھی حضور کی حیات کا اقرار ہے۔

چنانچہ اس واقعہ سے ان کا اقرار معلوم ہو جائے گا۔ تاریخ مدینہ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور میں نے خود اس تاریخ میں دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند صدی بعد (یاد نہیں رہا کس بادشاہ کے وقت میں) دو شخص مدینہ میں حضور کے جسد اطہر کو نکالنے کے لئے آئے تھے مسجد نبوی کے پاس ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا اور دن بھر نماز و تسبیح میں مشغول رہتے تھے۔ لوگ ان کے معتقد بھی ہو گئے تھے۔ زاہد مشہور ہو گئے تھے۔ وہ کم بخت رات کے وقت اس مکان سے قبر شریف کی طرف سرنگ کھودتے تھے اور جس قدر سرنگ کھود لیتے تھے راتوں رات مٹی مدینہ سے باہر پھینک آتے تھے اور جگہ برابر کر دیتے تھے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کئی ہفتہ تک وہ لوگ سرنگ کھودنے میں مشغول رہے۔

جب ادھر ان لوگوں نے یہ کام شروع کیا حق تعالیٰ نے اس زمانہ کے سلطان کو (نام یاد نہیں رہا) بذریعہ خواب کے متنبہ کر دیا۔ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کا چہرہ مبارک پر حزن و غم کے آثار ہیں اور آپ اس بادشاہ کا نام لے کر فرما رہے ہیں کہ مجھے ان دو شخصوں نے بہت ایذا دے رکھی ہے جلد مجھے ان سے نجات دو۔ خواب میں دونوں شخصوں کی صورت بھی بادشاہ کو دکھلا دی گئی۔ خواب سے بیدار ہو کر بادشاہ نے وزیر سے اس کا تذکرہ کیا۔ وزیر نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ آپ جلد مدینہ تشریف لے جاویں۔ بادشاہ نے فوراً فوج لے کر بہت تیزی کے ساتھ مدینہ کی طرف سفر شروع کیا اور بہت جلد مدینہ پہنچ گیا۔

اس عرصہ میں وہ لوگ بہت سرنگ کھود چکے تھے اور بالکل جسد اطہر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک دن کی بادشاہ کو اور تاخیر ہو جاتی تو وہ لوگ اپنا کام پورا کر لیتے بادشاہ نے مدینہ پہنچ کر تمام لوگوں کی مدینہ سے باہر دعوت کی اور سب کو مدینہ سے ایک خاص دروازے سے باہر نکالنے کا حکم کیا اور خود دروازہ پر کھڑے ہو کر ہر شخص کو خوب غور سے دیکھتا جاتا تھا یہاں تک کہ مدینہ کے سب مرد شہر سے باہر نکل آئے مگر ان دو شخصوں کی صورت نظر نہ پڑی جن کو خواب میں دیکھا تھا اس لئے بادشاہ کو سخت حیرت ہوئی اور لوگوں سے کہا کہ کیا سب لوگ باہر آ گئے لوگوں نے کہا اب کوئی اندر نہیں رہا۔ بادشاہ نے کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ضرور کوئی اندر رہا ہے لوگوں نے کہا کہ دو زاہد اندر رہ گئے ہیں وہ کسی کی دعوت میں جایا نہیں کرتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا مجھے ان ہی سے کام ہے۔

چنانچہ جب وہ پکڑ کر لائے گئے تو وہ بعینہ وہ دو صورتیں نظر پڑیں جو خواب میں دکھلائی گئی تھیں۔ ان کو فوراً قید کر لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے حضور کو کیا ایذا دی ہے چنانچہ بڑی دیر کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ ہم نے جسد اطہر کو نکالنے کے لئے سرنگ کھودی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے وہ سرنگ دیکھی تو معلوم ہوا کہ قدم

مبارک تک پہنچ چکی ہے بادشاہ نے قدم مبارک کو بوسہ دے کر سرنگ بند کرا دی اور زمین کو پانی کی تہ تک کھدوا کر قبر مبارک کے چاروں طرف سیسہ پلا دیا تاکہ آئندہ کوئی سرنگ نہ لگا سکے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسد اطہر کے صحیح و سالم ہونے کا ایسا پختہ اعتقاد ہے کہ کئی سو برس کے بعد بھی اس کے نکالنے کی کوشش کی۔ اگر ان کو جسد اطہر کے محفوظ نہ ہونے کا یقین ہوتا تو وہ سرنگ کیوں لگاتے۔ محض وہم و شبہ پر اتنا بڑا خطرہ کا کام کوئی نہیں کرتا وہ لوگ اہل کتاب ہیں وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ نبی کے جسم کو زمین نہیں کھا سکتی۔

عرش و فرش

وہ خوب جانتے ہیں کہ حضور نبی برحق تھے مگر بوجہ عناد کے اقرار نہیں کرتے۔ جب حضور کا جسد اطہر موافقین و مخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے اور مع روح ہے جیسا کہ بیان کیا گیا تو ظاہر ہے اور علماء نے بھی تصریح کی ہے کہ وہ بقعہ جس سے جسم مبارک خصوص مع الروح مس کئے ہوئے ہے عرش سے بھی افضل ہے کیونکہ عرش پر معاذ اللہ حق تعالیٰ شانہ بیٹھے ہوئے ہوتے تو بے شک وہ جگہ سب سے افضل ہوتی۔ مگر خدا تعالیٰ مکان سے پاک ہیں اس لئے عرش کو مستقر خداوندی نہیں کہا جا سکتا۔

اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے معنی استقرار کے نہیں ہو سکتے کیونکہ بیٹھنے کی جگہ وہ ہو سکتی ہے جو بیٹھنے والے سے زیادہ یا کم سے کم اس کے برابر تو ہو۔ مثلاً اگر ہم تخت یا کرسی پر بیٹھیں اور اس کے اوپر ایک تنکا پڑا ہوا ہو تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم تنکے پر مستقر ہوئے کیونکہ اس کو ہم سے کچھ بھی نسبت نہیں اس لئے وہ ہمارا مکان نہیں بن سکتا۔ پس اسی طرح عرش خدا تعالیٰ کا مکان نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے وہ نسبت بھی نہیں جو رائی کے دانہ کو ہم سے ہے۔ اس دلیل سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے معنی بیٹھنے کے ہرگز یہاں نہیں ہو سکتے۔

اب سوال ہوگا کہ پھر کیا معنی مراد ہیں۔ اس میں سلف کا مسلک تو یہ ہے کہ سکوت کرو اور واقعی سلامتی اسی میں ہے مگر متاخرین نے بمصلحت وقت کسی مناسب تاویل کر دینے کی اجازت دے دی ہے۔ جب مصلحت کی بناء پر باب تاویل مفتوح ہو گیا تو ہر شخص کو مناسب تاویل کر دینے کا حق ہے۔

ایک تاویل میرے ذہن میں اس آیت کی آئی ہے جو دوسری تاویلوں کی بہ نسبت اقرب اور بہت صاف ہے اگرچہ میرا مذاق طبعی اس بارہ میں سلف کے موافق ہے لیکن جو لوگ بضرورت تاویل کرنا ہی پسند کرتے ہیں وہ میری اس تاویل کو بھی ان ہی تاویلوں میں جگہ دے دیں۔

میرے ذہن میں اس اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے متعلق یہ بات آئی ہے کہ بعض آیات میں اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے بعد یدبر الامر بھی آیا ہے جس کو اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا بیان قرار دیا جائے

تو یہ محاورہ ایسا ہو جائے گا کہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے کہ ولی عہد تخت نشین ہو گیا۔ عرف میں تخت نشین ہونے کے معنی حکمران ہونے کے ہیں خاص تخت پر بیٹھنا ضروری نہیں۔ اسی طرح استویٰ علی العرش کے معنی تدبیر حکمرانی فرمانے کے ہیں یعنی زمین و آسمان کو پیدا فرما کر حق تعالیٰ شانہ ان آسمان و زمین میں حکمرانی و تدبیر و تصرف کرنے لگے۔ پس اگر تاویل کی جاوے تو یہ تاویل بھی عمدہ اور لطیف تاویل ہے۔ پس یہ کنایہ ہوگا۔

غرض حق تعالیٰ شانہ پر بوجہ مانعات عقلیہ کے استویٰ متعارف کا حکم نہیں کہا جا سکتا۔ تو عرش کو محل استقرار حق کی وجہ سے فضیلت نہیں ہے کہ بقعہ شریفہ سے وہ افضل ہوتا بلکہ اس کو صرف اس وجہ سے اور اماکن پر فضیلت ہے کہ وہ ایک تجلی گاہ ہے اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون تجلی گاہ الٰہی ہوگا۔ پس اس حیثیت کے اثر سے بھی بقعہ شریفہ خالی نہ رہا۔ اس لئے ہر طرح وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں سب سے زیادہ اشرف ہوئی کیونکہ تجلیات حق بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ تمام اماکن سے زیادہ فائض ہوتے ہیں۔ بہر حال اس مسئلہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے۔ یہ تو ایک مقدمہ تھا کہ بقعہ شریفہ و قبر شریف تمام اماکن سے افضل ہے۔

عذاب فساد عقائد

اب اس مقدمہ کے بعد یہ سمجھنا چاہئے کہ قبر شریف تو بلا اختلاف بعینہ باقی ہے اس میں کبھی کسی کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا اور یوم الولادت و یوم المعراج و یوم البعثت وغیرہ یقیناً باقی نہیں کیونکہ زمانہ غیر قار ہے۔ اور دن جس میں حضور کی ولادت ہوئی تھی۔ اب یقیناً نہیں لوٹتا بلکہ اس کا مثل عود کرتا ہے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا۔

اس کے بعد یہ سمجھو کہ جب حضور نے قبر کو عید بنانے سے منع فرما دیا اور اس کا عید بنانا حرام ہو گیا جو کہ یقیناً باقی ہے تو اب پیروں کو عید بنانا جو کہ بعینہ باقی نہیں کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک تو اس حدیث سے عید میلاد کی صراحۃً نفی ہوتی ہے اب بھی کسی کو اس کی حرمت میں شک ہو تو وہ جانے اور اس کا کام جانے۔

اس تقریر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت اور کلام کی جامعیت بھی واضح ہو گئی ہوگی کہ حضور نے خاص طور پر قبر ہی کی عید بنانے سے کیوں منع فرمایا۔ سو اس لئے منع فرمایا کہ اس کی فضیلت و شرافت تو بوجہ معین اور یقینی ہونے کے سب کو مسلم ہوگی۔ جب ایسی چیز کی بابت کوئی حکم بیان کر دیا جائے گا اس پر ادنیٰ کو قیاس کر کے بقیہ سب چیزوں کا حکم معلوم ہو جائے گا۔ جب ان چیزوں کا عید بنانا معلوم ہو گیا کہ حرام ہے اور قرآن میں نعیم جنت کا ایمان و عمل صالح پر ترتب صاف صاف مذکور ہے اور عمل صالح میں حرام امور کے ترک پر موقوف ہے تو اگر نعیم جنت حاصل کرنے کا اشتیاق ہے اور یقیناً ہر مسلمان کو ہے تو ان غیر مشروع کاموں کو چھوڑنا چاہئے کیونکہ نجات کلی بغیر اعمال صالحہ کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرآن میں جابجا آمنوا کے بعد عملوا الصٰلحٰت ضرور مذکور ہے۔ اگر بدرجہ اتم واکمل نجات چاہیں تو ان چیزوں کو ترک کریں۔ بدرجہ اتم واکمل اس لئے کہا کہ کسی نہ کسی وقت تو اہل بدعت بھی نجات پا ہی لیں گے۔ اگرچہ وہ ہمیں کافر کہیں مگر ہم ان کو کافر نہیں کہتے کہ محروم عن النجاۃ سمجھیں۔

اس پر ایک طالب علمانہ شبہ ہے جس کو میں دفع کردینا چاہتا ہوں۔ شبہ یہ ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے تہتر فرقے ہوں گے جن میں بجز ایک فرقہ کے سب ناری ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ ناجیہ صرف ایک ہی ہے۔ باقی ناجی نہیں کیونکہ اگر باقی فرقے بھی کچھ عذاب بھگت کر نجات پا جائیں تو ان فرقوں میں اور فرقہ ناجیہ میں کیا فرق ہوگا کیونکہ ناجیہ جو کہ اہل حق ہیں ان کے لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سب کے سب بدوں حساب کتاب اور بدوں کسی قدر مواخذہ کے جنت میں جائیں گے جیسا اہل حق میں بھی عصاۃ کو بھی نجات اولیٰ حاصل نہیں تو دونوں میں فرق کیا ہوا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہوگا کہ ان میں ناجی صرف ایک فرقہ ہے معلوم ہوا کہ فرقہ ناجیہ کو تو کبھی نہ کبھی نجات حاصل ہو جائے گی اور باقی بہتر فرقوں کو کبھی نجات حاصل نہ ہوگی تو یہ اہل بدعت کیونکر نجات پا سکتے ہیں۔ اگر اس کا التزام کیا جاوے تو اہل بدعت کی عدم تکفیر کے کیا معنی؟

جواب یہ ہے کہ مراد حدیث میں یہ ہے کہ وہ بہتر بوجہ فساد عقیدہ کے جہنم میں جائیں گے اور اہل حق جو کہ فرقہ ناجیہ ہے فساد عقیدہ کی وجہ سے جہنم میں نہ جائیں گے دونوں میں مابہ الفرق دخول الفساد والعقائد ہے۔ باقی دخول للعمل یہ دونوں میں مشترک ہے پس اس تقریر کے بعد اہل بدعت کا خلود ثابت نہ ہوا۔ اور اس تقریر کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ نص قطعی فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ سے معلوم ہے کہ اور جو کوئی ذرہ برابر برائی کرے گا اس کو بھی دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بھلائی کرے گا اس کو بھی دیکھ لے گا تو جس شخص میں کچھ ایمان ہے اگرچہ فساد عقیدہ ہی کے ساتھ ہے تو اگر وہ بھی ناجی نہ ہو تو وہ اس کی جزا کب پائے گا۔ آیا قبل دخول نار یا بعد دخول نار۔ قبل دخول نار تو محال ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ وہ اول جنت میں جاوے اور پھر وہاں سے خارج ہو کے جہنم میں جاوے اور نصوص سے معلوم ہے کہ بعد دخول جنت کسی کو عذاب نہ ہوگا۔ اور اگر جنت کے سوا اور کہیں ثواب پاوے تو جنت سے پہلے کوئی اور موقع ثواب کا نہیں۔ بس یہی ایک صورت ہے کہ وہ اپنے ایمان قلیل کی جزا بعد دخول نار پائے کہ جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہو ورنہ اگر کہیں جزا نہ ملے تو لازم آئے گا کہ کوئی عمل صالح ایسا بھی ہوا جس کا کوئی صلہ کرنے والے کو نہ ملے اور یہ اس آیت کے خلاف ہے اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اہل بدعت کو خلود ہوگا کبھی نجات نہ ہوگی بلکہ کبھی نہ کبھی تو نجات ضرور ہو جائے گی۔ گو اس سے پہلے عذاب بھی بھگتنا پڑے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ جو عذاب فساد عقائد سے ہو وہ اشد ہے اس عذاب سے جو فساد عمل سے ہو۔ چنانچہ احادیث اور بزرگوں کے اقوال سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل بدعت کو دوسرے فساق سے زیادہ سخت عذاب ہوگا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک جگہ میرا گزر ہوا تو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ اہل قبور کو عذاب ہو رہا ہے ہم نے ان کے لئے دعا کی تو معلوم ہوا کہ اہل بدعت کے سوا سب کی اس وقت مغفرت ہوگئی۔

اس لئے یوں تو سب گناہوں سے مسلمان کو بچنا چاہئے کیونکہ مقصود اعلیٰ نجات اکمل ہی ہے اور وہ بدوں گناہوں سے بچے حاصل نہیں ہو سکتی مگر بدعت سے بہت زیادہ اجتناب ضروری ہے کیونکہ بدعت حق تعالیٰ شانہ کو بہت مبغوض ہے۔ اس لئے کہ دیگر اعمال تو لوگ حرام اور گناہ سمجھ کر کرتے ہیں اور افعال بدعت کو نیکی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سے توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ ان ہی میں سے منکرات متعلقہ رسم مولد بھی ہیں۔ یہاں تک تو پہلا مضمون تھا جس کا ہمیشہ بیان کرنے کا معمول ہے۔ یعنی رسم میلاد کا جو کہ ختم ہو چکا۔ اس جزو کا نام الحبور لنور الصدور ہونا چاہئے کیونکہ جو نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صدور یعنی قلوب میں ہے اور وہ قیامت میں معلوم ہوگا اور اس سے جنتیوں میں خوشی حاصل ہوگی یہ اس کا تذکرہ تھا۔

تبرکات نبویہ

اب دوسرا مضمون جو بعد میں منضم ہوا ہے یعنی تبرکات نبویہ کا بھی جو کہ ربیع الاول کے متعلق ہے اور گیارہویں کا بیان بھی جو کہ ربیع الثانی کے متعلق ہے شروع کرتا ہوں لوگوں سے ان دونوں میں کوتاہی زیادہ ہو رہی ہے۔ میں ہر ایک کو الگ الگ بیان کروں گا۔

تبرکات نبویؐ میں ایک تو وہی زیادتی ہو رہی ہے جو اور بدعات میں ہے کہ اس کو لوگوں نے عید بنا رکھا ہے۔ اس باب میں اکثر لوگ یہاں تک کہ بعض طلباء بھی شک میں ہیں یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے جبہ نبویؐ کی زیارت باعث برکت ہے۔ اگر کوئی صرف زیارت کی نیت سے جائے تو مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔

مجھ سے ایک طالب علم نے جن کا مکان جلال آباد میں ہے اور جبہ شریف کے مکان کے پاس ان کی دکان ہے۔ سوال کیا کہ میں دوکان میں بیٹھ کر جبہ کی زیارت کرلوں گا مگر میں نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ مجمع بالکل میلوں عرسوں کی طرح ہوتا ہے۔ تاریخ کی تعیین ہوتی ہے۔ دعوت ہوتی ہے دور سے آدمی آتے ہیں۔ عورتوں کا اجتماع بھی ہوتا ہے ایسے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے زیارت کرنے آتے ہیں حالانکہ زیارت جبہ کی نماز روزہ کے برابر کبھی نہیں ہو سکتی۔

حدیث **لاتتخذوا قبری عیدا** (میری قبر کو عید نہ بناؤ) سے اس کی بھی نفی ہوگئی کیونکہ جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہو سکتی گو اس میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مثل یوم ولادت

وغیرہ کے اس میں بھی تبدل ہو گیا۔ اگرچہ عدم تبدل کا یقین بھی نہیں مگر خیر جو بات دل میں نہیں اس کو زبان پر بھی نہ لانا چاہئے۔ مگر ایک دوسری بات مابہ الامتیاز یہاں بھی موجود ہے کہ اس وقت وہ ملبوس جسد اطہر سے مماس نہیں اور قبر شریف کو مماس حاصل ہے اسی لئے جبہ نبوی کو کسی نے عرش سے افضل نہیں کہا۔ پس جب قبر کا عید بنانا حرام ہے تو ملبوس شریف کو عید بنانا کس طرح جائز ہوگا۔

کہیں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اس وقت تک موجود ہیں عید بنانا ان کا بھی جائز نہیں کیونکہ اگرچہ بظاہر یہ خیال کرکے کہ موئے مبارک جزو بدن ہے قبر سے افضل معلوم ہوتا ہے مگر قبر میں اتصال اور مماس کی ایسی فضیلت موجود ہے جو موئے مبارک کو بالفعل حاصل نہیں۔ اس لئے دونوں خیر مساوی ہوئے موئے مبارک جزو ہے مگر اب مماس نہیں اور قبر شریف جزو نہیں مگر مماس ہے تو دونوں برابر ہوئے اور ایک مساوی سے دوسرے مساوی کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔ پس حدیث **لاتتخذوا قبری عیدا** سے موئے مبارک کو عید بنانا حرام ہو گیا یہ حضور کی غایت بلاغت ہے کہ آپ نے قبر کو ذکر میں اختیار فرمایا جس سے ملبوس وشعر وغیرہ سب کے احکام خود بخود معلوم ہو گئے۔

علاوہ ازیں صحابہ اور سلف صالحین نے یعید کو کبھی اختیار نہیں کیا حالانکہ ان کے پاس ہم سے زیادہ تبرکات نبویہ موجود تھے اور ان کو ہم سے زیادہ ثواب کے کاموں میں سبقت تھی۔ اگر یہ کوئی خیر ہوتی تو سلف میں اس کی کچھ تو اصل ہوتی۔

اب صرف یہ سوال رہ گیا کہ صحابہ میں عید کی طرح اجتماع نہ تھا تو آخر تبرکات کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا تھا۔ تو اس کے لئے میں نے چند احادیث ایک پرچہ پر لکھ لی ہیں۔ کیونکہ ان کو بلفظہا یاد رکھنا دشوار تھا اس وقت ان کو نقل کئے دیتا ہوں۔

> **عن عثمان بن عبداللہ بن وھب قال فارسلنی اھلی الی ام سلمۃ بقدح من ماء و کان اذا اصاب الانسان عین اوشئی بعث الیھا مخضبہ لھافاخرجت من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت تمسکہ فی جلجل من فضتہ فخضخضتہ فشرب منہ قال فاطلعت فی الجلجل فرائیت شعرات حمراء رواہ البخاری** (مسند الامام احمد ۲:۳۶۷، المصنف لابن ابی شیبۃ ۲:۳۷۵، ۳۴۵، مجمع الزوائد ۳:۳)

عثمان بن عبداللہ بن وھب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے حضرت ام المومنین سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا کے پاس ایک پیالہ پانی کا دے کر بھیجا اور یہ قاعدہ تھا کہ جب کسی انسان کو نظر وغیرہ کی تکلیف ہوتی تو حضرت ام سلمہؓ کے پاس پانی کا پیالہ بھیج دیتا۔ ان کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے جن کو انہوں نے چاندی کی نلکی میں رکھا ہوا تھا۔ پانی میں

ان بالوں کو ہلا دیا کرتی تھیں اور وہ پانی بیمار کو پلا دیا جاتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے جو جھک کر نلکی کو دیکھا تو اس میں چند سرخ بال تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوگیا کہ ایک صحابیہ کے پاس نلکی میں بال رکھے ہوئے تھے جس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جاتا تھا کہ بیماروں کی شفا کے لئے اس کا غسالہ پلا دیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے بارہ میں اختلاف ہوا ہے صحیح یہ ہے کہ حضورؐ کے بال پکنے لگے تھے جس سے دیکھنے والوں کو خضاب کا شبہ ہوتا تھا ورنہ حضور نے خضاب کبھی نہیں کیا کیونکہ حضور کے کل سفید بال قریب بیس کے تھے یا کچھ زائد۔

نلکی پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک تھانیدار کے یہاں ایک شخص نے رپٹ لکھوائی کہ میری فاتحہ چوری ہوگئی۔ داروغہ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ یا اللہ فاتحہ کیا اور اس کا چوری ہونا کیسا! پوچھا تو قصہ بیان کیا کہ ہمارا ایک پیر ہے جب وہ آیا کرے ہے تو ہمارے کھانا کی فاتحہ دیا کرے ہے اور جب جاوے ہے ایک نلکی میں فاتحہ بند کر دے ہے کہ سال بھر تک اس سے کام لیتے رہیو۔ پھر میں آ کر دوبارہ پڑھ دوں گا۔ تو نلکی چوری ہوگئی ہے۔

عن اسماء بنت ابی بکر رضی الله تعالیٰ عنهما انها اخرجت جبة طيالسية كسروانيه لهالينته ديباج دفرجيها مكفوفين بالديباج كانت عد عائشة فلما قبضت قبضتها وكان النبی صلی الله عليه وسلم يلبسها نحن نغسلها للمرضی نستشفی بها (الصحيح لمسلم
كتاب الحج: ۳۲۶، سنن الترمذی: ۹۱۳، السنن الكبری للبيهقی ۵ ۱۳۳)

حضرت اسما بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک جبہ طیلسانی کسروی نکالا جس کے گریبان اور دونوں چاک پر ریشم کی سنجاف لگی ہوئی تھی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے جو حضرت عائشہؓ کے پاس تھا ان کی وفات کے بعد میں نے اسے لے لیا۔ حضور اس کو پہنا کرتے تھے۔ ہم اس کو پانی میں دھو کر وہ پانی بیماروں کو پلا دیتے ہیں شفاء حاصل کرنے کے لئے۔

اس حدیث پر شاید بادی النظر میں کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ جبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماء کے پاس کیونکر رہا اور جب تک ترکہ نبوی تقسیم نہ ہو جائے ان کو اس کے استعمال کا کیا حق تھا۔

تو بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں میراث جاری نہیں ہوگی بلکہ آپ کے مال میں تمام مسلمانوں کا حق تھا تو آپ کا ترکہ وقف تھا اور یہ حضرات اس کے متولی تھے اور ان کے اذن سے سب مسلمانوں کو بطریق برکت اس کے استعمال کا حق حاصل ہے۔ اور باذن متولی کی قید اس لئے بڑھا دی کہ شاید کسی کو یہ سن کر کہ حضور کا مال وقف ہے اس جبہ متبرکہ کے لینے کی فکر ہوئی ہو۔ سو یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ حضور کا ترکہ وقف ہے مگر وقف میں بدوں اذن متولی کسی کو تصرف کرنا جائز نہیں۔ پس

جبہ شریف کو اس کے خدام سے چھیننا یا بلا اجازت استعمال کرنا کسی کو جائز نہیں اور اس قسم کی باتوں کی ضرورت ہی کیا پڑتی ہے وہ خدام تو بیچارے خود ہی اپنے سر پر رکھ کر ہر شخص کے گھر لے جا کر زیارت کرا دیتے ہیں البتہ روٹی ان لوگوں کو دینا پڑے گی اس سے زیادہ وہ تم سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ یہ بھی جبہ شریف کی برکت کھلی ہوئی ہے کہ اس کے خدام بے طمع ہیں۔

احتیاط در بارہ تبرکات

(خواب بابت جبہ شریف) احقر نے ایک بار یہ دیکھا کہ کوئی شخص اس کے چرانے کی فکر میں ہے۔ میں نے خدام سے کہلا بھیجا کہ گو میرا خواب کوئی چیز نہیں، مگر احتیاط کا مقتضا یہ ہے کہ جبہ شریف کی زیادہ حفاظت کی جاوے۔

وعن انس قال ان النبی صلی الله علیه وسلم اتی منی فاتی الجمرة فرماهاثم اتی منزله بمنی و نحر نسکه ثم دعا بالحلاق و ناول الحالق شقه الایمن فحلقه ثم دعااباطلحة الا نصاری فاعطاه ثم ناول الشق الایسر فقال احلق فحلقه فاعطاه اباطلحة فقال اقسمه بین الناس.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں عرفات سے منیٰ میں تشریف لائے اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا۔ پھر حلاق کو بلایا اور اس کو سر کا داہنا حصہ اول دیا اس نے داہنے حصہ کو مونڈا پھر حضور نے ابوطلحہ انصاری کو بلایا وہ بال ان کو عطا کئے پھر نائی کو سر کا بایاں حصہ دیا اور فرمایا مونڈو اس نے بائیں حصہ کو بھی مونڈا۔ آپ نے وہ بال بھی ابوطلحہ انصاری کو دیئے اور فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کرو۔

یہاں سے ایک بات پر متنبہ کر دینا مناسب ہے وہ یہ کہ نائی کو آج کل حجام کہتے ہیں یہ لفظ غلط ہے۔ حجام اصل میں پچھنے لگانے والے کو کہا جاتا ہے۔ نائی کو عربی میں حلاق کہتے ہیں مگر ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں یہ قوم پچھنے لگانے کا پیشہ بھی کرتی ہو اس وجہ سے اس وقت اس کام کی مناسبت سے حجام لقب پڑ گیا ہوگا پھر اس پیشہ کے چھوڑ دینے کے بعد بھی لقب باقی رہا۔

ایک شاعر نے حجام کو خوب دھمکایا ہے کہ تو بڑا بے ادب ہے خط پروردگار میں اصلاح کر دیتا ہے۔

یعنی داڑھی وغیرہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں تو ان میں اصلاح کر دیتا ہے تو خط پروردگار کو درست کرتا ہے۔ یہ شاعر بھی کسی کو نہیں چھوڑتے شعر یہ ہے۔

حجام ہر دو دست ترا قطع واجب است — اصلاح میدہی خط پروردگار را

حجام تیرے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالنے ضروری ہیں کیونکہ پروردگار کے پیدا کئے ہوئے خط کی اصلاح کرتا ہے)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے بہت مقدار میں اپنے موئے مبارک صحابہ میں تقسیم فرمائے ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابہ شرقاً و غرباً منتشر ہوئے تھے۔ تو اگر کہیں موئے مبارک پایا جائے تو جلدی سے اس کا انکار نہ کر دیا جائے بلکہ اگر سند صحیح سے اس کا پتہ معلوم ہو جائے تو اس کی تعظیم کی جائے ورنہ اگر یقینی دلیل افتراء و اختراع کی نہ ہو تو سکوت کیا جائے یعنی نہ تصدیق کی جاوے نہ تکذیب۔ مشتبہ امر میں شریعت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔

قال علیه السلام لاتصدقوا اهل الکتب ولاتکذبوهم وقولوا امنا بالله وما انزل الینا رواه البخاری قال فی المرقاة فیه اشارة الی التوقف فیما استشکل من الامور والعلوم (الصحیح للبخاری ۳:۶۳۷، ۴:۲۵، ۹:۱۳۶، ۱۹۳، السنن الکبری للبیهقی ۱۰:۱۶۳، مشکوة المصابیح: ۱۵۵، شرح السنة للبغوی ۱:۲۶۹، البدایة والنهایة لابن کثیر ۲:۱۳۳)

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو بلکہ کہو کہ ہم اللہ پر اور اس کی کتاب پر جو کہ ہماری طرف نازل ہوئی ایمان لاتے ہیں۔)

ملا علی قاری مرقاۃ میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو امر اور جو مضمون علمی مشتبہ ہو اس میں توقف کرنا چاہئے۔ جرات کر کے ایک جانب کو بلا تیقن معین نہ کرنا چاہئے۔ اہل کتاب کے اقوال میں توقف اس لئے واجب ہے کہ قرآن سے تورات و انجیل کا کتاب اللہ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے اس میں تحریف بھی کی ہے۔ اب جو مضمون وہ بیان کریں اس میں یہ بھی شبہ ہے کہ کلام الٰہی ہو اور یہ بھی خدشہ ہے کہ اہل کتاب کے محرفات میں سے ہو۔ پس بلا دلیل مستقل کسی ایک جانب کی تعیین دشوار ہے اس لئے توقف واجب ہے۔

یہی حال موئے مبارک کا ہے کہ حضور نے بہت سے بال صحابہ کو تقسیم فرمائے ہیں اور ظاہر ہے کہ حضور کا بال جہاں بھی ہو گا اس کی حفاظت کی گئی ہے اس لئے عقل بھی تقاضا کرتی ہے کہ اس میں سے کچھ بقایا ضرور موجود ہوں گے مگر آج کل جھوٹ کا بھی بازار گرم ہے یہ بھی شبہ ہے کہ طمع دنیا سے کہیں جھوٹ موٹ دعویٰ نہ کیا گیا ہو اس لئے اس کے بارہ میں بھی توقف واجب ہے نہ تصدیق کی جائے نہ تکذیب مگر سنا ہے مدینہ میں موئے مبارک بسند معتبر موجود ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موئے مبارک کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہم نے موئے مبارک پایا نہیں مگر اتنی خبر سنی ہے کہ دنیا میں موجود ہے سو تسلی کے لئے ہمیں اتنا بھی کافی ہے۔ پھر اس پر یہ شعر فرماتے ہیں۔

مرا از زلف تو موئے پسند است   ہوس را راہ مدہ بوئے پسند است

شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ اشعار خوب موقع سے لاتے ہیں۔ ایک مقام پر جہاں حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کا حال آیا ہے کہ ایک دن حضور نے حجرہ شریف کا پردہ اٹھا کر صحابہ کو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ اور آپ مسرور ہوئے۔ صحابہ فرماتے ہیں کہ حضور کا چہرہ مبارک دیکھ کر قریب تھا کہ ہم نمازیں توڑ دیں کہ حضور نے اشارہ سے سب کو سکون کا حکم فرمایا۔ اس جگہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شعر بہت اچھا لکھا ہے۔

در نماز خم ابروئے تو چوں یاد آمد حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

برکات تبرکات

وعن ام عطیة فی قصته غسل زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و تکفینها انها قالت فالقی حقوہ فقال اشعرنها ایاہ قال الشیخ فی اللمعات و ھذا الحدیث اصل فی البرکة باثار صالحین ولباسھم (الصحیح للبخاری ۲: ۹۳، ۹۴، الصحیح لمسلم کتاب الجنائز ۳۶، ۴۰، سنن ابی داود کتاب الجنائز باب: ۳۳ سنن النسائی ۴: ۲۲، ۲۹، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵۔)

حضرت ام عطیہ حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل و کفن کے واقعہ میں روایت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہ بند ہمارے پاس ڈال دیا کہ اس کو مرحومہ کے بدن سے مماس کر کے پہناؤ۔ یعنی سب سے نیچے اس کو رکھو (تاکہ اس کی برکت بدن سے متصل رہے)

حضرت شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ لمعات شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث آثار و ملبوسات صالحین سے برکت لینے میں اصل ہے۔ معلوم ہوا کہ تبرکات سے برکت حاصل کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بعد موت کے اس کو کفن میں رکھ دیا جائے۔ مگر اس سے قرآن اور دعاؤں کی کتابوں کا کفن میں رکھنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں ان کا احترام باطل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ساتھ ناپاکی نجاست قرآن کو بھی لگے گی۔ اسی طرح وہ کتابیں جن میں دعائیں ہیں اور اللہ رسول کا نام جا بجا ہے قابل احترام بلکہ الفاظ و حروف مطلقاً قابل احترام ہیں بلکہ سادہ کاغذ بھی بوجہ آلہ علم ہونے کے قابل احترام ہے۔

بعض لوگ فرعون و ہامان کا نام لکھ کر اس پر جوتے مارتے ہیں۔ یہ بالکل لغو و مہمل حرکت ہے۔ اس پر تو بس نہ چلا الفاظ ہی کی بے حرمتی پر بہادری دکھلائی۔ یہ لوگ وہ تھے جو فرعون کے لفظ کی بے حرمتی کرتے ہیں اور ان کے مقابل بعض لوگ وہ ہیں جو اس لفظ کی ایسی حرمت کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے احسان و انعام سے تذکرہ کا ایک صنعت سے اس کو عنوان بتاتے ہیں چنانچہ مثنوی کے ایک محشی نے موسیٰ علیہ السلام

کی فتح کے قصہ کو ان الفاظ سے بیان کیا ہے۔ لفرعون الٰہی فرعون بدریائے نیل غرق شدہ۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ فرعون الٰہی یہ ترکیب کتنی فصیح ہے مگر مقصود تو یہ تھا کہ فرعون کے قصہ میں خدا کی مدد کا بیان بھی اسی کے نام سے ہوا۔ استغفر اللہ العظیم۔ یہ سخت واہیات ہے۔

اسی طرح آج کل یہ دستور شائع ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے احسانات و انعامات کا عنوان پیر کے نام سے قرار دیا جاتا ہے مثلاً شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے مریدین اپنے اوپر فضل و احسان خداوندی کے تذکرہ کریں گے تو سارے الفاظ چھوڑ کر یوں لکھیں گے کہ بفضل رحمان۔

اسی طرح ہمارے سلسلہ میں بعض لوگ خطوط میں بامداد اللہ لکھتے ہیں مجھے تو اس سے سخت نفرت ہے اور اس میں شرک کی بو آتی ہے۔ اب تو صرف یہ عادت ہے مگر یاد رکھو کہ چند روز کے بعد عبادت ہو جائے گی۔

غرض اس حدیث سے تبرکات وغیرہ کا قبر میں رکھنا جائز معلوم ہوا کیونکہ حضورؐ نے اپنا ملبوس شریف تبرکاً کفن میں رکھنے کے لئے عطا فرمایا ہے مگر ہم کو تبرک کی نیت سے کسی کو کوئی چیز اپنا ملبوس وغیرہ دینا جائز نہیں کیونکہ حضور نبی تھے اور اپنی برکت کو آپ وحی سے جانتے تھے۔ ہمارے اوپر کونسی وحی اتری ہے کہ ہم بھی بزرگ اور صاحب برکت ہیں۔ خاتمہ ایمان پر ہو جائے تو بس غنیمت ہے۔ میں نے ایک بار ایسی نادانی کی کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ اپنے کچھ حالات بطور سوانح لکھوا دیجئے۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا خوب! اپنے ہی منہ میاں مٹھو بنوں۔ واقعی اپنے کو بزرگ سمجھنا کیسے ہو سکتا ہے اور تبرک ہوتا ہے بزرگوں کا پس اپنا تبرک کیسے دیا جائے۔

یہاں پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مشائخ سے ثابت ہے کہ انہوں نے بعض دفعہ خود بخود بدوں درخواست کے اپنے متعلقین کو اپنے تبرکات دیئے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات تبرکاً نہیں دیتے تھے بلکہ مرید کا جی خوش کرنے کے لئے دیتے تھے کہ مرید کو یہ معلوم ہو جائے کہ شیخ کی میرے حال پر توجہ بہت ہے یا اس خیال سے دیتے ہیں کہ لینے والے کو اس میں برکت کا گمان ہو گا تو اس کو اس خیال سے نفع ہو گا۔ چنانچہ واقعی نفع ہوتا ہے ایک نفع تو میں نے خود محسوس کیا ہے۔

کیرانہ میں ایک گوجر تھے حاجی عبداللہ بڑے بزرگ آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے ایک چھینٹ کا جبہ دیا تھا جس کا یہ اثر تھا کہ جب تک میں اسے پہنے رہتا تھا معاصی کا خیال نہ آتا تھا بلکہ معاصی سے نفرت رہتی تھی۔

شاید پیروں کے کوئی معتقد یہ سوال کریں کہ شیخ کے تبرک کو پہن کر پائخانہ میں جانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ جائز ہے البتہ اگر غلبہ ادب ہو تو واجب بھی نہیں اور ہر جائز کام کا کرنا ضروری ہی کیا ہے۔ خود میری یہ حالت ہے کہ جب جبہ شریف تھانہ بھون میں آتا ہے تو اگرچہ اس مکان کی طرف

جہاں وہ رکھا جاتا ہے پیر کرنا جائز ہے۔ مگر غلبہ ادب کی وجہ سے مجھ سے اس طرف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر اس سے احکام نہیں بدل سکتے۔ حکم شرعی وہی ہے کہ پیر کرنا اس کی طرف جائز ہے اور تبرکات کو پہن کر پاخانہ میں بھی جانا جائز ہے۔ اور یوں کسی کو غلبہ ادب ہو، وہ ایسا نہ کرے مگر حکم یہی ہے شرعی حکم کے سامنے نہ الہام کوئی چیز ہے اور نہ خواب و کشف کچھ ہے۔

شاہ نظام الدین اولیاء و قاضی ضیاء الدین سنامی رحمۃ اللہ علیہما کا قصہ ہے کہ حضرت سلطان جی سماع سنا کرتے تھے اور قاضی صاحب ان کو روکتے تھے۔ حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ اچھا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں کہ میں حق پر ہوں جب بھی مانو گے تو انہوں نے کہا کہ اچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دو۔ حضرت سلطان جی نے اپنی چادر اتار کر ان کو اڑھا دی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ دربار رسالت قائم ہے۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مجمع ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں تشریف فرما ہیں اور ارشاد فرما رہے ہیں کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ قاضی صاحب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس وقت مجھے معلوم نہیں کہ میں کس حال میں ہوں ہوش میں ہوں یا بے ہوش ہوں۔ ایسی حالت کا سنا ہوا حکم معتبر نہیں ہوسکتا۔ حکم وہی ہوگا جو کہ حضور سے ہوش و حواس کی حالت میں صحابہ نے نقل فرمایا ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ حضرت سلطان جی نے چادر اتار لی اور کہا دیکھا بھی حضور نے کیا فرمایا۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ سنا بھی ہم نے کیا عرض کیا۔

تو صاحبو! شریعت کے احکام کے سامنے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت منامیہ کے وقت کی سنی ہوئی باتیں بھی حجت نہ ہوں گی۔ کیونکہ احکام شرعیہ حضورؐ سے اس طرح منقول ہیں۔ جن میں ذرا شبہ کو گنجائش نہیں اور خواب یا کشف کی زیارت میں غلطی کا احتمال ہے۔

احترام تبرکات

عن كبشة قالت دخل على رسول الله صلى الله عليه وسلم فشرب من ماء فى قربت معلقه قائما فقت الى فيها فقطعتها

(حضرت کبشہ صحابیہ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف لائے اور ایک لٹکے ہوئے مشکیزہ سے منہ لگا کر کھڑے کھڑے پانی پیا۔ میں کھڑی ہوئی اور دہانہ مشک کو کاٹ کر تبرکاً اپنے پاس رکھ لیا۔)

قال القاضى عياض رحمة الله عليه فى الشفاء و من اعظامه صلى الله عليه وسلم اعظام جميع اسبابه واكرام مشاهده و امكنته من مكة والمدينة و معاهده و ملامسة عليه الصلوٰة والسلام وايضا قال كانت فى قلنسوة خالد بن الوليد شعرات من شعره صلى الله عليه

وسلم فسقطت قلنسوته فی بعض حروبه فشد علیها شدته انکسرعلیه الصحابة لکثرة من قتل فقال لم افعلها بسبب القلنسوة بل لما تضمنت من شعر النبی صلی الله علیه وسلم لئلااسلب برکتها وتقع فی ایدی المشرکین. الخ

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ شفاء میں لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں سے یہ بھی ہے کہ حضور کے تمام متعلقات کی تعظیم کی جائے اور جس جگہ آپ تشریف لے گئے ہیں اس کا اکرام کیا جاوے اور مکہ مدینہ میں جن مکانات کو حضور سے کسی قسم کا انتساب ہے ان کا احترام کیا جاوے ویسے ہی جن چیزوں کو آپ نے مس کیا ہے۔ نیز شفاء میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ بعض لڑائیوں میں ان کی کلاہ سر پر سے گر پڑی تو اس کے لئے انہوں نے ایسا سخت حملہ کیا جو ان کے ساتھیوں کو غیر معمولی معلوم ہوا کیونکہ اس حملہ میں بہت آدمی قتل ہوئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے یہ حملہ ٹوپی کی وجہ سے نہیں کیا تھا بلکہ اس میں حضور کے موئے مبارک تھے اس کی وجہ سے کیا تھا کہ مبادا کہیں میں ان کی برکت سے محروم نہ ہو جاؤں اور یہ مبارک بال کفار کے ہاتھ میں پہنچ جائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ چند کھجوریں حضور نے ان کو دم کر کے دی تھیں جس کو انہوں نے ایک توشہ میں رکھ لیا تھا اور ان میں ایسی برکت ہوئی کہ ہمیشہ ان میں سے کھاتے رہے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ شہادت میں وہ ان کے پاس سے کھوئی گئیں جس کا ان کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ ان کا شعر بھی اس بارہ میں مشہور ہے۔

للناس هم و لی الیوم لی همان　　　فقد الجراب و قتل الشیخ عثمان

کہ لوگوں کو ایک ہی غم ہے اور مجھے آج دو غم ہیں۔ توشہ دان کے کھوئے جانے کا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کا حضرت ابو ہریرہ کو اس برکت نبوی کے فوت ہو جانے کا غم تھا جو ان چھواروں میں تھی عشاق کی یہی حالت ہوتی ہے کہ محبوب کی ذرا ذرا سی چیز پر جان دے دیتے ہیں۔

درمنزلے کہ جاناں روزے رسیدہ باشد　　　باخاک آستانش داریم مرحبائے

عشاق کو تو اسی حب منزل محبوب کی بناء پر جنت کی بھی تمنا اسی طمع واشتیاق میں ہوگی کہ وہاں جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونگے۔ جنت میں گو راحت تو انشاء اللہ ملے ہی گی مگر عشاق کو جنت کی اصل تمنا اور آرزو زیادہ اسی لئے ہوتی ہے کہ وہاں حضور کی زیارت ہوگی تو گویا جنت بھی آپ ہی کی ذات بابرکت سے مقصود ہوگی اور جنت تو جنت آپ کی تو یہ شان ہے کہ دنیا میں بھی جس حصہ زمین پر آپ ہوں وہ مقصود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَاَنْتَ حِلٌّ ۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ

اس کی تفسیر میں بعض مفسرین نے واوٴ حالیہ قرار دیا ہے پس معنی یہ ہوں گے کہ میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اس حال میں کہ آپ اس میں مقیم ہیں یعنی آپ کی اقامت کی وجہ سے یہ شہر اس درجہ مکرم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ اس کی قسم کھاتے ہیں پس اس بناء پر کہ جب جنت میں داخل ہو جاوٴ گے تو ایک خوشی تو ہو گی راحت ملنے کی اور غم کے زائل ہونے کی کہ اللہ کا شکر ہے دنیا کے مصائب سے نجات ہو گئی۔ چنانچہ حق تعالیٰ جنتیوں کا قول نقل فرماتے ہیں کہ اہل جنت کہیں گے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝

یعنی حمد و شکر کرتے ہیں ہم اللہ کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔ بیشک خدا تعالیٰ بڑے بخشنے والے بہت قدر دان ہیں جنہوں نے اپنے فضل سے اقامت کی جگہ میں پہنچا دیا۔ (یعنی جنت مثل دنیا کے دار الارتحال نہیں بلکہ دار الاقامۃ ہے) نہ ہمیں اس میں مشقت پہنچتی ہے نہ تھکن۔

یہ خوشی تو طبعی ہو گی دوسری خوشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو گی اور یہ خوشی عشقی ہو گی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ کے ضمن میں تبریز کا ذکر فرماتے ہوئے مولانا شمس تبریز کو یاد کر کے تبریز کے حق میں کہتے ہیں۔

ابرکی یا ناقتی طالب الامور　　ان تبریزا مناجات الصدور
اسرحی یا ناقتی حول الریاض　　ان تبریزا النعام نعم المفاض
سار بانا بار بکشاز اشتراں　　شہر تبریز ست و کوئے گلستان

یہ اشعار زبان حال سے جنت میں جانے کے وقت پڑھنے کے قابل ہوں گے۔ پس ابرکی اور اسرحی یا ناقتی جب جنت میں پڑھیں گے تو وہاں ناقہ سے مراد جسم ہو گا یعنی اے بدن ٹھہر جا اور خوب کھا پی۔ اب تعب نہیں رہا۔ مشقت کے دن گئے اب تبریز حقیقی آ گیا تو یہ جسم اونٹنی ہے جو روح کا مرکب ہے اور اس پر سوار ہو کر ہم اعمال کرتے ہیں اور اس مرکب ہونے کے لحاظ سے یہ اعضاء بھی قابل قدر ہیں کہ اعمال صالحہ کا ذریعہ ہیں۔ عارفین کو اپنے بدن کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ اسی وجہ سے ہوتی ہے ایک عارف کہتے ہیں۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

یعنی محبوب تک رسائی ہونے میں چونکہ ان کو دخل ہے اس وجہ سے یہ رتبہ ان اعضاء کا ہو گیا کہ یہ قابل بوسہ کے ہیں اور باعث ناز ہیں اور جب اس تعلق سے قطع نظر کر لی جائے تو اس حالت میں یہ اس کے مصداق ہیں جو دوسرے صاحب حال کہتے ہیں۔

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود　　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

یا جیسے حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

یعنی میری نظر ہونے کے لحاظ سے یہ بھی غیر ہے اور قابل غیرت ہے اور اس حیثیت سے کہ آپ کا عطیہ ہے قابل قدر و باعث فخر ہے چنانچہ اس کے بعد ہی ہم کا مقصود ہونا اسی اعتبار سے فرماتے ہیں۔

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد　　　تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم

اگر ملک الموت میری جان نکالنے کے لئے آئے تو جب تک تیری تجلی نہ دیکھ لوں فرشتہ کو روح نکالنے نہ دوں۔

پس ناقہ بدن کو من حیث آلۃ الوصول گویا جنتی بلسان حال خطاب کرتا ہے ابرکی یا ناقتی اور اسرحی یا ناقتی اور عجیب بات ہے کہ اشعار میں بھی حول الریاض آیا ہے اور اس آیت کا بیان ہو رہا ہے اس میں بھی فی روضۃ وہی مادہ واقع ہے پس یہ عجیب تطابق ہے لفظاً بھی معنیً بھی۔ اور فی روضۃ کے بعد جو یحبرون آیا ہے۔ مضمون مقصود کا نام الحبور بھی اسی لئے رکھا گیا ہے بہر حال جنت میں جانا حبور ہے تو جنت میں جانے کا سبب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم و اتباع کی برکت ہے اصل الحبور رہے پھر بقیہ مضمون تبرکات کا معروض ہے۔

و ایضا قال القاضی و حکی عن عبدالرحمن السلمی عن احمد بن فضلویه الزاهد و کان من عزة الرماة انه قال مامست القوس بیدی الا علی طهارته منذبلغنی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اخذ القوس بیده.

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تابعی کی حکایت بیان فرمائی ہے کہ وہ کہتے تھے جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کمان کو اپنے دست مبارک میں لیا ہے اس وقت سے بے وضو کمان کو میں نے کبھی ہاتھ میں نہیں لیا۔

اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے ادب کا کہ جس چیز کا ہاتھ میں لینا حضور سے ثابت ہو گیا اس کی مثل کو بھی بے وضو کبھی نہ چھوا۔ یہ تو سب کر سکتے ہیں کہ جس چیز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مس فرمایا ہے اس کو بے وضو ہاتھ میں نہ لیا جائے مگر یہ بات کہ اس کی نوع میں سے بھی کسی کو بے وضو نہ چھوا جائے۔ یہ غایت ادب ہے۔

و ایضاً قال القاضی عیاض رای بن عمر رضی الله تعالیٰ عنه واضعایده علی مقعد النبی صلی الله علیه وسلم من المنبر ثم وضعها علی جنینه.

قاضی عیاض حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اپنا ہاتھ منبر نبوی پر پشت گاہ نبوی سے مس کرکے اپنی پیشانی کو ملتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز ملبوس نبوی سے مس کی گئی ہو اس میں بھی برکت ہوتی ہے۔ مگر اس سب کے ساتھ ان کو عید نہ بنانا چاہئے کیونکہ سمجھنے کی بات ہے کہ ان چیزوں کی قدر کس لئے ہے۔ اسی لئے کہ یہ حضور کی چیزیں ہیں۔ پھر احکام بھی تو حضور ہی کے ہیں ان کی بھی تو قدر کرنی چاہئے۔ ان میں بھی تو برکت ہے۔ اس برکت کو بھی تو لینا چاہئے۔ غرض وہ جو سوال کیا گیا تھا سلف صالحین کا تبرکات کے ساتھ کیا برتاؤ تھا۔ ان روایتوں سے اس کا جواب معلوم ہو گیا۔ ان ہی کے موافق ہم کو بھی عمل کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ تعدی نہ کرنی چاہئے۔

نذریں ماننا

بعض لوگ یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ جبہ شریفہ کے لئے نذریں مانتے ہیں۔ فقہاء نے اس کو حرام لکھا ہے کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں ہو سکتی۔ عبادت خالق جل واعلیٰ شانہ کے لئے خاص ہے۔ بحرالرائق میں اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ نذر ماننا مخلوق کے لئے سب کے نزدیک اتفاقاً حرام ہے نہ وہ نذر منعقد ہو گی اور نہ اس کا پورا کرنا ذمہ میں واجب ہو گا۔ اور وہ حرام بلکہ سخت حرام ہے۔ مجاوروں کو اس کا لینا، کھانا اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں۔ اصل عبارت یہ ہے۔

فی البحر النذر للمخلوق لایجوز لانه عبادة والعبادة لایکون للمخلوق و فیه الاجماع علی حرمته النذر للمخلوق ولا ینعقد ولا تشتغل الذمة منه وانه حرام بل سحت ولایجوز الخادم الشیخ اخذه ولااکله ولا التصرف فیه بوجه من الوجو

بعض لوگ جبہ شریف کے عرس وغیرہ کے لئے زمینیں وقف کرتے ہیں تو یاد رکھئے اگر وقف کرنے والے کی نیت اس وقف سے یہی ہے کہ ان بدعات وخرافات میں اس کا روپیہ صرف کیا جائے تب تو یہ وقف باطل ہے جائز نہیں اور وقف کرنے والا گنہگار ہے۔

و فی العالمگیریة و منها ان من شرائط صحته ان یکون قربته من ذاته و عند التصرف الخ

یعنی صحت وقف کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس کام کے لئے وقف کیا گیا ہے وہ فی نفسہ بھی قربت ہو۔ اور وقت تصرف کے بھی قربت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ عرس وغیرہ کا دلائل شرعیہ سے حرام ہونا معلوم تو اس کی نیت سے وقف بھی صحیح نہ ہو گا اور نہ اس کے لئے چندہ دینا درست ہو گا

البتہ اگر اس نیت سے وقف کیا جائے کہ جو فقراء و مساکین اس کی زیارت کو حاضر ہوں ان پر صرف کیا جائے اور جو لوگ اس کے متولی ہوں وہ بھی بقدر حاجت اس میں سے لے لیا کریں تو یہ وقف صحیح ہے اور اس نیت سے خدام جبہ کو کچھ دینا بھی جائز ہے۔

غرض جبہ شریف کے لئے نذریں ماننا بالکل حرام ہے اس سے مسلمانوں کو احتراز لازم ہے بعض لوگ نذر کے پیسے جبہ شریف کے اوپر لا کر رکھتے ہیں اور یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ گویا معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دست مبارک میں لیتے ہیں۔ استغفر اللہ العظیم! کیا یہ ناپاک چیزیں اسی قابل ہیں کہ جبہ شریف پر ان کو رکھا جائے اور یہ اعتقاد کیا جائے کہ حضور ان کو دست مبارک میں لیتے ہیں واقعی جب ادب میں غلو ہوتا ہے تو بے ادبی ہونے لگتی ہے اور کرنے والوں کی آنکھوں پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ ان کو ذرا بھی عقل نہیں آتی بھلا یہ گندے پیسے جو چمار اور بھنگیوں کے ہاتھوں میں بھی جاتے ہیں جبہ شریف پر رکھنے کے قابل ہیں۔

سچ کہا کسی نے توقع زوالا اذا قیل تم۔ کہ جب کوئی چیز کمال کو پہنچ جاتی ہے اب اس کے زوال کی توقع کرو کیونکہ کمال کے بعد آگے کوئی مرتبہ رہا نہیں۔ لامحالہ پیچھے کو لوٹیں گے۔ بالکل یہی حال ہو رہا ہے کہ ادب میں غلو کرتے کرتے اب بے ادبی کی طرف لوٹنے لگے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اعتدال سے ہر کام کرنا چاہئے اس مضمون کا پہلا جزو جو کہ تبرکات کے متعلق تھا ختم ہوا۔

گیارہویں کا معاملہ

اب دوسرا جزو کہ وہ بھی اسی مضمون کے متعلق ہے اور پھر دونوں جزو مل کر ایک ہیں وہ بیان کرتا ہوں اور وہ جزو گیارہویں کے متعلق ہے اس روز لوگ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں مناتے ہیں اول تو لاتتخذوا قبری عیدا سے اس کا بھی رد ہو گیا کیونکہ مثل یوم المیلاد وغیرہ کے یہ دن بھی متبدل ہو گیا جب غیر متبدل یعنی قبر نبوی کا عید بنانا حرام ہے تو متبدل یعنی بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کا عید بنانا کیسے جائز ہو گا۔

دوسرے یہ تاریخ حضرت کی وفات کی کسی مورخ نے نہیں لکھی۔ نہ معلوم عوام نے گیارہویں تاریخ کس کشف والہام سے معلوم کر لی بعض لوگ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو اول تو یہ روایت ثابت نہیں اس کا ثبوت دینا چاہئے دوسرے اگر ہو بھی تو کیا تم حضرت غوث اعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کرتے ہو کہ رسول اللہ کی گیارہویں چھوڑ کر بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کرتے ہو یہ تو ان کے بھی خلاف ہے کیونکہ اگر بالفرض وہ گیارہویں رسول کی کیا کرتے تھے تو اس کو ہرگز گوارا نہ کرتے تھے کہ میرے بعد بجائے رسول کے میری گیارہویں کی جائے۔

تیسرے اس میں عقیدہ بھی فاسد ہے کہ لوگ حضرت غوث اعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر سمجھتے ہیں کہ حضور کا میلاد کرتے ہیں تو بڑے پیر کی گیارہویں بلکہ بعض جگہ حضرت غوث اعظم کا میلاد بھی ہونے لگا گویا بالکل ہی رسول کی مساوات ہوگئی اور غضب یہ ہے کہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارہویں نہ کریں گے تو بلا نازل ہوگی۔ بڑے پیر صاحب ناخوش ہو جائیں گے اور پھر نا معلوم کیا سے کیا کر دیں گے۔ گویا نعوذ باللہ وہ مخلوق کو تکلیف دیتے پھرتے ہیں نیز گیارہویں کرنے کو مال واولاد کی ترقی کا باعث سمجھتے ہیں اس میں حضرت غوث اعظم سے دنیا کے لئے تعلق رکھنا ہوا یہ کیسی بے حیائی ہے کہ جس مردار کو چھوڑ کر وہ الگ ہو گئے تھے اسی کے لئے اس سے تعلق کیا جائے۔

غرض گیارہویں کے اندر بھی عملی اور اعتقادی بہت سی خرابیاں ہیں ان کو چھوڑنا چاہئے۔ اگر کسی کو حضرت غوث اعظم کے ساتھ محبت کا دعویٰ ہو تو کچھ قرآن پڑھ کر ان کی روح کو ثواب بخش دے یا بلا تعیین تاریخ وغیرہ غربا کو کھانا کھلا دے۔

اب میں وعظ کو ختم کرتا ہوں اور اس دوسرے حصہ وعظ کا نام الحضور لامور الصدور رکھتا ہوں۔ اس میں صدور جمع ہے صدر کی جس کے معنی ہیں عظیم الشان چونکہ اس میں تبرکات کی زیارت وغیرہ کا ذکر ہے اس لئے یہ نام مناسب ہے یہ تو ہر حصہ کا الگ الگ نام ہے پھر جی چاہتا ہے کہ مجموعہ کا نام بھی رکھ دیا جائے تو مجموعہ کا نام راس الربیعین ہے وجہ اس نام کی یہ ہے کہ جزو اول اس نام کا یعنی راس بمعنی طرف ہے جس کا اطلاق کبھی طرف اول پر کبھی اخیر پر آتا ہے اور آج کا دن ایک ماہ کا محمل ختم اور دوسرے ماہ کا محمل آغاز ہے اور جزو ثانی کے معنی ظاہر ہیں اور لطیفہ اس میں یہ بھی ہے کہ یہ نام اس سے پہلے والے وعظ کے نام کے بھی یعنی اساس الربیعین کے مناسب ہے اگر کوئی صاحب شائع کریں تو دونوں کو الگ الگ شائع نہ کریں کیونکہ میرا لطیفہ ربیعین کا ضائع ہو جائے گا۔

اس کے متعلق میں نے ایک خواب کانپور میں سنا تھا جب جامع مسجد کانپور کے وسیع کرنے کا خیال ہوا تو ایک مینار کو توڑنے کی رائے ہوئی تاکہ بیچ میں مینار واقع نہ ہو بلکہ مسجد کو بڑھا کر کنارہ میں نیا مینار تعمیر کیا جائے تو ایک شخص نے رات کو خواب میں دیکھا کہ دونوں مینار گلے مل کر رو رہے ہیں اللہ اکبر جمادات میں بھی انس کا مادہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ دونوں وعظ باہم متناسب اور موزوں ہیں اور قریب قریب ایک مضمون کے ہی ہیں اور ایک ہی وقت میں بیان ہوئے ہیں اس لئے ان میں بھی جدائی نہ کی جائے اگرچہ شرعاً جائز ہے۔

سب مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ بڑی خوشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے اس بات پر ہونی چاہئے کہ آپ کی برکت سے ہمیں ایمان اور اعمال کی توفیق ہوئی اور یہ خوشی جنت میں جا کر پوری طرح محسوس ہوگی جس کی آیت میں بشارت ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ

(مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو وہ جنت کے باغ میں مسرور ہونگے۔)

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔ آمین!

اس سال یہ مضمون ربیع الاول کے بالکل اخیر میں ہوا جس میں منجانب اللہ یہ لطیفہ ہوگیا کہ وقت کا التزام نہ رہا اور انشاء اللہ کبھی ایسا بھی ہوگا کہ اس کے متعلق بالکل ہی بیان نہ ہوگا تاکہ التزام کا بالکل وہم بھی نہ رہے۔ **والحمدللہ رب العالمین**

المریع فی الربیع

حضور کے حقوق کے متعلق یہ وعظ بروز جمعہ ۸ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ کو جامع
مسجد کانپور میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا جو ۲ گھنٹہ میں ختم ہوا حاضری ۵۰۰ کے قریب
تھی حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا

خدا تعالیٰ نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا وہ نصیحت نامہ دے کر ایک ایسا رسول بھیجا جو تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام صاف پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں تا کہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں تاریکیوں سے نور کی طرف آئیں جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی روزی دی۔

ادائے حق

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس کی تلاوت پر اس لئے اکتفا کیا گیا کہ اس وقت اس جزو آیت ہی کا صرف بیان مقصود ہے۔ حق تعالیٰ نے اس آیت کے جزو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے حقوق اور برکات بیان فرمائے ہیں وجہ اس بیان کے اختیار کرنے کی اس وقت یہ ہے کہ بعض

محبین کی عادت ہے کہ وہ اس زمانہ میں تذکرہ کیا کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے مگر اس کے ساتھ جو ان کو غلطی واقع ہوئی ہے اس کا رفع کرنا ضروری ہے۔ اس آیت میں غور کرنے سے اور نیز دوسری نصوص میں غور ونظر کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا واجب ہے اور ادائے حق کے معنی یہ ہیں کہ تمام حقوق ادا کئے جاویں ایک کیا اور ایک نہ کیا اس سے ادائے حق نہیں ہوتا۔ علم کی کمی سے مختلف قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک غلطی یہ ہے کہ بعض ایک حق کو اور بعض دوسرے کو اور بعض تیسرے کو ادا کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے ادائے حق کر دیا۔ حالانکہ ادائے حق کے معنی یہ ہیں کہ تمام حقوق کی رعایت کی جائے۔

مثلاً باپ کا حق یہ ہے کہ اس کا ادب بھی کرے' اطاعت بھی کرے' اس کے لئے دعا بھی کرے' اس کی تعظیم بھی کرے' اگر اس کو حاجت ہو تو خدمت بھی کرے' اور مثلاً بادشاہ کا حق یہ ہے کہ اس کا ادب کرے' اس کے احکام کو مانے' اس کی عظمت دل میں ہو' اس کی اطاعت کرے۔ اب اگر کوئی اس کی تعظیم نہ کرے یا احکام نہ کرے یا احکام کو نہ مانے تو اس نے بادشاہ کا حق ادا نہیں کیا۔

مثلاً جب گفتگو کرتا ہے تو نہایت خلاف ادب یا تعظیم و تکریم تو اس قدر کرتا ہے کہ پچھلے پاؤں ہٹا جاتا ہے مگر قانون کے خلاف کرتا ہے تو قانون کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ ہاں زبان سے بادشاہ کی مدح و ثنا خوب ہی کرتا ہے اور اس کے متعلق مختلف جلسوں میں خوب تقریریں کرتا ہے اور اگر کوئی کہتا ہے تو جواب میں یہ کہتا ہے کہ جو میں کر رہا ہوں میرے نزدیک ادائے حق ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی اس عذر کو قبول نہیں کرے گا بلکہ سب سے بڑا حق تو سلطان کا رعایا پر یہی ہے کہ اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ غرض یہ تو ادائے حقوق کی حقیقت ہے۔

اب سمجھئے کہ حقوق میں تفاوت ہوتا ہے۔ باپ کا اور حق ہے' ماں کا اور' بی بی کا اور' بیٹے کا اور' بہن کا اور رسول کا اور خدا کا اور یہ قاعدہ سب میں مشترک ہے کہ ادائے حق اسی کو کہیں گے جو سب حقوق ادا کئے جائیں۔ مثلاً باپ کا حق یہ تھا کہ اس کی تعظیم بجالانا اطاعت کرنا' اس کی خدمت کرنا' اس کی مدح کرنا' دعا کرنا' ادب سے گفتگو کرنا' مگر بیٹے کی حالت یہ ہے کہ نہ اس کی تعظیم بجالاتا ہے' نہ اطاعت کرتا ہے نہ دعا مگر ہاں۔ مجمعوں میں باپ کی مدح و ثنا خوب کرتا ہے تو کیا اس کو کہا جاوے گا کہ وہ باپ کا حق ادا کرتا ہے۔ اگر باپ کہتا ہے کہ بیٹا اٹھ کر پانی دے دو۔ تو یوں جواب دیتا ہے کہ میں نے آپ کی بہت سی تعریفیں کر دی ہیں اب مجھے ضرورت اطاعت کی نہیں رہی میں خدمت نہ کروں گا۔ یہ کہاں کی علت لگائی کہ میں یہ باتیں بھی کروں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عاقل اس کو ادائے حق نہ کہے گا وعلی ہذا اور حقوق کے بارے میں بھی ایسا ہی کہہ دے۔

ان مثالوں سے معلوم ہو گیا کہ بعض حق ادا کرنے سے حق ادا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے جو حقوق ہیں تو ان کا ادا کرنے والا وہی شخص سمجھا جاوے گا جو سب حقوق ادا کرے اور کسی شخص کے اس طرز کو کافی نہ سمجھا جائے گا کہ ایک حق ادا کرے اور باقی کو چھوڑ دے۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق پہچانے جائیں۔

حقوق الرسول

اس بات میں اس وقت تین جماعتیں ہیں۔ کثرت سے وہ لوگ ہیں کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا دعویٰ ہے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زبانی فضائل بیان کرنے کو کافی سمجھتے ہیں نہ اطاعت سے بحث ہے نہ ان کے دل میں حقیقی محبت ہے نہ تعظیم ہے۔ تین حقوق تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایک حق اطاعت ایک حق محبت ایک حق عظمت سو زیادہ حصہ تو ان لوگوں کا ہے جو صرف زبانی محبت پر اکتفا کرنے کو کافی سمجھتے ہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کر لیا جاوے۔ باقی جتنا اہتمام ذکر کا ہوتا ہے اطاعت کا نہیں ہوتا۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر اطاعت کرتے تو علماء سے رجوع کرتے۔ ان سے مسائل دین کے پوچھتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کا طریق دریافت کرتے ان سے احکام کی تحقیق کرتے مگر دیکھا جاتا ہے کہ اس کا ذکر بھی نہیں۔ سو زیادہ لوگ تو اسی قسم کے ہیں۔ اس واسطے ضرورت اس کی ہوئی کہ اس غلطی کو رفع کر دیا جائے۔

محبت بے شک بڑا حق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کا مقتضا یہ بھی ہے کہ اطاعت کی جائے اسی کا مقتضا یہ ہے کہ تعظیم کی جائے۔ چنانچہ دنیا میں جس سے محبت وخلوص ہوتا ہے اس کا کہنا مانا جاتا ہے اس کی عظمت قلب میں ہوتی ہے۔ خود اس کی محبت کا تقاضا ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف نہ کیا جائے خواہ اس کو اس کی خبر ہو یا نہ ہو۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مجھ کو ایک اونی اچکن میں رفو کرانے کی ضرورت تھی۔ ایک دوست سے میں نے کہا کہ کسی کاریگر سے رفو کرا دو اور اجرت پوچھ کر بتلا دو۔ چنانچہ انہوں نے رفو کرنے کے لئے وہ اچکن کاریگر کو دے دی۔ جب رفو ہو کر آ گیا تو میں نے اجرت پوچھی تو کہا کہ اجرت اس نے بتلائی نہیں۔ پھر میں نے تقاضا کیا تو کہا کہ وہ بتلاتا نہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ پوچھ کر آئے مگر ٹالتے رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے پاس سے اجرت دے دی تھی اور ظاہر تک نہیں کیا۔ محبت سے تو غرض یہ ہوتی ہے کہ دل ٹھنڈا ہو محبوب کا۔ اسے راحت ہو اس لئے خبر ہونے کی ضرورت بھی نہیں اور جہاں خبر بھی ہوتی ہو تو وہاں تو زیادہ اثر ہوگا۔ زیادہ اہتمام ہوگا اور جب یہ معلوم ہو کہ اس طرح اس کو خبر ہوتی ہے کہ خلاف کرنے میں ایذا بھی ہوتی ہے تب ظاہر ہے جیسا کچھ اہتمام ہوگا اور یہ محبت کیسی ہے کہ اپنے محبوب کو تکلیف پہنچائی جائے۔

اب سمجھئے کہ سب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعمال امت کے پیش ہوتے ہیں کہ فلاں نے یہ کیا۔ کوئی شراب پیتا ہو، رشوت لیتا ہو، فسق وفجور میں مبتلا ہو سب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کی جاتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت تھی امت سے۔ یہ حالت تھی کہ رات رات بھر کھڑے کھڑے قدم مبارک ورم کر جاتے تھے امت کے لئے دعا کرنے میں۔ ایک بار ساری رات گزر گئی اس آیت کی تلاوت میں۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

(اگر آپ ان کو عذاب دیں تو آپ کے بندے ہیں اور اگر بخش دیں تو آپ زبردست قادر ہیں)

یعنی آپ زبردست قادر ہیں کیا مشکل ہے آپ کو بخشنا۔ ساری رات اسی میں گزر گئی۔ ہمارا وجود بھی کہیں نہ تھا اور آپ کی یہ حالت تھی۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود　　لطف تو بے گفتہ ما می شنود

(بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں)

نہ ہم تھے نہ ہماری طرف سے تقاضا تھا مگر بے کہے ہوئے درخواست پیش بھی ہو گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام بھی شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کیا نفع۔ ہم کیا پیش کر رہے ہیں کیا فیض تھا ہم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اور ہم کو حضور سے ہزاروں قسم کا نفع پہنچا ہے۔

مقبولیت درود شریف

اگر کہو کہ ہم درود شریف پڑھتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ حضور والا کو اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا آپ لوگوں کو ہوتا ہے ہمیں ارشاد ہے حق تعالیٰ کا کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

اے ایمان والو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجو۔

اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ ہزار روپیہ ہیں ہم سے کہو کہ ہم اپنے بیٹے کو دے دیں تو اس نوکر کے مقبول بنانے کو اور اس کی عزت بڑھانے کو یہ صورت تجویز کی ہے نہ کہ بیٹا روپے ملنے میں اس نوکر کا محتاج ہے اگر نوکر نہ بھی کہے تب بھی روپیہ بیٹے کے لئے تجویز کر لیا گیا ہے۔ صرف نوکر کی عزت افزائی کے لئے ایسا کیا ہے۔ یہی حال درود شریف کا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ رحمت کی دعا کرو رسولؐ کے لئے۔ رحمت بھیجنا تو منظور ہی ہے (خواہ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں) چنانچہ اس کے قبل

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ

(بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔)

موجود ہے مگر ہماری قدر بڑھانے کو ہمیں کہہ دیا کہ درود بھیجو کہ تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا۔ کوئی شخص کیا منہ لے کر کہہ سکتا ہے کہ آپ ہمارے محتاج ہیں اور اس کہنے سے آپ پر رحمت ہو گی۔ یہ شبہ شاید کسی خشک مزاج کو ہوتا اس لئے رفع کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ حق تعالیٰ کا ہے وہ ہماری درخواست پر موقوف نہیں۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اور عبادات بعض دفعہ مقبول ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مردود لیکن درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا ہے۔ سو اگر ہمارے عمل کا آپ پر رحمت نازل ہونے میں کوئی اثر ہوتا ہے تو جیسے اور اعمال ہیں یہ بھی ہمارا عمل ایسا ہی ہونا چاہے تھا۔ (کبھی مقبول اور کبھی مردود) سو ہمیشہ مقبول ہونا دلیل ہے اس کی کہ معلوم ہوا کہ ہمارے عمل کا اس میں کوئی اثر نہیں۔ حق تعالیٰ ضرور رحمت بھیجتے ہی ہیں ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں اس لئے درود شریف کبھی غیر مقبول نہیں ہوتا۔ بس خدا تعالیٰ کو رحمت بھیجنا تو ہے ہی ہم کو جو حکم دیا تو صرف ہماری عزت بڑھانے کے لئے۔

نیز ہمارے اعمال ظاہر ہے کہ مقبول ہونے کے قابل ہیں نہیں اور جو عمل مقبول نہ ہو وہ کالعدم ہے۔ پھر ہمارا درود پڑھنا کالعدم ہوا۔ مگر پھر بھی آپ پر رحمت ہوتی ہے کوئی شخص یہ احسان نہ سمجھے کہ میں درود بھیجتا ہوں تب ہی رحمت ہوتی ہے۔ اگر ہم آفتاب کے سامنے ہو گئے تو آفتاب نے ہم کو منور کر دیا۔ آفتاب ہمارا محتاج شعاع میں نہیں پس علماء کے قول سے بھی اس کی تائید ہو گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نفع کے محتاج نہیں۔

البتہ اس مقام پر ایک شبہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کی تعلیم کی ہے اور ہمارے عمل کرنے سے آپ کو بھی ثواب پہنچتا ہے تو اگر ہم عمل نہ کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ثواب کیسے ملے گا؟ پھر ہمارے عمل کو اس میں دخل ہوا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس نیت سے تعلیم فرمائی کہ امتی عمل کریں اور نیت پر اجر مل جاتا ہے۔ پس

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نیت فرمائی تو آپ ہر حال میں ماجور تو ہو گئے۔

حق محبت

اب ہمارے عمل کرنے کا اثر اتنا رہا کہ عمل کرنے سے آپ کا جی خوش ہوتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں امتی نے یہ عمل کیا تو آپ خوش ہوتے ہیں۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کوئی نفع نہیں مگر پھر بھی آپ کو ہم سے کتنی محبت ہے اور ہماری یہ کیفیت کہ زبانی دعویٰ محبت کا اور بہت خیر بعض میں کسی قدر زبانی سوز و گداز بھی سہی۔ چنانچہ جب اس قسم کی مجالس میں شعر اشعار پڑھے جاتے ہیں تو ہائے ہو بہت کرتے ہیں مگر اس کی پروا نہیں کہ جس سے محبت کا دعویٰ ہے اعمال ناشائستہ کا ارتکاب کر کے ان ہی کو ایذا پہنچا رہے ہیں۔ تو صاحب ایسے سوز و گداز سے کیا نتیجہ

مجھے اس پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک شاعر آزاد منش تھے۔ بعض کا دل رقیق ہوتا ہے وہ بھی ایسے ہی تھے ن ے ان کے کلام میں سوز و گداز تھا۔ ایک شخص ان کا فارسی کلام دیکھ کر کلام سے ان کو صوفی سمجھ کر ایران سے چلے۔ آ کر کیا دیکھا کہ ایک حجام ان کے سامنے ہے اور ان کا چہرہ استرہ سے صاف کر رہا ہے۔ اس شخص نے جھلا کر کہا کہ آغا ریش تراشی؟ (آغا کیا ڈاڑھی ترشواتے ہو) شاعر صاحب نے کہا کہ بے ریش می تراشم مگر دل کسے را نمی خراشم یعنی داڑھی تو ترشواتا ہوں مگر کسی کا دل نہیں دکھاتا' کیونکہ بڑا گناہ دل دکھانا ہے۔ اس نے بے ساختہ جواب دیا کہ ارے دل رسول اللہ را می خراشی (ہاں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل تراشتے ہو (مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع ہوگی کہ فلاں شخص سنت کے خلاف کر رہا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسی ایذا ہوگی۔ یہ سن کر شاعر کی آنکھیں کھل گئیں اور زبان حال سے یہ شعر پڑھتے تھے۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی　　　مرا جان جاناں ہمراز کر دی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر عطا فرمائے کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے محبوب کا ہمراز بنا دیا)

یعنی تم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ میں تو اندھا تھا آج معلوم ہو گیا مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ غرض یہ محبت کیسی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔

یہ تقریر تو اس پر مبنی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حق ہیں۔ محبت' عظمت' اطاعت' لیکن اگر کوئی شخص تینوں حق کو جدا جدا نہ سمجھے بلکہ صرف ایک محبت ہی کو حق سمجھے تو میں کہتا ہوں کہ خود محبت ہی ایک ایسا حق ہے کہ اور حقوق کو مستلزم ہے یعنی محبت مستلزم ہے عظمت کو بھی اطاعت کو بھی۔ یعنی جب سچی محبت ہو گی تو عظمت بھی ہو گی' اطاعت بھی ہو گی۔ مگر لوگوں نے صرف یہ یاد کر لیا ہے کہ ہم عاشق ہیں رسول کے۔ بس اپنے زعم میں اور کسی بات کے مکلف ہی نہیں رہے بلکہ اگر کچھ بھی ہو سوز و گداز اور اس سے چیخنا چلانا' رقت کا طاری ہونا یا آثار پیدا ہوتے ہوں تو گو ظاہر نظر میں یہ کمال معلوم ہوتا ہے مگر محققین کے نزدیک خود یہ ضعیف محبت ہے اور ضعیف اس وجہ سے کہ محل محبت کا ہے قلب اور یہ علامتیں ہیں ضعف قلب کی۔ تو جب قلب ہی ضعیف ہے تو جو اس کی صفت ہو گی وہ بھی ضعیف ہو گی۔ اس کو محبت کامل نہیں کہیں گے محبت کامل وہ ہے کہ رگ رگ عشق سے چور ہو مگر پھر بدحواس نہ ہو۔

سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ سے کیسی محبت تھی۔ صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیسی محبت تھی کسی صحابی کا قصہ ایسا بتلاؤ کہ محبت میں بدحواس ہو گئے ہوں۔ سب میں زیادہ چاہنے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ کی یہ حالت تھی محبت میں کہ جب آپ غار میں چھپے ہیں تو حضرت ابو بکر نے یوں عرض کیا کہ پہلے مجھے جانے دیجئے۔

شاید کوئی چیز موذی ہو۔ جب غار میں پہنچے تو اس میں بہت سے سوراخ تھے آپ نے اپنے کپڑے پھ
ان کو بند کیا۔ دو سوراخ باقی رہ گئے اور کوئی چیز بند کرنے کو رہی نہیں تو آپ نے دونوں پاؤں اس میں اڑا دیئے اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ تشریف لے آیئے کیا انتہا ہے اس عشق و محبت کی۔

حضور اندر تشریف لائے اور نیند غالب ہوئی تو حضرت صدیقؓ کے زانوں پر سر رکھ کر آرام فرمایا۔ وہاں اس سوراخ میں ایک سانپ تھا اس نے حضرت ابوبکر کے پاؤں میں ڈسا مگر پاؤں محض اس لئے نہ ہٹایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بے چین نہ ہوں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور چہرہ مبارک پر آنسو گرنے لگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کر دی اثر جاتا رہا مگر انہوں نے تو اس بھروسہ پر پاؤں نہ دیا تھا کہ اگر کچھ ضرر پہنچے گا تو حضور والا دعا کر دیں گے مگر باوجود اس (محبت) کے کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا جس میں ابوبکر مغلوب ہو گئے ہوں۔

کمال عشق

سب سے بڑا واقعہ وفات کا تھا۔ ایسے عشاق کو تو حس بھی نہیں رہنی چاہیے تھی مگر وہی ہیں کہ ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ کسی قدر پریشان ہو گئے۔ اسی میں ان کو اجتہادی غلطی ہو گئی۔ وہ غلطی یہ تھی کہ بعض صحابہ وفات ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ ہونا سمجھتے تھے کہ یہ ایسا ہی ہو گا جیسے معراج میں (کہ حضور جا کر واپس آ گئے تھے۔ اسی طرح یہاں بھی ہو گا کہ گو وفات ہو گئی مگر پھر زندہ ہو جاویں گے) اس وقت ایک عارضی غیبت ہے اس کے مرتفع ہونے پر آپ زندہ ہو جاویں گے۔ یہ خیال تھا۔ بعض صحابہ کا یہی حال تھا حضرت عمر کا۔ یوں کہتے تھے کہ اگر کوئی کہے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ اسی حالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر میں تشریف لے گئے اور چہرہ مبارک سے چادر اٹھا کر پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا طبت حیا و میتا۔ یعنی آپ حیات اور موت دونوں حالت میں پاک ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ آپ اس سے منزہ ہیں کہ حق تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع کریں۔ نہیں کبھی نہیں ایسا ہو گا اور باہر آ کر فرمایا حضرت عمر سے اے بھلے مانس، بیٹھ! پھر جا کر خطبہ پڑھا۔

من کان منکم یعبد محمدا فان محمدا قدمات و من کان یعبد الله فان الله حی لایموت

اور یہ آیت پڑھی۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُم مَّيِّتُونَ اور یہ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَابِكُمْ

اور صحابہ کا جو یہ خیال ہو گیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت میں محبوب کی موت کا خیال بھی لانا ناگوار نہیں ہوتا اس لئے صحابہ کبھی سوچتے بھی نہ تھے کہ موت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گی۔

مجھ کو اس امر پر تعجب ضرور ہوتا تھا مگر ایک واقعہ دیکھ کر یقین ہو گیا قریب کا واقعہ ہے۔ ایک بی بی کی شادی ہوئی ایک عالم سے وہ عالم مر گئے۔ شدید صدمہ ہوا۔ جس کی وجہ سے یہ تحقیق ہوئی کہ اس بی بی کا گمان یہ تھا کہ عالم مرا نہیں کرتے اور یوں کہا کرتی تھی کہ میں بڑی خوش قسمت ہوں جو ان سے شادی ہوئی کہ کبھی مریں گے نہیں۔ ان کا طاعون میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بی بی کہتی تھیں کہ میں نے سنا ہی نہ تھا کہ مولوی مرتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے اب موجود ہیں جو علماء پر موت کے ورود کو بعید سمجھتے ہیں تو صحابہ کو مرتبہ حال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسا خیال ہو گیا بعید ہے۔ مگر حضرت ابوبکر باوجود کمال عشق کے مستقل رہے تو حقیقت میں کمال عشق وہ ہے جو کمال عقل کے ساتھ ہو۔ سو ایسا شخص مغلوب الحال نہ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام نہیں چھوڑے گا۔

ہمارے مجمع میں ایک مجذوب ہیں اللہ اور اہل اللہ کا نام سن کر اس قدر چلاتے ہیں کہ تاب نہیں رہتی مگر نماز میں کبھی چیخ نہیں نکلتی۔ آہ بھی نہیں نکلتی۔ یہ کمال اتباع کی دلیل ہے۔

شیخ عبدالحق محدث ردولویؒ اس قدر مغلوب الحال تھے کہ جامع مسجد میں تیس برس تک نماز پڑھنے پر بھی مسجد کا راستہ یاد نہ ہوا مگر جماعت ایک وقت بھی قضا نہ ہوئی۔

مخدوم صابر بارہ برس تک مستغرق رہے مگر نماز قضا نہ ہوئی نماز پڑھی۔ پھر مستغرق ہو گئے۔ یہ کمال عقل کی علامت ہے اور عقل جس قدر زیادہ کامل ہو گی اتنی ہی زیادہ محبت ہو گی جیسے یہ حضرات اہل محبت تھے کہ خدا کے احکام کے اندر مغلوب نہ ہوئے۔

اس کا راز یہ ہے کہ محبت بڑھتی ہے معرفت سے اور معرفت ہوتی ہے عقل سے جتنی عقل کامل ہو گی اتنی ہی معرفت ہو گی اور جتنی معرفت ہو گی اتنی محبت ہو گی جتنی عقل کم ہو گی معرفت کم ہو گی۔ بس کامل العقل وہ ہے جس کی شان انبیاء علیہم السلام کی سی ہو۔ انبیاء علیہم السلام کو کتنی محبت تھی مگر مغلوب نہیں ہوتے تھے سو کمال محبت تو یہ ہے کہ اضطراراً بھی احکام میں اختلال نہ ہو لیکن اگر ایسا اختلال بھی ہو گیا تو کمال نہیں مگر صدق تو ہے اور جہاں اختیاراً و قصداً اختلال ہو جیسے یہ لوگ (مدعیان محبت) کھاتے پیتے' زراعت کرتے ہیں رشوت' سود' بنا لیتے دیتے ہیں پھر عاشق یہ اچھے عاشق ہیں کہ سارے احکام ان سے ٹل گئے ظاہر ہے کہ جب مغلوب نہ ہو گا تو تمام اس پر ہوں گے سو ایسے لوگوں کے متعلق تو کمال سے قطع نظر کر کے محبت ہی میں کلام ہے۔

خاصیت محبت

دوسرے محبت کی خاصیت یہ ہے کہ اذا جاءت الالفت رفعت الکلف۔ (جب الفت ہو گئی تو کلفت اٹھ گئی) یعنی وہ شخص محب رسوم کا پابند نہیں ہوتا تکلف جاتا رہتا ہے اب ہم دیکھتے ہیں

کہ ان مدعیوں میں تکلف اور زیادہ ہے۔ صحابہؓ کی شان تھی کہ وہ اکثر اوقات ذکر کرتے تھے رسم کی اس میں کوئی قید نہ تھی۔ چار آدمی بیٹھے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اور کوئی ذکر کریں۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے تھے ہماری یہ کیفیت ہے کہ کسی کو سال بھر کے بعد یاد آتا ہے کسی کو مہینہ کے بعد وہ اس کے منتظر نہیں رہتے تھے کہ مجمع کریں۔ شیرینی منگائیں اب یہ کیا بات ہے کہ کبھی بلا اس کے ذکر ہی نہیں ہوتا خصوص جب کہ تکلف آپ کی سنت کے بھی خلاف ہو جن کی محبت کا دعویٰ ہے پس گو ایک لیمپ کافی ہو مگر بیس بیس جلائیں گے کیا یہ اسراف نہیں ہے۔ واعظ کے لئے مسند بچھایا گیا ہے خواہ ریشمی ہی ہو"۔ اس کا استعمال کہاں جائز ہے داڑھی ترشوائی ہے یہ ادب ہے محفل ذکر شریف کا اور جہاں ایسا تکلف نہ ہو اور کوئی شخص محفل منعقد کرے تو کوئی بھی نہ آئے۔

یہیں کانپور کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اشتہار دیا کہ فلاں مسجد میں میلاد ہے مگر اخیر میں مٹھائی نہیں بانٹی تو برا بھلا کہتے گئے کہ بڑا دھوکہ دیا۔ محبوب کا ذکر بھی سن کر مٹھائی کی سوجھ رہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے سامنے ہفت اقلیم کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ یہ محبت تو کیا ہوتی نقل محبت بھی نہیں۔ اگر نقل ہوتی تو کم از کم صورت تو ویسی بنا لیتے۔ وہی ہیئت بنا لیتے۔

اس پر عالمگیر کی حکایت یاد آئی۔ جب عالمگیر کی تخت نشینی کا جلسہ ہوا تو کام کے لوگوں کو عطایا دیئے گئے ایک بہروپیہ بھی مانگنے آیا مگر عالمگیر عالم تھے اس کو کس مد سے دیتے اور ویسے صاف انکار کرنا بھی آداب شاہی کے اعتبار سے نازیبا معلوم ہوا۔ حیلہ سے ٹالنا چاہا۔ اس سے کہا کہ انعام کسی کمال پر ہوتا ہے تمہارا کمال یہ ہے کہ ناشناسا صورت میں آؤ مگر وہ جب کبھی بھیس بدل کر آیا بادشاہ نے پہچان لیا کبھی دھوکہ نہیں کھایا کہ جس روز دھوکا دے دے گا انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔ اتفاق سے عالمگیر کو سفر دکن کا درپیش تھا بہروپیہ ڈاڑھی بڑھا' مقدس لوگوں کی صورت بنا کر راستہ میں کسی گاؤں میں جا بیٹھا کچھ روز کے بعد شہرت ہو گئی۔ عالمگیر کی عادت تھی کہ جہاں جاتے تھے علماء اور فقراء سے برابر ملتے تھے چنانچہ جب اس مقام پر پہنچے وہاں شہرت سن کر اول وزیر کو اس کے پاس بھیجا۔ وزیر نے کچھ مسائل تصوف کے پوچھے۔ اس نے سب کے جواب معقول دیئے بات یہ تھی کہ اس وقت بہروپیے ہر فن کو قصداً حاصل کرتے تھے وزیر نے آ کر عالمگیر سے بہت تعریف کی۔ عالمگیر خود ملنے گئے۔ آپس میں خوب گفتگو رہی اور خوب سمجھ گئے کہ شاہ صاحب کامل شخص ہیں۔ چلتے وقت ایک ہزار اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ اس نے لات مار دی اور کہا تو ہم کو بھی سگ دنیا خیال کرتا ہے اس سے اور بھی اعتقاد بڑھا۔

واقعی استغناء عجیب چیز ہے عالمگیر لشکر میں واپس چلے آئے۔ پیچھے پیچھے بہروپیہ صاحب پہنچے کہ لایئے انعام! خدا حضور کو سلامت رکھے!! بادشاہ نے کہا ارے تو تھا؟ کہ اس وقت جو پیش کیا تھا اس کو کیوں نہیں لیا تھا وہ تو اس سے بہت زیادہ تھا اور میں اس کو واپس تھوڑے ہی لیتا۔ اس نے کہا کہ حضور!

اگر میں لیتا تو نقل صحیح نہ ہوتی کیونکہ وہ فقیری کا روپ تھا اور فقیر کی شان کے خلاف تھا وہ لیتا۔

نقل تو اس کو کہتے ہیں۔ کم از کم مدعیان محبت نے شکل تو بنائی ہوتی اہل محبت کی سی۔ اگر شکل بناتے تو ظاہر ہی میں رسم اور قیود کی پابندی نہ ہوتی۔ عرب میں پھر یہاں سے تفاوت ہے یہ حالت ہے کہ چھوارے بانٹنے شروع کیے۔ اگر کچھ آدمی بچ رہے اور چھوارے ختم ہو گئے تو کہہ دیتے ہیں (خلاص) یعنی اب نہیں رہا۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ اگر مٹھائی آنے میں دیر ہو تو پڑھنے والے سے کہہ دیتے ہیں کہ ذرا تھام تھام کر پڑھنا۔ امرتیاں منگائی ہیں ابھی آئی نہیں کبھی نک کٹی ہو جاوے یہاں تو نقل بھی نہیں دعویٰ ہی ہے۔

بے تکلفی پر یاد آیا کہ ایک بزرگ تھے ان کی عادت تھی کہ کبھی کبھی کچھ منگا کر مساکین کو تقسیم کر کے روح مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کو ثواب پہنچا دیتے۔ ایک دفعہ کچھ نہ تھا چنے ہی تقسیم کر دیئے تو خواب میں دیکھا کہ چنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھے ہیں۔ محبت کا طریق یہ ہے محبت میں تکلف ہو ہی نہیں سکتا۔

خلوص کا فقدان

ایک بزرگ کے خلوص اور بے تکلفی کی حکایت یاد آئی کہ وہ ایک دوسرے بزرگ سے ملنے چلے ان کا جی چاہا کہ کچھ لے چلیں مگر پاس کچھ تھا نہیں۔ بس یہ کیا کہ جنگل سے خشک لکڑیاں ہی تھوڑی سی جمع کر کے لے گئے اور پیش کر دیں۔ انہوں نے حکم دیا خادم کو کہ یہ لکڑیاں احتیاط سے رکھ لو۔ جب ہمارا انتقال ہو تو پانی ہمارے غسل کے لئے ان ہی لکڑیوں سے گرم کیا جائے ہم کو اس کی برکت سے امید ہے نجات کی۔

یہ کیفیت تھی بے تکلفی کی اور اب تو یہ حالت رہ گئی ہے کہ یوں خیال کرتے ہیں کہ پیر کی خدمت میں جب جائیں کہ جب کچھ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیر کو بھی دنیا دار سمجھتے ہیں اگر ایسا سمجھا ہے تو ایسے پیر کو چھوڑ دینا واجب ہے یہ تو مریدوں کے تکلف کی کیفیت تھی۔

اب رہے پیر سو ان کے طمع کی بھی یہ حالت ہے کہ جب کوئی مریدین میں سے ان کے پاس آتا ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کچھ لایا ہوگا بقول مولانا گنگوہی کے کہ کوئی سر کھجلانے لگے تو پیر یہ سمجھیں گے کہ پگڑی سے نکال کر کچھ دے گا۔ ایسا طمع کا باب کھلا ہے۔ ایسے پیروں سے تو ان کے بعضے مرید اچھے جو پیر سے محض نیک نیتی سے تعلق رکھتے ہیں گو اس تعلق رکھنے میں ان سے غلطی ہوئی ہے مگر خلوص تو ہے۔

ایک ایسے ہی پیر و مرید کا قصہ یاد آیا کہ ایک مرید نے اپنے پیر سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری غلاظت میں پیر نے کہا کہ کیوں نہیں ہم ایسے ہی ہیں اور تم ایسے ہی ہو۔ مرید نے فوراً کہا کہ حضور! ابھی خواب پورا بیان نہیں ہوا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی چاٹ رہا ہوں۔ پیر نے کہا نکل یہاں سے خبیث۔ اس نے کہا کہ خبیث تو ہوں مگر دیکھا یوں ہی ہے۔

یا تو واقعی یہ خواب ہی دیکھا ہوگا یا مرید نے پیر کا حال ظاہر کرنے کو تراشا ہوگا۔ ہر حال میں مطلب یہ تھا کہ مرید کا تعلق تو پیر سے دین کے لئے تھا اور پیر کا تعلق مرید سے دنیا کے لئے تھا۔ یہ حالت ہو رہی ہے پیری کیا ہے ایک دکان ہے کیسی پیری مریدی اگر پیر ایسا ہے کہ تمہارے خالی جانے سے ناراض ہوگا تو واجب ہے آپ کے ذمہ کہ اس کو طلاق دو۔ غرض یہ تکلفات سب علامتیں اس کی ہیں کہ خلوص اور حقیقی محبت نہیں۔

ایسی طرح ذکر مبارک نبوی میں سمجھئے کہ اگر سچی محبت ہوتی تو قیود و تکلفات کا انتظار نہ ہوتا۔ چین نہ ہوتا۔ یہ نہ سوچتے کہ پہلے لڈو منگوالیں۔ اس وقت ذکر کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ ارے بھائی! کیا اس میں اس قسم کی کوئی شرط ہے نماز میں تو وقت و عدد وغیرہ کی شروط ہیں مگر ذکر میں تو بجز موافقت حدود شرعیہ کے ایسی کوئی شرط نہیں جیسا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کوئی شرط نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرو۔ اس میں نہ وضو کی قید ہے نہ عدد کی قید بلکہ یہ ہونا چاہئے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شا نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک کی مقدار بھی محبوب سے غافل نہ رہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کرے اور تم آگاہ نہ ہو)

اور ہر آں کو غافل از حق یک زمان ست در آندم کافر ست اما نہان ست

(جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھڑی میں وہ کافر ہے لیکن پوشیدگی میں)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر کرتے تھے **یذکر اللہ فی کل احیانہ** البتہ علماء نے اتنا تو فرمایا ہے کہ پاخانہ پیشاب کے وقت زبان سے نہ کرے لیکن قلب سے دھیان رکھے۔ جب ذکر اللہ کے یہ احکام ہیں اور عشاق کے نزدیک آپ کا ذکر مثل ذکر اللہ تعالیٰ کے ہے جب اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے کوئی قید نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے لئے کیوں کوئی قید ہوگی۔ چار آدمی بیٹھے حضور کا ذکر کر لیں۔ تنہا ہو ذکر کرلے بلکہ تنہائی میں تو بہت لطف آتا ہے۔ اور یہ حالت ہوتی ہے۔

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا ہی اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ کوئی محب اپنے محبوب کے وصل سے لطف اندوز ہو)

جو بڑی بڑی محفلیں کرتے ہیں ان سے قسم دے کر پوچھئے کہ بدوں اس خاص ہیئت کے تم کو کتنی توفیق ہوتی ہے اس ذکر کی۔ کوئی کتاب پڑھتے ہو اس سے مزہ لیتے ہو بلکہ بعض تو اس کو (یعنی میلاد کو) دین بھی نہیں سمجھتے بلکہ عمل سمجھتے ہیں روزگار کی ترقی کا۔ اسی نیت سے کرتے ہیں گیارہویں بارہویں اور یوں سمجھتے ہیں کہ سال بھر تک جو کمایا تھا گیارہویں بارہویں کرنے سے گذشتہ تو ساری کمائی پاک ہو جاوے گی اور آئندہ آفات سے بچے رہیں گے۔ عہدہ بڑھے گا اولاد جئے گی۔ ان دنیاوی اغراض سے کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ اسی لئے ایسے لوگوں میں بالکل ادب نہیں ذکر مبارک کا۔

یہیں کا قصہ ہے کہ ایک جگہ میلاد ہوا اور اس سے اگلے ہی دن وہیں ناچ ہوا۔ شادی تھی ایک صاحب کے یہاں جس میں ناچ کی دعوت بھی کی گئی تھی۔ بعض ان کے دوستوں میں ثقہ بھی تھے انہوں نے انکار کیا بس ان کی ضرورت سے یہ محفل کی تھی مگر دوسرے دن وہیں ناچ کی محفل کرادی جو ان کا اصلی مقصود تھا۔

اس شخص نے دونوں پلے برابر سمجھے۔ یہ حالت ہے اور بعض جگہ اگر کوئی ایسا امر منکر بھی نہیں ہوتا تب بھی سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ روایات میں اس قدر بے اعتدالی کرتے ہیں کہ جن کا سر نہ پاؤں۔

شعراء کی بے ادبیاں

قصیدے اس قسم کے پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی خود رسول کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں عرض کرتا ہوں واقعات دکھاتا ہوں تاکہ محض فرضی دعویٰ نہ سمجھا جائے۔ ایک قصیدہ ہے اور اس کا یہ شعر شاعری میں آ کر یوں کہہ دیا۔

طواف کعبہ مشتاق زیارت کو بہانہ ہے   کوئی ڈھب چاہئے آخر رقیبوں کی خوشامد کا

یعنی اصل تو زیارت مدینہ کی ہے حج مقصود نہیں ہے حج محض ایک مصلحت سے کرتے ہیں او.. مصلحت یہ ہے کہ اللہ میاں (نعوذ باللہ) عاشق ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ہم بھی عاشق ار لیے حضور کی زیارت کو چلے اور محبوب کے دو عاشق آپس میں رقیب کہلاتے ہیں تو گویا اللہ میاں (نعوذ باللہ) ان کے رقیب ہوئے اور رستہ میں گھر پڑتا ہے رقیب کا جو قادر ہے شاید جانے نہ دے اس لئے حج کر کے ان کی خوشامد کر لینی چاہئے۔ اس سبب سے پہلے طواف کعبہ کرتے ہیں کہ خوش رہیں اور کچھ کھنڈت نہ ڈال دیں (نعوذ باللہ) اور لیجئے۔

پئے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف   محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

یہ جو مشہور ہے کہ سایہ نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے گو وہ ضعیف ہیں مگر فضائل میں متمسک بہ ہو سکتی ہیں۔ سو شاعر صاحب اس کا نکتہ بیان کرتے ہیں کہ سایہ کیوں نہ تھا تو وہ نکتہ یہ ہوا کہ یعقوب علیہ السلام نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو رخصت کرتے وقت یہ سوچ کر کہ یوسف مجھ سے جدا ہوتے ہیں میرے دل کو تسلی کیسے ہوگی پیراہن رکھ لیا کہ اسی کو دیکھا کروں گا۔ اسی طرح نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنا چاہا تو سوچ ہوئی کہ میں کاہے سے تسلی حاصل کروں گا۔ اس لئے سایہ کو رکھ لیا کہ اس سے تسلی تو ہو جایا کرے گی۔

الٰہی توبہ! الٰہی توبہ! انصاف سے کہئے کہ ان مضامین کے بعد ایمان باقی رہ سکتا ہے س شعر میں حق تعالیٰ کے لئے بے چینی ثابت کی ہے۔ پھر بصیر ہونے کا انکار کیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ جب بصیر و خبیر ہیں تو پھر کیا اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا کرتے پھر

سایہ رکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیا ایسی محفل کرنے سے پکڑ دھکڑ نہ ہوگی۔ بانی مجلس پر مواخذہ نہ ہو گا۔ اگر دین ایسا سستا ہے کہ کہیں سے بھی نہیں جاتا تب تو خیر گستاخی بھی کوئی چیز نہیں مگر دین تو ایسا سستا نہیں ہے۔ کیا دین کے یہ معنی ہیں کہ سب کچھ کئے جاؤ اور وہ نہ جائے۔

یہ تو اللہ میاں کی شان میں سوادب تھے اب انبیاء علیہم السلام کی شان میں دیکھئے ایک شاعر صاحب کہتے ہیں۔

برآسمانِ چہارم مسیح بیمار ست   تبسم تو برائے علاج درکارست

(یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان چہارم پر بیمار ہیں اور ان کا علاج آپ کا تبسم سے ہے)

سچ بتلایئے کہ کیا حضرت عیسیٰ بیمار ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسم سے وہ اچھے ہو جائیں گے اور حقیقت میں اسی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ناراض کرنا ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات سے خوش ہوں گے جس میں دوسرے نبی کی توہین ہوتی ہو۔

آپ سمجھئے کہ اگر آپ کا کوئی بھائی حقیقی ہو اور اس کے ایک بیٹا ہو اور وہ آپ کی شان میں گستاخی کرے تو کیا بھائی کو یہ بات پسند ہوگی۔ اسی طرح انبیاء آپس میں بھائی ہیں اور حضور پر نور سب میں بڑے ہیں اگر آپ نے کسی نبی کی توہین اور ان کی شان میں گستاخی کی تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوں گے۔

ایک شاعر صاحب ہیں کہ انہوں نے نعت لکھنے کے لئے روشنائی تجویز کی ہے اور یعقوب علیہ السلام کی آنکھ کو اس روشنائی کے حل کرنے کے لئے کھرل قرار دیا ہے وہ شعر اس وقت مجھ کو یاد نہیں رہا۔ سچ بتلایئے ایمان سے اگر ہم انبیاء علیہم السلام کو کسی موقع پر مجتمع پائیں اور وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہوں تو کیا اس مجمع میں ہم ان اشعار کو تکرار کر سکتے ہیں۔ کیا یعقوب علیہ السلام کی آنکھ میں روشنائی پیس سکتے ہیں یا ان کے منہ پر ایسی بات کہہ سکتے ہیں۔ جو بات منہ پر کہنا بے ادبی قرار دی جائے کیا پیچھے کہنا گستاخی نہ ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان ہے مخلص لوگوں نے تو دوسرے اہل اللہ کے ساتھ بھی اس کی رعایت کی ہے۔

ایک قصہ یاد آیا۔ ایک عورت جس کو جزام کا مرض تھا حضرت عمر کے زمانہ میں طواف کعبہ کر رہی تھی آپ نے فرمایا۔ یا امۃ اللہ اقعدی فی بیتک ولاتوذی الناس۔ یعنی کہ لوگوں کو تیری وجہ سے تکلیف ہوتی ہے اب نہ آنا۔ چنانچہ وہ چلی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر طواف کا شوق ہوا آ کر طواف کرنے لگی۔ ایک شخص نے کہا کہ خوب دل کھول کر طواف کر جو شخص تیرا روکنے والا تھا وہ انتقال کر گیا۔ کہنے لگی وہ شخص ایسا نہ تھا کہ سامنے تو اس شخص کا اتباع کیا جائے اور بعد میں مخالفت کی جائے یہ کہہ کر چل دی اور کہا کہ اب نہ آؤں گی۔ کیونکہ وہ منع کر گئے تھے۔ میں تو اس لئے آئی تھی کہ طواف کر کے پھر ان کو راضی کر لوں گی۔ جب وہ نہیں تو کس سے معاف کراؤں۔

سو آدمی پیچھے وہ معاملہ کرے جو سامنے کر سکتا ہو۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پیچھے کیوں ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جو سامنے نہیں کر سکتے۔ کسی نے خوب رد کیا ہے اس شعر کا (جس میں دیدہ یعقوب کو کھرل بنایا تھا) وہ یہ ہے۔

ابھی اس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل   نظر آتا ہے جسے دیدہ یعقوب کھرل

اور کہتے ہیں

توبہ ہے یوں ہو کہیں چشم نبی مستعمل   کوئی تشبیہ نہ تھی اور نصیب اجہل

انبیاء کی شان میں تو ایسے اشعار بطور نقل بھی کہتے ہوئے پریشانی ہوتی ہے۔ بلکہ سب سے بڑھ کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہایت بے ادبی کی جاتی ہے آپ کی شان میں کہتے ہیں فتنۂ عرب، شورِ عجم، آوردہ رسم کافری، جس ذات نے کفر کی جڑ کاٹی ان کے لئے یہ کہا جائے۔ اصل میں یہ امیر خسرو کا شعر ہے جو مجازی فرضی محبوب کے لئے کہا گیا ہے کسی نے اس کو نعت کے اشعار میں تضمین کر لیا۔ باقی امیر خسرو نے یہ شعر نعت میں نہیں کہا اور اگر امیر خسرو بھی کہتے تو ہم ان کی نسبت بھی یوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ معاف کرے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی بھی غلطی ہوتی۔ باقی ان کی نسبت ہم زیادہ اس لئے نہ کہتے کہ وہ بزرگ ہیں وہاں تاویل غلبہ حال کی ہو سکتی ہے گو اوروں کو اس کا نقل بطور شغل کے جائز نہ ہوتا مگر جو صاحب حال بھی نہ ہو اس کے پاس کیا عذر ہے ان گستاخیوں کا۔

مصلحین پر تہمت

اب بتلایئے یہی محبت ہے۔ نیز اگر محبت ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے حقوق محبت بھی تو ادا ہوتے۔ جو لوگ اہتمام کرتے ہیں اس مجلس کا ان سے قسم دے کر پوچھو کہ وہ کس قدر درود شریف دن رات میں پڑھتے ہیں اگر ان سے جب کہ وہ محفل میں بلانے کے لئے آویں یوں کہو کہ جتنے درود شریف وہاں پڑھے جاتے ہیں میں اس سے زیادہ یہاں پڑھ لوں گا تو کبھی راضی نہ ہوں۔ ایک شخص ایک ہزار مرتبہ درود شریف پڑھ رہا ہے اس پر تو انکار ہے اور جو محفل میں چار مرتبہ بھی نہ پڑھیں گے وہ محب ہیں۔ ایسے ہی لوگ اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں کہ مولود شریف کا منکر ہے۔

مگر صاحبو! سمجھنے کی بات ہے نماز سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں۔ لیکن اس میں بھی اگر کوئی شخص بجائے قبلہ کے ادھر (مشرق کی طرف) منہ کر کے اور گھٹنے کھول کر پڑھے اور اس پر کوئی منع کرے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ یہ نماز سے روکتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے روکنا تو اس کو کہتے ہیں کہ نہ تو کلمہ پڑھنے دے نہ حضور کا نام لینے دے ایسے شخص کو بے شک منکر کہیں گے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر واجب ہے مگر تعجب ہے کہ اس کو منکر کہا جاتا ہے۔ جو شخص یوں کہے کہ نشر الطیب

پڑھواور وہ کتابیں پڑھو جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے حالات ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات مذکور ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے احکام ہیں یہ سب ذکر ہی ہیں مگر اس میں کوئی قید نہیں ہے۔ کیا ایسے شخص کو منکر رسول کہیں گے۔ کیا یہ تہمت نہیں ہے کیا اس کا حساب نہ ہوگا۔

حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب گنج مراد آبادی سے کسی نے پوچھا کہ مولود کیسا ہے تو فرمایا کہ ہم تو ہر وقت مولود کرتے ہیں اور کلمہ طیبہ پڑھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور فرمایا یہ بھی تو مولود ہو گیا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو آپ کا کلمہ کیسے پڑھا جاتا۔ مولانا کا یہ مولود شریف تھا۔ ایسے شخص کو یہ کہنا کہ منکر رسول ہے اس کو محبت نہیں رسول سے کتنی سخت بات ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم ذکر کرتے تھے وہاں یہ قیدیں کہاں تھیں۔ کسی صحابی نے مٹھائی منگائی ہو۔ کسی نے صحابہ کو بلا کر جمع کیا ہو۔ نہ آنے والوں کو تاڑا ہو تو بتلاؤ۔

ایجاد میلاد کی وجوہ

بات یہ ہے کہ یہ چیزیں دو طرح سے ایجاد ہوئی ہیں بعض تو تکلف و تفاخر کی غرض سے۔ چنانچہ ہم اس کی علامت بتلاتے ہیں کہ ایک فہرست لکھواور اس میں یہ بھی لکھو کہ ہمارے ہاں مٹھائی نہ ہو گی۔ دیکھیں ایسی فہرست لکھنا کون گوارا کرتا ہے۔ اس سے تو بانی صاحب کی طبیعت اور نیت کا حال معلوم ہو گیا۔ اگر تفاخر نہیں تو یہ کیوں ناگوار ہے۔

آگے سننے والوں کی نیت کو دیکھئے کہ اگر کوئی ہمت کر کے لکھ بھی دے تو پھر دیکھنا آتا کون ہے۔ دو قسم کی محفلیں کر کے دیکھ لو۔ ایک وہ محفل جس میں مٹھائی ہو اور ایک وہ جس میں مٹھائی نہ ہو۔ پھر دیکھو کہاں زیادہ آدمی ہوں گے۔ دوسرے تفاخر کی ایک دلیل یہ ہے کہ اگر اتفاقاً مٹھائی کم ہو جائے اور آدھے آدمی بلا مٹھائی چلے جائیں تو نک کٹی کے خیال سے کس قدر قلق ہوتی ہے۔

اگر لوگ مسجد میں نماز کے لئے آئیں گو کسی اشتہار ہی پر آئیں گے اور جگہ نہ ملے تو کوئی شکایت نہیں کرتا کہ مہتمم صاحب نے بے قدری کی اور نہ مہتمم کو اس کا خیال ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو جگہ نہیں ملی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مہتمم کہہ سکتا ہے کہ ہمارے اوپر کوئی احسان نہیں۔ آپ دین کا کام کرنے آئے تھے جس قدر اہتمام ہم سے ہو سکتا تھا ہم نے کر دیا۔ ہمارے ذمہ کچھ بھی نہیں۔ ہاں کسی کے بلائے ہوئے شادی میں آؤ اور اہتمام میں کمی ہو تو شکایت ہو سکتی ہے پھر جب محفل میلاد میں جگہ نہ ملنے یا مٹھائی سے رہ جانے کی شکایت ہوتی ہے اور خود محفل انجام دینے والے کو بھی سخت شرمندگی ہوتی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مثل حاضری مسجد کے نہیں سمجھتے مثل شرکت شادی کے سمجھتے ہیں جہاں تفاخر سبب ہوتا ہے اہتمام کا۔ جس کی کمی سے شکایت ہوتی ہے پس اگر اس محفل کو دین کا کام سمجھتے ہیں تو حالات مذکورہ میں شرمندگی

کیوں ہوتی ہے اسی طرح مٹھائی موقوف کردی جاوے تو اس سے سامعین کی نیت کا اندازہ ہوجاوے گا کہ کتنے آدمی ذکر میں شریک ہوتے ہیں مگر مٹھائی کے موقوف کرنے سے یہ نفع ضرور ہوگا کہ دوسرے غریب بھی ہمت کریں گے ذکر کی جن کو وسعت نہیں مگر کیا کوئی اس کو گوارا کرسکتا ہے۔ نام کیسے ہوگا۔

قیام کی اصل

غرض ان رسوم کی ایجاد کی بنا ایک تو یہی تکلف و تفاخر ہے جس کو ابھی بیان کرچکا ہوں۔ اور بعض شروع ہوئی ہیں غلبہ حال سے۔ چنانچہ قیام کی اصل ہی غلبہ حال اور وجد ہے اور آداب وجد میں سے امام غزالی نے لکھا ہے احیاء العلوم میں کہ اگر مجلس میں کسی کو وجد ہو اور وہ کھڑا ہوجاوے تو سب کو چاہئے کہ کھڑے ہوجاویں کیونکہ مخالفت سے انقباض ہوتا ہے اور موافقت سے انبساط مخالفت سے طبیعت بجھ جاتی ہے۔

تو یہ قیام کرنا بھی ذکر مبارک میں کوئی حکم شرعی نہیں صحابہ سے ثابت نہیں۔ محض ایک قسم کا وجد ہے۔ کسی وقت میں کسی صاحب پر حال طاری ہوا۔ وہ حالت غلبہ میں کھڑا ہوگیا اور مطابق ادب وجد کے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس کے کھڑے ہونے پر سب کھڑے ہوگئے۔ بس اصل تو اتنی تھی۔ بعد میں کسی کو یہ ہیئت پسند آگئی۔ بس پاس کرلی (یعنی یہ بات اختیار کرلی کہ جب ولادت شریف ہو تو ضرور کھڑا ہوجانے) اب غلو کی یہ حالت ہے کہ نماز تو بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے عذر میں۔ مگر میلاد بدوں قیام نہیں ہوتا۔ بہرحال جب یہ وجد تھا تو جب غلبہ حال نہیں تو پھر اس کے اختیار کرنے کے کیا معنی۔

پھر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج اور وفات کا ذکر بھی تو ذکر ہی ہے نزول وحی کا ذکر بھی ذکر ہے پھر پیدا ہونے کے ذکر کی کیا تخصیص ہے۔ بس رسم ہے اور کچھ بھی نہیں۔ جیسے بعض بعض جگہ سماع میں اختراعات ہوگئے ہیں کہ اصل تو گزر گئی رسم رہ گئی۔

ایک موقع پر ایک بزرگ پر عین سماع کے اندر ایک وجد طاری ہوا وہ اٹھ کر مسجد کی طرف چلے۔ قوال ان کے پیچھے پیچھے ہولئے۔ قوال بھی پہنچ گئے مسجد میں۔ بس اتنی ہی حقیقت تھی۔ کہ ایک دفعہ ایسا ہو گیا تھا۔ اب وہاں لازم ہوگیا ہے کہ عین سماع کے اندر صاحب سجادہ قصداً کھڑے ہوتے ہیں اور مسجد میں جاتے ہیں اور قوال ان کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں اور مسجد میں بیٹھ کر گانا بجانا ہوتا ہے۔

اسی طرح کوئی صاحب وجد ذکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سن کر کھڑے ہوگئے تھے محبت رسول میں اور دوسرے شرکاء کھڑے ہوگئے ان کی موافقت میں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اب یہ لازم کیوں ہوگیا۔ اگر یوں کہو کہ جی چاہتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر کسی مستحب میں بھی احتمال ہو اوروں کے بگڑنے کا تو اس کو نہ کرنا چاہئے۔ چہ جائیکہ مستحب بھی نہ ہو محض جی ہی چاہتی چیز ہو تو اگر اس کو اس مفسدہ کے سبب ترک کردیں تو کیا حرج ہے اور اگر بالکلیہ ترک کرنے کو دل گوارا نہ کرے تو اچھا ضروری اصلاح تو ضروری ہی

ہونا چاہئے۔ جس کی سہل صورت یہ ہے کہ میلاد میں کبھی قیام کریں کبھی نہ کریں۔ اگر ایسا ہو تو کیا حرج ہے۔ صاحب اگر پھر کوئی تم پر اعتراض کرے تب ہی کہئے۔ مشکل تو یہ ہے کہ اس کو ایسا لازم سمجھتے ہیں کہ بھلا کوئی ترک قیام کرا تو لے۔ باقی منع کرنے والے مطلق حرام نہیں کہتے جیسا کرنے والے لوگ مطلقاً واجب سمجھتے ہیں۔ بہر حال جب ایسی ایسی باتیں پیدا ہو گئیں تو اگر نہ کہا جائے تو کیا کیا جائے۔

اسی طرح گیارہویں میں گیارہ تاریخ کی پابندی نہ کرو کبھی نویں کو کرلو کبھی بارہویں کو کرلو مگر عقیدہ درست رکھو۔ اب تو یہ بھی نہیں۔ اکثر لوگ گیارہویں ڈر کے مارے کرتے ہیں کہ نہ کریں گے تو حضرت سیدنا غوث پاک ناخوش ہو جاویں گے جس سے کچھ ضرر ہو جاوے گا اور اگر خوف سے نہ کرتے ان کو مقبول سمجھ کر محبت سے کرتے تو پھر پابندی کی ضرورت کیا تھی۔ کیا مقبولین و اولیاء کی یہ شان ہوتی ہے کہ نذرانہ دو خوش ورنہ ناخوش۔

ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ میں نے ان بدعات کے متعلق بیان کیا تو وعظ کے بعد ایک صاحب بیان کرنے لگے کہ ایسے مسائل بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ خواہ مخواہ لوگوں کو بھڑکانا۔ میں نے کہا' ضرورت آپ ہی حضرات نے ثابت کی ہے۔ اگر آپ یہ بدعات نہ کرتے ہوتے تو ہمیں ان کے رد کی نوبت نہ آتی۔ آپ کرنا چھوڑ دیں ہم رد کرنا چھوڑ دیں۔ قصور تو آپ ہی کا ہے۔ آپ عمل کرتے ہیں بلا ضرورت ہم کہتے ہیں بضرورت۔ باقی ہم نفس عمل کو منع نہیں کرتے۔ تم تخصیص تاریخ کو چھوڑ دو اور نیت اپنی درست کرلو ہم کچھ نہ کہیں گے۔ نیت یہ مت رکھو کہ روزگار میں ترقی ہوگی یا بیٹا ہوگا۔ نیت یہ رکھو کہ حضرت غوث اعظمؒ ہمارے محسن ہیں کہ ہم کو ان سے دین پہنچا اگر وہ تشریف رکھتے ہوتے تو ان کی خدمت کرتے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا تو ہم ان کو ثواب ہی بخش دیں تو پھر ہم منع نہ کریں گے۔ مگر معیار اس نیت کا یہ ہوگا کہ پھر سب کی نیاز ہونا چاہئے۔ ابو حنیفہؒ کی بھی امام بخاری کی بھی (کیونکہ سب محسن ہیں حضرت غوث اعظم کی تخصیص نہ ہوگی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تخصیص کیوں کرلی ہے۔

اسی طرح سے ہم قیام کو منع کرتے ہیں کہیں تو ذکر ولادت کے وقت کھڑے ہو جاؤ کبھی رضاعت کے بیان میں کبھی معراج کے ذکر میں علیٰ ہذا۔ بعضی محفل میں تین چار دفعہ کھڑے ہو جاؤ۔ اگر اس طرح رکھو تو کون شخص منع کرے۔ یہ حقیقت ہے اس عمل کی۔ مقصود یہ ہے کہ محبت رسول یہ نہیں ہے۔ جیسے تم کرتے ہو۔ محبت کے لوازم سے ہے کہ سب حقوق ادا کئے جائیں۔

حقیقی ذکر

ان میں سے ایک ذکر بھی ہے۔ پھر ذکر میں درود شریف بھی ہے قرآن شریف کی تلاوت بھی ہے جس میں جابجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نہایت جامع تذکرہ ہے۔ اگر قرآن شریف ختم کرلیا تو گویا پورا ذکر کرلیا۔ چنانچہ آپ کے تذکرہ میں فرماتے ہیں

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ الخ

(حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا جبکہ ان میں سے انہی کے جنس میں سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ انکو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کرسناتے ہیں۔)

اسی طرح بہت آیتیں ہیں۔ ان سب آیات میں ذکر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ذکر بھی بادشاہوں کا سا۔ اگر کسی بادشاہ کی سوانح عمری لکھو تو کیا بس اتنا لکھو گے کہ فلاں تاریخ پیدا ہوا اور فلاں تاریخ تخت نشین ہوا۔ اصل سوانح عمری تو یہ ہے کہ اس نے اتنے ملک فتح کیئے۔ یہ یہ احکام جاری کیئے۔ اس طرح مخالفین کی سرکوبی کی ایسی ایسی شجاعت ظاہر کی۔ یہ ہے اصل سوانح عمری۔ پس اس قاعدہ سے آپ کی اصل سوانح عمری دو ہی چیزیں ہیں قرآن وحدیث۔ قرآن شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری شان ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کے اخلاق کا ذکر ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔

اور آپکی شان میں فرماتے ہیں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا

بے شک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور مؤمنین کو بشارت دینے والے اور کفار کو ڈرانے والے اور سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روشن چراغ ہیں۔

اسی طرح حدیث میں آپ کا کھانا پینا سونا جاگنا اور دوسرے حالات مذکور ہیں۔ اے امداد اس کا تذکرہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں اس کی وجہ بتلاتا ہوں۔

ایک حریص سے پوچھا تھا کہ تجھ کو قرآن شریف میں کون سا حکم سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس نے کہا کلوا واشربوا کہ کھاؤ اور پیو۔ پوچھا دعا کونسی پسند ہے کہا رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (اے ہمارے پروردگار ہم کو آسمان سے دسترخوان نازل فرما) پس جس طرح اس شخص کو یہ پسند آیا اور اس میں کچھ کیوں نہ پسند آیا کیونکہ اور باتوں میں تو نفس کے خلاف کچھ کرنا پڑتا ہے اور اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اسی طرح ان لوگوں کو سارے ذکروں میں یہ پسند آیا کہ آپ کا نور پیدا ہوا۔ پھر وہ آپ کی والدہ میں آیا۔ پھر فلاں تاریخ ولادت شریف ہوئی اور یہ ذکر پسند نہیں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگ جاگ کر طاعت کی ہے۔ ایک ہی آیت کی تلاوت میں رات گزر گئی۔ پاؤں مبارک ورم کر گئے اور یہ ذکر پسند نہیں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضی ظاہر کی ہے معصیت سے زنا سے حرام خوری سے اس کو نہیں منع کیا جاتا۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ اس میں نفس کے خلاف کرنا پڑتا ہے سو اگر محض رسم ہی کی

پابندی ہے تو اس کا علاج نہیں اور اگر عقل سے بھی کام لیا جانا کوئی چیز ہے تو کیا یہ شان ہوتی ہے محبین کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور تذکروں کو اڑا ہی دیں۔

اسی طرح محبت کے لوازم میں سے ہے آپ کی شان میں گستاخی نہ کرنا اور آپ کی تعظیم کی جائے نیز متابعت کرنا۔ میرے ایک صالح دوست نے جو کہ ذکر مبارک کے عاشق تھے خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم اس کی سفارش نہ کریں گے جو ہماری بہت تعریفیں کرے۔ ہم تو اس کی سفارش کریں گے جو ہمارا کہنا مانے۔ یہ تو ان کا ذکر تھا جنہوں نے بزعم خود آپ کے حقوق میں سے صرف محبت کا پہلو لیا۔

شرط ایمان

بعض وہ ہیں جنہوں نے عظمت کو لیا ہے۔ نہ تو محبت ہے نہ متابعت۔ اکثر یہ وہ لوگ ہیں جن پر تعلیم جدید کا مذاق غالب ہے۔ طرز ان کا یہ ہے کہ یہ لوگ علماء سے علتیں احکام کی پوچھتیں ہیں۔ احکام میں خود علتیں نکالتے ہیں اور جو بات اپنی عقل نارسا و ناقص کے خلاف ہو اس کے ماننے میں ان کو تامل ہوتا ہے۔

کہیں کہتے ہیں کہ پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے (اس لئے کہ وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے پھر کیسے کوئی چل سکتا ہے) کہیں کہتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں کا بوسہ عقل کے خلاف ہے۔ ان امور میں سے ایک معراج بھی ہے کہ ان کے نزدیک خلاف عقل ہے۔ کہتے ہیں کہ تھوڑی دور جا کر ہوا نہیں ہے وہاں پہنچ کر جاندار کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ طرز بتلا رہا ہے کہ ان کو محبت نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ کیونکہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کے احکام میں شبہ نہیں ہوا کرتا۔

فرض کیجئے کہ کسی عورت سے محبت ہو جائے اور وہ کہے کہ اپنا کرتا نکال کر سر بازار برہنہ نکل جاؤ تو میں تم سے خوش ہوں گی تو اگر وہ شخص محبت و عشق میں پکا ہے تو کبھی نہ پوچھے گا کہ اس میں حکمت کیا ہے بلکہ یوں کہے گا کہ میرے محبوب نے اپنے راضی ہونے کی ایک صورت تو نکالی۔ مجھ کو اس فرمائش کی وجہ دریافت کرنے سے کیا غرض۔ میرا تو مطلب نکلتا ہے۔ ہرگز کسی مصلحت اور حکمت کے معلوم ہونے کا انتظار نہ کرے گا۔ محب کی تو بڑی مصلحت محبوب کا راضی کر دینا ہے۔

جب ایک عورت مردار کی محبت میں یہ حالت ہے کہ اس کے احکام کی علت دریافت نہیں کی جاتی تو یہ احکام تو دیکھو کیسی ذات مقدس کے ہیں ان کی علتیں کیوں دریافت کی جاتی ہیں۔ بس بات یہ ہے کہ جو لوگ احکام میں شبہات نکالتے ہیں ان کو محبت نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر محبت نہیں ہے تو ان کا ایمان ہی کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تصریحاً فرماتے ہیں۔

لایومن احدکم حتیٰ اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین

(الصحیح للبخاری ۱: ۱۰، الصحیح لمسلم کتاب الإیمان باب ۱۶، رقم: ۷۰، سنن النسائی ۸: ۱۱۴)

(اس وقت تک تم میں سے کوئی مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کو اپنے والد اور بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو جائے۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اتنی محبت نہ ہوگی تو ایمان نصیب نہ ہوگا۔ خود حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ ایمان باللہ وہ ہے جس میں محبت ہو شدت کے ساتھ۔ اور ایمان باللہ اور ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرط بھی وہی شدت محبت ہوگی اور علاوہ شہادت قرآن وحدیث کے ویسے بھی تو مشاہدہ ہے۔

حقیقی طاعت وعظمت

موٹی بات ہے کہ طاعت کا لطف ہی بلا محبت نہیں آتا۔ جو طاعت بلا محبت کے ہو وہ محض ضابطہ کی طاعت ہوتی ہے حقیقی طاعت نہیں ہوتی۔ اس طاعت کی ایسی مثال ہوگی جیسے انجن میں بھاپ نہ ہو اور اس کو مزدور ٹھیلتے ہوں جس کی رفتار کچھ بھی قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ جہاں ٹھیلنا بند کیا بس رک گیا۔ اسی طرح بدوں محبت کے جو طاعت ہوگی قابل اعتبار نہیں۔ طاعت جب ہی قابل اعتبار ہوگی کہ آگ لگی ہوئی ہو بھاپ بھری ہو محبت کی بلکہ قطع نظر لطف کے آسان بھی طاعت جب ہی ہوتی ہے جب محبت ہو۔

مثلاً ایک تو مزدور کا کہنا ماننا۔ اس کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ جہاں آقا ٹلا اور کام سے بیٹھ گئے اور ایک کسی کا محبّ کو کسی بات کی فرمائش کرنا اور اس کا کام پر لگ جانا۔ اس کی یہ حالت ہوگی کہ اس حالت میں کوئی اس سے یہ بھی کہے کہ کھانا تو کھالو۔ تو وہ یہی کہے گا کہ جب تک کام کو پورا نہ کرلوں گا مجھ کو کسی بات میں چین نہ آئے گا۔

غرض مزدور کے کام میں اور محبّ کے کام میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ دوام طاعت جو کہ عادۃً سہولت پر موقوف ہے بلا محبت نہیں ہوتا۔ پس جب عقلاً بھی محبت طاعت مفروض کا موقوف علیہ ہے تو ضرور محبت بھی فرض ہے۔ اور ایسے لوگوں کو جب محبت نہیں تو ظاہر ہے کہ متابعت بھی نہیں جو کہ محبت پر موقوف ہے اور ویسے بھی بدیہی ہے کہ جو لوگ احکام میں شبہات نکالتے ہیں وہ عمل کیا خاک کریں گے۔ غرض محبت ومتابعت سے تو یہ عاری ہیں البتہ ان لوگوں کے قلب میں آپ کی عظمت ہے ضرور۔ عظمت بھی وہ نہیں جو مطلوب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت جس حیثیت سے ہونی چاہئے وہ ان میں نہیں۔ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاً ایک شاندار اور عاقل بادشاہ سمجھتے ہیں اور نبی بھی۔ بس زیادہ عظمت آپ کی ان کے دلوں میں بادشاہ ہونے کی حیثیت سے

ہے۔ نبی ہونے کی حیثیت سے آپ کی زیادہ عظمت ان کے ذہن میں نہیں۔ اگر نبی ہونے کی حیثیت سے اصل عظمت ہوتی تو احکام میں علتیں نہ ڈھونڈتے کیونکہ نبی موسس احکام نہیں مبلغ احکام ہیں۔

اسی طرح آپ کا نام بانی اسلام نہ رکھئے' جیسا کہ یہ لوگ آپ کو بانی اسلام کہا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ لقب عیسائیوں سے لیا گیا ہے وہ لوگ اسلام کو خدا کا بنایا ہوا نہیں سمجھتے بلکہ بوجہ انکار نبوت کے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو بنایا ہے۔ مسلمانو! اس لقب کو چھوڑو۔ خوب سمجھ لیجئے کہ بانی اسلام خدا تعالیٰ ہیں آپ کی تو یہ شان ہے۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

(پس پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے جو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں۔)

آپ نے تو ادھر سے سنا ادھر کہہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز خود نہیں بنائی۔ آپ تو حکایت بیان فرما رہے ہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ آپ صرف سفیر ہی نہیں بلکہ ہمارے آقا اور سردار بھی ہیں۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک پیام پہنچانا تو وہ ہے جیسے ڈاکیہ خط پہنچاتا ہے اور ایک وہ جیسے استاد مضامین شاگرد کو پہنچاتا ہے۔ استاد صرف حکایت کرنے والا ہی نہیں بلکہ حاکم اور مربی بھی ہے۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی شان ہے۔ بعض بے ادب لوگوں کو دھوکا ہوا ہے کہ نعوذ باللہ آپ کی مثال محض سفیر جیسی ہے۔ سو یہ محض باطل ہے بلکہ ہم غلام ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ ہمارے آقا ہیں۔ البتہ مبلغ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے گھٹاتے بڑھاتے نہیں ہیں اور اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ آپ اجتہاد نہیں فرماتے تھے مگر وہ اجتہاد بھی مآلاً احکام وحی ہی میں داخل ہے کیونکہ جس اجتہاد کو قائم رکھنا نہ ہوتا تھا وہ منسوخ کر دیا جاتا تھا پس جو منسوخ نہ ہوا وہ بھی وحی منصوص بن گیا۔ پس احکام اجتہادیہ میں بھی آپ کی یہی شان ہے۔

گفتہ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ کا کہا اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے اگرچہ بندے کے منہ سے نکلا ہے۔)

اور اوپر جو کہا گیا ہے کہ آپ محض سفیر نہ تھے مربی بھی تھے۔ اس کا ایک کھلا قرینہ یہ ہے کہ آپ کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی شخص امت میں سے خلاف کرتا تھا تو آپ افسوس کرتے تھے کہ کیوں بگڑ رہا ہے۔ سو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اس طرح کام سپرد ہوتا جیسے سفیر کے ہوتا ہے تو آپ افسوس ہی کیوں کرتے۔ کیونکہ جب آپ نے سفارت پوری کر دی تو آپ بری ہو گئے۔ سفیر کا کام تو اتنا ہی ہے خواہ کوئی جنت میں جائے یا دوزخ میں افسوس کے کیا معنی۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ سفیر محض نہ تھے۔ غرض نہ تو سفیر محض تھے جیسا اہل تفریط سمجھتے ہیں اور نہ مخترع احکام تھے ہمارے متبوع تھے مگر وحی کے

بالکل تابع۔ جب یہ ہے تو آپ کے فرمودہ احکام خدا کے احکام ہیں پھر خدا کے احکام میں عقل دوڑانا چہ معنی؟ کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم ہمارے علم کے جنس سے نہیں کہ ہم وہاں تک رسائی کی فکر کریں۔

سو جب ان لوگوں نے عقل دوڑائی تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ آپ کی شان نبوت کو مغلوب اور شان سلطنت کو غالب سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب کبھی یہ لوگ آپ کے کارنامے بیان کرتے ہیں تو صرف بادشاہت کے کارنامے بیان کرتے ہیں آپ کے فقر و فاقہ کو کبھی بیان نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ اس میں ہیٹی ہوگی۔

حضور کی شان

مگر خوب سمجھ لو کہ جن کی عظمت محدود ہے ان میں تو ایسی باتوں سے کمی ہو سکتی ہے ورنہ ان حکایتوں سے کیا کمی ہوتی بلکہ اگر کسی کے پاس لشکر و حشم و خدم سب کچھ ہو اور اس صورت میں اس کو غلبہ اور رعب حاصل ہو تو وہ چنداں کمال نہیں۔ بڑی عظمت تو اس میں ہے کہ ایسی تو آپ کی حالت مگر پھر رعب کی کیا کچھ کیفیت۔ ان لوگوں نے اپنے مذاق کے موافق قیاس کیا ہے جیسے ان کے یہاں اناج نہ رہے تو چھپاتے ہیں مہمان کے لئے کہیں سے سالن منگاتے ہیں تو مہمان سے چھپا کر۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

میرے یہاں کا قصہ ہے وہ یہ کہ ایک دفعہ ہمارے یہاں سالن کم ہو گیا۔ گھر کے لوگوں نے بھائی کے یہاں سے چھپا کر سالن منگایا کہ مہمان کو خبر نہ ہو کہ یہ دوسری جگہ سے آیا ہے۔ جب کھانے بیٹھے تو میں نے صاف کہہ دیا کہ یہ بھائی کے یہاں سے آیا ہے اور میں نے گھر میں کہا کہ ہم سے جو دوستوں کو محبت ہے تو اللہ کے واسطے ہے پھر اس میں اس کی کیا گنجائش۔ دوسرے ہماری شان ہی کیا ہے جو گھٹ جاوے گی۔

سو اپنی نسبت تو ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ ہماری شان ہی کیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ دوسرا ہے کہ آپ کی اتنی بڑی شان ہے کہ وہ ایسی حکایات سے گھٹتی ہی نہیں کوئی سمندر سے ایک قطرہ لے لے تو اس میں کیا کمی ہوگی۔ اگر چیونٹی نے ایک ریزہ مٹھائی کا حلوائی کی دکان سے توڑ لیا تو اس کی دکان میں کیا کمی ہو گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ہی ارفع ہے۔ آپ کے امتیوں میں ایسے ایسے گزرے ہیں کہ سلطنت کی بھی پروا نہیں کی۔

حضرت غوث اعظم قدس سرہ کے پاس شاہ سنجر نے لکھا تھا کہ ملک نیمروز کا ایک حصہ آپ کی خانقاہ کے خرچ کے لئے نذر کرنا چاہتا ہوں قبول فرما لیجئے۔ آپ نے جواب میں یہ دو شعر لکھے۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

چتر سنجر کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو اس لئے کہ مجھے جب سے نیم شب کی سلطنت ملی ہے میری نظر میں نیم روز کی سلطنت جو کے برابر نہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم جب سلطنت ترک کر کے چلے گئے تو ارکان دولت میں کمیٹی ہوئی کہ کسی طرح ان کو لانا چاہئے۔ وزیر گیا تو دیکھا کہ آپ گدڑی اوڑھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ عرض کیا کہ حضور سلطنت درہم برہم ہو رہی ہے۔ حضور تشریف لے چلیں آپ نے فرمایا کہ یہ سلطنت تمہیں مبارک ہو مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑی سلطنت عطا فرمادی ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی سوئی گدڑی سے نکال کر دریا میں پھینک دی اور وزیر سے کہا کہ میری سوئی دریا میں سے نکلوا دو۔ وزیر نے بے شمار آدمیوں کو دریا میں داخل کر دیا وہاں سوئی کا پتہ کہاں۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا اب ہماری سلطنت دیکھو۔ یہ کہہ کر مچھیوں کو مخاطب کیا کہ اے مچھیلو! میری سوئی لاؤ صدہا مچھلیاں اپنے اپنے منہ میں کوئی سونے کی کوئی چاندی کی سوئی لے کر حاضر ہوئیں۔ آپ نے فرمایا کہ میری وہی لوہے کی سوئی لاؤ۔ ایک مچھلی وہی لوہے کی سوئی لے کر نکلی۔ آپ نے وزیر کے سامنے ڈال دی اور فرمایا کہ دیکھی میری سلطنت۔ تمہیں اپنی سلطنت پر بڑا ناز ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

رو بر سلطان کاروبار بین
حسن تجری تحتہا الانہار بین

(بادشاہ کے پاس جاؤ اور کاروبار دیکھو عمدہ باغ کہ اس کے نیچے نہریں جاری۔) دیکھو عارف شیرازی کہتے ہیں۔

مبیں حقیر گدایان عشق را کین قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تاج و تخت ہیں۔)

اور کہتے ہیں۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں زلزلہ آیا۔ آپ نے زمین پر پاؤں رکھ کر فرمایا اسکنی یا ارض کہ اے زمین ٹھہر جا۔ بس زمین ٹھہر گئی۔ کیا حقیقت ہے سلطنت کی اس کے سامنے۔

ایک دفعہ دریائے نیل خشک ہو گیا۔ ہمیشہ چڑھا کرتا تھا۔ اسی سے آب پاشی ہوتی تھی اس دفعہ نہ چڑھا۔ عمرو بن العاص یا عبداللہ بن عمرو بن العاص مصر کے عامل تھے لوگوں نے آ کر عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کبھی پہلے بھی ایسے ہوا ہے تو تم کیا کرتے ہو لوگوں نے کہا کہ جب ایس ہوتا ہے تو ہم ایک جوان حسین لڑکی بھینٹ دیتے ہیں اس سے وہ جاری ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جاہلیت کی رسم کبھی نہیں ہو گی اسلام میں اور میں خلیفہ کو لکھتا ہوں۔ انہوں نے حضرت عمر کو لکھا۔ حضرت عمر نے نیل کے نام ایک حکم نامہ بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ اے نیل! اگر تو خدا تعالیٰ کے حکم سے جاری ہے تو کسی شیطان کے تصرف سے بند ہونے کے کیا معنی؟ اور اگر یہ نہیں ہے تو ہم کو تیری کچھ پروا نہیں خدا تعالیٰ ہمارا رازق ہے۔ آپ

کے اس لکھنے پر مخالفین ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ دریا پر بھی حکومت کرتے ہیں مگر قلندر آنچہ گوید دیدہ گوید (قلندر جو کچھ کہتا ہے دیکھا ہوا کہتا ہے)۔ آپ کو شبہ بھی نہ ہوا کہ ایسا نہ ہوا تو عزت گر کر رہے گی۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس رقعہ کو اعلان کے ساتھ لے کر چلے اور مخالفین کا گروہ بھی آپ کے پیچھے چلا۔ ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ اس رقعہ سے اور دریائے نیل کے جوش سے کیا نسبت۔ مگر وہ رقعہ دریا میں ڈالنا تھا کہ دریا کو جوش آیا اور لبریز ہو کر چلنے لگا۔

یہ باتیں تو کوڑھ مغزوں کو سمجھانے کے لئے ہیں۔ واقع میں تو ان کی سلطنت کچھ اور ہی ہے جس کو حضرت بایزید بسطامی نے ذرا تیز الفاظ میں کہا ہے مگر پھر کوئی ایسا نہ کہے انہوں نے کہا ہے **ملکی اعظم من ملک اللہ**۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی چیزیں ہیں وہ تو ملک ہیں اللہ کی اور اللہ تعالیٰ **ملک** میں ہماری۔ اور ظاہر ہے کہ کہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان اور کہاں دوسری چیزیں۔ اس لئے ہمارا **ملک** اعظم ٹھہرا۔ اور یہ آپ نے مرتبہ ناز میں کہا ہے۔ ہر شخص کا منہ اس کہنے کے لائق نہیں کیونکہ۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد
چوں نداری گرد بد خوئی مگرد

(ناز کیلئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس مت پھٹکو)

حاصل یہ کہ ان کی سلطنت کو کیا پوچھتے ہو اور جب اولیاء اللہ کی یہ کیفیت ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ دنیوی سلطنت کیا بلا ہے۔ سو آپ صرف بادشاہ ہی نہیں ہیں بادشاہ تو آپ کے غلام ہیں۔ آپ کو صرف بادشاہ قرار دینا تعظیم نہیں ہے۔ آپ کو نبی قرار دینا یہ ادب اور تعظیم ہے مگر آپ کی تعظیم میں ایک امر نہایت لازم اور فرض ہے۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا ادب ملحوظ رکھا جاوے آپ کو حق تعالیٰ کے برابر نہ کر دیا جائے۔

واعظین کی گستاخیاں

آج کل تو واعظین اپنی حکایت تراشتے ہیں کہ جن کا سر نہ پاؤں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی اور اولیاء اللہ کی شان میں بھی۔

چنانچہ ایک حضرت غوث الاعظم بھی ملے ہیں حکایات تراشنے کو۔ ایک حکایت گھڑی ہے کہ ایک بڑھیا گئی حضرت غوث الاعظم کے پاس اور کہا کہ میرا بیٹا مر گیا اس کو زندہ کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ زندہ نہیں ہو سکتا اس کی عمر ختم ہو چکی تھی۔ بڑھیا نے کہا کہ اگر اس کی عمر ختم نہ ہوتی تو آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ سے تو اسی واسطے کہا ہے کہ عمر ختم ہو گئی اور آپ کو زندہ کرنا پڑے گا۔ آپ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔ وہاں سے بھی اسی دلیل سے حکم ہوا کہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے بھی وہی جواب دیا۔ جب کسی طرح عرض منظور نہ ہوئی اور ادھر بڑھیا نے تنگ کیا تو آپ نے عزرائیل سے تھیلا روحوں

کا چھین کر اسے کھول دیا۔ ساری روحیں پھر پھر اڑ گئیں اور تمام مردے زندہ ہو گئے آپ نے فرمایا کہ دیکھا ایک کو نہ جلایا اب اچھا ہوا۔ عزرائیل نے خدا تعالیٰ کے یہاں نالش کی۔ وہاں سے حکم ہوا کہ ہم کو دوست کی خاطر منظور ہے۔ خیر جیسے وہ کہیں وہی سہی۔

الٰہی توبہ! کتنی بڑی گستاخی ہے حق تعالیٰ کی شان میں کیا خدا تعالیٰ کی سلطنت اودھ کی سلطنت ہے کہ کوئی قاعدہ قانون ہی نہیں جس کا جو جی چاہے کر گزرے ایسی غیر آئینی سلطنت پر ایک حکایت یاد آئی۔ کوئی شہر تھا ان نیاؤ پور۔ ان نفی کا کلمہ ہے۔ نیاؤ کے معنی ہیں انصاف کے پورے شہر کو کہتے ہیں اس کے معنی ہوئے بے انصافی کا شہر۔ ایک گرو اور ایک اس کا چیلہ اس شہر میں جا پہنچے اور چیزوں کا بھاؤ پوچھا۔ سب کا بھاؤ سولہ سیر۔ گیہوں بھی سولہ سیر، چنے بھی سولہ سیر گھی بھی سولہ سیر نمک بھی سولہ سیر گوشت بھی سولہ سیر غرض سب کا ایک ہی بھاؤ گرو نے یہ حال دیکھ کر چیلہ سے کہا کہ یہاں سے چلو یہ شہر رہنے کے قابل نہیں۔ یہاں کھرے کھوٹے ایک بھاؤ تلتے ہیں چیلہ نے کہا کہ ہم تو یہاں رہیں گے خوب گھی کھائیں گے طاقت آئے گی ہر چند گرو نے سمجھایا مگر اس نے ایک نہ مانی خیر ایک عرصہ تک وہاں رہا کئے۔ فراط سے سب چیزیں ملیں چیلہ کھا کھا کر خوب موٹا ہوا۔

ایک دفعہ اتفاق سے ایوان شاہی پر پہنچے۔ راجہ کے یہاں ایک مقدمہ پیش تھا وہ یہ کہ دو چور کسی مہاجن کے یہاں گئے تھے چوری کرنے نقب دے کر ایک باہر پہرہ پر رہا ایک اندر گیا اس پر وہ دیوار گر پڑی دب کر مر گیا۔ اس کے ساتھی نے دعویٰ دائر کیا مہاجن پر کہ اس نے ایسی دیوار کمزور بنائی تھی کہ وہ گر پڑی۔ مہاجن کو حاضر کیا گیا۔ اس نے عذر کیا کہ میرا قصور نہیں۔ معمار نے ایسی دیوار بنائی تھی۔ معمار حاضر کیا گیا اس سے پوچھا گیا اس نے کہا کہ مزدور نے گارا پتلا کر دیا تھا۔ اس نے اینٹ کو اچھی طرح نہیں پکڑا مزدور حاضر کیا گیا اس نے کہا کہ سقہ نے پانی زیادہ چھوڑ دیا تھا اس لئے گارا پتلا ہو گیا سقہ حاضر کیا گیا۔ اس نے کہا کہ سرکاری ہاتھی میری طرف دوڑا آ رہا تھا مشک کا دہانہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس لئے پانی زیادہ پڑ گیا۔ فیل بان کو حاضر کیا گیا اس نے کہا کہ ایک عورت بجتا ہوا زیور پہنے آ رہی تھی۔ پازیب کی جھنکار سے ہاتھی چونک گیا وہ عورت حاضر کی گئی۔ اس نے کہا کہ سنار نے پازیب میں باجا ڈال دیا تھا۔ سنار کو حاضر کیا گیا اس کو کچھ جواب نہ آیا۔ آخر کہیں تو سلسلہ ختم ہوتا۔ آخر یہ تجویز ہوا کہ اس سنار کو پھانسی دی جائے۔ اس کو پھانسی پر لے گئے اور گلے میں پھانسی ڈالی۔ اس کی گردن ایسی پتلی تھی کہ حلقہ اس کے گلے میں برابر نہ آیا۔ حلقہ تھا بڑا۔ جلاد نے آ کر کہا کہ حلقہ اس کے گلے میں نہیں آتا۔ اس پر یہ تجویز ہوا کہ کسی موٹے سے کو پھانسی دے دو۔ تلاش ہوئی تو سوائے چیلہ صاحب کے، اتنا موٹا کوئی اور نہ ملا۔ یہ پکڑے گئے۔ انہوں نے گرو جی سے کہا کہ اب کیا کروں۔ گرو جی نے کہا کہ بھائی میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شہر رہنے کے قابل نہیں مگر تو نے نہ مانا۔ اب اپنے کئے کو بھگت چیلہ نے کہا کہ حضور کسی طرح بچایئے کچھ تو کیجئے آخر آپ کا بچہ ہوں۔

گرو نے تدبیر نکالی کہ آپس میں جھگڑنا شروع کیا۔ گرو کہے کہ مجھے پھانسی دو اور چیلہ کہے کہ مجھے دو۔ خوب جھگڑے یہاں تک کہ راجہ تک نوبت پہنچی۔ راجہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ گرو نے کہا کہ یہ ایسی راحت ہے کہ جو کوئی ایسی ساعت میں پھانسی چڑھے تو سیدھا بیکنٹھ کو جاوے اس لئے ہم جھگڑتے ہیں کہ پھر ایسی ساعت نہ ملے گی۔ راجہ نے کہا کہ پھر اس سے اچھا موقع کہاں نصیب ہوگا ہمیں پھانسی دے دو۔ چنانچہ اس منحوس کو پھانسی دے دی گئی ایسے راجہ کو پھانسی دینا ہی اچھا پاپ کٹا خس کم جہاں پاک۔

یہ قصہ تھا ان نیاؤ پور کا۔ سو بہت سے لوگ مسلمان ہو کر ایسی ہی سلطنت سمجھتے ہیں خدا تعالیٰ کی جیسی نیاؤ پور کی حکومت کہ کوئی قاعدہ اور قانون ہی نہیں اندھا دھند معاملہ ہے جس کے کچھ اصول ہی نہیں صاحبو! کتنا بڑا ظلم وستم ہے کہ اولیاء کو یا انبیاء کو خدا کے برابر بلکہ مطابق ایسی خرافات حکایات کے خدا سے بڑھ کر قرار دیا جاوے اس لئے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا مت بڑھاؤ کہ خدا میں ملا دو۔ کہ اس سے تو حضور بھی ناخوش ہوں گے۔

اب بعض وہ لوگ رہ گئے کہ کسی قدر متابعت تو کرتے ہیں مگر نہ ان کے دل میں عظمت ہے اور نہ محبت۔ اور یہ لوگ زیدہ ان میں ہیں جو آج کل کسی امام کا اتباع نہیں کرتے کہتے ہیں کہ ترجمے موجود ہیں ضرورت کیا ہے اکابر کے اتباع کی۔ ہم خود دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ اگر عربی نہیں سمجھتے تو ترجمہ ہی سے احکام نکال لیتے ہیں۔ سو ان میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ نہ بزرگوں کا ادب کرتے ہیں نہ صحابہ کا نہ آئمہ کا اور بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں خشک الفاظ استعمال کرتے ہیں بس ظاہراً اطاعت تو کرتے ہیں اور بدعات سے بھی بچتے ہیں مگر نہ عظمت جیسا بیان ہوا اور نہ وہ سوز و گداز جو محبت میں ہوتا ہے۔ غرض اس وقت یہ تین جماعتیں ہیں۔

١۔ ایک وہ جو محبت رکھتے ہیں مگر اتباع و عظمت نہیں۔

٢۔ ایک وہ جو عظمت کرتے ہیں لیکن محبت و اتباع نہیں۔

٣۔ ایک وہ جو اتباع کرتے ہیں مگر عظمت و محبت نہیں۔

سو یہ تینوں جماعتیں پورے حقوق ادا نہیں کرتیں۔ کسی نے ایک کو لیا دو کو چھوڑا کسی نے دو کو لیا تیسرے کو چھوڑا اعلی ہذا جامع وہ شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں متابعت میں عظمت میں سرافگندہ رہتا ہو۔

ترجمہ وتفسیر آیت

بس اس آیت میں یہی مضمون ہے۔ آیت کا ترجمہ پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن تمہید میں مضمون طویل ہوگیا اب ترجمہ کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں حق تعالیٰ شانہ۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا الخ

(خداتعالیٰ نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔)

اس کی توجیہ میں اختلاف ہے ایک توجیہ تو یہ ہے کہ ذکر کی تفسیر قرآن مجید سے کی جائے اور ذکرا کا بدل الاشتمال ہے رسول اور ایک توجیہ ہے کہ ذکرا کے معنی ہیں شرفا کے اور رسولا اس سے بدل الکل ہو مطلب یہ ہے کہ خداتعالیٰ نے ایک شرف نازل کیا سو شرف کا لفظ عظمت کو ظاہر کر رہا ہے۔ وہ کون ہیں رسول ہیں۔ انزل بھی آپ کے شرف پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ انزال اوپر سے نیچے آنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تھی تو اونچی رکھنے کی چیز بوجہ شرف کے مگر تمہاری خاطر سے نیچے بھیج دیا ہے۔ اس صورت میں آپ کا شرف در شرف ظاہر ہو گیا۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ دوسرے موقع پر قرآن شریف میں ہے وانزلنا الحدید کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا حالانکہ وہاں اوپر سے نیچے آنا نہیں پایا جاتا کیونکہ لوہا آسمان سے تو نازل نہیں ہوتا وہ تو زمین میں سے نکلتا ہے اس لئے انزال کے معنی اوپر سے نیچے آنے کے کہاں ہوئے۔

جواب یہ ہے کہ وہاں مجاز ہے تعذر حقیقت کے سبب سے ہے اور قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا میں تعذر نہیں۔ اس لئے حقیقت مراد ہے۔ دوسرے کسی نے اس کی بھی توجیہ کی ہے کہ حضرت آدم کے ساتھ کئی چیزیں آئی تھیں۔ ہتھوڑا تھا اور وہ اوپر ہی سے آئی تھیں۔ تیسری توجیہ یہ کہ حدید نکلتا ہے زمین سے اور سبب اس کا بخارات ہیں جو پانی سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی اوپر سے آتا ہے اور زمین میں نفوذ کرتا ہے۔ سو اس طرح وہاں بھی معنے حقیقی ہی ہیں۔ غرض حقیقی معنے انزال کے اوپر سے آنے کے ہیں اور انزال کا کلمہ بارش کے لئے بھی آیا ہے۔ سو آپ کے لئے اس کا استعمال ہونا یہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کی شان بارش کی سی ہے کہ وہ بھی رحمت ہے اور آپ بھی رحمت۔ چنانچہ حدیث میں ہے انا رحمة مهداة یعنی میں خدا کی رحمت ہوں جو بندوں کے لئے خدا کے پاس سے تحفہ لے کر آیا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاصیت بارش کی سی ہے چنانچہ بارش سے حیات ہوتی ہے ارض کی اور آپ سے حیات ہوتی ہے قلب کی۔

ایک شعر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایسے موقع پر پڑھا تھا کہ کسی نے آپ سے مسئلہ مولد کے متعلق پوچھا تھا۔ آپ نے فرمایا لو ہم مولد پڑھتے ہیں اور یہ شعر پڑھا۔

تر ہوئی باراں سے سوکھی زمین ۔۔۔ یعنی آئے رحمت للعالمین

اس شعر سے میرے اس مضمون کو اور قوت ہو گئی۔ غرض ذکرا میں آپ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ رسولاً میں متابعت کی طرف کیونکہ ایک مدار متابعت کا رسالت ہے اور امنوا میں محبت کی طرف کیونکہ ایک آیت ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ایمان والے اللہ تعالیٰ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔

اور حب اللہ اور حب الرسول میں تلازم ہے تو جس طرح ایمان کے لئے اللہ کی شدت محبت لازم ہے اسی طرح رسول کی شدت محبت آگے ہے مبینات یعنی خود ظاہر بھی اور ظاہر کرنے والی بھی۔ آگے ارشاد ہے لِيُخْرِجَ الَّذِيْنَ الخ لِيُخْرِجَ میں لام غایت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیوں بھیجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے برکات حاصل کریں۔

یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ موصوف ہوگا وہ تو خود ہی خارج من الظلمات الی النور ہوگا۔ پھر ان کے خارج ہونے کے کیا معنی؟

سو مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظلمت سے نور کی طرف خارج ہوئے ہیں وہ ایمان اور اعمال صالحہ کر کے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ برکت ایمان اور اعمال صالحہ ہی کی ہے کہ وہ تاریکی سے نور کی طرف لے آئے ہیں۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے پورے حقوق ادا کرنے چاہئیں یعنی ذکر بھی کریں محبت بھی کریں متابعت بھی ادب وتعظیم بھی۔ آگے آیت میں خاصیت ایمان اور اعمال صالحہ کی بیان فرماتے ہیں۔ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ الخ مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کر کے کیا ملے گا۔ بشارت دیتے ہیں کہ یہ ملے گا۔

يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ
قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝

یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ ہے کہ حق تعالیٰ ایسی جنات میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ کہ وہ نعمتیں بلاحساب اور بلا انقطاع ہوں گی۔ یہی دو صورتیں کمال نعمت کی ہوتی ہیں کہ نفیس اور عمدہ بھی ہو اور بلا انقطاع بھی ہو کہ مزیت کما ہے سو یہ جنت میں حاصل ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ کے جملہ حقوق ادا کر کے جنت کی نعمتیں حاصل کریں اور اگر حقوق ادا نہ کئے برائے نام تھوڑی سی تعریف کر لی یا محفل منعقد کر لی اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً طبیب کی تعریف سے کیا فائدہ جب تک اس سے نسخہ لکھا کر اس کا استعمال نہ کیا جائے اور اس کے کہنے پر عمل نہ کیا جائے اور یہ حقوق آپ کے دائمی ہیں۔ تو آپ ایسی بارش کے مشابہ نہیں جو کسی خاص موسم میں ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بارش ہیں کہ جس سے ہمیشہ بہار ہی بہار ہے۔ کبھی خزاں ہی نہیں۔ یہ نہیں کہ ربیع الاول میں تو بہار ہو اور مہینوں میں نہ ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہار جو حیات میں تھی وہ اب بھی بحالہ ہے۔

اب میں اس مضمون کے مناسب اس شعر پر اپنے وعظ کو ختم کرتا ہوں۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشان ست   خم و خم خانہ با مہر و نشان ست

(وہ ابر رحمت ابھی تک درفشاں ہے خم وخمخانہ اور مہر ونشاں کے ساتھ موجود ہے۔)

محروم ہے وہ شخص جو ایسے نبی کی برکات حاصل نہ کرے دعا کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نصیب ہو متابعت کی توفیق ہو اور آپ کی عظمت ہو قلب میں اور اس وعظ کا نام بمناسبت بکلمات قرآنیہ کے ذکر الرسول مناسب ہے اور لقب اس کا بمناسبت آپ کے معنوی برکات کے جو مشابہ ہیں باران و بہار کے الربیع فی الربیع مناسب ہے (پھر دعا کر کے جلسہ ختم ہوا)

الرفع والوضع

حضور کے ہر فعل و حال سے سبق لینے کے بارے میں یہ وعظ بعد نماز جمعہ ۹ رجب ۱۳۴۲ھ کو مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ حاضری ۱۰۰ کے قریب تھی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّابَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے بے شک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔)

وجہ بیان

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنے رسول کریم (علیہ افضل الصلوۃ والتسلیم) کی بہت سی صفات بیان فرمائی ہیں جن میں سے اس وقت مقصود بالبیان اخیر کی صفت ہے اور اس سے مجھ کو وہ مضمون مستنبط کرنا ہے جس کے بیان کا اس وقت ارادہ ہے اور وہ صفت سراجاً منیراً ہے۔

وجہ بیان کی یہ ہے کہ بعض حضرات نے خلوص کے ساتھ بیان کی درخواست کی تھی کیونکہ عرصہ سے یہاں پر بیان نہ ہوا تھا۔ گو ابھی تک سفر کا تکان نہ اترا تھا۔ رات بھر سر میں درد تھا اور اب بھی موجود ہے اور بیان کے لئے جس انشراح کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے یہ مانع کافی تھا مگر درخواست خلوص سے تھی اس لئے انکار کو جی نہ چاہا۔ یہ خیال ہوا کہ اس درخواست کو پورا ہی کروں گا گو مختصر ہی بیان ہو۔ مگر تکان کی وجہ سے پختہ وعدہ بھی نہ کیا تھا۔ یہ کہہ دیا تھا کہ وقت پر جیسی رائے ہوگی اطلاع کردوں گا۔

پھر میں نے سوچا کہ اگر بیان کروں تو کیا بیان کروں۔ بڑی دیر تک کوئی مضمون ذہن میں نہ آیا اور یہ عادت نہیں کہ کیف ما اتفق کوئی سا مضمون بیان کر دیا جائے بلکہ یہ خیال رہتا ہے کہ ضرورت اور وقت کے مناسب مضمون بیان کیا جائے جب وقت کے مناسب بھی کوئی مضمون ذہن میں نہ آیا تو ایک مانع یہ موجود ہو گیا مگر دفعۃً نماز میں ایک مضمون کی طرف ذہن منتقل ہوا۔ وہ یہ کہ مہینہ رجب کا ہے جس میں باتفاق مورخین واہل سیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خاص کمال ظاہر ہوا ہے یعنی معراج۔ پھر اس طرف ذہن منتقل ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات متعدی ہیں لازم نہیں (یعنی حضور کے کمالات سے صرف آپ ہی کو نفع نہیں ہوا بلکہ آپ کے ہر کمال سے دوسروں کو بھی نفع ہوا ہے) اس لئے واقعہ معراج میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو کمال ظاہر ہوا ہے وہ بھی متعدی ہونا چاہئے لازمی نہ ہونا چاہئے۔

اس کے بعد عنوان متعین ہو گیا کہ آج یہ مضمون بیان کیا جائے کہ واقعہ معراج سے حضور کا کمال تو ظاہر ہی ہے اور ہوا امت کو بھی اس سے نفع پہنچا ہے تو آپ کا یہ کمال بھی دوسرے کمالات کی طرح متعدی ہے لازمی نہیں۔ اسی طرح پر یہ مضمون ہماری ضرورت کا ہو گیا۔ گو ہمارے واسطے حضور کے کمالات کا مطلقاً بیان بھی سبب سعادت ہے۔ خواہ ان کے تعدیہ پر نظر ہو یا نہ ہو مگر الاھم فالاھم کے قاعدہ سے چونکہ ابھی ہم اصلاح سے فارغ نہیں ہوئے ہم کو حضور کے کمالات میں بھی یہ نظر رکھنا چاہئے کہ ہم کو اس سے کیا نفع حاصل ہوا۔

اکتساب فیض کمالات

حضور کے کمالات کو محض اس نظر سے نہ دیکھنا چاہئے کہ یہ آپ کا خاص واقعہ ہے بلکہ سب سے سبق لینا چاہئے۔ اس کی شہادت قرآن سے ملتی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ

(ہم نے کسی رسول کو بھی نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ خدا کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے)

حالانکہ رسول کے لئے بہت بڑا کمال ہے مگر حق تعالیٰ نے لیطاع میں ہم کو متنبہ فرما دیا ہے کہ تم رسالت پر محض اس حیثیت سے نظر نہ کرو کہ وہ رسول کا ایک کمال ہے بلکہ تم اپنے فائدہ پر بھی نظر رکھو کہ رسالت ایسا کمال ہے جس کی اطاعت وموافقت سے مخلوق خالق کے نزدیک مقبول ومقرب ہو جاتی ہے دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ

یعنی حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار! ہماری اولاد میں ایسا رسول مبعوث فرمائیے جو ان پر آپ کی آیات کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

یہ آیت خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شان میں ہے کیونکہ یہ دعا ایسے نبی کے حق میں ہے جو دونوں حضرات کی اولاد میں ہوں اور ایسا رسول جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام دونوں کی اولاد ہو بجز حضور کے کوئی نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اس دعا کا مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور اس میں حضور کے جن کمالات کا بیان ہے ان کے متعدی ہونے کا بھی ساتھ ساتھ بیان ہے کہ وہ ایسے ہوں جو محض کمال رسالت ہی سے متصف نہ ہوں بلکہ ان کا یہ کمال متعدی بھی ہو کہ مخلوق کو ان سے فیض پہنچے۔ اس میں خاص حضور کے کمالات کے متعلق دو پیغمبروں کے صیغۂ دعا میں اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ لوگوں کو حضورؐ کے کمالات میں اپنے فائدہ پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ ایک مقام پر حق تعالیٰ نے حضور کی بعثت سے ہمارے اوپر امتنان فرمایا ہے تو وہاں بھی اس کے متعدی ہونے کا بیان فرمایا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں انہی کی جنس میں سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں۔

غرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں میرے اس دعویٰ کی دلیل موجود ہے کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر کمال سے سبق لینا چاہئے اور ان پر اس جہت سے نظر کرنی چاہئے کہ ہم کو اس کمال سے کیا فائدہ ہوا۔ جن میں حضور کا ایک بڑا کمال معراج بھی ہے تو اس سے بھی ہم کو سبق لینا چاہئے۔

اب اس اعتبار سے اس مضمون کو رجب کے مہینے سے کوئی خاص خصوصیت بھی نہیں رہی کیونکہ میں واقعہ معراج میں بیان کروں گا بلکہ یہ بتلاؤں گا کہ امت کو اس واقعہ سے کیا فیض پہنچا اور ظاہر ہے کہ اس ماہ سے واقعہ کو تو کچھ خصوصیت ہے بھی مگر جو فیض امت کو اس واقعہ سے پہنچا ہے وہ اس مہینہ کے ساتھ خاص نہیں۔ اس لئے یہ احتمال بھی نہ رہے گا کہ میں اس ماہ کی خصوصیت کی وجہ سے یہ مضمون بیان کر رہا ہوں۔ جیسا اس مہینہ میں بعض لوگ رجبی کرتے ہیں مگر وہ قصہ معراج بیان کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں بیان کرتا کہ امت کو اس سے کیا نفع ہوا۔ گو نفس واقعہ کا بیان بھی باعث برکت ہے بشرطیکہ منکرات سے خالی ہو جس میں تخصیص و التزام بھی داخل ہے۔

روشن چراغ

اب وہ مضمون بیان کرتا ہوں کہ امت کو واقعہ معراج سے کیا نفع حاصل ہوا جس کے لئے میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے جس میں میرے ذوق میں سراجاً منیراً سے اس مضمون کو مناسبت ہے۔ گو اس

پر استدلال موقوف نہیں۔ اس پر دوسرے مستقل دلائل ہیں مگر مناسبت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روشن چراغ فرمایا گیا ہے۔ اور یہ بطور تشبیہ کے ہے۔ جیسے زید اسد کہا جاتا ہے بوجہ شجاعت کے۔ اسی طرح حضور کو ایک خاص صفت میں چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تشبیہ میں مشبہ کا مشبہ سے اقوی واکمل ہونا لازم نہیں۔ البتہ واضح واشہر ہونا ضروری ہے۔ اس لئے حضور کو چراغ سے تشبیہ دینے میں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ اس صفت میں چراغ آپ سے افضل ہے بلکہ اس کا مبنیٰ بھی وہی ہے کہ چراغ اس صفت میں بوجہ محسوس ہونے کے مشہور ہے۔

یہاں سے یہ اشکال بھی مرتفع ہو گیا جو بہت لوگوں کو صیغہ صلوٰۃ **اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم۔** میں پیش آیا کرتا ہے کہ اس میں حضور پر صلوۃ کو ابراہیم علیہ السلام کے صلوٰۃ سے تشبیہ دی گئی ہے جس سے ابراہیم علیہ السلام کی صلوۃ کی افضیلت لازم آتی ہے۔

اس اشکال کا منشا یہ ہے کہ تشبیہ کے لئے مشبہ بہ کا افضل ہونا لازم سمجھا جاتا ہے مگر یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ تشبیہ کے لئے افضیلت مشبہ بہ کا لزوم ہی غلط ہے بلکہ اس کے لئے محض مشبہ بہ کا اشہر واوضح ہونا لازم ہے۔ افضل ہونا لازم نہیں۔ تتبع موارد استعمال سے اس کی تائید ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک مقام پر خود اپنے نور کو مصباح سے تشبیہ دی ہے حالانکہ یہاں مشبہ بہ کی فضیلت کا وہم بھی نہیں ہو سکتا فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ
فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ
لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ

گو یہاں مصباح کی بہت کچھ تقویت کی گئی ہے کہ چراغ شیشہ کے (گلاس کے اندر) ہے اور وہ ایسا چمکدار ہے جیسے روشن ستارہ اور اس چراغ میں تیل بھی زیتون کا ہے اتنا عمدہ کہ آگ لگنے سے پہلے ہی بھڑکنا چاہتا ہے لیکن گو وہ کتنا ہی قوی ہو حق تعالیٰ کے نور سے اس کو کیا نسبت۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ مشبہ بہ کے لئے مشبہ سے افضل ہونا ضرور نہیں۔ گو اتفاق سے زید اسد میں اسد زید سے زیادہ ہی بہادر ہو اور واقعی اس جانور کو خدا تعالیٰ نے قوت و شجاعت بہت زیادہ دی ہے اور عجب نہیں ایسی ہی جزئیات سے لوگوں کو یہ غلطی واقع ہو گئی ہو کہ مشبہ بہ کو مشبہ سے افضل ہونا چاہیے مگر حقیقت میں یہ لازم نہیں۔ ورنہ نور مصباح کو نور خداوندی سے افضل کہنا پڑے گا حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تحقیق یہ ہے کہ مشبہ بہ کا صرف اشہر واوضح ہونا ضرور ہے۔ افضیلت ضروری نہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ غائب از نظر ہیں۔ کوئی

شخص ان آنکھوں سے دنیا میں ان کو نہیں دیکھ سکتا اس لئے خدا کا نور اشہر نہیں اور نور مصباح اشہر ہے اس وجہ سے ان کو نور مصباح سے تشبیہ دے دی گئی ہے۔

خدا کے نور کی تو بڑی شان ہے۔ لوگ عالم کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ حضرت تو روشن چراغ ہیں۔ اس میں بھی ان کو یہ وہم نہیں ہوتا کہ چراغ نور میں ان سے افضل ہے مگر چونکہ یہ چراغ کوئی بھی خالی از نور نہیں دیکھا گیا اس لئے اس کا نور اشہر ہے اور بشر بعض ظلمانی ہیں' بعض نورانی' اس لئے اس کا منور ہونا محتاج دلیل ہے تو اس کا منور ہونا اشہر نہیں۔

اس تفصیل سے یہ مسئلہ طے ہو گیا کہ مشبہ بہ کے لئے مشبہ سے افضل ہونا لازم نہیں صرف اشہر واوضح ہونا ضروری ہے۔ پس حضور کو سراج منیر فرمانے سے افضلیت سراج کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تشبیہا روشن چراغ فرمایا گیا ہے۔ تو بناء براصول تشبیہ جو خاص وصف چراغ میں ہے۔ وہ آپ میں ہونا لازم ہے اور اسی سے یہ بھی دفع ہو جائے گا کہ آفتاب یا ماہتاب سے حضور کو کیوں نہ تشبیہ دی گئی حالانکہ آفتاب تمام منیرات میں روشن تر ہے اس کے سامنے نہ چاند کی کوئی حقیقت ہے نہ چراغ کی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آفتاب کی روشنی میں حرارت اور تیزی زیادہ ہے جس کی وجہ سے کوئی اس پر نگاہ نہیں جما سکتا اس لئے اس سے تشبیہ نہیں دی گئی تو پھر چاند سے تشبیہ دے دی جاتی۔ چراغ سے تو وہ بدرجہا زیادہ ہے۔

وجہ دفع یہ ہے کہ چراغ میں ایک خاص صفت ایسی ہے جو نہ آفتاب میں ہے نہ ماہتاب میں۔ اس لئے حضور کو چراغ روشن فرمایا گیا۔ بات یہ ہے کہ چراغ میں تین صفتیں ہیں۔

(۱) ایک اس کا خود روشن ہونا۔

(۲) دوسرے اپنے غیر کو روشنی دینا کہ چراغ کی وجہ سے دوسری چیزیں ظلمت سے نور میں آجاتی ہیں۔

ان دو صفتوں میں چراغ اور آفتاب و ماہتاب سب شریک ہیں۔ اور یہ دو وصف آفتاب میں بے شک چراغ سے زیادہ ہیں۔

(۳) تیسری صفت چراغ میں یہ ہے کہ اس سے دوسرا چراغ اسی کے مثل روشن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔

یہ صفت خاص چراغ ہی میں ایسی ہے کہ آفتاب و ماہتاب میں نہیں ہے۔ کیونکہ آفتاب سے دوسرا آفتاب اور ماہتاب سے دوسرا ماہتاب روشن نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آفتاب و ماہتاب دوسری چیزوں کو منور (باسم المفعول) تو کر دیتے ہیں مگر منور (باسم الفاعل) نہیں کرتے اور چراغ دوسری اشیاء کو منور بھی کرتا ہے۔

اس لئے حضور کو آفتاب و ماہتاب سے تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ چراغ روشن فرمایا گیا۔

تو چراغ کی طرح آپ میں بھی علاوہ خود نورانی ہونے کے دو صفتیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ آپ دوسروں کو منور کرتے ہیں دوسرے یہ کہ آپ بعضوں کو منور بنانے والے ہیں۔ پہلا کمال آپ کا امت میں ظاہر ہوا اور دوسرا کمال انبیاء علیہم السلام میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام آپ سے فیض حاصل کرتے ہیں مستقل چراغ ہو گئے۔ جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کر لیا جاوے تو وہ بجائے خود مستقل منور ہو جاتا ہے۔ یہی شان انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ امت کی یہ حالت نہیں کیونکہ امتی کے اندر جو نور آپ کے واسطے سے آتا ہے وہ اس میں مستقل نہیں۔

پس آپ انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے لئے بمنزلہ واسطہ فی الثبوت کے ہیں کہ ذی واسطہ بھی اس کمال کے ساتھ موصوف حقیقتہ ہو جاتا ہے اور واقع میں وہاں دو صفتیں ہوتی ہیں۔ ایک واسطہ کی اور ایک ذی واسطہ کی۔ اور امتیوں کے لئے بمنزلہ واسطہ فی العروض کے ہیں ذی واسطہ حقیقتہً اس کمال کے ساتھ موصوف ہی نہیں ہوتا محض مجازاً متصف ہوتا ہے کیونکہ وہاں واقع میں ایک ہی صفت ہوتی ہے صرف واسطہ میں اور ذی واسطہ میں کوئی صفت ہوتی ہی نہیں۔ اسی طرح امتیوں میں واقع میں صفت تنویر کی ہے ہی نہیں وہ حضور کی صفت ہے کہ امتیوں کی طرف مجازاً منسوب کر دی جاتی ہے بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ واقع میں بھی ان میں تنویر کی صفت ہو جاتی ہے گو آپ ہی کی برکت سے تھی۔

رہا یہ کہ حضور سے جمیع کمالات میں انبیاء علیہم السلام کو فیض پہنچنے کی کیا دلیل۔ تو ہم کو اس کے دلائل بتلانے کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ یہ مسئلہ اہل تحقیق کا اجماعی ہے مگر تقریب فہم کے طور پر بتلانے کا کچھ حرج بھی نہیں۔

جامع کمالات

سو ایک مقدمہ اول سمجھنا چاہئے کہ آپ جمیع کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اور اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم انبیاء کے فضائل میں گفتگو کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ بنایا۔ کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ بنایا۔ کسی نے کہا کہ حق تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ وکلمۃ اللہ بنایا وعلی ہذا۔ اور اس گفتگو سے صحابہ کا یہ مقصود نہ تھا کہ انبیاء کو آپ پر فضیلت دیں بلکہ غالباً وہ یہ چاہ رہے تھے کہ جس طرح ہم کو ان انبیاء کے خاص اوصاف معلوم ہیں اسی طرح یہ بھی معلوم کریں کہ ہمارے حضور میں خاص صفت کیا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ سب انبیاء سے افضل ہیں۔

صحابہ اسی گفتگو میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا

کہ میں نے تمہاری گفتگو سنی۔ واقعی حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ وکلمۃ اللہ ہیں الا ان صاحبکم حبیب اللہ۔ اس واقعہ میں یہ تو ضرور ہے کہ حضور نے اپنی یہ خاص صفت اپنی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے بیان فرمائی۔

چنانچہ سیاق کلام اس کو مقتضی ہے مگر اس پر اشکال[1] یہ ہے کہ لغت میں تتبع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت وخلت میں خلت کا درجہ بڑھا ہوا ہے کیونکہ محبت کا اطلاق تو تھوڑی محبت پر بھی ہو سکتا ہے مگر خلت کا اطلاق جبھی ہوتا ہے جبکہ محبت خلت قلب یعنی اندرون قلب میں پہنچ جائے جس کو متنبی نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

عذل العواذل حول قلب التائه
وھوی الاحبته منه فی سودائه

(ملامت گروں کی ملامت قلب کے گرداگرد ہے اور دوستوں کی محبت سودائے قلب یعنی دل کے اندر ہے۔)

پس خلت اس درجہ کی محبت کا نام ہے جو سویدائے قلب میں پیوستہ ہو جائے۔ تو اب حضور کا یہ فرمانا کہ میں حبیب اللہ ہوں ابراہیم علیہ السلام پر آپ کی فضیلت کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ وہ خلیل اللہ ہیں اور خلت کا درجہ محبت سے بڑھا ہوا ہے۔

چنانچہ خلیل تو جس طرح معشوق کو کہتے ہیں اسی طرح اس کا اطلاق عاشق پر بھی آتا ہے بخلاف حبیب کے کہ اس کا اطلاق محض معشوق پر ہوتا ہے عاشق پر حبیب کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کو محبّ کہتے ہیں۔ پس خلیل اللہ وحبیب اللہ میں یہ فرق ہوا کہ خلیل اللہ خدا کے عاشق کو بھی کہہ سکتے ہیں اور معشوق کو بھی اور حبیب اللہ صرف محبوب ہی کو کہیں گے (گو جو خدا کا محبوب ہوگا وہ محبّ بھی ضرور ہوگا مگر) مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں محبوبیت کی شان ابراہیم علیہ السلام سے بڑھی ہوئی ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حضور میں شان محبوبی سب سے زیادہ ہے تو اب عادات پر نظر کی جائے گی عادت یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا محبوب ہوتا ہے تو محبّ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو چیز بھی عمدہ ہو اور محبوب کو دی جا سکتی ہو وہ اس کو ضرور دیتا ہے۔ دی جا سکتی ہے کی قید میں نے اس لئے بڑھائی تاکہ کوئی صاحب اس دلیل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب وخواص الوہیت کو نہ ثابت کرنے لگیں اگر کوئی ایسا کرے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ گفتگو ان امور میں ہے جو محبوب کو دیئے جا سکتے ہوں اور خواص الوہیت کا عطا بشر کو محال ہے (ورنہ یہ بھی ممکن ہوگا کہ حق تعالیٰ کسی کو خدا بنا دیں حالانکہ اس کے امکان کا کوئی بھی قائل نہیں) اور یقیناً جتنے کمالات انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے ہیں وہ سب عمدہ ہیں اور قابل

---

[1] اس اشکال کے جواب میں لوگوں نے مختلف تقریریں کی ہیں مگر سہل جواب یہ ہے کہ اس جگہ آپ نے محبت کا اطلاق معنی لغوی کے اعتبار سے نہیں فرمایا ہے بلکہ محاورات کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ پس لغۃً گو خلت محبت سے بڑھی ہوئی ہے لیکن استعمال واطلاق محاورات میں گو محبت خلت سے بڑھی ہوئی نہ ہو مگر حبیب کا صیغہ خلیل سے بڑھا ہوا ہے۔

عطا ہیں۔ تو اس قاعدہ عادیہ کی بناء پر جو کہ بمنزلہ لازم عقلی کے ہیں حق تعالیٰ نے وہ سب کمالات حضور کو کیوں نہ عطا فرمائے ہوں گے۔ پس ثابت ہو گیا کہ جو کمالات جملہ انبیاء میں منفرداً موجود ہیں وہ سب حضور میں مجتمعاً موجود ہیں۔ اسی کو کسی نے کہا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(آپ حسن یوسف علیہ السلام دم عیسیٰ علیہ السلام اور ید بیضا رکھتے ہیں جو تمام اوصاف حضرت انبیاء علیہم السلام رکھتے ہیں وہ تمام اوصاف تنہا آپ میں موجود ہیں۔)

اور چونکہ یہ مقدمات اقناعیہ ہیں۔ اس لئے اگر ان پر کچھ عقلی اشکالات واقع ہوں تو مضر نہیں۔ کیونکہ مقدمات اقناعیہ سے سامعہ کی تسلی کر دینا مقصود ہوتا ہے اس سے الزام مقصود نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس مقصود پر مقدمات عادیہ سے استدلال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور چونکہ اصل مقصود ان مقدمات پر موقوف نہیں لہٰذا ان کا اقناعی ہونا اصل مقصود کو بھی مضر نہیں۔

شاید اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنان مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ حضور میں یہ بات کہاں تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی انواع ہیں۔ حسن کی ایک نوع یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن ایسا ہی تھا۔ چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے۔ اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے تحمل سے باہر ہوتا جائے جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دل میں گھستا جائے۔ اسی کو ایک شاعر بیان کرتا ہے۔

یزیدک وجهه حسنا　　اذا ما زدته نظراً

جتنی گہری نظر سے دیکھو گے اتنا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور میں حسن میں اضافہ محسوس ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ایسا ہی تھا کہ اس میں دفعۃً متحیر کر دینے کی شان ظاہر نہ تھی (کیونکہ آپ میں خداداد عظمت وجلال کی شان ایسی تھی کہ دیکھنے والے پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے دیکھتے ہی نیا آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس کو حسن صورت پر آنکھ بھر کر نگاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی تاکہ تحیر کی نوبت آئے کما فی الحدیث علی من راٰہ بداھۃ ھابہ۔ اخرجہ الترمذی فی الشمائل جامع) البتہ جتنا کوئی زیادہ پاس رہتا اتنا ہی حضور کا حسن اس پر منکشف ہوتا تھا اور دن بدن دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا (کما فی حدیث علی المذکور ومن خالطہ بشاشتہ احبہ) یوسف علیہ السلام کے حسن پر عورتوں کا عاشق ہو جانا منقول ہے مگر فی نفسہ یہ زیادہ بعید نہیں بلکہ

فطری امر ہے جو عادت کے مطابق ہے۔ گو کسی درجہ خاص میں خارق عادت بھی ہے اور حضور پر مرد عاشق تھے جن میں[1] (بچے بھی اور) بوڑھے بھی تھے۔ مردوں کا عاشق ہونا وہ بھی (بچوں اور) بوڑھوں کا یہ فی نفسہ بھی بہت عجیب ہے۔ ایک عاشق صحابی فرماتے ہیں۔

رایته صلی الله علیه وسلم لیلة فی حلته حمراء والقمر طالع فکنت اری الی القمر مرته والی وجهه صلی الله علیه وسلم مرته فوالله کان وجهه احسن منه او کمال قال

یعنی ایک رات میں حضور کو سرخ (دھاریدار) جوڑے میں دیکھا۔ اس وقت چاند نکلا ہوا تھا تو میں کبھی آپ کے چہرہ پر نظر کرتا کبھی چاند کو دیکھتا۔ بخدا آپ کا چہرہ مبارک چاند سے زیادہ خوبصورت تھا اسی کو کسی شاعر نے عجیب لطیف عنوان سے تعبیر کیا ہے۔

گہے بروئے تو گاہے بسوئے مہ نگرم　　　کند مقابلہ چوں کس کتاب را تنہا

(یعنی کتاب کے مقابلہ کے لئے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے میں تنہا کیونکر مقابلہ کرسکتا ہوں)

ایک مرتبہ حضرت طلحہ صحابی رضی اللہ عنہ نے لڑائی میں اپنے ہاتھوں کو حضور کا سپر بنایا تھا۔ کفار کے جتنے تیر آتے تھے وہ سب کو ہاتھ پر روکتے تھے تاکہ حضور کو کوئی تیر نہ لگنے پائے۔ یہ عشق نہ تھا تو کیا تھا۔ اس کے علاوہ صحابہ کی محبت کے واقعات کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ بہت صحابہ نے آپ کی محبت میں گھر چھوڑا۔ بار چھوڑا' بیوی بچے چھوڑے' اپنے عزیزوں کو جب کہ وہ حضور کے مخالف ہوتے بے دریغ قتل کیا حتی کہ خود اپنی جانیں حضور پر نثار کردیں اور سر کٹوا دیئے۔ اسی حسن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

لو اٰی زلیخا لورائین جبینه　　　لا ثرن بقطع القلوب علی الید

زلیخا کو ملامت کرنے والی عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ دیئے تھے (حضرت یوسفؑ کے حسن و جمال کی تاب نہ لا کر اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کا نظارہ کرتیں تو بجائے ہاتھوں سے اپنے دلوں کو کاٹ ڈالتیں۔

(یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اتنی گفتگو پر کفایت کرتا ہوں اور حقیقت میں اتنا بھی میرے مذاق کے خلاف ہے۔ باقی اس باب میں تفصیلی گفتگو کرتا تو میرے مذاق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں ایہام تنقیص کا ہو جاتا ہے۔

---

[1] جیسا کہ حدیث میں دو نوجوان بچوں کا حضور کی محبت میں ابو جہل پر حملہ آور ہونا مذکور ہے۔ انہوں نے یہ سن لیا تھا کہ ابو جہل حضور کا بہت دشمن ہے اس لئے دونوں اس کے قتل کے لئے بے تاب تھے جب معرکہ بدر میں ابو جہل کی صورت پر نظر پڑی فوراً دونوں اس پر دوڑے اور ذرا سی دیر میں اس کو تہ تیغ کر دیا ۱۲ جامع۔

خاتم کمالات

دوسری دلیل اس مدعا کی آپ کی جامعیت لجمیع کمالات انبیاء علیہم السلام ہے وہ ہے جو مولانا رومی (قدس اللہ سرہ) نے خاتم النبیین سے مستنبط کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت جس طرح زمانی ہے اسی طرح آپ کو خاتمیت رتبی بھی حاصل ہے کہ کمالات انبیاء کے تمام مراتب آپ پر ختم ہوگئے ہیں۔ یعنی آپ میں تمام کمالات سب سے اعلیٰ درجہ کے مجتمع ہیں۔ مولانا نے اس مضمون کو بہت اشعار میں بیان فرمایا۔ وعظ الظہور میں وہ سب اشعار مفصل مذکور ہیں۔ اور اس سے مولانا کا یہ مقصود نہیں ہے کہ نعوذ باللہ آپ خاتم زمانی نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ خاتم زمانی ہونے کے ساتھ خاتم رتبی بھی ہیں۔ یعنی تمام مراتب کمالات آپ پر ختم ہوگئے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس تفسیر پر آپ کی خاتمیت اور زیادہ اکمل ہوگی خاتمیت زمانی وخاتمیت رتبی دونوں آپ کے لئے ثابت ہوں گی۔

یہی وہ مضمون ہے جو مولانا محمد قاسم صاحب نے ظاہر فرمایا تھا تو لوگوں نے اس پر بہت شور مچایا مگر مولانا رومی کو کوئی کچھ نہیں کہتا کیونکہ لوگ ان کو درویش سمجھتے ہیں۔ اور درویش بھی مجذوب۔ اس لئے ان سے ڈرتے ہیں۔ لوگ درویشوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ یہ زبان سے کہہ دیں گے وہی ہو جائے گا بلکہ ان کی مخالفت سے وبال آجانے کا خوف کرتے ہیں اس لئے ان پر زبان درازی نہیں کرتے۔ خصوصاً مجذوبوں پر کیونکہ سالک تو پھر کچھ سوچ سمجھ کر کہتا ہے اور مجذوب تو بے باک ہوتا ہے جو جی میں آتا ہے بے دھڑک کہہ ڈالتا ہے خواہ بددعا سے کوئی ہلاک ہی ہوجاوے۔

چنانچہ مولانا رومی نے مثنوی میں ایک جگہ اپنے کشف سے ان لوگوں کا حال بھی بیان فرمایا ہے جو مثنوی کے مضامین پر انکار کرتے تھے کہ اے حسام الدین! تو دیکھ رہے ہو کہ یہ لوگ انکار کی وجہ سے جہنم میں کس طرح گر رہے ہیں۔ اشعار میں تو صراحۃً یہ مذکور نہیں کہ مولانا نے کن لوگوں کی نسبت یہ ارشاد فرمایا ہے مگر شراح نے اس کی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ مولانا نے منکرین مثنوی کے بارہ میں یہ اشعار فرمائے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ مثنوی عام تصانیف کی طرح نہیں لکھی گئی بلکہ بطور املا کے لکھی گئی ہے کہ مولانا رومی پر کسی وقت خاص حالت ہوتی تھی۔ اس میں مولانا کی زبان پر اشعار جاری ہوتے تھے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے تھے۔ اسی طرح پوری مثنوی لکھی گئی۔ تو اس حالت میں منکرین کا واقعہ بھی منکشف ہوگیا۔ اس کو بھی بیان فرمادیا۔ واللہ اعلم۔

تو ان اشعار کو مع شرح کے دیکھ کر مولانا پر اعتراض کرنے کی لوگوں کو اور بھی جرات نہیں ہوتی۔ ڈرتے ہیں کہیں ہمارا بھی وہی حشر نہ ہو جو منکرین مثنوی کا مولانا کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس لئے ان اشعار پر کوئی

اعتراض نہیں کرتا مگر اسی مضمون کو مولانا محمد قاسم صاحب[۱] نے جو بیان فرمایا تو لگے فتوے لگنے۔

بات یہ ہے کہ لوگ علماء کے زیادہ معتقد نہیں ہوتے نہ ان سے ڈرتے ہیں اور ہمارے حضرات کو لوگ علماء ہی سمجھتے ہیں صوفی اور شیخ نہیں سمجھتے حالانکہ مولانا محمد قاسم صاحب عالم متبحر ہونے کے ساتھ بہت بڑے شیخ کامل بھی تھے مگر اچھا ہے کہ لوگ ان حضرات کو عالم ہی سمجھیں شیخ نہ سمجھیں۔ کیونکہ عوام جس کو شیخ سمجھتے ہیں اس کو بہت لپٹنے لگتے ہیں۔ ان کے پاس دنیوی قصے جھگڑے لے جاتے ہیں جس میں عارف کا وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ کیمیا گر کا تو مذاق یہی ہوتا ہے کہ کوئی اس کو کیمیا گر نہ سمجھے۔ اگر لوگ اس کے کیمیا گر نہ سمجھیں گے تو اس کو کیا نقصان ہے اگر کچھ نقصان ہے تو انہی کا ہے کہ اس کے فیوض و برکات سے محروم رہ گئے۔ عارف تو خود چاہا کرتا ہے کہ نا اہلوں کو میرے کمال کی اطلاع نہ ہو۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

مدعی سے اسرار عشق و مستی بیان نہ کرو اس کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔

غرض جو تفسیر مولانا رومی نے بیان فرمائی ہے اس پر کسی نے کلام نہیں کیا۔ اور جن لوگوں نے مولانا محمد قاسم صاحب پر اعتراض کیا ہے اگر ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ مضمون مثنوی میں بھی ہے تو ہرگز کلام نہ

---

[۱] اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو تحذیر الناس میں مضمون خاتمیت یعنی وہ مہریں (نقصان استعداد کی) جو انبیاء چھوڑ گئے تھے۔ آپ کا دین ایسا کامل ہے کہ اس کی برکت نے وہ سب نقصان اٹھا دیے۔

قفلہائے ناکشادہ ماندہ بود   از کف انا فتحنا برکشود

یعنی استعداد کے بہت سے قفل بے کھلے رہ گئے تھے انا فتحنا یعنی صاحب انا فتحنا کے دست مبارک سے کھل گئے۔ مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہر ایں خاتم شد است او کہ بجود   مثل او نے بود و نے خواہند بود

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) آپ اس سبب سے خاتم ہوئے ہیں کہ فیوض و علوم کے جود و عطا میں آپ کا مثل نہ ہوا ہوگا۔ کمالات کے تمام مراتب آپ پر ختم ہو گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خاتم زمانی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ خاتم مطلق ہیں زمانا بھی کمالا بھی۔

چونکہ در صنعت برد استاد دست   نے تو گوئی ختم صنعت بر تو است

تمثیل کے طور پر فرماتے ہیں کہ دیکھو جب کوئی استاد کسی صنعت میں سبقت لے جاتا ہے تو کیا تم اس کو یہ نہیں کہتے کہ یہ صنعت تم پر ختم ہے" یعنی ضرور کہتے ہو۔ اسی طرح خاتم النبیین میں ختم کمالات پر بھی اشارہ بعید نہیں کہ آپ پر کمالات نبوت ختم ہیں یعنی ان میں آپ کا کوئی مثل نہیں۔

پس یہ معنی ہیں خاتمیت کے اور مطلب وہی ہے کہ ختم زمانہ کے ساتھ آپ اس طرح بھی خاتم ہیں۔

در کشاد ختمہا تو خاتمی   در جہان روح بخشاں خاتمی

اول تو قوت فیضان کے اندر آپ کا خاتم ہونا ظاہر فرماتے ہیں کہ آپ ان مہروں کو کھولنے میں بھی خاتم ہیں اور روح عطا کرنے والے حضرات (یعنی انبیاء علیہم السلام) کے عالم میں آپ بمعنی خاتم کے ہیں۔ ۱۲ من الجامع

کرتے اس لئے ہمیں اپنے مدعیٰ کے اثبات میں مولانا رومی کے کلام سے استدلال کا حق ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاتمیت زمانیہ کے ساتھ خاتمیت رتبیہ بھی ثابت ہے تو معلوم ہوا کہ تمام کمالات حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہیں اور دوسرے انبیاء ان میں آپ سے مستفید ہیں۔

اولیت علیت

جب ان دلیلوں سے یہ مقدمہ ثابت ہو گیا کہ آپ جمیع کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اب میں اس دعوے کو ثابت کرتا ہوں کہ ان جمیع کمالات کا فیض حضرات انبیاء علیہم السلام کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے پہنچا ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ مصنف عبدالرزاق میں ایک حدیث ہے

یا جابر ان اللہ تعالیٰ خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نورہ (الحدیث)

اے جابرؓ! حق تعالیٰ نے سب سے پہلے تمہارے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا پھر جب اللہ تعالیٰ نے اور مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نور کے چار حصے کئے اور ایک حصہ سے قلم پیدا کیا اور دوسرے سے لوح اور تیسرے سے عرش۔ آگے طویل حدیث ہے۔ اب یہ حدیث ان الفاظ سے مشہور ہو گئی ہے اول ماخلق اللہ نوری۔ مضمون تو صحیح ہے مگر حدیث کے الفاظ یہ نہیں ہیں۔ سو اول تو اس حدیث جابر میں تصیص ہے کہ بقیہ سب مخلوقات کی تکوین میں جن میں حضرات انبیاء اور ان کے کمالات بھی آ گئے آپ کو دخل ہے اور یہی حاصل ہے استفادہ کا آپ سے۔

دوسرے یہاں بھی جس طرح مولانا رومی نے خاتمیت کی دو قسمیں کی ہیں اولیت انبیاء کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک اولیت زمانیہ کہ حضور زماناً سب سے مقدم ہیں۔ ایک اولیت ذاتیہ کہ آپ ذاتاً سب سے مقدم ہیں کہ تمام مخلوقات اپنے وجود اور کمالات میں حضور کی محتاج ہیں جن میں انبیاء بھی داخل ہیں مگر اولیت ذاتیہ کے وہ معنی مراد نہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے جس میں مقدم کی ذات مستلزم ہے متاخر کے وجود کو بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ میں اولیت زمانیہ کے ساتھ اولیت علیت بھی ہے کہ آپ دوسری مخلوق کے لئے علت ثبوت کمالات ہیں مگر نہ علت بمعنی موثر بالاضطرار بلکہ علت بمعنی توسط کے ہیں۔ جیسے فلاسفہ باری تعالیٰ کو عقل اول کے اعتبار سے مقدم بالذات کہتے ہیں کہ عقل کو مخلوق بالاختیار نہیں کہتے بلکہ مجعول بالاضطرار کہتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ سے بالاضطرار موجود ہو گئی۔ پھر وہ اپنے ماتحت کے لئے اسی طرح علت موثرہ ہے بلکہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اول مخلوق بالاختیار ہیں۔ جس سے آپ کا حدوث لازم ہے اور پھر آپ دیگر مخلوق کے وجود کمالات میں بھی اس طرح موثر نہیں ہیں محض باختیار حق واسطہ ہیں۔

غرض اس حدیث سے آپ کے دو کمال ظاہر ہوئے۔ ایک اولیت زمانیہ دوسرے اولیت بالعلیۃ۔ آپ کا زمانہ سب سے اول ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ میں استفادہ فیض وجود و کمالات وجود کی قابلیت تمام مخلوق سے زیادہ ہے اور اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ وہ قابلیت آپ کے

اندر از خود بلا جعل حق تھی بلکہ وہ قابلیت بھی آپ کے اندر مشیت الٰہی و عطاء خداوندی سے آئی ہے۔ قابلیت بھی آپ کے لئے بالاضطرار ثابت نہیں بلکہ بالقصد والاختیار ثابت ہوئی ہے۔ یہاں سے اس شعر کا اگر اس میں تاویل ہو جائے غلط ہونا واضح ہو گیا۔

نقصاں ز قابل است وگرنہ علی الدوام
فیض سعادتش ہمہ کس را برابر است

اس کا مدلول یہ ہے کہ مخلوق میں جو بعض کامل اور بعض ناقص ہیں اس اختلاف کا منشا قابل کی استعداد کا ناقص و کامل ہونا ہے ورنہ حق تعالیٰ کا فیض سعادت سب کے لئے یکساں ہے۔ گویا فیض الٰہی کی مثال نور آفتاب جیسی ہے کہ وہ تو اپنی طرف سے نور افشانی سب پر یکساں کرتا ہے کسی پر کم زائد نہیں کرتا مگر قابل کے اختلاف سے آثار تنویر مختلف ہو جاتے ہیں (کہ سیاہ توے میں تنور کی قابلیت کم ہے اس لئے وہ زیادہ روشن نہ ہو سکا اور آئینہ میں قابلیت زیادہ ہے وہ زیادہ منور ہو گیا) یہ ہے مدلول اس شعر کا۔

سو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ہر شخص میں جو قابلیت مختلف ہے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے بالاضطرار ثابت ہے۔ بالاختیار ثابت نہیں اور اسی وجہ سے باوجودیکہ سب کو فیض برابر پہنچاتے ہیں مگر کہیں زیادہ پہنچتا ہے کہیں کم۔ اور یہ لازم بالکل باطل ہے کیونکہ وہ قابلیت فی نفسہ امر ممکن ہے تو بعض ممکنات کا قدیم و مستغنی عن الجاعل ہونا لازم آئے گا جو بالکل غلط ہے۔ ممکن کوئی ایسا نہیں جو جاعل سے مستغنی ہو یا حق تعالیٰ سے بطریق ایجاب و اضطرار کے صادر ہوا ہو۔ یہ مذہب فلاسفہ کا ہے جو مادہ کو اور اس کی استعداد کو قدیم اور صادر بالاضطرار کہتے ہیں اہل اسلام کا یہ مذہب نہیں ہے اور فلاسفہ کے قول کا غلط ہونا متکلمین نے خوب ثابت کر دیا ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ نقصان کا منشاء استعداد کا نقص ہے بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہی نے کسی کی استعداد کامل اور کسی کی ناقص بنائی ہے اور وہی خود سب کو یکساں فیض پہنچانا نہیں چاہتے اگر وہ سب کو یکساں فیض پہنچانا چاہیں تو استعداد ناقص کی کیا مجال ہے جو اس کو قبول نہ کرے اس لئے صحیح مضمون اس شعر کا ہے۔

داد او را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت داد اوست

یعنی حق تعالیٰ کی عطا قابلیت پر موقوف نہیں بلکہ قابلیت خود عطا پر موقوف ہے اگر حق تعالیٰ کسی کو کمالات عطا کرنا چاہیں تو اس میں قابلیت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ مضمون نصوص پر منطبق ہے۔ آیات و احادیث اس کی تائید کرتی ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو ان سب کو ہدایت پر متفق کر دیتے)
وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا

اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب چاہتا تو زمین والے سب ایمان لے آتے۔ وغیرہ ذالک۔

اور پہلا شعر غلط ہے۔ وہ شریعت پر منطبق نہیں ہوتا۔ مولانا اسماعیل صاحب شہید نے اسی بنا پر عرفی کے اس شعر کی تغلیط کی ہے اور سنا ہے کہ تکفیر بھی کی ہے۔

تقدیر یک ناقہ نشانید دو محمل　　سلمائے حدوث ولیلائے قدم را

اس شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حدوث وقدم کی دونوں صفتیں ثابت کی ہیں۔ یہ مذہب فلاسفہ کا ہے کہ حدوث ذاتی کے ساتھ قدم زمانی ممکن کے لئے بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اہل اسلام کا یہ مذہب نہیں۔ ہمارے نزدیک تعدد ذوات قدیمہ محال ہے۔ کوئی ممکن قدیم نہیں ہو سکتا نہ بالذات نہ بالزمان۔ ہاں اگر عرفی کے اس شعر میں قدم سے معنی مصطلح مراد نہ ہوں بلکہ معنی لغوی یعنی کہنگی مراد لی جائے اور اس صورت میں تکفیر کی ضرورت نہیں بلکہ اب اس کے وہی معنی ہوں گے جو اول ماخلق اللہ نوری (سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور ا پیدا کیا) کے معنی ہیں۔

غرض آپ کا اول مخلوق ہونا آپ کی کمال قابلیت کی دلیل ہے کہ اول فیض حق تعالیٰ کا آپ کو پہنچا گو وہ قابلیت بھی بمشیت الٰہی ہے مگر حق تعالیٰ کا آپ میں ایسی قابلیت کاملہ پیدا کرنا کیا تھوڑی بات ہے یہ بہت بڑی بات ہے اور اولیت زمانیہ سے زیادہ کمال یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ بالعلت سے بھی موصوف ہیں نہ بمعنی تاثیر بالذات کے۔ بلکہ بمعنی توسط کے۔ نیز نشر الطیب کے فصل ثانی کی پہلی اور دوسری روایت میں حاکم وبیہقی وطبرانی کی تخریج سے حدیث قدسی مذکور ہے کہ اے آدم! اگر محمد نہ ہوتے تو میں تم کو بھی پیدا نہ کرتا اور رسالہ راحت القلوب میں حاکم کی روایت اور تصحیح سے اور شیخ سبکی اور بلقینی کی اس روایت کی تقریر وتثبیت سے نقل کیا ہے کہ اگر نہ پیدا کرتا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پیدا کرتا میں آدم کو اور نہ بہشت اور دوزخ کو (الحدیث)

اب سب روایات سے آپ کا واسطہ فیوض وکمالات ہونا جمیع مخلوقات کے لئے ثابت ہوا۔ امت کے لئے تو واسطہ فی العروض کے طور پر اور انبیاء کے لئے واسطہ فی الثبوت کے طور پر کیونکہ واسطہ فی العروض میں موصوف بالشئی حقیقت میں واسطہ ہوتا ہے۔ ذی واسطہ مجازاً موصوف ہوتا ہے جیسے حرکت جالس فی السفینہ کی بواسطہ سفینہ کے کہ حرکت کے ساتھ حقیقت میں صرف سفینہ موصوف ہے۔ جالس در اصل ساکن ہے مگر بواسطہ حرکت سفینہ کے جس کو بھی مجازاً متحرک کہہ دیتے ہیں اور واسطہ الثبوت کی ایک قسم میں کہ وہی مراد ہے اس مقام پر موصوف بالشئی ذی واسطہ و واسطہ دونوں حقیقۃً ہوتے ہیں جیسے ید مفتاح دونوں متحرک ہوتے ہیں۔

ذاتی اصطلاحات

پس فیوض امت کے لئے تو حضور اس قسم کے واسطہ ہیں جیسے سفینہ واسطہ ہے حرکت جالس کے لئے اور فیوض انبیاء میں آپ اس طرح واسطہ ہیں جیسے حرکت ید واسطہ ہے حرکت مفتاح کے لئے۔ خوب سمجھ لو۔

یہی بات مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمائی تھی۔ جس پر لوگوں نے اعتراض کیا اور حیرت ہے کہ اپنی جماعت کے بعض اکابر کا بھی اشکال تھا اور وجہ اشکال یہ ہے کہ مولانا نے کمالات انبیاء میں بھی

---

[۱] قلت ویمکن تاویلہ بحملہ علی نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیصح ۱۲ جامع

واسطہ فی العروض کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اور اسی کو کہیں بالذات و بالعروض سے تعبیر فرماتے ہیں۔ بعض اکابر نے مجھ سے بھی اپنا یہ اشکال بیان فرمایا کہ اس سے تو دوسرے انبیاء کا کمالات کے ساتھ موصوف نہ ہونا لازم آتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مولانا کی خاص اصطلاح ہے کہ وہ واسطہ فی الثبوت کی جگہ بھی واسطہ فی العروض ہی استعمال فرماتے ہیں۔ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور دعا دی۔

بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی جدا اصطلاح قائم کر لینے کا حق ہے لامشاحۃ فی الاصطلاح۔ مولانا کے ذمہ شیخ بوعلی سینا کی اصطلاحات کا اتباع لازم نہیں۔ ان کی یہ ذاتی اصطلاح ہے کہ واسطہ فی الثبوت کی ایک خاص قسم کو واسطہ فی العروض سے تعبیر فرماتے ہیں اور صوفیہ پر اکثر اعتراض اسی لئے ہوتا ہے کہ لوگ ان کی خاص اصطلاح سے ناواقف ہوتے ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

اصطلاحاتیست مرا بدال را

(ابدال کی خاص اصطلاحات ہوتی ہیں)

مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی میں اور مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید میں تحریری مناظرہ ہوا کرتا زبانی مناظرہ کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ تو ایک دفعہ مولوی فضل حق صاحب نے اپنے طلباء سے پوچھا کہ بھلا اگر مولوی اسماعیل صاحب سے میرا زبانی مناظرہ ہوتا تو میں کس فن میں مناظرہ کرتا طلباء نے کہا معقول میں۔ کیونکہ مولوی فضل حق معقول کے امام مشہور تھے اور واقعی اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اس لئے طلباء نے بھی یہی کہا کہ آپ معقول میں مناظرہ کرتے۔ فرمایا سبحان اللہ! میں کیا پاگل تھا کہ معقول میں ان سے مناظرہ کرتا۔ جبھی میں اپنے قول کی تائید میں کہتا کہ شیخ نے یوں کہا ہے۔ وہ جواب دیتے کہ شیخ نے جھک مارا ہم اس کے قول کو نہیں مانتے۔ طلباء نے پوچھا کہ پھر کس فن میں آپ مناظرہ کرتے؟ فرمایا میں ادب میں گفتگو کرتا۔ کیونکہ یہ علم منقول محض ہے۔ اس میں ذہانت سے کام نہیں چلتا۔ اور مولانا اسماعیل صاحب کو اس فن میں ویسا توکل نہ تھا۔ جیسا مولوی فضل حق کو تھا۔

واقعی عجیب فن چھانٹا جس میں وہی چل سکتا ہے جو حافظ اشعار و لغات ہو۔ اس میں اپنی طرف سے ایک بات بھی نہیں چل سکتی۔ ہر دعویٰ کے لئے نقل کی ضرورت ہے۔

ہمارے استاد ملا محمود صاحب ادب سے بہت گھبراتے تھے اور سب فنون پڑھاتے تھے اور بہت اچھا پڑھاتے تھے مگر ادب کی کتاب جہاں کوئی لایا صاف فرما دیتے تھے کہ میں نہیں جانتا۔ تو بات وہی تھی کہ اس فن میں حفظ و نقل کی بہت ضرورت ہے۔ مگر دیکھئے یہ بھی ان کی بے نفسی تھی کہ صاف کہہ دیتے تھے کہ مجھے یہ فن نہیں آتا۔ میں نہیں جانتا۔ بھلا آج تو کوئی اپنے طلباء سے ایسا کہہ دے۔ نہیں کہہ سکتا۔

مولانا بڑے بے نفس تھے۔ پان بہت کھایا کرتے تھے۔ سبق پڑھاتے میں بھی پان منہ میں رہتا تھا۔ اس لئے تقریر خود کم کرتے تھے بس طالب علم نے تقریر کی اور آپ نے ہوں کر دیا۔ بعض دفعہ کوئی شریر طالب علم ایک بار صحیح تقریر کر کے دوبارہ غلط مطلب بیان کرتا تو آپ غلط پر بھی ہوں کر دیا کرتے تھے۔

چنانچہ ایک بار آپ مدرسہ سے گھر جا رہے تھے ایک کاشغری طالب علم کوئی بات پوچھنے کے لئے ساتھ ہولیا۔ اس نے تقریر کی آپ نے ہوں کر دیا۔ اس نے شرارت سے پھر دوبارہ غلط تقریر کی آپ نے اس پر بھی ہوں کر دیا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ کہ ہوں ہوں کرتا ہے۔ بتلاتا نہیں۔ اس وقت آپ کو ہنسی آ گئی اور پان تھوک کر فرمایا کہ گدھے کے پلے تو ہی تو خود تقریر کر رہا تھا۔ تو نے مجھ سے کب کہا تھا کہ تم تقریر کرو اب تو نے کہا تو میں تقریر کروں گا۔ پھر آپ نے صحیح مطلب بیان فرمایا۔

مولانا صاحب کسی پر غصے ہوتے تو گدھے کا پلہ فرمایا کرتے۔ طلبہ کہتے کہ حضرت گدھے کا بھی کہیں پلہ ہوتا ہے۔ پلہ تو کتے کا ہوتا ہے۔ بہت ہی بے نفس اور بھولے تھے مگر علوم میں بہت خوب استحضار تھا۔

غرض دیکھئے مولوی فضل حق صاحب نے منطق کی حقیقت ظاہر کر دی کہ اگر میں مولوی اسماعیل صاحب سے منطق میں مناظرہ کرتا تو وہ ایک بات کہہ کر میرے تمام دلائل کو اڑا دیتے کہ شیخ نے جھک مارا۔ ارسطو نے غلط کہا۔ اسی طرح مولانا محمد قاسم صاحب اصطلاح فلاسفہ کے پابند نہ تھے۔ ان کی یہ الگ اصطلاح تھی کہ وہ واسطہ فی الثبوت کو واسطہ فی العروض فرماتے ہیں۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کمالات انبیاء میں واسطہ فی الثبوت ہیں اس لئے جتنے کمالات انبیاء میں موجود ہیں وہ سب آپ میں مجتمع ہیں اور آپ ہی سے انبیاء کو حاصل ہوئے ہیں۔ اس کی مزید تائید نشر الطیب کی چھٹی روایت منقولہ من المواہب سے ہوتی ہے کہ امام محمد باقر فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے عالم میثاق میں یہ اقرار لیا کہ الست بربکم سب سے پہلے آپ ہی نے فرمایا۔ بلیٰ۔ گویا اور حضرات اس جواب کی آپ سے تلقی کی۔

رسالہ مذکورہ کی ساتویں روایت میں مواہب سے حضرت عباس کے اشعار میں کہ تقریر نبوی سے وہ حجت ہیں۔ سفینہ نوح علیہ السلام کی سلامتی اور نار نمرود میں حضرت ابراہیم کی حفاظت کا آپ کی برکت سے ہونا مذکور ہے۔ اسی کا خلاصہ صاحب قصیدہ بردہ نے اس شعر میں کہا ہے۔

وکل ای اتی الرسل الکرام بھا   فانما تصلت من نورہ بھم

اور ہر معجزہ جس کو رسولان کرام علیہم السلام لائے سوائے اس کے نہیں کہ وہ معجزہ صرف بدولت حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچا ہے۔

ان سب دلائل سے آپ کی ذات مقدسہ میں جمیع کمالات انبیاء کا اجتماع اور دوسرے حضرات میں آپ کے واسطہ سے پہنچنا اچھی طرح ثابت ہو گیا۔

عکس فیوض قلب

شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں معجزہ عصا کہاں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب ومجاورت سے ایک سوکھی لکڑی میں حیات پیدا ہوگئی تھی جس سے ٹیک لگا کر آپ خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ جب ممبر نبوی تیار ہوگیا اور آپ پہلی جگہ سے ہٹ کر ممبر پر تشریف فرما ہوئے تو اثناء خطبہ میں اس سوکھی لکڑی کے اندر بہت زور سے رونے کی آواز نکلنے لگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر سے اتر کر اس کے پاس تشریف لائے اور اس کی تسلی فرمائی تو وہ آواز آہستہ آہستہ کم ہونے لگی جیسے بچہ روتے ہوئے سسکتا ہے۔

اور کمال یہ کہ اس واقعہ میں استن حنانہ میں بصورت جمادیت ہی صورت وحیات پیدا ہوگئی۔ صورت حی میں منقلب ہونے کے بعد آثار حیات کا ظہور نہیں ہوا اور یہ معجزہ عصا سے زیادہ عجیب ہے کیونکہ عصائے موسوی میں آثار حیات کا ظہور بانقلاب صورت شکل اژدہا میں ہوتا تھا۔ اور یہ گو بڑا خرق عادت ہے مگر واقعہ میں استن حنانہ اس سے زیادہ عجیب ہے۔ پس حضور میں معجزہ عصا کا وجود واقعہ استن حنانہ سے ثابت ہوگیا۔

پھر میں وہی کہتا ہوں کہ اسباب میں تفصیلاً گفتگو نہ کرنا چاہئے مگر اتنے پتے کے طور پر میں نے ایک مثال بیان کر دی ہے جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اگر غور کیا جائے گا تو حضور میں وہ سب کمالات مجتمعاً معلوم ہو جائیں گے جو حضرات انبیاء میں منفرداً منفرداً موجود تھے اور ان کو حضور ہی کے واسطہ سے وہ کمالات حاصل ہوئے ہیں اور گو یہ کمالات انبیاء علیہم السلام میں حقیقی ہیں مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ آپ میں وہ کمالات اوروں سے اقوی واکمل ہیں اور اجمالاً اتنا کہنے کا ہمیں حق حاصل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء ہونا مجتمع علیہ ہے۔ باقی کمالات امت کے واسطے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم واسطہ فی العروض ہیں۔ اس لئے یہاں وہ مثال نہیں ہے جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو کر مستقل ہو جاتا ہے بلکہ یہاں وہ مثال ہے جیسے گھر میں چراغ روشن ہونے سے در ودیوار منور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ در ودیوار میں روشنی کوئی مستقل نہیں ہے۔ وہی ہے جو چراغ میں ہے۔ چنانچہ وہاں سے اگر چراغ کو اٹھا لیا جاوے تو در ودیوار سب تاریک ہو جائیں گے۔ اسی طرح امتی کے اندر جو کمالات ہیں وہ محض آپ کے فیوض کا عکس ہے کوئی مستقل کمال نہیں۔ اگر وہ اپنے کو صاحب کمال مستقل سمجھنے لگے تو کورا رہ جائے گا۔

جیسا ایک کاتب وحی کا قصہ ہے۔ جس کا نام عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تھا۔ حضور کی برکت صحبت سے اس میں یہ بات پیدا ہوگئی کہ ایک مرتبہ آپ نے اس کو قرآن شریف کی یہ آیت لکھنے کا امر فرمایا جو اسی وقت نازل ہوئی تھی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿١٢﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ
مَّكِيْنٍ ﴿١٣﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ
عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا اور پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ ایک محفوظ مقام میں رہا پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا پھر ہم نے اس ہڈی پر گوشت چڑھایا پھر ہم نے اس کو ایک دوسری ہی مخلوق بنا دیا پس کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تک پڑھنے پائے تھے کہ اس کا اخیر جزو بے ساختہ کاتب کی زبان پر جاری ہو گیا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ حضور نے فرمایا لکھو یہی وحی میں بھی ہے تو یہ کیا تھا۔ حضور کے فیوض قلب کا عکس تھا کہ اس شخص کے دل پر حضور کے قلب کا عکس پڑ گیا اور فی الجملہ وحی سے مناسبت ہو گئی کہ از خود اس کے دل میں آیت کا اخیر لفظ آ گیا۔ مگر وہ شخص سمجھا کہ بس میں بھی ہو گیا مجھ پر بھی وحی آنے لگی۔ کم ظرف اور کم حوصلہ تھا کہ اتنی بات پر آپے سے باہر آ گیا اور مدعی نبوت بن کر مرتد ہو گیا اور حضور سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔ یہ نہ سمجھا کہ یہ حضور ہی کا فیض تھا ورنہ مرتد ہونے کے بعد اس نے قرآن کی مثل کوئی جملہ کیوں نہ بنا لیا۔ بس آپ سے تعلق قطع کرتے ہی کورا ہو گیا۔ اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

(اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ تہمت لگائے یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آئی اور جو شخص یوں کہے کہ جب کلام اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اسی طرح کا کلام میں بھی لاتا ہوں۔)

یہ شخص ایک جملہ ہی کے توارد پر آپے سے باہر ہو گیا کیونکہ کم ظرف تھا۔

برکت صحبت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بارہا ایسا قصہ پیش آیا کہ وحی سے ان کو توافق ہو گیا۔ بعض دفعہ تو وحی ان کی رائے کے موافق نازل ہوئی اور بعض دفعہ بلفظہٖ توافق ہوا کہ وحی انہیں الفاظ میں نازل ہوئی جو حضرت عمر کی زبان سے نکلے تھے مگر ان کو ایک دفعہ بھی یہ خیال نہ ہوا کہ میں کچھ ہوں اور مجھ پر بھی وحی آتی ہے بلکہ وہ اس کی حقیقت کو سمجھتے تھے کہ یہ محض حضور کی صحبت کی برکت ہے جو ہمارے قلب میں تھوڑی سی نورانیت حضور کے طفیل سے پیدا ہو گئی ہے کہ بعض دفعہ وہی بات دل میں آ جاتی ہے جس کے موافق وحی نازل ہونے والی ہے بلکہ حضرت عمر کو اس پر ناز تو کیا ہوتا بعض دفعہ کسی واقعہ میں جب ان کی رائے میں اور حضور کی رائے میں اختلاف ہوتا اور وحی حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق نازل ہوتی تو حضرت عمر بجائے خوش ہونے کے شرمندہ ہوتے اور کئی کئی دن تک شرمندہ رہتے۔

چنانچہ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) کے قصہ موت میں حضرت عمر نے حضور سے گفتگو کی تھی کہ آپ اس منافق کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ان منافقوں کی بابت آپ کتنا ہی استغفار کریں ہم ان کی مغفرت ہرگز نہ کریں گے (اور نماز جنازہ کی حقیقت دعاؤ استغفار ہی ہے تو ان کے لئے دعا نہ کرنا چاہیے) حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواہ ان کے لئے استغفار کریں یا ان کے لئے استغفار نہ کریں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا۔)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر! اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے صراحۃ ان کے لئے استغفار کرنے سے منع نہیں فرمایا اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے ستر سے زیادہ استغفار کرنے سے حق تعالیٰ بخش دیں گے تو میں ستر سے زیادہ استغفار کرلوں گا۔ اس گفتگو کے بعد آپ نے نماز جنازہ پڑھادی۔ وہاں سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ وحی نازل ہوئی۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۚ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ

(اور ان میں اگر کوئی مر جائے اور اس پر کبھی نماز (جنازہ) نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوجئے انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ حالت کفر میں مرتے ہیں۔)

جس میں حضرت عمر کی رائے کی پوری موافقت تھی۔ حضور نے حضرت عمر سے فرمایا کہ اے عمر! حق تعالیٰ نے تمہاری رائے کو قبول فرمایا۔ حضرت عمر بہت ہی شرمندہ ہوئے کہ یہ کیا ہوا۔ میں نے حضور سے کیوں اختلاف کیا تھا۔ روایات میں حضرت عمر کا قول آتا ہے۔

فعجبت من جراءتی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رواہ البخاری

(پس مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس جرات پر حیرانی ہوئی۔)

بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو عبداللہ بن عمر سعد بن ابی سرح کے واقعہ میں توافق بالوحی نہ تھا کیونکہ وہاں وحی نازل ہو چکی تھی صرف انعکاس تھا کہ آپ کے دل میں جو الفاظ منزلہ موجود تھے ان میں سے ایک جملہ اس کے قلب میں آ گیا اور یہ کچھ زیادہ عجیب بات نہیں۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے دل میں جو بات ہوتی ہے پاس بیٹھنے والے پر اس کا عکس پڑ جاتا ہے اور اس کی زبان سے وہی بات نکل جاتی ہے جو پہلے شخص کے دل میں تھی۔ چنانچہ ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ میاں تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ۱۲ جامع) اور حضرت عمر کے واقعہ میں وحی اب تک نازل بھی نہ ہوئی تھی۔ واقعہ

اختلاف کے بعد وحی نازل ہوئی جو ان کی رائے کے مطابق تھی اور بعض دفعہ تو الفاظ بھی وہی ہوتے تھے مگر ان کو ایک دفعہ بھی اس پر ناز نہ ہوا بلکہ اس کو حضور ہی کی صحبت کی برکت سمجھتے تھے۔

غرض امتی اپنے کو مستقل سمجھنے سے بالکل کورا رہ جائے گا۔ سارے کمالات سلب ہو جائیں گے جیسا ابن ابی سرح کے واقعہ میں ہوا۔ پس کمالات امت کے لئے آپ واسطہ فی العروض ہی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الثبوت ہیں۔

غلبہ رحمت

مقصود تو اس سے حاصل ہو گیا مگر یہاں ایک اشکال طالب علمانہ رہ گیا۔ ساتھ میں اس کو بھی حل کئے دیتا ہوں۔ اشکال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں) کو تخییر پر محمول فرمایا۔ حالانکہ سیاق کلام سے یہ جملہ تسویہ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ چاہے آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ استغفار کریں۔ اگر آپ ستر دفعہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ ان کی مغفرت کبھی نہ کریں گے۔ یعنی دونوں باتیں ان کے حق میں مساوی ہیں۔ چنانچہ اہل محاورات اس کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیز اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً (خواہ ان کے لئے ستر بار استغفار کریں) میں عدد سبعین سے کثرت مراد ہے عدد خاص مراد نہیں اور مطلب یہ ہے کہ چاہے آپ کتنا ہی استغفار کریں ان کی مغفرت نہ ہوگی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ میں ستر سے زیادہ استغفار کروں گا اس کی کیا وجہ ہے آپ تو افصح العرب ہیں۔ آپ نے آیت کو تخییر پر اور عدد کو تحدید پر کیوں محمول فرمایا۔

اس اشکال کا جواب شافی میں نے منقول تو دیکھا نہیں اور نہ کتابوں پر میری نظر زیادہ ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے میں نے جو جواب سنا ہے وہ بیان کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ نقل سے بھی اس کی تائید ہو جائے اور اگر نقل سے تائید نہ بھی ہو تو حضرت مولانا کو حق تعالیٰ نے فن تفسیر سے خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ ان کے جواب کو ہم حجت سمجھتے ہیں۔ مولانا نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ بے شک اسلوب کلام تو تسویہ ہی کے لئے ہے اور عدد سبعین سے بھی خصوصیت عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت رحمت کا حال غالب تھا۔ غلبہ رحمت سے آپ نے صورت کلام سے تمسک فرمایا تو اس جواب سے اشکال تو رفع ہو گیا مگر اس سے صوفیہ کے ایک قول کو مقید کرنا پڑے گا۔ وہ یہ کہ صوفیہ کا قول ہے کہ کاملین پر غلبہ حال نہیں ہوتا تو اس میں یہ قید لگانا پڑے گی یعنی اکثر نہیں ہوتا کبھی کبھی ہوتا ہے اور یہ تقیید محض مولانا کے جواب کی وجہ سے نہیں بلکہ احادیث صحیحہ اس کی تائید کرتی ہیں۔

چنانچہ واقعہ بدر میں جب مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہونے والا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس

وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عریش مبارک میں نہایت الحاح کے ساتھ وعدہ فرمارہے تھے کہ اے اللہ! اپنے وعدہ نصر کو پورا فرمایئے اور مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمایئے حتیٰ کہ جوش میں یہ بھی فرمایا۔

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لم تعبد بعدالیوم (الصحیح لمسلم: ۱۳۸۳ مسند الإمام أحمد ۱: ۳۲ إتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۹، ۲۲۸)

(اے اللہ! اگر یہ تھوڑی سی جماعت (مسلمانوں کی) ہلاک ہوگئی تو پھر زمین میں آپ کی عبادت نہ ہوگی)

اللہ اکبر! خدا تعالیٰ سے یہ کہا جارہا ہے کہ اگر مسلمان اس واقعہ میں مغلوب ہوگئے تو پھر کوئی آپ کا نام نہ لے گا۔ صاحبو! یہ کیا تھا۔ علماء قشر تو تھک جائیں گے تاویلیں کرتے کرتے مگر ان سے کچھ جواب نہ آئے گا۔ ہاں صوفیہ اس کا جواب نہایت سہولت سے دے دیں گے کہ اس وقت آپ پر غلبہ حال تھا۔ مقام ناز کی کیفیت غالب تھی لیجئے سارا اشکال مرتفع ہوگیا۔ مگر یہ جواب اس کو مقتضی ہے کہ صوفیاء کے اس قول مشہور کو مقید کیا جائے۔

محرومی ایمان کا اثر

اب ایک اشکال اور رہ گیا۔ وہ یہ کہ ہم نے تسلیم کیا کہ آیت کی صورت تخییر کو متحمل تھی مگر اس سے محض جواز معلوم ہوا وجوب تو نہیں معلوم ہوا۔ تخییر سے جس طرح منافقین کی نماز پڑھنے کا جواز نکلتا ہے ترک صلوٰۃ کا جواز بھی نکلتا ہے۔ پھر حضور نے صلوۃ کو ترک صلوۃ پر کیوں ترجیح دی۔ آپ نے نماز پڑھی کیوں۔ اس کے لئے کوئی مرجح بتلانا چاہئے ورنہ آپ کے فعل کا عبث ہونا لازم آئے گا۔

اس کا جواب ایک تو مورخین نے دیا ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے سخت ترین دشمن پر یہ رحمت وشفقت دیکھ کر بہت لوگ مسلمان ہوگئے تھے تو گویا آپ کے فعل میں یہ فائدہ اور یہ حکمت تھی اور دشمنوں کو یہ دکھلانا منظور تھا کہ رسول کو اپنے نفس کے لئے کسی سے بھی عداوت نہیں ہے بلکہ وہ دل سے اپنے دشمنوں کے لئے بھی رحمت ومغفرت کے خواہاں ہیں (جب تک حق تعالیٰ ممانعت نہ فرمادیں) اگر نفس کے لئے کسی سے آپ کی دشمنی ہوتی تو عبداللہ بن ابی کے کفن میں اپنا قمیص مبارک ہرگز نہ دیتے نہ اس کی نماز پڑھتے نہ دفن میں شریک ہوتے کیونکہ شرعاً آپ کے ذمہ ان میں سے ایک کام بھی نہ تھا مگر آپ نے شفقت ورحمت سے سب کچھ کیا اور اس کی دشمنی پر کچھ بھی التفات نہیں فرمایا۔

ایک جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے دیا کہ حضورؐ نے عبداللہ بن ابی کے واقعہ میں اس مسئلہ کو حل فرمایا ہے کہ تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے بدوں ایمان کے سب بے کار ہیں۔ چنانچہ دیکھو لوکہ ابن ابی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہوگئے تھے۔ حضور نے اپنا قمیص مبارک اس کے کفن میں دیا۔ بھلا یہ بات

کس کو نصیب ہوتی ہے۔ آج کل کوئی بہت کرے گا غلاف کعبہ کا ٹکڑا رکھ دے گا۔ مگر غلاف کو حضور کی قمیص سے کیا نسبت۔ حضور کا جسد اطہر عرش و کعبہ سب سے افضل ہے اور اگر غلاف کعبہ کو قمیص نبوی کے برابر مان بھی لیا جائے تو یہ دولت کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ حضور کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑے۔ عبداللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ نے اپنا لعاب بھی اس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ وہ تو آپ کا جزو تھا جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ تھی۔ پھر آپ نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی گویا اس کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ ((۱)سنن الترمذی: ۱۹۵۵، مشکوۃ المصابیح: ۳۰۲۵، کنز العمال: ۶۳۴۳، مسند الإمام أحمد ۲: ۲۵۸، ۳: ۳۳۲: ۲۷۸، ۸: ۱۸۱، ۱۸۲ (۲) الأسرار المرفوعة لعلی القاری ۸۳، ۲۹۲.) بھلا یہ شرف آج کس کو نصیب ہو سکتا ہے کہ حضور صحابہ کو لے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبداللہ بن ابی کو ان تبرکات سے کچھ بھی نفع نہ ہوا کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا۔ حق تعالیٰ نے صاف فرما دیا۔

إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ

(انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ حالت کفر ہی میں مرے ہیں۔)

کرامات اولیاء

غرض حضرت عمر کے قصہ پر یہ سارا بیان چل پڑا تھا۔ اس کے قبل میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور سے جدا اور مستقل ہو کر رہنے سے امتی تمام کمالات سے کورا ہو جاتا ہے اور آپ کی بڑی شان ہے۔ حضرات اولیاء اللہ سے بھی گستاخی کے ساتھ تعلق قطع کرنا سلب فیوض و برکات و سلب نسبت بلکہ بعض دفعہ سلب ایمان کا سبب ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بھی اپنے مستفیدین کے لئے واسطہ فی الفیوض ہوتے ہیں اور واسطہ کے ساتھ گستاخی عادت الٰہی کے موافق گستاخ کو تمام فیوض سے کورا کر دیتی ہے۔

راز اس میں یہ ہے کہ اولیاء کے کمالات جیسا کہ اوپر مذکور ہوا بعینہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ہیں۔ چنانچہ علماء نے کہا بھی ہے کہ اولیاء کے کرامات حضور کے معجزات ہیں جو ان اولیاء میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پس جس شخص نے اس ولی کو جزماً یا احتمالاً صاحب کمال مان لیا اس کے کمال کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مان لیا۔ پس اس کمال کی بے ادبی کرنا حضور کے ساتھ بے ادبی کرنا ہے۔ ہاں اگر کسی وجہ شرعی سے اس کو صاحب کمال ہی نہ مانے تو وہاں یہ علت جاری نہیں ہوگی۔

چنانچہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ اپنی جوانی میں ایک بزرگ کی زیارت کو جا رہے تھے۔ ساتھ میں دو آدمی اور تھے۔ آپس میں گفتگو ہوئی جس طرح راستہ طے کرنے والے رفیقوں میں ہوا کرتی ہے کہ بھائی تم ان بزرگ کے پاس کس غرض سے جا رہے ہو۔ ایک شخص نے تو کچھ دنیوی غرض بتلائی کہ میں اپنے لئے فراخی رزق وغیرہ کی دعا کروں گا۔ دوسرے شخص نے جو کہ عالم تھا اور اس کا نام

ابن السقا تھا کہا میں تو ان بزرگ کا امتحان کرنے جارہا ہوں کہ دیکھوں یہ خالی بزرگ ہی ہیں یا کچھ علم سے بھی تعلق ہے۔ میں ان سے ایسے پیچیدہ سوالات کروں اگر جن کا جواب نہ بن پڑے پھر حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے ان دونوں نے پوچھا کہ صاحبزادے تم کس کام کے لئے جارہے ہو فرمایا کہ میں تو صرف اس لئے جارہا ہوں کہ یہ بزرگ اللہ کے مقبول بندے ہیں شاید ان کی زیارت سے ہمارے نفس کی اصلاح ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا ہمارے حال پر فضل ہو جائے۔

غرض تینوں ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کو کشف سے ان تینوں کی نیت کا حال پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا ابھی یہ لوگ کچھ عرض کرنے بھی نہ پائے تھے کہ شیخ نے خود ہی سب کے سوالات کا جواب دے دیا جو شخص دنیوی غرض سے آیا تھا اس سے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سونے چاندی کے ڈھیر تیرے پیروں کے نیچے ہوں گے (گویا اس کا مقصود پورا ہو گیا) ابن اسقا سے فرمایا کہ تیرا ایک سوال یہ ہے اور اس کا یہ جواب اور دوسرا یہ ہے اور اس کا یہ جواب۔ سوالوں کے جواب تو یہ ہیں مگر مجھے تیرے چہرہ پر آثار کفر نظر آ رہے ہیں۔ اور میں وہ حالت دیکھ رہا ہوں جب کہ تو اسلام سے مرتد ہو جائے گا۔

چنانچہ یہ شخص ایک مرتبہ خلیفہ وقت کی طرف سے ہرقل کے پاس کوئی پیام لے کر گیا تھا۔ بہت بڑا عالم تھا کہ خلیفہ نے سفارت کے لئے اس کو منتخب کر رکھا تھا مگر اس نے ان بزرگ کے ساتھ گستاخی کی نیت کی تھی اس کے وبال میں ہرقل کے پاس جا کر اس کی کسی لڑکی پر فریفتہ ہو کر اس کے عشق میں نصرانی ہو گیا اور اسی حالت میں مرا۔ نعوذ باللہ منہ۔

اور حضرت عبدالقادر رحمۃ اللہ سے فرمایا کہ مجھ کو یہ بات نظر آ رہی ہے کہ تم منبر بغداد پر بیٹھے ہوئے یہ کہہ رہے ہو۔

قدمی هذه علی رقاب کل اولیاء الله

اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اولیاء اللہ کی گردنیں اس وقت جھک رہی ہیں کتنا صحیح کشف تھا۔ کیونکہ یہ بات انہوں نے ایسے وقت میں فرمائی تھی کہ اس وقت حضرت شیخ عبدالقادر بالکل بچے نوجوان تھے۔ اس کا کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کسی وقت اس درجہ کو پہنچیں گے مگر کشف بالکل صحیح تھا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا جس کا واقعہ مشہور ہے کہ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ منبر بغداد پر بیٹھے ہوئے ایک دن وعظ فرما رہے تھے کہ اثنائے وعظ میں جوش آیا اور فرمایا **قدمی هذه علی رقاب کل اولیاء الله**۔ اس وقت جتنے اولیاء زمین پر تھے سب نے اس آواز کو سنا اور گردنیں جھکا دیں بلکہ بعض نے گردن جھکا کر یہ بھی کہا بل **علی راءسی و عینی**۔ یہ ویسا ہی قصہ ہوا جیسا کہ حضرت خلیل اللہ کی آواز کو حق تعالیٰ نے تمام عالم میں پہنچا دیا تھا۔ کہ ارواح نے اپنے باپ و ماں کی پشت اور رحم میں سے جواب دیا۔ لبیک لبیک۔ اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادر کی وہ آواز خلیل اللہ آواز تھی جس کو تمام عالم کے اولیاء وقت نے سنا۔ خدا تعالیٰ نے سب کو آواز پہنچا دی۔

اہمیت اقرار رسالت

پس جب اولیاء سے قطع تعلق کا یہ اثر ہے تو حضور سے قطع تعلق کرنے والا تو کیوں کر کمالات سے کورا نہ رہ جائے گا۔ مگر اتنا فرق ہے کہ اولیاء سے تو قطع مطلقاً سلب کمالات کا سبب نہیں۔ جب گستاخی کے ساتھ قطع تعلق کرے اس وقت وبال پڑتا ہے اور حضور سے تعلق قطع کرنا مطلقاً سلب فیوض وکمالات کا سبب ہے اگرچہ گستاخی بھی نہ کرے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو محض توحید کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں تصدیق رسالت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ افسوس مسلمانوں میں بھی بعض لوگ ایسے پیدا ہوگئے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تعلیم کے لئے آئے تھے تو جو شخص توحید کا اقرار کرلے وہ نجات پالے گا گو حضور کی رسالت کا اقرار نہ کرے یاد رکھو یہ قول بالکل باطل ہے نجات بدوں تصدیق رسالت کے ہرگز نہیں ہوسکتی۔ جس طرح توحید رکن ایمان ہے اسی طرح تصدیق رسالت بھی رکن ایمان ہے۔ ان لوگوں نے اس آیت سے دھوکہ دینا چاہا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ (الآیۃ)

جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی اور نصرانی ہیں اور جو صابی ہیں (ان میں سے) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس حق الخدمت بھی ہے اور (وہاں) ان پر کسی طرح اندیشہ بھی نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

اس آیت میں تصدیق رسالت کا ذکر (ظاہرا) نہیں ہے بلکہ سب فرقوں کے نجات کا مدار صرف ایمان باللہ وایمان بالآخرۃ کو قرار دیا گیا ہے اس سے بعض لوگوں نے اس غلطی میں ڈالنا چاہا کہ نجات کے لئے تصدیق رسالت محمدیہ کی ضرورت نہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ ایمان باللہ بغیر تصدیق رسالت محمدیہ کے متحقق ہی نہیں ہوسکتا۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تصدیق رسالت کا ذکر نہیں۔ تفصیل اس جواب کی وہ ہے جو میں نے ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کہلا کر بھیجی تھی وہ بندہ خدا بھی اسی غلطی میں مبتلا تھے۔ ویسے بڑے نیک پابند صوم وصلوٰۃ تھے مگر شیطان نے ان کے دل میں یہ وسوسہ ڈال رکھا تھا کہ نجات کے لئے ایمان باللہ کافی ہے تصدیق رسالت کی ضرورت نہیں۔

واقعی بدوں علم دین کے کامل اصلاح نہیں ہوتی۔ عقائد بھی درست نہیں ہوتے۔ افسوس آج کل لوگوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم سمجھ لیا ہے۔ بس وہ ایسا علم ہے جس سے روپیہ پیسہ معلوم ہوجاتا ہے۔ خدا اس سے معلوم نہیں ہوسکتا۔

میں نے ان ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کہلا کر بھیجا کہ ایمان باللہ کے صرف یہی معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو موجود مان لے کیونکہ وجود کا انکار تو مشرکین بھی نہیں کرتے بلکہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفات کمال سے متصف اور صفات نقص سے منزہ سمجھے۔ اب میں کہتا ہوں کہ صفات کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے جس کے ساتھ خدا تعالیٰ کو موصوف ماننا توحید کے لئے ضروری ہے۔ اور صفات نقص میں سے ایک صفت کذب بھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں محمد رسول اللہ (اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے) تو اس خبر کو سچا سمجھنا واجب ہے پس جو آپ کو رسول نہیں مانتا وہ خدا تعالیٰ کو کاذب کہتا ہے جب کاذب کہا تو پھر اللہ پر کہاں ایمان لایا؟ پس ثابت ہو گیا کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانا بدوں تصدیق رسالت کے ممکن نہیں۔ میں نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ جواب کے لئے دس سال کی مہلت ہے۔ اس دلیل کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ پھر خدا نے کیا ان کی اصلاح ہو گئی۔ بعد میں مجھ سے ملے بھی تھے اس وقت ان کا شبہ رفع ہو چکا تھا بیچاروں کا خاتمہ اچھا ہوا۔ پس خوب سمجھ لو کہ بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے نجات ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ایک فلسفی کی بابت ایک شخص نے خواب دیکھا تھا۔ میں اس فلسفی کا نام بتلانا نہیں چاہتا۔ خواہ مخواہ ایک مسلمان سے خواب کی بناء پر کفر کی بدگمانی ہو جائے گی مگر اس شخص کے خیالات تھے فلسفیانہ گو ظاہر میں مسلمان کہلاتا تھا۔ خواب یہ تھا کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو اس نے حضور سے دریافت کیا کہ حضور فلاں شخص کا کیا حال ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ بدوں میرے توسط کے جنت میں جانا چاہتا تھا اور جنت کے قریب بھی پہنچ گیا تھا۔ مگر میں نے ہاتھ پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا کہ دور ہو کمبخت جنت میں بغیر میرے تعلق کے کوئی نہیں جا سکتا۔

غرض آپ امت کے لئے واسطہ فی العروض ہیں تمام کمالات وفیوض میں۔ بدوں آپ کے واسطے کے کوئی شخص بھی کمالات بلکہ ایمان سے بھی موصوف نہیں ہو سکتا۔ اسی کو حضرت سعدی فرماتے ہیں۔

مسند سعدی کہ راہ صفا　　تواں رفت جز بر پے مصطفا
خلاف پیمبر کسے راہ گزید　　کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

سعدیؒ یہ گمان نہ کرو کہ صاف راستہ سوائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چل سکو گے جس شخص نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کیا وہ ہرگز منزل مقصود کو نہ پہنچے گا۔

یہ تو ان کے واسطے ہے جو بدوں حضور کے تعلق کے راستہ کو قطع کرنا چاہیں اور تعلق والوں کے واسطے انشاء اللہ یہ ہو گا۔

نماند بعصیاں کسے در گرو　　کہ دارد چنیں سید پیشرو

دوزخ میں گناہوں کی وجہ سے کوئی شخص نہ رہے گا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ہو۔ اور یہ ہوگا

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا　　من العنایة رکنا غیر منهدم

(اے گروہ اسلام ہمارے لئے خوشخبری ہے عنایت الٰہی ہمارے لئے ایسا ستون ہے جو منہدم نہ ہوگا)

ہمارے پاس خدا کے فضل سے ایک مضبوط رکن ہے۔ انشاء اللہ ہم بے کھٹکے پار ہو جائیں گے اور جن کے پاس یہ واسطہ نہیں ہے اوران کی محرومی پر افسوس ہے۔

اتباع انبیاء

پس یہ مسئلہ خوب متحقق ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے واسطہ فی العروض ہیں اور امتی کے اندر اس وقت تک کچھ فیوض و برکات ہیں جب تک حضور سے تعلق توسط ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ باقی انبیاء علیہم السلام کے لئے آپ واسطہ فی الثبوت ہیں کہ وہ آپ سے فیوض حاصل کر کے استقلال کی ایسی شان اپنے اندر رکھتے ہیں جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو جاتا ہے اور بظاہر اس کا مقتضا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو آپ سے تعلق رکھنے کی ضرورت نہ ہو۔ وہ آپ سے تعلق قطع کر کے بھی منور رہ سکتے ہیں۔ مگر ایک دوسری دلیل سے ان کے لئے بھی آپ سے تعلق رکھنا ضروری وہ یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ لنَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ

(یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا ہے کہ اگر ہم تم کو کتاب وحکمت دیں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو تمہاری کتاب کا مصداق ہو تو تم اس کی تصدیق ونصرت ضرور کرنا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جو مفسر القرآن ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا بھی فرمائی ہے۔ **اللهم علمه الكتاب** (اے اللہ انہیں کتاب اللہ کا علم عطا فرما) اس لئے ان کی تفسیر حجت ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ عہد جملہ انبیاء سے حضور کے متعلق لیا گیا ہے کہ جو نبی حضور کا زمانہ پائے اس کے ذمہ ضروری ہے کہ آپ کی تصدیق ونصرت کرے۔ پھر یہ بات ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نے بھی آپ کا زمانہ نہیں پایا تو یہ عہد ان سے کیوں لیا گیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت اور ہر زمانہ میں حضور کے اتباع وتصدیق کے لئے تیار رہنا چاہئے خواہ وہ آپ کا زمانہ پائیں یا نہ پائیں مگر اپنی طرف سے ہر وقت اس کے لئے آمادہ رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بھی حضور سے کسی وقت اپنے تعلق کو قطع نہیں کر سکتے۔

دوسرے اگر یہ عہد بھی نہ لیا جائے جب بھی انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق قطع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مسئلہ شرعیہ اصلیہ ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ

(جس نے (ان) لوگوں کا شکر نہیں کیا (جو واسطہ نعمت ہیں) اس نے خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کیا)

اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الکمالات ہیں گو فی الثبوت سہی تو اس قاعدہ کے موافق انبیاء علیہم السلام حضور سے کبھی تعلق قطع نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے شکر الٰہی میں نقصان لازم آتا ہے جس سے وہ حضرات مبرا ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام پر آپ کے تعلق کا وجوب بالقوہ تو اس حدیث سے ظاہر ہے۔

لو کان موسیٰ حیاً لما وسعه الا اتباعی

(اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں سوائے میری اتباع کے چارہ نہ تھا۔)

اور بالفعل اس سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزول الی الارض کے وجوباً آپ کا اتباع فرماویں گے اور کسی کو وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا سے اس کے خلاف کا شبہ نہ ہو کیونکہ ملت ابراہیم خود آپ کی ملت کا بوجہ تناسب لقب ہے جس میں حکمت ترغیب ہے تمام اہل ملل کی اس ملت کے اختیار کرنے پر کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی جلالت متفق علیہ تھی۔ اس لئے اتبع ابراہیم نہیں فرمایا اسی طرح بعد ذکر انبیاء علیہم السلام کے حضور کو خطاب کیا گیا ہے۔ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ یوں نہیں فرمایا فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ پس هداهم سے مراد هدی اللہ ہے۔ اس کو ملابست کے سبب هداهم فرمایا۔

یہ سب تمہید تھی مقصود کی اور خلاف امید تمہید میں زیادہ وقت گزر گیا اب میں مقصود کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

حقیقت وصورت معراج

مقصود یہ تھا کہ حضور کی معراج سے کیا سبق ہم کو حاصل کرنا چاہئے تو سمجھئے کہ معراج کی کیا حقیقت ہے۔ لوگ معراج اس کو سمجھتے ہیں کہ حضور زمین سے آسمان پر تشریف لے گئے۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ عروج آسمانی حقیقت معراج نہیں بلکہ صورت معراج ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ صورت آپ کے کمالات میں سے نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت معراج اسی صورت پر موقوف نہیں بلکہ اس کا تحقق دوسری صورتوں سے بھی ہو سکتا تھا۔ گو جو صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محقق ہوئی ہے وہ سب سے افضل واکمل ہے اور آپ معراج کی حقیقت وصورت دونوں کے جامع ہیں۔

یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج صوری یعنی عروج آسمانی کا انکار کرتے ہیں اور اس معراج کو منامی یا کشفی بتلاتے ہیں۔ سو یہ بالکل نصوص کے خلاف ہے بلکہ احادیث مشہورہ سے آپ کا آسمانوں پر تشریف لے جانا ثابت ہے اور بیت المقدس تک تشریف لے جانا تو نص قرآنی سے ثابت ہے جس کا انکار بلا تاویل کفر ہے اور بتاویل بدعت۔

ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں کچھ نقلی۔ عقلی دلائل تو یہ ہیں کہ اس سے افلاک میں خرق والتیام لازم آتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق والتیام کے امتناع پر کوئی دلیل نہیں اور جب وہ دلائل پیش کریں گے اس وقت انشاء اللہ ہم ان سب کا لغو و باطل ہونا ظاہر کردیں گے چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنی جلدی سیر سماوات سے فارغ ہو کر واپس آگئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی۔ یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کر آئیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہو جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ کی کیا بات ہے ہاں استبعاد ہو سکتا ہے سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے۔

چنانچہ رات اور دن کا آنا طلوع و غروب کا ہونا یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے۔ اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہوگا وہی رہے گا اگر رات موجود ہوگی رات ہی رہے گی دن موجود ہوگا دن ہی رہے گا تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات کو حرکت فلک کو تھوڑی دیر کیلئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں۔ معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔

ہم جب حیدر آباد گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی لوگوں کو سڑک پر چلنے سے روک رہے ہیں اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے۔ پس آفتاب جس جگہ تھا اسی جگہ رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا۔ اس میں کیا استبعاد ہے۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام معراج سے فارغ ہو گئے پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی۔ تو آپ کی سیر میں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا کیونکہ حرکت زمانہ اس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت فلک کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے لزوم کو ثابت کرے۔ انشاء اللہ ایک دلیل بھی قائم نہ کر سکے گا۔ دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی نے دیا ہے۔

تن او کہ صافی تر از جان ماست　　　اگر آمد و شد بیک دم رواست

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم ہماری روح سے صاف تر ہے ایک گھڑی میں آمد و رفت صحیح ہے۔

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائے گا۔ خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے وہ مادیات کی طرح کثیف نہیں اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجب و مانع نہیں ہوتا۔ تو مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہو آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

ایک دلیل عقلی فلاسفہ جدید پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہونے کے سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا تو آپ اس میں سے اگر گزرتے زندہ کیسے رہتے۔

مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس التزام کے یہ اس وقت ہے جب متنفس کو اس میں کچھ مکث بھی ہو۔ چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ کو نکالا جائے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔ پس آپ اگر نہایت سرعت کے ساتھ اس خلا میں سے گزر جائیں تو وہ عدم تنفس میں موثر نہ ہوگا اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔

واللہ مافقد جسد محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ الاسراء

(کہ بخدا شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا)

اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کہاں تھیں۔ نیز اس وقت ان کی عمر بہت ہی کم تھی شاید چار پانچ سال کی ہوگی۔ اور اگر معراج ۵ھ نبوت میں ہوئی ہو جیسا کہ زہری کا قول ہے تو وہ اسی سال پیدا ہوئی ہوں گی۔ اس لئے اجلہ صحابہ کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے۔

مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے بے تحقیق ایک بات فرما دی ہم حضرت صدیقہؓ پر یہ گمان نہیں کر سکتے۔ نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرات ہو سکتی ہے یہ مانا کہ وہ اس وقت حضور کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کم سن بھی تھیں مگر جو بات وہ فرما رہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئی ہے اور ایسے وقت میں وہ بدوں تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں۔ یقیناً تحقیق کے بعد فرما رہی ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرماتی ہوں کیونکہ معراج میں تعدد ہے تو پھر کچھ بھی معتر نہیں۔

میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنے ہیں۔ ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا ہٹ جانا دوسرے تلاش کرنا۔ چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا

استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ[1] یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کو تلاش کرتے ہو۔ یہاں فقدان کے معنی طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں۔

پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ کی تلاش کی جاتی یہ مطلب[2] نہیں کہ آپ ساری رات میں اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے تاکہ اس سے معراج منامی یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ گھر سے جدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس میں گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔

غرض اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی اور آپ اس جسم سے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اس کا انکار ہرگز نہیں ہوسکتا اور یقیناً یہ صورت عروج ظہور کا بہت بڑا کمال ہے۔

قرب الٰہی

مگر معراج کو ایسی صورت میں منحصر نہ سمجھنا چاہئے اور نہ محض عروج آسمانی کے ساتھ حقیقت معراج کو مخصوص کرنا چاہئے بلکہ اس کی حقیقت اس عروج کے علاوہ دوسری چیز ہے اور وہ قرب الٰہی ہے جس کی ایک صورت یہ بھی تھی جو حضور کو پیش آئی ہے اور یہ اکمل صورت ہے مگر اس صورت کے علاوہ ایک دوسری صورت سے بھی اس حقیقت کا تحقق ہوسکتا ہے کیونکہ قرب الٰہی جو حقیقت معراج ہے کسی خاص صورت میں منحصر نہیں پس سمجھنا چاہئے کہ قرب الٰہی کبھی بصورت عروج ہوتا ہے اور کبھی بصورت نزول اور کبھی دونوں طرح مجتمع ہو جاتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج عروجی اور نزولی دونوں ہوئی ہیں۔ اس

---

[1] قلت نص البغوی فی تفسیرہ ماذا تفقدون ما الذی ضل عنکم والفقدان ضد الوجدان اھ۔ وکذا نص الخازن بان الفقدان عند الوجود اھ (ص ۶۳۲ ج ۱) وکذا نص فی القاموس فقد الفقد وفقدانا وفقودا عدمہ فھو فقید ومفقود اھ (ص ۲۰۱ ج ۱) ولم اجد الفقود بمعنی المفقد بعد ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔ ۱۲

[2] احقر اشرف علی کے ذہن میں اس حاشیہ کو دیکھ کر ایک تاویل آئی تھی جس کو حاشیہ آئندہ میں ظاہر کردیا گیا ۱۲۔

اور اگر فقدان کے وہی معنے لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک شب معراج میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضورؐ اپنے گھر سے اس رات جدا ہی نہیں ہوئے کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم۔ اس کے معنی غیبت وانفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے ایک کا فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست ہے کیونکہ آپ شب گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے تھے اور معراج ایسے وقت ہوئی جو کہ عادتاً لوگوں کی گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جاگنے کے وقت سے پہلے آپ گھر تشریف لے آئے بلکہ خود آ کر گھر والوں کو نماز صبح کے لئے جگایا تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور کو گھر میں نہ دیکھا ہو اور اتنی بات مفقود ہونے کے لئے ضروری ہے قلت و لعل ھذا ھو مراد الشیخ بصرہ بالفتش

لئے کہ قرب الٰہی جیسا کہ بوقت عروج آپ کو حاصل ہوا ہے نزول کے وقت بھی حاصل تھا بلکہ یہ قرب پہلے سے زیادہ تھا جیسا عنقریب آتا ہے اور بعض انبیاء کو صرف عروجی معراج ہوئی ہے جیسا ادریس علیہ السلام کے متعلق وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کی تفسیر میں بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ زندہ دنیا سے آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے۔ اسی کو ایک عارف نے کہا ہے۔

بمیر اے دوست پیش از مرگ اگر می زندگی میں خواہی
کہ ادریس از چنیں مردن بہشتی گشت پیش از ما

والا فالفقدان غیر الفقد نسیم ہو۔ یستدعی فاقدا کما لا یخفی ۱۲ جامع احقر اشرف علی کے ذہن میں پہلا حاشیہ دیکھ کر ہی یہ تاویل آ گئی تھی مگر دوسرے عنوان سے پھر یہ دوسرا حاشیہ دیکھا اب اس تاویل کی اس دوسرے عنوان سے ذرا واضح تقریر کرتا ہوں وہ یہ کہ فقدان کے معنے گم ہی کرنے کے ہیں مگر اس کے دو درجے ہیں ایک مطلق گم کرنا اور ایک ایسا گم کرنا جس کے بعد اس کی تلاش میں لگ جائے۔ پس پہلا درجہ فقد مطلق ہوا دوسرا درجہ فقد مقید۔ پس اس حدیث میں دوسرا درجہ مراد ہے یعنی آپ کا جسد ایسا مفقود نہیں ہوا جس سے تلاش کی نوبت آ گئی ہو کیونکہ زمانہ فقد کا اتنا قلیل تھا کہ کسی کو اس فقد کی اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ پس متن میں میری عبارت میں ہٹ جانے کو پہلے درجہ پر اور تلاش کرنے کو دوسرے درجہ پر محمول کیا جاوے تو اب معنی لغوی کے خلاف نہیں ہوا اور بنا بر قواعد تصوف یہ بھی ممکن ہے کہ جسم عنصری ملکوت میں پہنچا ہو اور جسم مثالی ناسوت میں رہا ہو اس کے دیکھتے ہوئے اس کو جسم عنصری سمجھ کر ما فقد کا حکم کرایا ہو۔ اور موٹی بات ہے کہ اگر معراج جسد عنصری سمجھ کر ما فقد کا حکم کرایا ہو اور موٹی بات ہے کہ اگر معراج جسد عنصری سے دعوی نہیں کرتا کہ اس پر اس قدر استبعاد کیا جائے ۱۲۔

احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ بعد میں تفسیر المقیاس میں جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے ماذا تفقدون اور تفقد کی تفسیر ماذا تطلبون اور طلب کے ساتھ میری نظر سے گزری اور یہ تفسیر بالکل اس معنے کے مطابق ہے جو حضرت حکیم الامت نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں کیونکہ طلب کے معنی تلاش کرنے اور ڈھونڈھنے ہی کے ہیں اور بظاہر ابن عباس کی یہ تفسیر باللازم ہے کیونکہ فقدان اکثر طلب کو مستلزم ہوتا ہے لہٰذا ملزوم کی تفسیر لازم سے فرما دی لیکن اس سے یہ تو معلوم ہو گیا ہے فقدان سے طلب و تفتیش بھی مراد ہوا کرتی ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں بھی اس معنی کا احتمال ہے جیسا کہ حضرت مولانا نے فرمایا ہے واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔ اور ہر چند کہ تفسیر تنویر المقیاس اکثر محدثین کے نزدیک معتبر نہیں کیونکہ اس کے راوی کلبی اور ان کے شاگرد محمد بن مروان سدی صغیر مجروح ہیں مگر سیوطی نے اتقان میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ لکن قال ابن عدی فی الکامل للکلبی احادیث صالحۃ و خاصۃ عن ابی صالح و ہو معروف بالتفسیر و لیس لاحد تفسیر اطول منہ ولا اشبع اھ (ص ۱۹۶ ج ۲)

جس سے فی الجملہ اس کی تقویت ہوتی ہے دوسرے یہ مسئلہ کوئی احکام کی قبیل سے نہیں جس میں راوی کا مجروح ہونا مضر ہو بلکہ از قبیل نقل لغت ہے جس میں بہت وسعت ہے فافہم و اللہ اعلم و انما اطلنا الکلام فی ہذا المقام لیظہر لک نعمتہ اللہ علی جماعتنا ولہ الحمد انہا تقبل اقوال اکابرہا فی تفسیر معانی القران الابعد ظہورہا مطابقتہا الاقوال السلف واکابرہا لایتکدرون لایراد الاصاغر علیہم اذا کان بالادب لاجل الطلب و الیظہر لک حسن ذوق حضرۃ حکیم الامۃ فی التفسیر بحیث لایتخطی عن الصواب ولو قال شیئا بغیر مطالعۃ الکتاب ۱۲۔

(اگر تو اے دوست زندگی چاہتا ہے تو مرنے سے فنا حاصل کر کہ ادریس علیہ السلام ایسے مرے فنا سے پہلے ہم سے جنتی ہو گئے۔)

پھر اس کے بعد اس کو نزولی معراج نہیں ہوئی۔ اور جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح معراج ہوئی ہے اور اس کے بعد ابھی تک نزول نہیں ہوا مگر آخر زمانہ میں نزول ہوگا۔ اور یونس علیہ السلام کو نزولی معراج ہوئی ہے اس کو مولانا رومی نے سمجھا ہے واقعی بڑے محقق ہیں بیان اس کا یہ ہے کہ مولانا نے مثنوی دفتر سوم میں ایک مقام پر حدیث **لاتفضلونی علی یونس بن متی** (مجھے حضرت یونس بن متی علیہ السلام پر فضیلت نہ دو) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ۔

گفت پیغمبر کہ معراجک مرا　　نیست از معراج یونس اجتبا
آں من بالا و آں او بشیب　　زانکہ قرب حق بروںست از حسیب
قرب تر پائیں ببالا جستن است　　قرب حق از حبس ہستی رستن است

پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ میری معراج حضرت یونس علیہ السلام کی معراج سے برگزیدہ نہیں ہے میری معراج عروجی تھی اور انکی نزولی اس لئے کہ قرب حق حساب سے باہر ہے قرب حق کی حقیقت ارتفاع مکانی نہیں ہے بلکہ قرب حق قید ہستی سے چھوٹنا ہے۔

اس تفسیر میں اشارہ اس طرف ہے کہ حدیث عام ہے جس میں وہ سب امور داخل ہیں جن میں تفضیل سے وہم تنقیص ہو سکتا ہے۔ پس مطلب حدیث کا یہ ہوا کہ جن باتوں میں تم کو میری فضیلت اور یونس علیہ السلام کے نقص کا شبہ ہو اس میں مجھ کو یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو جن میں قصہ معراج بھی داخل ہے کہ حضور تو ساتوں آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ آپ کو اس طرح معراج ہوئی اور یونس علیہ السلام عرصہ تک مچھلی کے پیٹ میں رہے ظاہر بینوں کو ان کی یہ حالت ناقص معلوم ہوتی ہے مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی یہ حالت ناقص نہ تھی بلکہ یہ یونس علیہ السلام کی معراج تھی جو بصورت نزول واقع ہوئی پس حضور کی معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو (یعنی ایسی فضیلت جس سے وہم ان کے نقص کا ہو) اور یہ مت سمجھو کہ معراج صرف حضور ہی کو ہوئی ہے۔ یونس علیہ السلام کو نہیں ہوئی۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کو بھی ہوئی۔ مچھلی کے پیٹ میں ان کا جانا یہ بھی معراج ہی تھی کیونکہ معراج کی حقیقت ہے یہ حضور کو قرب حق اور صورت سے حاصل ہوا عروجا بھی اور نزولا بھی اور یونس علیہ السلام کو قرب حق اور صورت سے حاصل ہوا کہ وہ دریا میں ہوئے اور مچھلی کے پیٹ میں رہے۔

جس کا قصہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈرایا اور فرمایا کہ ایمان لے آؤ ورنہ اتنی مدت میں عذاب نازل ہوگا۔ جب وہ مدت قریب آئی تو آپ اس خیال سے کہ یہاں عذاب نازل ہوگا وہاں سے چل پڑے مگر حق تعالیٰ سے صریح اذن نہیں لیا۔

اور یہاں یہ قصہ ہوا کہ جب وہ تاریخ آئی عذاب کی آمد شروع ہوئی۔ یہ آثار دیکھ کر لوگ گھبرائے اور ایمان پر آمادہ ہوئے اور یونس علیہ السلام کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر ایمان لائیں۔ یہ نہ ملے تو انہوں نے کہا کہ اگر یونس علیہ السلام نہیں ہیں تو کیا ہوا ان پر اور حق تعالیٰ پر ایمان لانا تو ممکن ہے چنانچہ ایمان لے آئے اور عذاب ٹل گیا یونس علیہ السلام لوگوں سے اس بستی کا حال پوچھتے رہتے تھے۔ جب کسی نے عذاب کی خبر نہ سنائی اور پورا واقعہ معلوم نہ ہوا تو آپ کو خیال ہوا کہ اب اگر واپس بستی میں جاؤں گا تو وہ لوگ جھٹلائیں گے کہ تمہارے قول کے موافق عذاب تو نہ آیا۔ اس شرمندگی کی وجہ سے واپس نہ ہوئے بڑھے چلے گئے راستہ میں دریا پڑا اور آپ کشتی میں سوار ہوئے چلتے چلتے وہ کشتی چکر کھانے لگی ملاح نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا سوار ہے اس وقت یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں بھائی! میں اپنے آقا سے بدوں اجازت بھاگ آیا ہوں مجھے دریا میں ڈال دو۔ لوگوں نے ان کی صورت سے نیکی اور بزرگی کے آثار دیکھ کر اس کلام میں شبہ کیا بالآخر قرعہ اندازی ہوئی جس میں یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ یونس علیہ السلام نے قرعہ اندازی کی تو وہی ہارے۔ پس لوگوں نے ان کو دریا میں ڈال دیا۔ وہاں ایک بہت بڑی مچھلی تھی اس نے بحکم حق آپ کو نگل لیا اور قعر دریا میں پہنچی چالیس دن اس کے پیٹ میں رہے مگر ہضم نہیں ہوئے حق تعالیٰ نے حفاظت فرمائی مولانا اس کو معراج قرار دے کر فرماتے ہیں۔

قرب تر پستی ببالا رفتن است　　　قرب حق از حبس ہستی رفتن است

(قرب پستی سے بالا جانے کا نام ہے اور قرب حق قید ہستی سے آزاد ہونے کا نام ہے۔)

یعنی حق تعالیٰ کے قرب کی حقیقت مکانی ارتفاع نہیں بلکہ یہ ہے کہ بندہ اپنی ہستی کی قید سے چھوٹ جائے اس کا یہ مطلب نہیں کہ زہر کھالے۔ یہ تو بڑا سستا قرب ہے جو ایک پیسہ کے سنکھیے سے حاصل ہو سکتا ہے سو یہ قید ہستی سے چھوٹنا نہیں بلکہ اس میں تو قید ہستی کے موجود ہونے کی دلیل ہے کیونکہ خودکشی حرام ہے اور خلاف مرضی حق پر پیشقدمی کرنا قید ہستی یعنی دعویٰ و زعم استقلال ہستی کی علامت ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعویٰ ہستی کو چھوڑ دے اپنے کمالات سے نظر اٹھ جائے اپنے ارادہ کو ارادہ حق میں فنا کر دے بس یہ ہے قرب کی حقیقت جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے اوپر نظر نہ رہے حاصل یہ کہ تم خود ہی قرب حق سے اپنے حاجب ہو اس کو مرتفع کرو اسی کو عارف فرماتے ہیں۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق اور معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے۔ حافظ خود ہی تو درمیان سے اٹھ۔)

اور اسی کو حضرت شاہ بوعلی قلندر فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی باتیں نہ سننے دوں۔)

بلکہ ہمہ تن مشاہدہ حق میں فنا ہو جائے کہ نہ اپنے کان کو اپنا کان سمجھے نہ اپنی آنکھ کو اپنی آنکھ سمجھے بس وہ حال ہو جائے **بی یبصر و بی یسمع**۔

حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا یارب **دلنی الی اقرب الطرق الیک**۔ اے اللہ! مجھے اپنے تک پہنچنے کا نزدیک تر راستہ بتلا دیجئے جواب میں ارشاد ہوا یا ابا یزید دع نفسک وتعالیٰ یعنی اے ابا یزید! بس اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ (یعنی اتباع نفس کو) سبحان اللہ کیا نزدیک راستہ بتلایا گیا۔

یہی مراد ہے صوفیہ کے اس قول میں کہ مرید کو چاہئے کہ شیخ کے ہاتھ میں اپنے آپ کو ایسا سپرد کر دے کالمیت فی ید الغسال یعنی جیسے مردہ غسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جس طرف چاہتا ہے اس کو پلٹ دیتا ہے وہ کچھ نہیں کہتا اسی طرح مرید کو ہونا چاہئے کہ شیخ کے ارادہ میں اپنی رائے واختیار اور قصد کو فنا کر دے وہ اگر جگا دے تو جاگے سلا دے تو سو رہے نفلوں کا حکم کرے تو نفلیں پڑھے منع کر دے تو چھوڑ دے بشرطیکہ وہ خلاف شرع کا امر نہ کرے اگر شیخ کامل ہے تو وہ ایسا کرنے ہی کیوں لگا اور اگر ناقص ہے تو ایسے شیخ ہی کو سلام کرنا چاہئے۔ جب مرید شیخ کے ہاتھ میں اپنے کو اس طرح سپرد کر دیتا ہے تو پھر اس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی یہی تسلیم نصیب ہو جائے گی اور ایک وہ وقت آئے گا کہ یہ آسانی کے ساتھ اپنے ارادہ واختیار کو ارادہ خداوندی میں فنا کر دے گا یہی ہے قرب حق۔

حقیقی معراج

یہی قرب حقیقت ہے معراج کی اور ظاہر ہے کہ قرب حق تمام انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا تو حقیقی معراج سب کو حاصل تھی گو بعض کو صوری نہ ہوئی ہو اور ادریس علیہ السلام کو تو ایک قول پر صوری بھی ہوئی ہے اور مولانا رومی کی تحقیق کے موافق یونس علیہ السلام کو نزولی معراج ہوئی ہے۔ پس ان کو اس طرح قرب ہوا کہ اوپر سے نیچے بلائے گئے اور یہ ضروری نہیں کہ معراج بصورت نزول ناقص ہوا کرے تا کہ اس بناء پر معراج یونسی کو معراج محمدی سے مفضول کہا جاوے گو دوسرے دلائل سے آپ کی معراج سب معراجوں سے افضل ہے مگر محض نزول کو ناقص ماننا اس کی بنا نہیں ہے بلکہ صوفیہ کا مقولہ یہ ہے کہ عروج سے نزول افضل ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج میں ایک تو آپ کی حالت عروج تھی جب کہ آپ نیچے سے اوپر کو جا رہے تھے اور ایک حالت نزول تھی جب کہ آپ اوپر سے نیچے کو آ رہے تھے صوفیا فرماتے ہیں کہ حضور کی نزولی حالت آپ کی پہلی حالت سے اکمل تھی۔

اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں یونس علیہ السلام کے نزول کو حضور کے عروج پر ترجیح دے رہا ہوں۔ ہرگز نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ حضور کو جو کبھی نزول اور کبھی عروج ہوا ہے تو ان دونوں میں آپ کے عروج سے آپ کا نزول افضل تھا باقی آپ کا عروج دوسرے دلائل سے ایسا اکمل ہے کہ وہ دوسروں کے نزول سے بھی افضل ہے مگر اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ نزول فی نفسہ نقص نہیں۔

غرض حضور کی معراج عروجی تو کامل ہے اور آپ کی معراج نزولی اکمل ہے سو ان میں فرق کامل اکمل کا ہے ناقص کامل کا نہیں کیونکہ آپ کی جو حالت بھی ہے وہ کمال سے خالی نہیں۔ گو بعض حالتیں بعض سے زیادہ کامل ہوں مگر ناقص کوئی نہیں۔ اور آپ کی معراج نزولی کا معراج عروجی سے افضل ہونا صرف صوفیہ کے قول ہی سے ثابت نہیں بلکہ اس پر دلائل موجود ہیں۔

ایک دلیل تو یہ ہے کہ معراج کی غایت حق تعالیٰ نے رویت آیات بیان فرمائی ہے چنانچہ سورہ نجم میں تو فرمایا ہے لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی (انہوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے) اور سورۃ الاسراء میں فرمایا ہے لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (تاکہ ہم ان کو کچھ عجائبات قدرت دکھلائیں) اور ظاہر ہے کہ حضور کو آیات دکھلانے سے دو فائدے ہو سکتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ آپ کی معرفت زیادہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپ خود دیکھ کر دوسروں کو بتلا دیں۔

خلاصہ یہ کہ معراج سے دو مقصود تھے۔ ایک یہ کہ رویت آیات و ازدیاد علوم سے آپ کی تکمیل ہو۔ دوسرے یہ کہ ان علوم سے آپ دوسروں کی تکمیل کریں پہلا فائدہ لازمی ہے اور دوسرا فائدہ متعدی ہے اور ظاہر ہے کہ جو وقت فائدہ متعدیہ کے ظہور کا ہو گا وہ فائدہ لازمیہ کے وقت سے افضل ہو گا کیونکہ بعثت رسول سے اصل مقصود افادہ خلائق ہی ہے نیز دوسروں کی تکمیل سے خود رسول کے درجات میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فائدہ متعدیہ کا ظہور بعد نزول کے ہوا تو نزول کا عروج سے افضل ہونا ثابت ہو گا۔

دوسری دلیل یہ آیت ہے وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی۔ اس کا بیان یہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ دنوں نزول وحی میں توقف ہو گیا اور کفار نے طعن کیا تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رنج و غم کا اثر ہوا اور آپ پر حالت قبض طاری ہو گئی۔ تو بعد میں حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی فرمائی اور سورۂ ضحی نازل ہوئی جس میں اول ان آیات کی قسم کھائی ہے جن کو اس حالت سے خاص مناسبت ہے فرماتے ہیں۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی

قسم ہے دن کی اور رات کی جب وہ قرار پکڑ لے۔ اس جگہ رات اور دن کی قسم بہت ہی مناسب ہے کیونکہ دن مشابہ ہے حالت بسط کے اور یہ رات مشابہ ہے حالت قبض کے۔

وجہ تشبیہ ایک تو یہ ہے کہ حالت بسط میں انوار کا توارد ہوتا ہے اور دن بھی محل نور ہے اور حالت قبض میں وہ انوار نہیں رہتے تو وہ رات کے مشابہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح دن میں کاروبار زیادہ ہوتے ہیں اسی طرح حالت بسط میں سالک سے کام زیادہ ہوتا ہے اور حالت قبض میں کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔ نماز میں دل لگتا ہے نہ ذکر میں نہ تلاوت میں تو قبض میں کام کم ہو جاتا ہے۔ وہ رات کے مشابہ ہے کہ اس میں بھی کاروبار بند ہو جاتے ہیں حق تعالیٰ نے اس جگہ رات اور دن کی قسم سے مقام کی یعنی جواب قسم مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کی حقیقت بتلادی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ سالک پر ان دونوں حالتوں کا آنا ایسا ہے جیسے لیل ونہار کا تعاقب پس جس طرح دن کے بعد رات کا آجانا غیر مقبول ہونے کی علامت نہیں۔ اسی طرح بسط کے بعد کہ تواتر وحی ہے قبض کا آنا کہ توقف وحی ہے غیر مقبول ہونے کی دلیل نہیں بلکہ جس طرح ہم نے عالم میں لیل ونہار کا اختلاف حکمت کے لئے رکھا ہے یونہی سالک پر بسط وقبض کا تعاقب حکمت کے لئے مقرر کیا ہے پس قبض سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔

نیز اس میں قبض کی ایک حکمت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جس طرح دن میں اگرچہ کاروبار زیادہ ہوتا ہے مگر مخلوق کی راحت وآرام کے واسطے رات کا آنا بھی ضروری ہے اگر رات نہ آوے تو کاروبار کا تعب زائل نہ ہو سکے گا۔ راحت وآرام کے لئے دن موضوع نہیں۔ اس کے واسطے رات ہی کا وقت مناسب ہے اسی طرح گو بسط میں سالک سے کام زیادہ ہوتا ہے مگر اس کام کے دوام کے لئے قبض کی بھی ضرورت ہے اگر ہمیشہ بسط ہی رہے تو ایک نہ ایک دن کام کرتے کرتے اکتا جائے گا اس لئے ہم قبض کی حالت مسلط کر دیتے ہیں تا کہ یہ زیادہ کام نہ کرے۔ تھوڑے ہی پر اکتفا کرے اور قدرے آرام مل جائے پھر قبض رفع ہونے کے بعد جو بسط آئے گا تو اس کو پہلے سے زیادہ نشاط عمل میں ہوگا اسی طرح پر قبض وبسط کے تعاقب سے یہ ہمیشہ کام کرتا رہے گا۔ اسی کو عارف فرماتے ہیں۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم
گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(میں ہجر کی شکایت نہیں کرتا کیونکہ اگر ہجر نہ ہوتا تو قرب میں لذت نہ معلوم ہوتی)۔

اس معنی خیز قسم کے بعد جواب ارشاد فرماتے ہیں مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے آپ بے فکر رہیں۔ اس میں تسلی ہو گئی مگر یہاں ایک شبہ آپ کو ہو سکتا تھا یہ کہ گو قبض وبسط میں لیل ونہار کی طرح تعاقب ہے اور قبض سے مجھے کچھ تنزل نہیں ہوا مگر بظاہر بسط اس سے افضل ہے۔ کیونکہ اوفق للطبع ہے۔ اس میں کام بھی زیادہ ہوتا ہے توجہ بھی اس میں عالم بالا کی طرف زیادہ رہتی ہے تو بسط میں ترقی زیادہ ہوتی ہوگی گو قبض میں بھی خود قبض کے سبب سے تنزل نہ ہوتا مگر ترقی بھی تو بسط کے برابر نہیں ہوتی ہوگی آگے اس شبہ کا جواب دیتے ہیں۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى یعنی کل حالة اخرة لک خیر من الحالة الاولی
یعنی آپ کی ہر پچھلی حالت ہر پہلی حالت سے افضل ہے اس لئے زمانہ قبض کی حالت آپ کی

اس بسط کی حالت سے افضل تھی جو اس سے پہلے تھی اور جب وہ پہلی حالت سے افضل تھی تو اس میں بھی ترقی بند نہیں ہوئی بلکہ برابر آپ کو ترقی ہو رہی ہے۔

یہ جواب ایسا ہے کہ واقعہ تحویل قبلہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ (اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردیں) جب بیت المقدس سے پھر کعبہ کی طرف قبلہ محول کیا گیا تو بعض صحابہ کو شبہ ہوا کہ جتنے دنوں ہم نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے۔ شاید ان میں ثواب کم ملا ہو گا۔ کیونکہ تحویل سے معلوم ہوا کہ اصلی کعبہ تو کعبہ تھا اور وہ قبلہ عارضی ہوگا اصلی قبلہ میں اور عارضی میں فرق ضرور ہے تو جو نمازیں عارضی قبلہ کی طرف ہم نے پڑھی ہیں ان میں کم ثواب ہوا ہوگا۔

حق تعالیٰ نے اس شبہ کا جواب دیا کہ ہم ایسے نہیں ہیں کہ تمہاری طاعات سابقہ کا ثواب کم کر دیں یا ضائع کر دیں کیونکہ تم نے تو بہر حال ہمارے حکم کی اطاعت کی ہے تم کو عارضی و اصلی ہونا معلوم نہ تھا۔ اس لئے ثواب بھی تم کو کم نہیں ملا۔ بلکہ ان نمازوں میں بھی پورا ہی ثواب ملا ہے۔

اسی طرح حضور کو ارشاد ہے کہ قبض و بسط جب ہماری طرف سے ہے اور آپ کے فعل کو اس میں کچھ دخل نہیں تو آپ کو حالت قبض میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے ترقی میں کمی نہیں خصوصاً جب کہ ہم نے آپ کو قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیجئے کہ اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما) کی تعلیم دی ہے (اور ہمارا یہ دعا تعلیم کرنا علامت اجابت ہے) تو آپ کو ہر وقت ترقی ہوتی رہتی ہے اور آپ کی ہر پچھلی حالت ہر پہلی حالت سے افضل ہوتی ہے پس جس بسط کے بعد قبض آیا ہے یہ قبض پہلے بسط سے افضل ہے اور اس قبض کے بعد جو بسط آئے گا وہ اس قبض سے افضل ہوگا اور حضور کی تو بڑی شان ہے۔ حضرات صوفیہ نے ہر عارف کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ عارف کی ہر حالت آئندہ حالت گذشتہ سے افضل ہوتی ہے کیونکہ وہ ہر دم ترقی کرتا رہتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

سیر زاہد در مہے یک سالہ راہ　　سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

(زاہد ایک مہینہ میں ایک سال کی راہ طے کرتا ہے اور ذرا سی دیر میں تخت شاہ تک پہنچ جاتا ہے۔)

اور اسی کو ایک شوخ مزاج صوفی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

بیزارم ازاں کہنہ خدائے کہ تو داری　　ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(تمہارے پرانے خدا سے بیزار ہوں ہر دم مجھے دوسرے تازہ خدا کی ضرورت ہے)۔

یہ عنوان ظاہر میں بہت موحش ہے مگر مطلب معلوم کرنے کے بعد استبعاد نہ رہے گا۔ بات یہ ہے کہ ہر شخص کا حق تعالیٰ کے متعلق کچھ نہ کچھ خیال ضرور ہوتا ہے گو حق تعالیٰ ہمارے خیالات سے وراء الوریٰ ثم وراء الوریٰ ہیں مگر یہ ضروری ہے کہ ہم کو جب تصور ہوتا ہے تو کسی خاص کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب

سمجھئے کہ غیر عارف کو تو چونکہ ترقی معرفت میں ہوتی نہیں اس لئے جو خیال اس نے حق تعالیٰ کے متعلق ایک دفعہ قائم کرلیا ہے ہمیشہ بس وہی خیال رہتا ہے کہ حق تعالیٰ ایسے ہوں گے اس طرح ہوں گے اسی کو شعر میں کہنہ خدا کہا ہے اور عارف کو چونکہ ہمیشہ ترقی ہوتی اور تجلی الٰہی قلب میں تازہ ہوتی رہتی ہے اور روزانہ معرفت بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے جو خیال اس کو حق تعالیٰ کے متعلق آج تھا وہ کل نہ رہے گا اور جو کل ہوگا وہ اس کے بعد نہ رہے گا۔ وہ ہمیشہ اپنے گذشتہ خیالات سے توبہ کرتا رہتا ہے کیونکہ ہر وقت حق تعالیٰ کی عظمت اس شان سے منکشف ہوتی ہے کہ پہلا خیال اس کے سامنے غلط معلوم ہوتا ہے اسی کو ان حضرات نے تازہ خدا کہا ہے یعنی تازہ تجلی معرفت خدا۔ اب مطلب تو صاف ہوگیا مگر عنوان کے متوحش ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن ان لوگوں کو اپنے غلبہ حال میں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ کسی کا ایمان رہے گا یا جائے گا یا ہمارے اوپر کفر کے فتوے لگیں گے۔ غرض جب عارف کو ہر دم ترقی ہوتی رہتی ہے تو اس کو قبض سے پریشان نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کو حالت نزول پر محمول کرنا چاہئے اور یہ سمجھ لے کہ یہ نزول پہلے عروج سے افضل ہے اور اس کے بعد جو عروج ہوگا یعنی بسط وہ اس نزول سے افضل ہوگا۔

معراج سے پہلا سبق

تو اب واقعہ معراج سے جو سبق ہم کو حاصل ہوا وہ دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ معراج کی حقیقت قرب الٰہی ہے اور وہ سب انبیاء کو حاصل ہے تو یہ نہ کہنا چاہئے کہ معراج صرف حضور ہی کو ہوئی ہے اور کسی کو نہیں ہوئی۔ نہیں بلکہ معراج سب کو ہوئی ہے۔ ہاں اجمالاً اس کہنے کا مضائقہ نہیں کہ حضور کی معراج اوروں کی معراج سے افضل واکمل ہے۔ وہ بھی اس طرح سے کہا جاوے جس میں دوسرے انبیاء کی معراج کی تنقیص نہ ہو بلکہ صرف حضور کی افضلیت واکملیت کا بیان ہو اور معراج ہی کی کچھ تخصیص نہیں مطلقاً تمام احوال ومقامات انبیاء میں تفصیلی فضیلت جب تک منصوص نہ ہو بیان نہ کرنا چاہئے جیسا عام لوگوں کی عادت ہے اور غضب ہے کہ بعض مصنفین بھی جن پر معقول کا غلبہ ہے اس مرض میں مبتلا ہیں میرا تو ایسی باتوں سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک مصنف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح فضیلت بیان کی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو غار ثور میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جب وہ کفار کے آجانے سے پریشان ہوئے یوں تسلی دی تھی لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا تم غم نہ کرو یقینا اللہ تعالیٰ ہمارے ہمراہ ہے۔ جس میں اول لاتحزن فرما کر غم کو ہلکا کردیا پھر اپنے ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا۔ جس میں خدا تعالیٰ کے ذکر کو مقدم فرمایا اور معیت میں حضرت صدیق کو بھی شریک فرمایا کہ صیغہ جمع معنا استعمال فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو جب فرعون اور لشکر فرعون کے آجانے سے پریشانی ہوئی اور انہوں نے موسیٰ علیہ

السلام سے اس پریشانی کو ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ جس میں سب سے پہلے لفظ کلا استعمال فرمایا جو دھمکی کے واسطے موضوع ہے۔ عربی میں لفظ کلا ایسے ہی موقعہ میں استعمال ہوتا ہے جہاں اردو کا کلا بھی استعمال ہوتا ہے۔ گویا کلے پر طمانچہ ماردیا۔ پھر اپنے ساتھ معیت حق کو جو بیان فرمایا ہے تو اپنے ذکر کو خدا تعالیٰ کے ذکر سے مقدم فرمایا یعنی لفظ معی کو ربی سے پہلے ذکر کیا گویا یہ حضرت مصنف سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بولنا سکھاتے ہیں کہ حضرت آپ کو خدا کا ذکر اپنے ذکر سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔ گویا ان کو آداب کلام بھی نعوذ باللہ معلوم نہ تھے۔

پھر یہ بھی وجہ فضیلت بیان کی کہ موسیٰ علیہ السلام نے معی بصیغہ مفرد فرمایا جس میں معیت الٰہیہ کو اپنے ساتھ خاص کیا قوم کو اپنے ساتھ اس دولت میں شریک نہ کیا مجھے ان مصنف صاحب پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلا کیوں کہ میں تو یہ کہوں گا کہ

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

(اے دوست خطا یہی ہے کہ تو سخن شناس نہیں ہے)

اول تو ان کو ان جزئیات میں کلام کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ حضور کے فضائل کلیہ منصوصہ کیا کم ہیں جو جزئیات غیر منصوصہ سے آپ کا افضل ہونا ثابت کیا جائے اور اگر ان کو ایسا ہی شوق تھا تو یہ غور کرنا چاہیے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب کون ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب کون کیونکہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ ہر حال اور ہر موقع ومحل کے لئے ایک ہی طرز کلام نہیں ہوتا بلکہ ہر موقع کے لئے جدا طرز ہوا کرتا ہے۔

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد

(ہر کلام میں باریکی ہے اور ہر باریکی میں ایک مقام ہے۔)

میں بطور احتمال کے کہتا ہوں اور دعائع کے لئے بمقابلہ مستدل کے احتمال کافی ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب حضرت صدیق جیسے لوگ ہوتے تو وہ بھی وہی فرماتے جو حضور نے فرمایا اور اگر حضور کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب تھے تو حضور بھی وہی فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ غار ثور میں حضرت صدیق نے جن کی یہ حالت تھی کہ جب حضور غار ثور پر پہنچے ہیں تو حضرت صدیق نے اپنے چادر یا لنگی کو پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کئے تاکہ کوئی موذی جانور نکل کر حضور کو ایذا نہ دے سارے سوراخ تو بند ہوگئے مگر ایک رہ گیا اس کے لئے کپڑا نہ رہا تھا۔ اس پر حضرت صدیق نے اپنا پیر لگالیا کہ اگر کچھ نکلے گا تو میرے ہی پیر میں کاٹ لے گا حضور تک نہ پہنچ سکے گا اس حالت میں جو حضرت صدیق کو کفار کے آجانے سے پریشانی ہوئی ظاہر ہے کہ وہ پریشانی اپنی جان کے خوف سے نہ تھی بلکہ محض حضور کے خیال سے پریشانی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو دشمن آپ

کو دیکھ پائیں اور حضور کو اذیت پہنچائیں۔ جو شخص اتنا عاشق ہو جس نے سانپ کے بل میں اپنے پیر رکھ دیئے جس میں سانپ نے کاٹ بھی لیا تھا اس کو بھلا حضور کے ہوتے ہوئے اپنی جان کا خیال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔ ان کو جو کچھ خطرہ تھا وہ محض حضور کی اذیت کا تھا اور اس خطرہ کا منشا بھی محض یہ تھا۔

عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق میں ہزار بدگمانیاں ہیں)

ورنہ حضرت صدیقؓ دولت توکل سے پوری طرح مالا مال تھے ایسے شخص کی تسلی کے لئے وہی کلام مناسب تھا جو حضور نے استعمال فرمایا کہ اول ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے لاتحزن فرمایا پھر معیت حق میں ان کو بھی شریک فرمایا اور چونکہ آپ کو حصر مقصود نہ تھا اس لئے موافق اصل وضع کے ذکر اللہ کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا۔

اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ حضرت صدیق کے برابر متوکل تھے نہ ایسے جان نثار تھے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ بالکل نہ تھا محض موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا خطرہ تھا بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس کو جزم و یقین کے ساتھ ظاہر کیا۔ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ جس میں انا اور جملہ اسمیہ اور لام تاکید تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے حالانکہ بارہا دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نصر کو سن کر چلے تھے ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا ایسا جزم ہو گیا صاف ان کے غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے دھمکا کر فرمایا کلا گویا ایک چپت لگا دیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا جس تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کلا میں ہے۔ چونکہ یہ لوگ بدرجہ کامل الیقین نہ ہونے کی معیت حق سے محروم تھے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لئے موخر کو مقدم کیا اور مقدم کو موخر کیا کیونکہ قاعدہ ہے **تقدیم ماحقہ التاخیر یفید الحصر**۔ اور اسی وجہ سے معی بصیغہ مفرد فرمایا۔ صیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا مطلب یہ تھا کہ میرے ہی ساتھ میرا پروردگار ہے تم لوگ بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو۔

اب بتلایئے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصود کو ادا فرمانا چاہتے جو موسیٰ علیہ السلام نے ادا فرمایا کیا اس وقت بھی آپ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ہی فرماتے جو لوگ بلاغت سے کچھ ذوق رکھتے ہیں وہ کبھی اس کے قائل نہ ہوں گے بلکہ وہ اس کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس مقصود کے ادا کے لئے حضور بھی وہی اختیار فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے اختیار فرمایا۔

لیجئے تفصیلی جزئیات میں کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ایک ادنیٰ طالب علم بھی احتمال نکال کر باطل

کر سکتا ہے اس لئے حضور کے فضائل میں ہمیشہ اجمالی گفتگو کرنی چاہئے تفصیلی کلام کبھی نہ کرنا چاہئے مثلاً معراج ہی کے بارہ میں اجمالاً یہ کہنے کا مضائقہ نہیں کہ حضور کی معراج دیگر انبیاء کی معراج سے اکمل و افضل ہے کیونکہ آپ سید الانبیاء ہیں۔ آپ کو حق تعالیٰ سے جس درجہ قرب ہے وہ سب کے قرب سے بڑھا ہوا ہے اور معراج کی حقیقت قرب ہی ہے اور تفصیل کر کے یوں مت کہو کہ حضور کی معراج یونس علیہ السلام کی معراج سے اس لئے افضل ہے کہ آپ نیچے سے اوپر بلائے گئے اور وہ اوپر سے نیچے بلائے گئے کیونکہ میں بتلا چکا ہوں کہ نزول بنفسہ وجہ نقص نہیں بلکہ نزول تو ہر صاحب عروج کا اس کے عروج سے افضل ہوتم ہے گو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یونس علیہ السلام کا نزول حضور کے عروج سے افضل ہو مگر تاہم یہ تو معلوم ہو گیا کہ نزول فی نفسہ سبب نقص نہیں اگر نزول کو علی الاطلاق نقص کہا جاوے تو نعوذ باللہ آپ حق تعالیٰ کے لئے بھی نقص کو ثابت کریں گے کیونکہ وہاں بھی نزول ثابت ہے حدیث میں ہے۔

ینزل ربنا تبارک و تعالیٰ کل لیلة الی السماء الدنیا (سنن ابی داود کتاب التطوع باب: ۲۲ ، شرح السنة للبغوی باب: ۲۰ ، سنن الترمذی: ۳۴۹۸ مسند الإمام أحمد ۲: ۲۶۴ ، ۲۶۷.)

(ہمارے رب تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر تشریف لاتے ہیں)

پس نہ عروج علی الاطلاق افضل ہوا نہ نزول بلکہ جس کو جو عطا ہو جائے وہی افضل ہے۔ ایک سبق تو یہ ہوا۔ اور اس مقام پر چند شبہات ہیں۔

اول:۔ اوپر سے نیچے آنے کو جو معراج نزولی کہا گیا ہے نہ صرف مکان کے اعتبار سے بلکہ حقیقت نزول کے اعتبار سے مگر اتفاق سے وہ حقیقت اس صورت کے ساتھ مقرون ہو گئی۔

دوم:۔ کسی نبی یا ولی کے کسی عروج کو جو اس کے کسی نزول سے افضل کہا گیا ہے اس سے اس کلیہ میں شبہ نہ کیا جاوے کہ نزول افضل ہوتا ہے کیونکہ عروج کا افضل ہونا باعتبار بعض خصوصیات مقصودہ کے ہوتا ہے۔

سوم:۔ یونس علیہ السلام کا نیچے جانا نزول کہا گیا ہے اور نزول کی افضلیت باعتبار توجہ الی الخلق للافادہ کے قرار دی گئی ہے۔

(مخلوق کی افادہ کی خاطر توجہ) کے قرار دی گئی ہے۔ سو اس وقت یہ افادہ کہاں تھا۔

جواب یہ۔ ہے کہ ایک وجہ نزول کے افضل ہونے کی غلبہ انکسار و افتقار بھی ہے سو یہ حاصل تھا اور قبض کا انفع ہونا بسط سے اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

معراج سے دوسرا سبق

دوسرا سبق اس واقعہ معراج سے سالکین کو یہ حاصل ہوا کہ وہ اپنے جو اپنے حالات کا فیصلہ خود کر

لیا کرتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے مثلاً پہلے ذکر میں جی لگتا تھا خطرات نہ آتے تھے انوار کی کثرت تھی اس کو وہ افضل حالت سمجھتے ہیں پھر خطرات آنے لگے انوار میں کمی ہوگئی تو اب سمجھتے ہیں کہ ہم مردود ہوگئے خبر بھی ہے کہ وہ عروج کی حالت تھی اور یہ نزول کی حالت ہے اور معراج کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے کہ معراج کبھی عروج سے ہوتی ہے کبھی نزول سے ہوتی ہے اور دونوں حالتیں مقبول ہیں پھر تم نزول کو ادون کیوں سمجھتے ہو پس سالک کی تو یہ حالت ہونا چاہئے۔

تو بندگی چوں گدایاں بشرط مزد مکن　　　کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو گداگروں کی طرح مزدوری کی شرط پر بندگی مت کر اس لئے کہ آقا خود بندہ پروری کا طریقہ جانتا ہے۔)

چاہے قبض ہو یا بسط ہر حال میں خدا سے راضی رہے اور اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہ کرے اگر قبض کسی معصیت کی وجہ سے نہ ہو تو پھر اس کو نزول پر محمول کرنا چاہئے جو کہ صوفیہ کے نزدیک عروج سے افضل ہے مگر اپنے لئے تجویز اس کو بھی نہ کرے بلکہ جب بسط عطا ہو تو اسی میں خوش رہے حق تعالیٰ نے قبض و بسط و نزول و عروج تمہاری مصلحت کے لئے عطا فرمایا ہے۔ وہی مصلحت کو خوب جانتے ہیں ایک عارف فرماتے ہیں۔

بگوش گل چہ سخن گفت کہ خنداں است　　　بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(گل سے کیا کہہ دیا کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ نالاں ہے۔)

گل سے صاحب بسط مراد ہے اور عندلیب سے صاحب قبض۔ مطلب یہ ہے کہ سب اسی کے باغ کی پروردہ ہیں گل بھی اور عندلیب بھی کسی کا خندہ ان کو پسند ہے اس کو بسط عطا فرمادیا کسی کا نالہ و گریہ پسند ہے اس کو قبض عطا فرمادیا تم کو تجویز کا کوئی حق نہیں ہر حال میں راضی رہنا چاہئے اصل مقصود معیت ہے اور وہ سب ان احوال میں حاصل ہے صرف لون مختلف ہے۔ اسی کو مولانا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست　　　ور بجہل آئیم ما زندان اوست
گر بخواب آئیم مستان وئیم　　　ور بہ بیداری بدستان وئیم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان ہی کا ایوان ہے کہ درج علم تک ان سے تصرف عطا ہوا اور اگر ہم جہل میں مبتلا رہیں تو ان ہی کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سو رہیں تو ان ہی کے بے ہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو انہی کی گفتگو میں ہیں یعنی یہ قوت بیانیہ بھی انہی کی عطا کی ہوئی ہے۔)

اور جہل سے مراد جہل غیر مضر ہے اور بعض دفعہ سالک پر ایسی حالت پیش آتی ہے کہ نہ اس کا قبض ہونا معلوم ہوتا ہے نہ بسط ہونا اس میں سالک حیران ہوتا ہے کہ میں اپنی اس حالت کو کیسا سمجھوں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ حالت کیسی ہے۔ مولانا اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

در تردد ہر کہ او آشفتہ است   حق بگوش او معما گفتہ است

(جو شخص کسی تردد میں پریشان ہو رہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہہ دیا ہے)

یعنی پریشان نہ ہو محبوب نے تمہارے کان میں معما کہہ دیا ہے جس کا مطلب حل نہ ہونے سے پریشانی ہو رہی ہے کبھی وہ عاشق کے امتحان کے لئے ایسی بات فرما دیا کرتے ہیں جس سے وہ چکر میں پڑ جائے۔ حیرت کی ایک قسم یہ بھی ہے۔ مولانا نے حیرت کے اقسام بیان فرمائے ہیں کہ ایک تو حیرت محمودہ ہے اور ایک حیرت مذمومہ۔ حیرت مذمومہ وہ ہے جس کا منشاء جہل محض ہو کہ اس کو محبوب کا راستہ ہی نہیں ملا بلکہ رستہ سے الٹا جا رہا ہے اس کی حیرت تو حیرت مذمومہ ہے۔ اور ایک حیرت وہ ہے جس کا منشاء کثرت علوم ہو کہ محبوب کا پتہ تو لگا لیا ہے رستہ پر چل رہا ہے مگر کسی تجلی کے تواتر سے حیران ہو گیا ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں   جز کہ حیرانی نباشد کار دین

(کبھی یہ دکھلاتے ہیں کبھی اس کی ضد۔ سوائے حیرانی تجلیات میں کچھ نہیں ہے۔
آگے بعض دوسری اقسام کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔)

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوئے دوست   بل چنیں حیراں کہ رویش سوئے دوست
آں یکے حیراں کہ رویش سوئے دوست   واں دگر حیراں کہ رویش روئے دوست

(نہ ایسے حیران کہ دوست کی طرف پیٹھ کئے ہوں بلکہ ایسے حیران ہیں توجہ ان کی محبوب کی طرف ہے وہ ایک ایسا حیران ہے کہ منہ اس کا دوست کی طرف ہے وہ دوسرا ایسا حیران ہے اس کا منہ دوست کے چہرہ کی طرف ہے۔)

خلاصہ مجموعہ اشعار کا یہ کہ جس کے کان میں حق تعالیٰ معما فرماتے ہیں اس کو ایسی حیرت ہو جاتی ہے جیسے کوئی عاشق محبوب کا چہرہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے اور غیر سالک کو یا اس سالک کو جو شریعت کے خلاف سلوک طے کر رہا ہو جو پریشانی پیش آتی ہے وہ حیرت مذمومہ ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ پشتش سوئے دوست کہ محبوب کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے پریشان ہے۔ پس جو سالک شریعت کے موافق چل رہا ہو اس کو کسی حالت سے پریشان نہ ہونا چاہئے عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست   بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جو کچھ طریق عشق میں سالک کو پیش آئے وہی اس کے لئے بہتر ہے صراط مستقیم اے دل کوئی گمراہ نہیں ہے۔ صراط مستقیم سے شریعت مراد ہے اگر سالک کسی معصیت میں مبتلا نہ ہو تو پھر قبض ہو یا بسط ہر حال میں راضی رہے۔ پریشان نہ ہو مولانا فرماتے ہیں۔

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو   آں صلاح تست آیس دل مشو

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں		تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

جب تجھ کو اے سالک حالت قبض پیش آئے وہ تیری اصلاح ہی کے لئے ہے جب تجھ پر حالت قبض طاری ہو تو اس میں بسط کا ملاحظہ کر خوش و خرم رہو پیشانی پر جھری مت ڈال یعنی رنجیدہ نہ ہو۔

ہاں احتیاطاً کثرت استغفار قبض کی حالت میں کر لینی چاہئے ممکن ہے کہ یہ قبض کسی ظاہری یا باطنی گناہ سے آیا ہو تو استغفار سے اس کا تدارک ہو جاوے گا۔

ہر چہ بر تو آید از ظلمات و غم		آں ز بے باکی و گستاخی ست ہم
غم چوں بینی زود استغفار کن		غم بامر خالق آمد کار کن

(تجھ کو جو ظلمات اور غم والم پیش آتے ہیں وہ تیری بے باکی اور گستاخی سے آتے ہیں جب کوئی غم پیش آئے تو فوراً استغفار کر غم حق تعالیٰ سے کارکن ہو کر آیا ہے۔)

مولانا تو محقق ہیں۔ اس لئے ذرا دھیمی طرح تسلی فرماتے ہیں مگر جو آزاد ہیں وہ کان کھول کر دو ٹوک بات کہتے ہیں چنانچہ سرمد آزاد ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں جو قبض و بسط کے تعاقب سے پریشان ہوتے اور اپنے لئے ہمیشہ بسط ہی رہنا تجویز کرتے ہیں۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد		یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد		یا قطع نظر زیار می باید کرد

(سرمد گلہ شکوہ کم کرو دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو جان و تن محبوب کی رضا میں دے دو یا دوست سے قطع تعلق کرو۔)

یعنی یہ کیا روز روز کی شکایتیں لئے پھرتے ہو بس سن لو کہ یہ محبوب تو ایسا ہی ہے جو کبھی تم کو خوش کرے گا اور کبھی رلائے گا۔ اب دو باتوں میں سے ایک بات کرو یا تو جان و تن اس پر نثار کر دو اور جس حال میں وہ رکھے اس پر راضی رہو ورنہ پھر ایسے محبوب ہی کو چھوڑ دو کیونکہ وہ تمہاری مرضی کا تابع نہ ہوگا۔ اپنی مرضی کا تابع بنانا چاہتا ہے اگر اس کی محبت کا دعویٰ ہے تو بس چپکے چپکے پڑے رہو کان نہ ہلاؤ ورنہ جاؤ اس محبوب کو چھوڑ کر کسی دوسرے محبوب کو تلاش کر لو واقعی سنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک پورا علاج ان لوگوں کا حضرت سرمد نے کیا ہے۔ مولانا کے سمجھانے سے تو سیدھے نہ ہوئے تھے اب سب درست ہو گئے۔

بس طالب کا مذاق تو وہ ہونا چاہئے جیسا حضرت سعدی نے ایک بزرگ کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ ایک رات وہ تہجد کے لئے اٹھے تو ندا آئی کہ تو جو کچھ بھی کرتا رہ یہاں کچھ قبول نہیں۔ اور ندا بھی اس زور سے آئی کہ ان بزرگ کے ایک مرید نے بھی سن لی خیر اس رات تو نماز پڑھ کر لیٹ رہے۔ اگلی رات ہوئی تو پھر وہ اپنا بوریا بندھنا لے کر اٹھے مرید نے کہا کہ حضرت ایسی بھی کیا بے غیرتی ہے

کہ وہاں تو کچھ قبول نہیں ہوتا اور آپ پھر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ شیخ نے جواب دیا کہ برخوردار یہ تو سب کچھ ہے کہ میرا عمل وہاں قبول نہیں مگر تم مجھے یہ بتلا دو کہ پھر اس در کو چھوڑ کر جاؤں کہاں؟ کوئی اور در بھی تو نہیں جہاں جاؤں میں تو اسی در پر پڑا رہوں گا۔ قبول سے مجھے کیا بحث۔

توانی ازاں دل بپرداختن　　　کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

(اس سے دل اٹھا سکتا ہے کہ بغیر اس کے کسی دوسرے سے موافقت کرے گا۔)

اس جواب پر جس میں عبدیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی رحمت کو جوش ہوا اور ندا آئی۔

قبول است اگرچہ ہنر نیستت　　　کہ جز ما پناہے دگر نیستت

(کہ جاؤ قبول کرلیا گو ہنر تو کچھ نہ تھا مگر یہ دیکھ کر رحم آ گیا کہ ہمارے سوا تیری پناہ کسی جگہ نہیں۔ بس عاشق کو تو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ سچ مچ بھی رد کردیں جب بھی لپٹا ہی رہے سعدی فرماتے ہیں۔)

اگر دعوتم رد کنی ور قبول　　　من دوست و دامان آل رسول

(اگر میری دعا در کردیا قبول کرو، میں ہوں اور میرا ہاتھ اور آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن)

پھر کیا ایسے کو قبول نہ کریں گے جو رد پر بھی راضی ہو ضرور قبول کریں گے مگر وہ کبھی اپنے عشاق کا امتحان لیا کرتے ہیں کہ دیکھیں ان کا عشق کس درجہ کا ہے۔ یہ ہمارے رد کرنے پر بھی لپٹے رہتے ہیں یا چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ امتحان بھی نہ کریں عاشق کو اس چاہنے کا کوئی حق نہیں۔

صاحبو! عشاق تو رد کرنے پر بھی نہیں گھبرائے آپ صرف قبض و بسط ہی سے گھبرا گئے۔ تعجب ہے بس اگر طالب ہو تو کام میں لگے رہو۔ اس کی پروا نہ کرو کہ ذکر میں دل لگتا ہے یا نہیں لگتا۔ ہمارے حاجی صاحب سے جو کوئی کہتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو آپ جوش کے ساتھ فرماتے کہ کیا یہ نفع کچھ کم ہے کہ تم ذکر تو کرتے ہو پھر فرماتے۔

یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے می کنم　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں ملے یا نہ ملے اس کی آرزو کرتا ہوں)

غرض سالک کو ہر حال میں راضی رہنا چاہئے (اس موقعہ پر عصر کی اذان ہوگئی تو فرمایا کہ) بس اب میں اس بیان کا خلاصہ بیان کرکے ختم ہی کرنے والا ہوں۔

خلاصہ بیان

خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ واقعہ معراج سے ہماری دو غلطیوں کا ازالہ ہوا۔ ایک تو یہ کہ ہم لوگ مقامات انبیاء میں کلام کرتے ہیں سو ہم کو ایسا نہ کرنا چاہئے تم کبھی اپنے قیاس سے یہ نہ کہو کہ فلاں نبی کا یہ مقام تھا اور یہ مقام دوسرے نبی کو حاصل نہ تھا تم کو انبیاء کے مقامات کی کیا خبر جو تم یہ فیصلے کرنے

چلے ہو۔ اس کی وہی مثال ہے کہ لومڑی شیروں کا فیصلہ کرے۔ اور اس کا ضمیمہ یہ بھی ہے کہ اولیاء کے مقامات بھی مختلف ہوتے کیونکہ انبیاء کی طرح اولیاء کے بھی مقامات مختلف ہوتے ہیں۔ آج کل لوگ اس مرض میں بہت مبتلا ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میرے پیر کا تہجد کبھی ناغہ نہیں ہوتا جاڑے ہوں یا گرمی سفر ہو یا حضر ہمیشہ اپنے معمولات کو بخوبی پورا کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے کے پیر میں یہ کمال نہیں اس کے معمولات کبھی ناغہ بھی ہو جاتے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ میرے حضرت کو خدا تعالیٰ کی طرف ایسی توجہ دائم رہتی ہے کہ اس میں کبھی فرق نہیں آتا ان کو معمولات ظاہری سے معمولات قلبیہ کا زیادہ اہتمام ہے۔ غرض کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے یہ سب خرافات ہے۔ بس جس سے جس کو نفع ہو رہا ہو اس سے لگا لپٹا رہے تم کو تفصیل کے لئے کس نے کہا ہے۔ سالکین کو مقامات اولیاء میں کبھی کلام نہ کرنا چاہئے۔

دوسرا سبق یہ حاصل ہوا کہ سالک اپنے کسی غیر اختیاری حال کو برا نہ سمجھے بشرطیکہ شریعت پر مستقیم ہو شریعت پر استقامت کے ساتھ جو حال بھی پیش آئے اس پر راضی رہے اور سب کو عروج و نزول پر محمول کرتا رہے یعنی کوئی حال عروج ہے کوئی نزول ہے اور دونوں نعمت ہیں۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام الرفع والوضع تجویز کرتا ہوں کیونکہ اس میں معراج کی حقیقت عروج و نزول ہی بتلائی گئی ہے اور وضع و رفع کے بھی یہی معنی ہیں اس کے بعد دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق دیں۔ آمین **والحمد لله رب العالمین. وصلی الله تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد خیر خلقه و علی اله و اصحابه اجمعین.**

نوٹ:۔ منبر سے اتر کر حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ وعظ جلدی صاف ہو جاوے تو اچھا ہے بحمد للہ۔ حسب ارشاد آج ۲۴ رجب ۲۴ھ کو اس کی تسوید تفصیلی تمام ہوئی اے اللہ! اس ناکارہ کو بھی ان برکات سے متمتع فرما جن کا ذکر اس بیان میں ہوا ہے۔ آمین۔

دعا قبول ہونے کے متعلق فرمایا کہ کبھی جو کچھ آدمی مانگتا ہے اس سے بہتر چیز اس کو مل جاتی ہے مثلاً کوئی سو روپیہ اللہ میاں سے مانگے اور دو رکعت آخر شب میں نصیب ہو جاویں اور سو روپیہ نہ ملیں تو دعا قبول ہوگئی کیا دو رکعت سو روپیہ سے بھی کم ہیں۔ (کمالات اشرفیہ)

نفذ اللبیب
فی عقد الحبیب

ابطال رسوم کے تحت یہ وعظ ۷ جمادی الاول ۱۳۴۱ھ کے مطابق ۲۶ دسمبر ۱۹۲۲ء بروز منگل کوٹا پولیس لائن میں چوکی پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا جو ۲ بج کر ۲۱ منٹ پر شروع ہو کر ۴ بجکر ۳۳ منٹ پر ختم ہوا۔ حاضری ۱۵۰ کے قریب تھی۔ مرزا منور بیگ مختصر نویس و خواجہ صاحب و حکیم صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لاَشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

اَمَّابَعۡدُ: اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی

کیا انسان گمان کرتا ہے کہ مہمل اس کو چھوڑ دیا جائے۔

خام خیالی

یہ ایک آیت ہے سورہ قیامۃ کی اس میں حق سبحانہ تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ نے نادانوں کے ایک خیال پر انکار فرمایا ہے۔ اس خیال کو رد کیا ہے خواہ وہ خیال درجہ اعتقاد میں ہو یا وہ خیال درجہ عمل میں ہو۔ اس تعمیم کی دلیل احسب کا لفظ ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہو جاوے گا۔

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ کیا گمان کرتا ہے انسان۔ جس کو دوسرے لفظوں سے یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ کیا خیال کر سکتا ہے انسان کو چھوڑ دیا جاوے مہمل۔ مہمل کی تفسیر اور مفہوم سمجھنا چاہئے اور اس کے بعد جو ضرورت ہوئی ہے اس کے بیان کرنے کی وہ سمجھنی چاہئے مہمل کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں دو احتمال ہیں یا تو مہمل باعتبار اعمال کے کہا گیا ہے یعنی تکلیف بالاعمال کے۔ یا مہمل باعتبار جزاء کے کہا گیا۔ کیا کے معنی میں دو درجے ہیں اہمال کے ایک درجہ تو یہ ہے کہ کسی شخص کو مکلف نہ بنایا جائے اور اس کو مطلق العنان چھوڑ دیا جاوے اور کوئی حکم اور کوئی قانون اس کے متعلق نہ ہو۔ جس کو آزادی کہتے ہیں آج کل یعنی آزاد کر دیا جاوے جیسے کوئی جانور رہا کرتا ہے آزاد اور کوئی قید اور کوئی قاعدہ اور ضابطہ اس کے لئے نہیں ہے

جہاں چاہتا ہے پھرتا ہے اور جہاں چاہتا ہے منہ مارتا ہے اور کوئی روک ٹوک اس کو نہیں۔ نہ وہ رات کو گھر لایا جاتا ہے نہ وہ کسی وقت باندھا جاتا ہے یعنی کسی عمل کا مکلف نہیں کیا جاتا اور نہ کسی ضابطہ میں پابند اس کو کیا جاتا ہے۔ یہ تو اہمال ہے باعتبار تکلیف بالعمل کے۔

اور ایک اہمال باعتبار جزاء کے ہے اس کے لئے کوئی جزا سزا نہیں بلکہ اس کو بالکل آزاد اور مطلق العنان رکھا گیا ہے۔ جزا اور سزا سے یعنی جو کچھ بھی کرے اس کا کوئی اثر نہیں جزا اور سزا کے اعتبار سے۔ یعنی خواہ وہ نیک کام کرے یا برا کام کرے نہ اس کو جزا ہے نہ سزا ہے اور اس کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایک درجہ اہمال کا یہ ہے۔

سدای کے لفظ میں دونوں احتمال ہیں اور قرآن مجید سے تائید ہوتی ہے دونوں احتمالوں کی۔ اس واسطے کہ یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن مجید کے اندر فرضیات سے گفتگو نہیں کی گئی بلکہ واقعات سے اور معاملات واقعیہ سے بحث کی گئی ہے اس واسطے ضرورت اس کی ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کو دیکھا جائے۔ اور اس میں غور کیا جاوے کہ آیا دونوں معنی اہمال کے لوگوں کے ذہن میں تھے یا نہیں۔ اس کو قرآن مجید کی آیتوں میں تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے دونوں خیال تھے۔ چنانچہ قرآن مجید کے اندر مذمت کی گئی ہے ایک خاص جماعت کی ان لفظوں سے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ

شکایت فرمائی ہے بعض فرقوں کی کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی کوئی عظمت نہیں کی اور کوئی قدر نہیں کی جب کہ یوں کہا کہ کسی بشر پر حق تعالیٰ نے کوئی شے نازل نہیں فرمائی اس خیال اور اس اعتقاد کے لوگ تھے کہ نبوت کوئی چیز نہیں اور شریعت کوئی چیز نہیں چنانچہ ان کے قول میں تصریح ہے۔ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ حق تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی شے نازل نہیں فرمائی۔ بشر نکرہ اور شی بھی نکرہ ہے اور دونوں واقع ہیں تحت میں نفی کے اور یہ قاعدہ ہے عربیت کا کہ جب نکرہ تحت میں ہوتا ہے نفی کے تو مفید ہوتا ہے عموم کو یعنی اس عموم کا حاصل یہ ہوا کہ کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی گئی بشر میں بھی تعمیم ہے اور شے میں بھی تعمیم ہے۔ پس بشر کے اندر تمام بشر آ گئے وہ حضرات بھی آ گئے جو واقع میں نبی ہیں۔ ان کی نبوت کا بھی وہ لوگ انکار کرتے تھے اور شی کے اندر تمام احکام آ گئے یعنی کسی قسم کا کوئی حکم قانون کسی شخص پر نازل نہیں ہوا۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا گویا انکار اور ایک عام انکار ہے نہ کسی ضابطہ کے ساتھ مخصوص نہ کسی بشر کے ساتھ مخصوص ان لوگوں کا خیال تھا کہ نبوت کوئی چیز نہیں ہے۔ اس آیت سے تو پتہ لگتا ہے کہ اس عقیدہ کے لوگ بھی تھے۔

دوسرے معنی جو ہیں اہمال کے اس کا پتہ لگتا ہے بہت سی آیتوں سے یہ آیت مذکور تو سوچنے ہی سے ذہن میں آئی تھی اور دوسرے معنی کے اعتبار سے جو اہمال ہے وہ تو کثرت سے منقول ہے۔ کفار

اور منکرین کے مقالات ہیں جس کا حاصل ہے بعث ونشر کا انکار۔ بہت کثرت سے آیتیں ہیں اس مضمون کی۔ یعنی کوئی چیز نہیں قیامت کوئی چیز نہیں حساب کتاب وہ کہتے تھے۔

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا

یہ فقط ہماری حیات دنیویہ ہے بس یوں ہی مرتے پیدا ہوتے چلے آئے ہیں یوں ہی سلسلہ جاری ہے۔ کوئی مرا کوئی پیدا ہوا۔ یعنی جیسے گھاس پھونس برسات میں اگتی ہے اور بڑھتی ہے اسی طرح سلسلہ جاری ہے۔ باقی معاد اور قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ۝

(اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے۔ محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں)

اسی طرح کثرت سے آیتیں ہیں جن کا مدلول یہ ہے کہ بعث وجزا کے منکر تھے ان کا اعتقاد یہ تھا کہ قیامت اور حساب کوئی چیز نہیں ہے اس اہمال کے بھی قائل تھے تو قرآن مجید سے پتہ لگ گیا کہ دونوں اہمال کا اعتقاد تھا منکرین کو حق تعالیٰ نے جب انکار فرمایا اس پر اور رد فرمایا اس اہمال کے اعتقاد کو اور اہمال کے دونوں اعتقاد قرآن مجید سے ثابت ہیں اور دونوں میں منافات کی وجہ نہیں ہے جو جمع نہ کیا جاسکے رد کے اندر دونوں کو لہٰذا اسی کے قائل ہو سکتے ہیں اور اس کی تفسیر کو عام کہہ سکتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوگا کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ اس کو اعمال کا مکلف نہیں کیا گیا اور یہ خیال ہے کہ اس کے لئے سزا وجزا کچھ نہیں ہے تو گویا دونوں پر رد ہے اعمال کے مکلف نہ کرنے کے خیال پر بھی اور سزا وجزا کے انکار پر بھی۔ یہ ہے حاصل آیت کا۔

حاصل تو معلوم ہوگیا اب یحسب کے لفظ پر غور کرنا چاہئے۔ یحسب کا لفظ بمعنی پنداشتن ہے جس کا مفہوم بہت عام ہے درجہ اعتقاد کو بھی اور درجہ اعتقاد سے گھٹا ہوا درجہ ہے خیال کا اس کو بھی دونوں کو عام ہے یہ ایک احکام لغات میں سے ہے جس کو عربیت کے ماہرین جانتے ہیں اور یہ لفظ عام ہے اس کی تعمیم کے بعد یحسب کا حاصل یہ ہوا کہ اس اعتقاد پر بھی انکار ہے جس کا کفار کو اعتقاد تھا اور وہ اعتقاد جازم تھا نیز اگر اعتقاد کے درجہ سے گھٹا ہوا ہو تو خیال پر بھی انکار ہے ہر چند کہ قرآن مجید میں اصل مقصود ان ہی فرقوں پر انکار ہے جو منکر تھے مگر حق تعالیٰ نے یہ کلام مقدس نازل کیا ہے جمیع امراض کے لئے اس لئے اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ ہر مرض کا علاج ہو سکے درجہ اعتقاد تک کی نفی تو ہے ہی قابل انکار لیکن اس سے جو کم درجہ ہے خیال کا وہ بھی قابل انکار ہے اور اس کم درجہ میں وہ درجہ بھی آ گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اعتقاد تو نہیں ہے مگر عمل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عمل ایسا ہے جیسے کہ اعتقاد انکار والوں کا عمل ہوا کرتا ہے۔

اتباع ہوئی

اس محاورہ کو نصوص کے اندر بہت استعمال کیا گیا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تارک صلوٰۃ کے لئے فقد کفر کا لفظ استعمال کیا ہے من ترک الصلوٰۃ متعمد افقد کفر۔ (جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی اس نے کفر کیا) حالانکہ اہل حق کا مذہب قرآن کی دلیل سے یہ ہے کہ کبائر کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا اور نماز کا چھوڑنا جب کہ اس کی فرضیت کا اعتقاد ہو موجب کفر نہیں ہے مگر پھر بھی کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کی تاویل میں علماء نے غور و فکر کیا ہے اور دلائل سے مول ہونا ثابت کیا ہے۔ اس کی تفصیل کی حاجت نہیں ہے اس وقت مگر صرف اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ کفر کا لفظ استعمال کرنے سے معلوم ہوا کہ کفر کے درجات مختلف ہیں۔

ایک کفر عملی ایک کفر اعتقادی

کفر عملی کا حاصل یہ ہے کہ اعتقاد تو مومنین کا سا ہے مگر اعمال کافروں کے سے ہیں تو فقد کفر کے معنی یہ ہوں گے کہ فقد کفر عملاً اس کی ایسی مثال ہے ہمارے محاورات میں جیسے کہ کوئی شخص عتاب میں زجر و توبیخ میں اپنے کسی عزیز بجگوم بیٹے کو یہ کہے کہ تم تو بالکل چمار ہو گئے ظاہر ہے کہ شرافت اس کی زائل نہ ہوگی نسب اس کا بدل نہیں گیا یعنی یہ کہ وہ ایک قوم سے نکل کر دوسری قوم میں داخل نہیں ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ کام تم ایسے رذیلوں کے کرتے ہو جیسے چمار کیا کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ محاورات کے اندر توسیع ہے مجاز بھی ہے حقیقت بھی ہے تو اس مجاز کا حاصل یہ ہوا کہ تشبیہ دی جاتی ہے ایک شخص کو کسی خاص حالت وصفت والے کے ساتھ کسی خاص وجہ سے تو فقد کفر کے بھی معنی یہ ہوئے کہ فقد کفر عملاً یعنی کام کیا کافروں کا سا۔ یعنی نماز کو فرض سمجھ کر نہ پڑھنا یہ مومن کی شان سے بعید ہے نماز نہ پڑھنا کام ہے کافروں کا کافر ہی نماز نہیں پڑھتے کیونکہ وہ منکر ہیں۔ جو نماز نہ پڑھے وہ مومن تو ہے بوجہ اعتقاد فرض سمجھنے کے مگر بھائی کام تو بہت ہی بے ہودہ کیا۔ تو جب کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے دوسرے درجہ کے لئے بھی حسب کا استعمال اس درجہ میں ہو تو کچھ بعید نہیں ہے۔

دوسرا درجہ کیا نکلا؟ یہ نکلا کہ اعتقاد تو نہیں ہے اعمال کا۔ یعنی اعتقاد میں تو نہیں سمجھتا کہ انسان مہمل ہے یعنی مکلف نہیں ہے اعمال کا یہ کہ سزا جزا نہ ہوگی۔ اعتقاد تو یہ ہے کہ جب کوئی پوچھتا ہے کیوں صاحب خدا اور رسول کا حق ہے تمہارے اوپر؟ ہاں صاحب! ہے۔ کیوں صاحب جیسا کرو گے ویسی جزا ملے گی؟ کیوں صاحب کیوں نہیں ملے گی۔ ایک ایک ذرہ کا حساب ہوگا پوچھنے پر تو یہ کہہ دیتا ہے کہ اعتقاد ضرور ہے لیکن برتاؤ ایسا ہے جیسے اس شخص کا ہو جو معتقد ہو اس کے انکار کا یعنی جزا و سزا کے انکار کا یا تشریع کے انکار کا کیونکہ اگر کوئی معتقد ہوتا انکار کا تو اس کا عمل کیا ہوتا۔ عمل یہی ہوتا کہ وہ شتر بے مہار کی

طرح مطلق العنان ہوتا کیونکہ جب اعتقاد ہی نہیں سزا جزا کا تو اس کے پابند ہونے کی ضرورت کیا تو اس کا جو طرز ہے وہی اس شخص نے اختیار کیا ایک درجہ یہ بھی ہے۔ حسبان کا وہ پہلا درجہ مخصوص کفار کے ساتھ ہے دوسرا درجہ بہت سے ایمان والوں میں بھی پایا جاتا ہے یعنی ظاہر ہے کہ بہت سے اہل ایمان کے اعمال وہی ہیں جو منکرین میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی اعتقاد تو درست ہے لیکن عمل وہی ہیں جو منکرین کے ہیں کچھ فکر اور پروا نہیں ہے کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں جو کچھ جی میں آیا کر لیا جس کو اتباع ہوئی کہنا چاہئے جو خواہش ہوئی کر بیٹھے۔ نہ یہ سوچ ہے کہ یہ جائز ہے یا نا جائز۔ نہ یہ خوف ہے کہ سزا جزا ہوگی یا نہیں۔ اگر کسی نے ٹوکا بھی تو گو بعض لوگ تمسخر سے یہ بھی کہہ ڈالتے ہیں۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

کیا مہمل بات ہے خدا تو جانتا ہی ہے عاقبت کی خبر۔ جب خدا نے بتلا دیا تو خدا کے بتانے سے تم بھی تو جان گئے۔ یہ کیا معنی یہ کیا شاعروں کی آزادیاں ہیں گو یہ ضرور ہے کہ یہ بے باکی کی دلیل ہے۔ اس قدر آزاد کلمات اس شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کو خوف نہ ہو یا جس کے قلب میں عظمت نہ ہو یہ خطرناک حالت ہے اس کی سرحد کفر سے ملی ہوئی ہے مگر جو لوگ بے باک ہیں وہ تو یہ نہیں کہتے جن سے بے پرواہی معلوم ہوتی ہو وہ شرمندہ ہوتے ہیں اور اکثر مسلمانوں کی حالت یہی ہے کہ کہتے ہیں کہ ہاں بھائی گنہگار ہیں مبتلا ہیں بہت سی مجبوریاں ہیں کیا علاج کیا جائے اللہ سے دعا کرو خدا ہماری حالت پر رحم کرے اور ہمیں اس بلا سے نجات دے یہ کہنے لگتے ہیں اکثر لوگ جو اور ذرا لکھے پڑھے ہیں انہوں نے کتابیں دیکھی ہیں اردو ہی کی سہی اب تو اردو کی کتابیں دیکھ کر بھی اپنے کو صاحب فضیلت سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بے شک گنہگار ہیں مگر اللہ تعالیٰ رحیم ہیں کریم ہیں اور غفور بھی تو ہیں۔ ان کی رحمت کے سامنے ہمارے گناہ کیا چیز ہیں کیوں صاحب! کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ تم کو آزاد کیا گیا ہے یہ تو اس آیت کے خلاف ہے یا یہ معنی ہیں کہ ان کی رحمت کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ مضر نہیں۔

اقسام ضرر

اگر یہ معنی ہیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ ضرر کی دو قسمیں ہیں۔ ضرر دنیوی اور ضرر اخروی ضرر دنیوی یہ ہے کہ کوئی چیز کھا کر بیمار پڑ جاؤ یا سنکھیا کھا کر مر جاؤ۔ یہ تو دنیوی ضرر ہے ضرر اخروی یہ ہے کہ مرنے کے بعد سزا جزا ہو عقوبیت ہو یہ دو ضرر ہوئے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ دنیوی ضرر اخف ہے اور ہلکا ہے اخروی سزا سے دو مقدمے تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ ہر موثر چیز جو کسی اثر کے زائل کرنے والی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ وہ خفیف اثر کو جلدی زائل کرے گی بہ نسبت شدید اثر کے مثلاً آگ جلانے والی ہے اور موثر ہے افناء اجسام میں یعنی جسموں کو فنا کر دیتی ہے تو جو جسم خفیف ہوگا جیسے کپڑا اور روئی اس کو جلد اڑا دے گی بہ نسبت پتھر اور لکڑی کے۔

جب تینوں مقدمے ثابت ہو گئے اور یہ اعتقاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ضرر اخروی کو رحمت حق تعالیٰ کی زائل کر دے گی اور حق تعالیٰ معاف فرما دیں گے تو دنیوی ضرر تو اس سے اخف ہے اس کو بدرجہ اول زائل کر دے گی۔ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کا غفور رحیم ہونا مسلم ہے پھر اگر ایک شخص سنکھیا کھا لے اور اس کو ضرر بھی پہنچ جاوے تو سنکھیا نے کیوں اثر کیا۔ کیا وجہ ہے اس کی؟ کیا جب کہ سنکھیا اثر کرتا ہے اس وقت خدا تعالیٰ رحیم ہیں یا نہیں۔ یہ اعتقاد تو کفر ہے کہ رحیم نہ رہے پھر کیا وجہ ہے اس نے ضرر کیوں کیا سنکھیا نے آپ کچھ جواب دیں گے یہی جواب دیں گے کہ رحیم تو ان کی شان ہے مگر جب تک اس کے ظہور کا ارادہ نہیں ہوگا تب تک ظہور رحمت کا فعلیت کے درجہ میں نہیں آتا اور یہ کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ چونکہ اس وقت رحمت کو متعلق کرنا نہیں چاہا اس واسطے سنکھیا کا اثر ہو گیا۔

سو بعینہ حالت ضرر اخروی عقوبت نار کے بارہ میں بھی ہے اس میں کیسے بے باکی اور جرات پیدا ہو گئی کہ وہ غفور رحیم ہیں کچھ ضرر نہ ہوگا اور کچھ اثر نہ ہوگا آخرت میں۔

بہرحال یہ وہ لوگ ہیں جن کا اعتقاد صحیح ہے مگر معاملہ اور برتاؤ ان لوگوں کا سا ہے جن کا اعتقاد باطل ہے۔ مسلمانوں میں کثرت سے اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو اعتقاداً تو انسان کو آزاد نہیں سمجھتے مگر عملاً آزاد سمجھتے ہیں اور زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ کہیں کہیں اعتقاداً بھی آزاد سمجھتے ہیں مگر اس آزادی میں اور کفار جس آزادی کے معتقد تھے اس میں قدرے فرق ہے۔ ان لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ حق تعالیٰ نے مکلّف بنایا ہی نہیں۔ ان کا یہ اعتقاد تو نہیں ہے مگر ہاں بعضوں کا یہ اعتقاد ہے کہ حق تعالیٰ نے زیادہ امور میں تنگی نہیں فرمائی اور حرمت و حلت کا قانون اس کے متعلق نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یہ ہے کہ شریعت نے اس میں دخل نہیں دیا۔ چنانچہ اب لوگوں کی زبان پر یہ بات آ گئی ہے کہ مولوی لوگ ہر بات میں تنگی کرتے ہیں۔ یہ تو دنیا کے کام میں، ہم کو اختیار دیا گیا ہے کہ جو چاہیں کر لیں۔

چنانچہ میں نے ایسی تحریریں دیکھی ہیں ایک تو زبانی گفتگو ہوتی ہے عوام کو وہ زیادہ مضر نہیں ہوتی نہ وہ باقی رہتی ہے وہ چونکہ الفاظ ہوتے ہیں جن کی حقیقت ہے صوت خاص اور صوت کی حقیقت ہے ہوا۔ تو الفاظ کی حقیقت ایک ہوا ہوئی کیونکہ قسم کی حقیقت مقسم ہوتی ہے ہوا ایک ایسی چیز ہے کہ اڑ جاتی ہے اس کو بقا نہیں۔ بات تمام ہو گئی منقطع ہو گئی بخلاف کتابت کے یہ گویا محفوظ چیز ہے تو بہت لوگ اس کو تقریر سے گزر کر تحریر میں بھی لے آئے ہیں۔ چنانچہ میری نظر سے ایسی تحریریں گزری ہیں اور یہ تحریریں ان لوگوں کی تحریریں ہیں جو اپنے کو محقق سمجھتے ہیں اور مصلح قوم سمجھتے ہیں اور بیڑا اٹھایا ہے قوم کی اصلاح کا مسلمانوں کی اصلاح کا۔ مگر ایسے مصلح مشابہ اس شخص کے ہیں جس کی حقیقت ایک بوجھ بجھکڑ کی سی ہے۔

کسی گاؤں میں ایک دانشمند رہتا تھا جو بہت عقلمند سمجھا جاتا تھا اتفاق سے اس گاؤں میں ایک شخص سے یہ غلطی ہوئی کہ تاڑ کے یا کھجور کے درخت پر چڑھ گیا۔ اب جو زمین نظر آئی تو خوف زدہ ہوئے۔

اترتے ہیں تو اترا نہیں جاتا خوف کے مارے چلانے لگے گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے سوچ بچار کرنے لگے کہ کس طرح اتاریں کوئی تدبیر ہی سمجھ میں نہیں آئی وہی بوجھ بجھکو یاد آئے انہیں بلایا گیا اوپر دیکھا نیچے دیکھا خوب غور کر کے فرمایا کہ رسالاؤ۔ رسالائے حلقہ سا بنا کر گرہ لگاؤ گرہ لگائی گئی اس نے کہا کہ اس کو کوئی قوی شخص اوپر پھینکے۔ کسی نہ کسی طرح اوپر پھینکا گیا ان کے پاس پہنچ کر حکم دیا یہ حلقہ کمر میں باندھ لو۔ پھر گاؤں والوں کو حکم دیا کہ جھٹکا دو کھینچو انہوں نے جھٹکا دیا نیچے آ پڑے مر مرا گئے گاؤں والوں نے کہا یہ کیا حماقت کی بولا قسمت! میں نے تو بہت سے آدمیوں کو اسی ترکیب سے کنویں سے نکالا اب میں قسمت کو کیا کروں۔

تو جیسے وہ بزرگ تھے ایسے ہی اس وقت مصلح قوم پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ نے درخت کو کنویں پر قیاس کیا جیسے کنویں کے اندر کا آدمی اس میں سے رسا کھینچنے سے نکلتا ہے ایسے ہی درخت پر سے بھی اتر آئے گا یا اس شخص نے قیاس فاسد کیا تھا۔

مصلحین قوم کی حالت

تو جیسے اس نے قیاس کیا تھا یہی حالت مدعیان اصلاح قوم کی ہے جبکہ ان کو علم دین حاصل نہ ہو محض رائے کی بنا پر اصلاح کرتے ہوں۔ یہی حالت ان کے قیاس فاسد کی ہے ایک حکم دیکھ کر اور ایک قانون کو دیکھ کر دوسری جزی کو اس کی نظیر سمجھ کر اس پر قیاس کر کے وہاں بھی حکم چلا دیتے ہیں اور یہ وہ خیال ہے جو جاہلیت کا خیال ہے کافر کہتے تھے اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بیع بھی مثل سود ہے) حق تعالیٰ نے جب ربوا کو حرام کیا تو شبہ کیا کہ بیع تو جائز ہے اس میں بھی زیادت ہوتی ہے اور نفع ہوتا ہے تو دونوں میں نفع ہے اس میں فرق ہی کیا ہے۔ یہ ایسی مثال ہے کہ ماں بھی عورت ہے بی بی بھی عورت ہے سمجھ میں نہیں آتا ایک حلال ہے اور ایک حرام ہے۔ کتا بھی جانور ہے بکری بھی جانور ہے سمجھ میں نہیں آتا ایک حلال ہے ایک حرام واقع میں تو فرق ہے مگر ہر شخص کو اس فرق کا نہ سمجھنا ضروری نہ سمجھانا ضروری ہے بلکہ ناممکن تو یہ حالت ہو رہی ہے مصلحان قوم کی۔

تو ان مصلحان قوم میں سے ایک کی تحریر دیکھی ہے جس نے کہا ہے کہ ان مولویوں نے شریعت کو تنگ کر ڈالا ہر چیز کو شریعت میں ٹھونس دیا اور یہاں تک حکم لگا دیا کہ فلاں جگہ کے بال رکھنا جائز اور فلاں جگہ کے ناجائز بھلا شریعت سے بالوں کا کیا تعلق۔ اور صاحب یوں نہ بیٹھئے یوں نہ لیٹئے۔ یوں کھاؤ یوں نہ کھاؤ یوں استنجا کرو یوں پیشاب کرو مصیبت میں ڈال دیا مسلمانوں کو۔ شریعت کو اس سے کیا بحث؟ ان لوگوں نے شریعت کو منحصر سمجھا ہے چند احکام میں نماز پڑھ لو روزہ رکھ لو حج کر لو زکوۃ دے لو بس ہو چکا اس سے کیا بحث شریعت کو کہ ریل میں جاؤ تو پندرہ سیر سے زیادہ اسباب نہ لے جاؤ ورنہ حقوق کا مواخذہ ہو گا۔ یہ کوئی بات ہے اگر لے گئے کیا ریل گھس گئی ریل کا کچھ بگڑ گیا۔

مجھے ایک سرحدی کی حکایت یاد آئی۔ ریل میں سفر کر رہے تھے دو من کا بورہ کشمش کا بغل میں لے کر اترے ماشاء اللہ بابو آیا ٹکٹ مانگا ٹکٹ دیا کہا اس کی بلٹی کہا بلٹی کیا وہ بولا اس بورہ کا ٹکٹ کہتے ہیں اس کا ٹکٹ بھی یہی ہے کیا یہ اس کا ٹکٹ نہیں ہو سکتا۔ یہ پندرہ سیر سے زیادہ ہے آپ نے قانون میں اجتہاد کیا کہنے لگا پندرہ سیر اس شخص کے لئے جو پندرہ سیر سے زیادہ نہ اٹھا سکے ہم دو من اٹھا سکتے ہیں ہمارا بھی پندرہ سیر ہے آپ نے قانون کی بھی تفسیر کی ایسے ہی مفسرین شریعت کے پیدا ہوئے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس حکم کا یہ حاصل ہے مولوی لوگ سمجھے نہیں۔

چنانچہ ربوا کے مسئلہ میں رسالے موجود ہیں خواہش نفس سے مسئلے بدل کر علماء پر الزام لگائے ہیں یہ غنیمت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہتے ہیں کہ حضور نے تو خاص وقت کے مناسب احکام بتلائے تھے مولویوں نے ان کو عام کر لیا یا حضور اقدس نے بعض حکم دیا ہی نہیں مولویوں نے ایجاد کر لیا۔

چنانچہ ایک بیرسٹر الہ آباد میں ہیں۔ وہ مولانا محمد حسین صاحب سے کہتے تھے مولوی صاحب! اب تو مسلمانوں کو بہت تنزل ہے اگر علماء سود کی اجازت دے دیں تو بہت اچھا ہے کہا قرآن مجید میں اس کی حرمت منصوص ہے کس کی مجال ہے اس کو حلال کرے توبہ کرو توبہ کرو! آپ کہتے ہیں کیا قرآن مجید میں اس کی حرمت آئی ہے؟ کہا ہاں! تو آہستہ آہستہ رخسارہ پر طمانچے مارے مولانا یہ معلوم نہ تھا اگر یہ ہے تو سر آنکھوں پر میں تو واللہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ان مولویوں نے یہ احکام تجویز کر لئے ہیں۔

تو بعضوں کا یہ گمان ہے کہ مولویوں نے یہ احکام اپنے گھر سے بنا لئے ہیں۔ غنیمت ہے مولویوں تک ہی تبرا پہنچایا آگے حضور تک نہیں پہنچے۔ الحمد للہ کہ علماء وقایہ تو ہو گئے حضور کے سبحان اللہ غرض یہ ہے کہ اپنے نزدیک اس قسم کی اصلاحات کرتے ہیں اس کی بنا یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم کو بالکل آزاد رکھا گیا ہے۔ اس لئے بہت سے احکام کی تشریع کا انکار ہے۔ سو بعضے اس اعتقاد کے لوگ مسلمانوں میں بھی ہیں اب اگر کوئی دوسرا شخص بھی ہوتا تو ان پر بھی فتویٰ دیتا۔

فرق اعتقاد

مگر میں فتوے میں رعایت کرتا ہوں کیونکہ ان کے اعتقاد میں اور کفار کے اعتقاد میں فرق ہے۔ ان کا تو اعتقاد ہے کہ شریعت سرے ہی سے کوئی چیز نہیں ہے۔ اور ان کا اعتقاد ہے کہ شریعت تو ہے مگر اس کی مجموعی ہیئت وہ نہیں ہے جو علماء نے سمجھ رکھی ہے۔ اس لئے کافر نہیں کہے جا سکتے۔ ہاں قریب ہیں ضرور کفر کے جیسے ایک شخص نہر کے کنارے پر کھڑا ہے اور اندیشہ ہے کہ پاؤں پھسلا اور پانی میں غرق۔

بہر حال اس خیال کے بھی لوگ ہیں مسلمانوں میں قرآن مجید اس کو بھی رد کر رہا ہے اگر کوئی

شخص کہے کہ اس خیال سے تو علماء بھی خالی نہیں کیونکہ علماء بھی بہت سی چیزوں کو جائز کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ کسی امر میں آزادی کے قائل ہی نہ ہوں۔ ان کے نزدیک بھی بہت سے افعال واعمال جائز بھی ہیں تو ایسے امور کے جائز کہنے کا حاصل یہی ہوا کہ انسان مخیر ہے شریعت نے اس کو آزادی دی ہے تو تخییر اور اختیار اور آزادی اور اطلاق جواز میں فرق ہی کیا ہوا۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جو معتقد ہیں کہ بعض امور میں ہم کو آزادی دی گئی ہے تو اس بناء پر نہیں کہ ان سے شریعت نے تعرض نہیں کیا بلکہ اس بناء پر معتقد ہیں کہ ان کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک میں شریعت کا اعمال ہے ایک میں اہمال ہے غرض بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں کہ ان کے متعلق کہیں بھی قانون شرعی نے خاص قیود سے مقید نہیں کیا۔

مثلاً قانون شریعت میں اس کے متعلق کوئی قید نہیں کہ عمامہ میں چار پیچ ہوں زیادہ نہ ہوں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا قانون نے اس سے تعرض ہی نہیں کیا حالانکہ یہ نہیں ہے بلکہ قانون نے اس کے متعلق بحث کی ہے اور بحث کر کے اجازت دی ہے تو علماء کا اعتقاد یہ نہیں ہے کہ بعض امور کے متعلق شریعت نے بحث ہی نہیں کی۔ نہیں بلکہ شریعت نے بحث کی ہے اور بحث کر کے ان امور کی اجازت دی۔ غرض یہ ہے کہ جن امور کو علماء نے جائز کیا ہے ان امور کے متعلق شریعت سے فتویٰ جواز کا ملا تب جائز کیا۔ اگر شریعت سے فتویٰ جواز کا نہ ملتا تو ہرگز جائز نہ کرتے اور آزاد لوگ شریعت میں جواز کا فتویٰ تلاش ہی نہیں کرتے۔ یہ فرق ہے علماء کی آزادی میں اور ان لوگوں کی آزادی میں بہرحال قرآن مجید رد کر رہا ہے ان کے اس خیال کو۔

یہاں ایک تقسیم اور بھی ہے وہ یہ کہ ایک قسم یہ ہے کہ تمام احکام میں یہ اعتقاد یا خیال یا برتاؤ ہے اور ایک یہ کہ بعض میں ہے اور بعض میں نہیں۔ سو ایسا تو کوئی مسلمان نہیں کہ تمام احکام میں یہ اعتقاد یا خیال یا عمل رکھتا ہو البتہ ایسے بہت لوگ پائے جاتے ہیں کہ بعض احکام میں ضرور ان کا یہی خیال یا اعتقاد یا عمل ہے چنانچہ ابھی میں نے بیان کیا کہ ان کا یہ خیال ہے کہ بہت سے امور میں شریعت نے تعرض نہیں کیا اور یہ خیال جیسا کہ نقلاً ونصاً باطل ہے اسی طرح عقلاً بھی باطل ہے۔

فرق ملکیت وتصرف

وجہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ ہمارے مالک ہیں یا نہیں اور پھر مالک ہیں تو مطلقاً یا بعض وجوہ سے یا یوں سمجھئے کہ ہم لوگ ان کی ملک تام ہیں یا ملک ناقص دوسرے یہ دیکھنا چاہئے کہ مالک کو حق ہوتا ہے تصرف کا یا نہیں یعنی حق تصرف مبنی ملکیت پر ہے یا نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تصرف کرنا موقوف ہے مالک ہونے پر نیز مالک ہونا مقتضی ہے تصرف کرنے کو۔ یعنی جیسا کہ تصرف

کرنا موقوف ہے مالک ہونے پر ایسے ہی مالک ہونا مقتضی ہے تصرف کرنے کو یعنی نہ تصرف ہو سکتا ہے بدوں مالکیت کے نہ ملکیت متحقق ہوتی ہے بدوں تصرف کے پہلا قضیہ تو بالکل صاف ہے حتی کہ جہاں بھی تصرف صحیح ہوگا وہاں مالکیت کا ہونا ضروری ہے خواہ ناقص ہو یا تام۔

مثلاً حکام دنیویہ جو رعایا میں تصرف کرتے ہیں اسی بنا پر کہ وہ ایک درجہ میں اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہیں گو وہ درجہ لغت میں ملکیت کا ہے یعنی حاکم مالک نہیں ہے صرف ملک ہے ملک کہتے ہیں حاکم کو اور بادشاہ کو اور بادشاہ مالک نہیں ہوتا کیونکہ لوگ اس کے بردے اور غلام نہیں البتہ ایک گونہ اس کو اختیار رہتا ہے خاص مصالح کی وجہ سے بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ کہیں تصرف نہیں ہوتا بدوں ملکیت کے اگر ہے تو غصب اور ظلم ہے تو تصرف صحیح اور تصرف بحق بدوں ملکیت کے نہیں ہوتا سو یہ تو بالکل صاف ہے البتہ اس میں ذرا اخفا ہے کہ ملکیت کا تحقق بدوں تصرف کے نہیں ہوتا کیونکہ ظاہراً تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک ہونے کے لئے یہ ضرور نہیں کہ تصرف بھی کرے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بادشاہ اور حکام بعض چیزوں کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتے غرض اس میں ذرا اخفا ہے۔

تو بات یہ ہے کہ ایک تو وہ مالک ہے جس کا علم ناتمام جس کی شفقت ناتمام جس کی حکمت ناتمام جس کا تصرف ناتمام جس کی ملک ناتمام ایسی ملکیت تو واقعی مقتضی نہیں تصرف کو اور ایک مالک وہ ہے کہ علم اس کا محیط ہر وقت اسے معلوم کہ کون چیز کس حالت میں ہے۔ قدرت اس کی پوری ہر قسم کے تصرف پر وہ قادر توجہ اس کی ایسی کامل کہ ایک قسم کی توجہ دوسری قسم کی توجہ سے مانع نہیں **لایشغلہ شان عن شان** ایک حال دوسرے حال سے اس کو غافل نہیں کرتا پھر حکم بھی علی الاطلاق کہ سب چیزوں کی مصالح کو محیط ادھر شفقت بھی عام اور تام نہایت خیر خواہ ہر چیز کی جو مصلحت ہے اس کے موافق اس کو مکمل بھی کرتا ہے ایک مقدمہ تو یہ اور دوسرا مقدمہ یہ کہ تکمیل بلا تصرف نہیں ہو سکتی جو مالک اس شان کا ہوگا وہ ان صفات کی وجہ سے لازم ہے کہ ہر وقت اپنی مملوک چیز میں تصرف کرے۔ حق تعالیٰ کی چونکہ یہی شان ہے اور تمام صفات کمال کی اس میں موجود ہیں تو عادۃً ممکن نہیں کہ وہ ہر چیز میں ہر وقت تصرف نہ کرے۔

پھر تصرف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تصرف تشریعی ایک تصرف تکوینی کسی چیز میں یہ کہ مثلاً اس چیز کا موجود کرنا اس شے کو نشو و نما دینا اس کو صحت دینا اس کو مریض کرنا اس کو ہلاک کرنا اس کو معدوم کرنا یہ تو تصرف تکوینی ہوا۔

ایک تصرف تشریعی ہے یعنی یہ خطاب کرنا کہ فلاں چیز جائز ہے فلاں چیز ناجائز کسی شے کی نسبت امر کرنا کسی شے سے نہی کرنا۔ جب ان کے تصرفات عام ہیں۔ تو جیسا کہ تکوینی تصرف سے کوئی چیز کسی وقت خالی نہیں اسی طرح تشریعی کیفیت و تصرف سے بھی کوئی شے کسی وقت عقلاً خالی نہیں ہو سکتی ہاں اگر کوئی امر اس تصرف سے مانع ہو تو وہ اور بات ہے مثلاً مخاطب میں عقل نہ ہو بلوغ نہ ہو و

مثل ذالک۔ پس انسان کو بھی سمجھنا چاہئے کہ وہ اس میں بھی ہر وقت متصرف ہیں۔ اسی تصرف کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہانوں کا۔

تو صلوٰۃ اور نسک تصرفات تشریعیہ ہیں اور محیا و ممات تصرفات تکوینیہ ہیں۔ اس سے ہر قسم کے تصرفات حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہوئے۔

آگے فرماتے ہیں لاشریک لہ۔ اور کوئی شخص نہیں ہے جو ان تصرفات میں شریک ہو۔ ہر چیز میں حق تعالیٰ ہی متصرف ہیں اور کسی کا تصرف نہیں۔ تو ایسے تصرف کا انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری بات ہے کہ کسی امر میں بھی ہم کو مہمل نہیں چھوڑا گیا۔ تو لازم آ گئی یہ بات اور ثابت ہو گیا کہ کسی ایک حکم میں بھی ہم کو آزاد نہیں چھوڑ اور کوئی ایسی حالت نہیں جس سے شریعت نے تعرض نہ کیا ہو اب کیا حال ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ شریعت کا قانون ہماری حالت سے تعرض نہیں کرتا بلکہ بعض سے کرتا ہے بعض سے نہیں کرتا۔

غرض حق تعالیٰ کے قانون کو دنیوی قانون پر قیاس نہیں کر سکتے اس لئے وہاں جو حکام ہیں ان کا تصرف عام نہیں ہے کیونکہ ان کی ملکیت ناتمام ہے اور ملکیت اس وجہ سے ناتمام ہے کہ جو کمالات شرط ہیں ملکیت کے وہ ان میں ناتمام ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ کے کمالات تام ہیں اس لئے ان کے صفات بھی عام اور تام ہونے چاہئیں غرض خدا تعالیٰ کا یہ تصرف ہے کہ ہم ان کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں نشو ونما پاتے ہیں صحت یاب ہوتے ہیں مریض ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی تصرف ہے کہ وہ ہم کو ہر حالت میں خطاب کرتے ہیں کہ افعل کذا و لا تفعل کذا۔ یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو یہ حاصل ہے آیت کا۔

بدعات وخرافات

اسی سے موقع شناسوں کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ کیا ضرورت ہے اس بیان کرنے کی۔ وہ ضرورت یہ ہے کہ اس تقریب نکاح میں مجھ کو بلایا گیا ہے اور اس کے متعلق بھی لوگوں کے ایسے ہی غلط خیالات ہیں کہ شریعت نے اس کی رسوم سے تعرض نہیں کیا یا تعرض کیا ہے تو اس طرح سے کہ ہم کو سب رسوم کی اجازت دی ہے اور یہ خیال خصوص ان رسوم کے متعلق نہایت عام ہے جن کی صورت بھی مباح ہے پس مجھ کو ان ہی کی اصلاح اس بیان سے مقصود ہے کیونکہ جی یوں چاہا کرتا ہے کہ ہر وقت کی ضرورت کے اقتضاء کے موافق بیان کیا جائے ورنہ یہ خیال ہو گا کہ جیسے کسی کو ہو تو بخار اور نسخہ لکھ دیا جاوے درد سر کا تو وہ ایسا بیان ہو گا بخلاف اس بیان کے جو اقتضائے وقت کے موافق ہو وہ ایسا ہو گا جیسا مرض ویسا علاج تو ان تقریبات کے متعلق بہت لوگوں کے جو خیالات ہیں ان کے غلط ہونے کو اس وقت ظاہر کرنا ہے اس لئے تقریبات کے متعلق دو قسم کے اعمال ہیں۔

ایک وہ ہیں جن کو ہر شخص جو ذرا برابر بھی دین سے مس رکھتا ہے ان اعمال کو برا اور ناجائز اور حرام سمجھتا ہے وہ اعمال رسوم شرکیہ و بدعیہ ہیں جن کو ہر شخص جو ذرا بھی تعلق اور جو کچھ بھی مس دین سے رکھتا ہے ناجائز سمجھتا ہے۔ باقی دین سے جن کو کچھ بھی مس نہ ہو ان کا تو ذکر ہی کیا ان کے یہاں تو ہر چیز جائز ہے۔

چنانچہ پہلے زمانہ میں ہر طرح کے شگون اور ٹوٹکے فقط جائز ہی نہیں بلکہ واجب اور لازم سمجھے جاتے تھے بلکہ اب بھی پرانے خیال کی بوڑھیوں میں وہ مرض موجود ہے ذرا ذرا سی بات سے فال اور شگون لیتی ہیں۔ جس کی نسبت حدیث شریف میں صاف لاطیرۃ آیا ہے بدشگونی اور ٹوٹکہ کوئی چیز نہیں بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں۔ بدھ منحوس ہے منگل کا دن ایسا ہے فلاں دن فلاں طرف سفر کرنا برا ہے فلاں دن فلاں طرف اچھا ہے۔ فلاں دن کپڑا مت خریدو فلاں دن کپڑا مت سیو اور بہت سے خیالات ہیں کوا بولا مہمان آئے گا جوتی پر جوتی چڑھ گئی سفر ہوگا۔ ہتھیلی کھجلائی روپیہ آئے گا خرافات اور جاہلیت کے خیالات۔

حیرت کی بات ہے کہ ان خرافات کے لئے دلائل تجویز کیے ہیں کہیں فالنامے ہیں کہیں حضرت علی سے روایتیں ہیں۔ حضرت علی انہیں ایسے سستے مل گئے ہیں کہ تمام عجائب و غرائب ان کے سر مڑھ دیئے جاتے ہیں۔ نعوذ باللہ! حضرات اہل بیت کے علوم تو مستفاد من النبوۃ ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لاطیرۃ تو حضرات اہل بیت کیسے قائل ہو جاویں گے طیرۃ کے پہلے زمانہ میں شادیوں کے اندر ایسی رسمیں شرک و بدعت کی بے حد تھیں یہاں تک کہ موسل میں ڈوری بندھوانے کی ایک رسم تھی جب کوئی بزرگ خاندان آتا تھا تو اس سے برکت کے لئے ڈوری بندھواتے تھے اور تعجب کی بات ہے کہ علماء کو بھی ان خرافات میں شریک کر لیتی تھیں اپنے گھر میں کوئی عالم ہوا تو اسے موسل میں ڈوری باندھنے لے جاتیں تاکہ برکت ہو اور من بھر کی جگہ دو من چاول نکل آویں۔ کہیں دلہن کے پلہ ہلدی کی گرہ باندھتیں کہیں ایک بچہ اس کی گود میں دیتیں کہ دیکھ کر کہا اللہ میاں ایسا ہی بچہ لے لوں گی۔ یہ باتیں کہیں کہیں اب بھی ہیں۔

کسی عورت کے اگر بچے نہ جئیں تو بعض جاہل بچہ کو پیدا ہوتے ہی گھورے پر ڈال آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھ اللہ میاں! اگر لینا ہے تو ابھی لے لے پھر نہیں ملے گا۔ اگر وہ کچھ دنوں نہیں مرتا تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا ان کا معاہدہ پورا ہوا۔ معاہدہ ہوا ہی کب تھا۔ اگر ہوا بھی تو ایک ہی طرف سے تو ہوا اس قسم کے خرافات کثرت سے ہیں۔

اناؤ کے ضلع میں میرے ایک دوست نے ایک نکاح میں مدعو کیا تھا میں نے کہا خرافات تو نہیں ہوں گی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ نہیں ہوں گے اور وعدہ بھی کیا عورتوں سے وعدہ لے کر ایک دن رات کو مجھے تو نیند میں پتہ بھی نہ چلا ان کو ڈھمک ڈھمک کی آواز سنائی دی گھر میں گئے تو دیکھا کہ ڈھول بج رہا ہے۔ انہوں نے ڈانٹا کہ یہ کیا واہیات ہے۔ کہا نہیں ذرا سا شگون کیا تھا۔ اتنا بھی نہ ہو تو میت میں اور شادی میں فرق ہی کیا رہا ہے۔

میرٹھ میں تماشا ہوا۔ ایک رئیس کے یہاں شادی تھی۔ وہ متبع سنت تھے بالکل سادگی کے ساتھ تقریب تھی نہ ڈھول نہ تماشا نہ باجا نہ گانا ایک صاحب چپکے سے بولے ارے میاں! چنوں کی کسر ہے ان رئیس صاحب نے کہیں سن لیا خدمتگار کو حکم دیا کہ ایک روپے کے چنے لے آؤ۔ جب وہ لے آیا تو کہا ان کے سامنے رکھ دو اور کہا پڑھے کلمہ شریف! کیا حرج ہے اور برکت ہو جائے گی اور کلمہ شریف کی برکت ہی حاصل کرنے کے لئے تو اس کو میت کے لئے پڑھتے ہیں تو میری شادی میں برکت ہو جاوے گی۔

اسی طرح سورۂ یاسین شریف جو موت کے قریب پڑھی جاتی ہے تو خاص برکات کے لئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا خاص موت ہی سے تعلق ہے۔ میں ایک جگہ مریض کی عیادت کے لئے گیا اس وقت جی چاہا کہ برکت کے لئے سورۂ یاسین شریف پڑھوں مگر ڈر کے مارے پکار کر نہ پڑھی کہ عورتیں کوسیں گی۔

ایک ظریف کو پورا قرآن تو یاد نہ تھا محض جاہل تھا۔ لیکن گاؤں میں اپنے کو حافظ مشہور کیا۔ رمضان شریف میں ادھر ادھر کی جو سورتیں یاد تھیں انہیں ملا کر سنا دیا اور کہا کہ کلام مجید ختم ہو گیا۔ مٹھائی تقسیم کرو۔ گاؤں میں ایک شخص کو یاسین یاد تھی۔ حافظ جی نے یاسین پڑھی نہ تھی کیونکہ انہیں یاد ہی نہ تھی۔ اس نے کہا حافظ جی یاسین نہیں پڑھی۔ وہیں بولے میاں کہیں نماز میں یاسین بھی پڑھی جاتی ہے۔ وہ مردوں پر پڑھی جاتی ہے اگر میں پڑھ دیتا تو سارا گاؤں مر جاتا۔ یہ سن کر وہ راضی ہو گیا۔

مردہ کے تلبس کا اتنا بڑا اثر سمجھتے ہیں کہ مردہ کی چارپائی کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اس کے کپڑے پہننے کے منحوس سمجھے جاتے ہیں۔ ان سب کو خیرات کر دیتے ہیں گویا خیرات کے لئے منحوس چیزیں ہیں مگر تماشا یہ ہے کہ مردہ کی ساری چیزیں تو منحوس لیکن روپیہ اور جائیداد منحوس نہیں۔ یہ تو ایسے مبارک ہیں کہ ان کے لئے پہلے سے امیدیں لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ بھائی اگر مردہ کی چیز منحوس ہے تو روپیہ اور جائیداد کیوں نہ منحوس ہو گئے۔ چونکہ یاسین شریف بھی مردہ کے مرنے کے وقت پڑھی جاتی ہے لہٰذا اس کو بھی اسی ذیل میں داخل کر لیا ہے اور اب کلمہ شریف کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگے ہیں۔ غرض یہاں تک غلو ہو گیا ہے کہ جس شادی میں ڈھول ڈھمکا نہ ہوا سے میت کی مجلس سمجھتے ہیں اسی لئے ان عورتوں نے شگون کیا تھا ڈھول سے۔ صاحب خانہ مجھ سے معذرت کرنے لگے۔ میں نے کہا کیا بات ہے انہوں نے ساری حکایت بیان کی۔

عقل اور شریعت

یہاں تک کہ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ بالکل اس تقریب کو جس کے اندر رسوم شرکیہ نہ ہوں تقریب ہی نہیں سمجھتے پہلے تو بہت زیادہ اس خیال کے تھے لیکن بعضے اب بھی اسی خیال کے ہیں مگر کم۔ دو وجہ سے ایک تو علم دین کی وجہ سے کہ اب علم دین پہلے سے بڑھ گیا ہے اور ایک علم دنیا کی وجہ سے یعنی دو قسم کے لوگ ہیں اہل دین اور اہل دنیا۔ دونوں اس رسموں کے قبیح ہونے پر متفق ہیں۔ اہل دین قبیح سمجھتے ہیں بوجہ مخالفت

شریعت کے اور اہل دنیا شریعت کے تو زیادہ لمبے چوڑے معتقد نہیں لیکن چونکہ یہ رسمیں عقل کے بھی خلاف ہیں اور لغو ہیں۔ اس لئے نئی روشنی والے بھی ان کو قبیح سمجھتے ہیں مگر چونکہ یہ لوگ محض عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے ان رسوم کو قبیح سمجھتے ہیں اس واسطے ہم ان کے ممنون نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے شریعت کو نہیں لیا بلکہ محض عقل کا اتباع کیا۔ ہم تو عقل کو بھی شریعت کے تابع رکھتے ہیں۔ ہم تو اول یہ دیکھیں گے کہ عقل جو حکم دیتی ہے وہ شریعت کے فتوے کے موافق ہے یا نہیں۔ اگر موافق ہے تو خیر ورنہ ہم یہ کہہ دیں گے۔

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ ساز خویش را

(عقل دور اندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا۔)

ہمیں ایسی عقل بھی نہیں چاہئے جو شریعت کے تابع نہ ہو۔ مگر عقل بالکل بے کار بھی نہیں ہے۔ اس کی مثال گھوڑے اور دامن کوہ کی سی ہے صرف اتنا کام گھوڑے کا ہے کہ دامن کوہ تک پہنچا دے اس کے بعد پہاڑ پر چڑھنے میں گھوڑا کچھ کام نہیں دے سکتا۔ آگے ضرورت ہے قدم کی۔ اسی طرح عقل اصول تک تو کار آمد ہے لیکن فروع کے درمیان ناکارہ محض ہے۔ ہاں عقل پر احسان ہے کہ اگر وہ کسی مقام پر شریعت کی خادم ہو کر کچھ تقریر کرے تو اس کی تقریر سن لی جائے۔

اگر کوئی بڑا حاکم تقریر کر رہا ہو تو اس کا خانساماں اس کی تائید میں کہے جی حضور بجا ہے تو کیا اس خانساماں کے اس تائید کرنے سے اس حاکم کے قول کی کچھ قدر بڑھ گئی۔ اور کیا اس تائید سے وہ خود حاکم ہو گیا۔ ہرگز نہیں بلکہ اس حاکم کا اس خانساماں پر احسان ہے کہ اس کی تائید کو سن لیا ہم تو اس خانساماں کو ڈانٹ دیتے کہ کیا بک بک کر رہا ہے۔

تو شریعت کی یہ عنایت ہے کہ اگر عقل شریعت کی خادم ہو کر اس کی تائید کرتی ہے تو وہ اس کی تائید کو سن لیتے ہیں ورنہ عقل کے دخل در معقولات کا مقتضا یہ تھا کہ شریعت عقل کو بولنے تک کی اجازت نہ دیتی۔ غرض حق تو یہ تھا کہ عقل شریعت کے سامنے لا و نعم کچھ نہ کہے بلا قیل و قال اس کا اتباع کرے ہاں البتہ اگر نعم کہے تو ہم تب بھی قدر کریں گے اور اگر کچھ نہ کہے تو وہ اس درجہ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست
لیک عشق بے زباں روشن ترست

(اگرچہ زبانی بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان روشن تر ہے۔)

اور اس انقیاد کے لزوم کی وجہ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو علاقہ ہے مومن کو وہ محض عقلی نہیں ہے بلکہ عشقی ہے اور جو عشقی علاقہ ہوتا ہے اس کا مقتضا یہ ہوتا ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں میں ہر حالت میں آپ سے راضی ہوں۔)

اور اس کا مذہب یہ ہوتا ہے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جان سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور ناپسند ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنا دل قربان کرتا ہوں۔)

ذرا بھی کہیں چوں وچرا نہیں کرتا فانی محض ہوتا ہے پس عشقی علاقہ اس کو مقتضی ہے کہ جہاں شریعت کا کوئی حکم سن لے اس کو بے چوں وچرا مان لے اس عشقی علاقہ میں عقل بے چاری کی رسائی بھی نہیں ہے مگر خیر اس کی تصدیق اور تائید میں کچھ بولے تو اجازت ہے۔

بہر حال ان عقلاء نے ان رسوم کی ممانعت اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ شریعت کے خلاف ہیں بلکہ اس وجہ سے ممانعت کی ہے کہ وہ ان رسوم کو اپنے نزدیک عقل کے خلاف سمجھتے ہیں اس واسطے ہم ان کے ممنون نہیں کیونکہ جب بنا ان کے حکم کی محض ان کی عقل نارسا ہے تو اگر کوئی حکم صحیح ان کی عقل کے خلاف ان کو معلوم ہوگا تو یہ اس حکم صحیح کو بھی چھوڑ دیں گے لیکن خیر اس پر بھی اگر ہم ممنون نہیں تو خاص اس تائید میں شاکی بھی نہیں لیکن بعد تعمق نظر ایک حالت پر شاکی بھی ہیں مگر شاکی دوستانہ ہیں اور شکایت دوستوں ہی سے ہوتی ہے وہ مسلمان ہیں اور ہمارے بھائی ہیں وہ شکایت معاندانہ اور نفرت کی نہیں ہے۔

وہ شکایت یہ ہے کہ عورتوں کو تو منع کرتے ہیں کہ فضول خرچیاں مت کرو اور خود ان کا یہ حال ہے کہ عورتوں کا زیور وغیرہ اتار کر اپنا فرنیچر درست کر لیا میز کرسی ہارمونیم اور گراموفون اور خاک بلا سینکڑوں فضول چیزیں جمع کر لیں ایک عورت شکایت کرتی تھی اور سچی شکایت کرتی تھی کہ ہمیں تو زیور سے خالی کر دیا یہ بھی آج کل مذاق ہے کہ عورتوں کو لڑکا سا رکھنا پسند کرتے ہیں نہ کچھ ہے نہ کچھ ہے یہ ایم اے ہیں۔ وہ میمیں ہیں وہ بی بی ہیں یہ بی اے ہیں گو قافیہ نہ ملا وہ عورت کہنے لگی کہ ہمارا سارا زیور چھین کر اپنے اوپر لاد لیا سر پر بجائے جھومر کے ٹوپی کا پھندنا گلے میں بجائے گلوبند اور ہار کے نکٹائی اور کالر تجویز کر لیا پاؤں میں بجائے کڑوں کے کلپ ہاتھوں میں کف حتیٰ کہ کف کی بدولت نماز کی بھی توفیق نہیں ہوتی کیونکہ وضو میں کف نہ بگڑ جاویں گے شکن نہ پڑ جاویں گی۔ بہر حال عورتوں کو تو زیور وغیرہ اتار کر ننگا منڈا کر دیا ان کو لگا دیا اپنی ضروریات میں اور خود فضولیات میں مبتلا ہو گئے مگر خیر

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی   گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

(خوش ہو رقیبوں سے دامن کھینچ کر گزر گئے اگرچہ ہماری مٹھی بھر خاک برباد ہوئی۔)

اتنا کام تو ہمارا چلا کہ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسوم نقلاً تو قبیح ہیں ہی عقلاً بھی ان لوگوں نے قبیح تسلیم کر لیا ہمارا اتنا کام تو چل گیا بہر حال اس وقت عقل پرستی کا بہت غلو ہے اس وجہ سے ہم کو یہ جوڑ لگانا پڑا کہ عقل بھی منع کرتی ہے ان رسوم شرکت وبدعت کو غرض ان رسوم کو قبیح سمجھنے میں تو اہل نقل وعقل دونوں متفق ہیں۔

فخریہ رسوم

اب رہیں دوسری رسوم ان میں بڑے بڑے عقلا بھی مبتلا ہیں اور کیا کہوں کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن واقعہ ہے کہ بہت سے علماء بھی ان رسوم میں ڈھیلے ہیں۔ میرے پاس ایسے خطوط آتے ہیں کہ اگر مجمع کرلیا یا کھانا کھلا دیا یا آپس میں کچھ دے دلا دیا تو اس میں شریعت کے خلاف کون سی بات ہوگئی۔ جب ہمارے طبیب ہی مریض ہیں تو پھر مریضوں کا علاج کون کرے وہ بیچارے جائیں گے کہاں؟

بات کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ رسوم دو قسم کی ہیں ایک وہ جو شرک و بدعت ہیں اور دوسری تفاخر کی میں کہتا ہوں کہ رسوم شرکیہ و بدعیہ تو بے شک گھٹ گئی ہیں لیکن تفاخر کی رسوم پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور چونکہ تفاخر کی رسوم کو رسوم ہی نہیں سمجھا جاتا اس لئے رسوم کی ممانعت کی جاتی ہے تو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اس وقت روشنی کا زمانہ ہے۔ اب رسوم ہی کہاں رہ گئی ہیں اور نظائر میں ان ہی رسوم شرکیہ کو پیش کردیتے ہیں اور واقع میں وہ بہت کم ہوگئی ہیں لیکن رسوم فخریہ پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں چونکہ پچھلے زمانہ میں نہ اتنا تمول تھا نہ اتنا دماغوں میں غلو تھا نہ فخر میں غلو تھا۔ بالکل سیدھی سادی معاشرت تھی بڑے بڑے امراء گاڑھا گزری پہنتے تھے ہمارے قصبہ میں صرف ایک رئیس کے یہاں ایک فرش اور ایک مراد آبادی حقہ اور ایک فتیل سوز تھا باوجودیکہ ہزاروں خوشحال اور متمول لوگ تھے جب کسی کے یہاں شادی ہوتی تو یہ چیزیں ان کے یہاں سے فرش قالین وغیرہ منگالی جاتی تھیں اور کسی کے یہاں نہ تھیں اب بھی پہلے بادشاہوں کے جوڑے عجائب خانوں میں موجود ہیں انہیں کو دیکھ لیجئے وہ ایسے ادنیٰ درجہ کے ہیں کہ بادشاہ تو بہت بڑی چیز ہے اب کوئی ادنیٰ ملازم بھی ایسے کپڑوں کو پسند نہیں کرتا یہاں تک کہ بادشاہ لوگ بھی نینو استعمال کرتے تھے چنانچہ ظفر شاہ کا جامہ نینو کا اب تک موجود ہے کیا ٹھکانہ ہے سادگی کا اب نینو چماریاں اور بھنگنیں بھی نہیں پہنتیں یہ حالت تھی اس زمانہ میں بہت ہی سادگی تھی کبر و فخر بھی کم تھا اور اس قسم کے لباس ہوتے تھے پہلے زمانہ میں۔

اب تو یہ حالت ہے کہ اگر دو سو سے کم کا ہو تو وہ جوڑا ہی نہیں اس کا نام کفن رکھا ہے کہا جاتا ہے کہ جوڑا کیا دیا جیسے کفن ڈال دیا اور اکثر جو جوڑے دوسرے عزیزوں کو دیئے جاتے ہیں وہ ہوتے بھی ایسے ہی ہیں کیونکہ اب تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہوں دس چاہے ہوں بالکل کفن سے خواہ مخواہ بہت سے جوڑے دیئے جاتے ہیں یہ بہو کے باپ ماں کا ہے' یہ نانا نانی کا ہے یہ خاک کا ہے یہ بلا کا ہے۔ غرض عدد کا پورا کرنا ضروری ہے حالانکہ ضرورت ایک کی بھی نہیں جیسے کہ کوئی لفظ بضرورت شعر بڑھا دیا جاتا ہے لیکن مصلح تو یہی کہے گا کہ شعر گفتن چہ ضرور! (شعر کہنا کیا ضروری ہے)

مرزا فائق ایک شاعر تھا۔ اس نے ایک خط منظوم غالب کو لکھا جس کے ایک شعر میں ید کا لفظ مشدد آتا تھا اور اس۔ کے حاشیہ پر لکھا دیا کہ تشدید بضرورت شعر غالب ایک مسخرہ شخص اگرچہ حاشیہ پر وہ نہ بھی لکھتا

تب بھی وہ کہیں چوکنے والا تھا اور اب تو ایک بہانہ مل گیا مسخرے نے اس کے جواب میں ایک قطعہ لکھا۔

چہ خوش گفت فائق شاعر غرا		کہ کس ہچو من ذہن رسا نباشد
چو مقام ضرورت شعر افتد		تشدید جائز چرا نباشد

(کیا خوب کہا فائق غرا شاعر نے کہ کوئی شخص میرے مثل ذہن رسا نہیں ہے جب شعر میں کسی جگہ ضرورت پیش آئے تو تشدید کس لئے جائز نہ ہوگی۔)

حقیقت میں شعر گفتن چہ ضرور۔ اسی طرح ان کو ضرورت اتنے جوڑوں کی کیا تھی۔ کون سی وحی نازل ہوئی تھی۔ اس کی بنا کیا ہے محض فخر اور اس کو کوئی برا سمجھتا نہیں اور برا کیوں نہیں سمجھتا وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری فہرست معاصی کی نہایت مختصر ہے ہم نے معاصی کی فہرست میں انتخاب کیا ہے۔ ہماری فہرست میں معاصی صرف دو چار ہیں۔ زنا، چوری، شراب خوری، بس یہ چیزیں ہمارے نزدیک معاصی ہیں اور کوئی چیز معصیت ہی نہیں۔ اگر یہ بات ہے تو حق تعالیٰ کے ارشاد کے کیا معنی سنئے ارشاد فرماتے۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (ظاہری گناہ بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ بھی۔)

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری گناہ اور باطنی گناہ۔ ظاہری گناہ کی تفسیر یہ ہے کہ جو محسوس ہو دوسروں کو اور باطنی گناہ وہ ہے جو دوسروں کو محسوس نہ ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جو ظاہری گناہ ہیں صرف یہی گناہ نہیں ہیں بلکہ اور بھی گناہ ہیں جو محسوس نہیں اور یہ جو محسوس گناہ ہیں ظاہر کے یہ محسوس کیوں ہیں۔ محسوس اس لئے ہیں کہ ان کا محل محسوس ہے یعنی ہاتھ پاؤں آنکھ زبان وغیرہ ان جوارح سے جو گناہ ہوتے ہیں چونکہ یہ جوارح محسوس ہیں اس واسطے ان کے افعال بھی محسوس ہوتے ہیں اور باطنی گناہ ایسے محل کے ہیں جو خود محسوس نہیں اس لئے وہ بھی غیر محسوس ہیں۔ وہ محل کون ہے وہ محل ہے قلب اور نفس تو معلوم ہوا کہ بعضے گناہ قلب اور نفس کے بھی ہیں۔

اب ذرا مہربانی کر کے ان گناہوں کے نام تو بتائیے جو نفس اور قلب کے ہیں آپ تو کیا بتلائیں گے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا

"خدا تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتے"۔ حدیث صحیح میں ہے۔

لایدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر (سنن ابی داود: ۴۰۹۱، سنن الترمذی: ۱۹۹۸، ۱۹۹۹، سنن ابن ماجه: ۵۹، ۴۱۷۳، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰: ۹۲.)

"جس کے قلب میں رائی برابر بھی کبر ہوگا وہ ہرگز جنت میں نہ جائے گا"۔ یہ ہے قلب کا گناہ۔ اب دیکھیے دوسرا گناہ قلب کا حق سبحانہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ

’’یعنی اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو۔ مثل اس شخص کے جو لوگوں کے دکھلاوے کے واسطے خرچ کرتا ہے‘‘۔ اس آیت سے ریا کا گناہ معلوم ہوا۔ یہ آیتیں اور حدیثیں ریا اور فخر کو حرام بتاتی ہیں اور یہ دونوں گناہ متعلق ہیں نفس اور قلب کے۔ اب اس کا تو کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا کہ ریا اور فخر بھی گناہ ہیں کیونکہ قرآن اور حدیث سے ان کا گناہ ہونا ثابت ہے۔

اب آگے واقعات کو دیکھئے کہ نیت کیا ہوتی ہے ان تقریبات میں۔ کیا یہ نیت نہیں ہوتی کہ شان ظاہر ہو شہرت ہو نام ہو ذرا ہماری بات لوگوں میں بڑھی رہے۔ گو سب کی نیتیں اس میں بھی یکساں نہیں ہوتیں۔ یعنی یہ ضرور ہے کہ انیس بیس کا فرق ہوتا ہے اور اگر زیادہ فرق بھی مان لیا جائے تب بھی کیا ہوتا ہے جس کی نیت میں زیادہ فساد بھی نہیں ہے وہ بھی یہ نہ سمجھیں کہ ہماری نیت بالکل پاک صاف ہے کچھ تو فساد ضرور ہوتا ہے اور جہاں نیت میں کچھ بھی فساد نہیں وہاں کے لئے ایک کلیہ اور موجود ہے۔ بے فکر نہ ہو جئے آگے دوسری دفعہ بھی قانون کی آتی ہے اس کے منتظر رہئے۔ ہاں اگر کوئی اس کلیہ میں بھی داخل نہ ہوتا ہو تو خیر اس کو اجازت ہوگی۔ لیکن یہ احتمال واقع ہی نہیں۔ چنانچہ ابھی عنقریب اس کا بیان آتا ہے۔

لیجئے اب زیادہ منتظر رکھنے کی کیا ضرورت ہے میں ابھی بیان کئے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اکثر طبائع کے اندر تو فخر و نمود کا ہی مادہ موجود ہے اور اس کی نسبت جیسے کلیات موجود ہیں جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ویسے ہی جزئیات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم۔

من لبس ثوب شهرة البسه الله ثوب الذل يوم القيمة (مسند الإمام أحمد ۲:۹۲، شرح السنة للبغوی ۱۲:۳۶، مشكوة المصابيح: ۴۳۴۶، ۴۳۴۹، كنز العمال: ۴۱۲۰۱.)

یعنی جو شخص شہرت کے لئے کپڑا پہنتا ہے اس کو حق تعالیٰ قیامت کے دن ذلت کا کپڑا پہنائیں گے۔

ثوب شہرت میں اضافت لامیہ ہے تو معنی یہ ہوئے الثوب للشہرۃ یعنی شہرت کی غرض سے جو کپڑا پہنا جاوے کہ لوگ انگشت نمائی کریں کہ کیسا بڑھیا کپڑا پہنا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی کپڑا اس نیت سے پہنا جاوے کہ ہمارا نام ہو ہماری شہرت ہو تو اسے قیامت میں ذلت کا لباس پہنایا جاوے گا۔ حالانکہ ہر جوڑا بہت قیمتی بھی نہیں ہوتا مگر جب اس کو شہرت کی غرض سے پہنا گیا تو وعید تو متعلق ہو گئی۔ اور شہرت کی نیت علامات سے ظاہر ہے چنانچہ بازار سے کپڑا چھانٹ کر لاتے ہیں۔ ایک دکھایا یہ نہیں۔ دوسرا دکھایا یہ نہیں تیسرا دکھایا یہ نہیں یہ ساری چھان پھوڑ فقط اس لئے ہوتی ہے کہ وہ کپڑا ایسا تو ہو کہ کم از کم ہمارے خاندان میں تو کسی کے پاس نہ نکلے تا کہ ہمارا امتیاز ہو اور ہمارا اعزاز ہو تو روزمرہ کے لباس میں دس بارہ ہیں روپیہ سے زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا پھر بھی بہت

تفاخر ہے اس میں وعید ہے۔ پس جب کہ اس قدر کم خرچ کرنے پر بھی وعید متعلق ہو جاتی ہے تو جہاں ہزاروں روپیہ خرچ کر دیا جاوے وہاں کا تو کیا پوچھنا ہے۔ ایک فساد تو یہ ہوا۔

اسراف کی حقیقت

دوسرا فساد جو اس کے لئے لازم ہے وہ اسراف ہے کیونکہ اسراف کہتے ہیں معصیت میں خرچ کرنے کو آپ کا خیال ہوگا کہ ہم کون سی معصیت میں خرچ کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں ناچ نہیں رنگ نہیں۔ اے صاحبو! تفاخر اور ریا بھی تو معصیت ہے۔ پس تفاخر کے لئے خرچ کرنا معصیت ہی میں خرچ کرنا ہے۔ اس لئے اسراف میں یقیناً داخل ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معصیت منحصر نہیں ہے ناچ رنگ اور دیگر افعال جوارح میں بلکہ بہت سے معاصی قلب کے متعلق بھی ہیں۔ چنانچہ تفاخر اور ریا ان ہی معاصی قلب میں سے ہے لہٰذا اس میں خرچ کرنا بھی معصیت ہی میں خرچ کرنا ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے۔ پس یہ بھی اسراف ہوا۔ اور ایک معصیت ہی میں خرچ کرنا کیا نماز روزہ میں بھی حد سے متجاوز ہونا اسراف ہے اور مطلق اسراف کے متعلق حق سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ان اللہ لا یحب المسرفین۔ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پس اسراف مطلقاً مذموم ہوگا۔

ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ جس کے پاس روپیہ نہ ہو اس کے لئے تقریبات میں خرچ کرنا اسراف ہے۔ ہمارے پاس تو بہت سا روپیہ ہے ہمارے لئے کیا اسراف ہے۔ کیوں صاحب! اگر روپیہ زیادہ ہو تو کیا اس کے لئے کوئی حدود نہیں ہیں۔ سنئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور سے پوچھا گیا او فی الوضوء سرف کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے۔ قال نعم فرمایا ہاں! وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے ولو کنت علی صفتہ نھر۔ یعنی اگرچہ نہر ہی کیوں نہ بہ رہی ہو وہاں بھی اسراف ہوتا ہے خواہ مخواہ ضرورت سے زیادہ پانی خرچ کرنا وہاں بھی منع ہے۔ غرض اسراف کی حقیقت ہے حد سے متجاوز ہونا۔ ہر شے میں جب حد سے بڑھو گے اسراف ہو جائے گا۔ یہ دوسرا فساد ہوا۔

اب اگر نیت کی درستی کے سبب اس فساد سے بھی بچ گئے تو ایک کلیہ شریعت میں اور ہے۔ اس کی مخالفت سے ایک تیسری دفعہ تم پر قائم ہو جاوے گی۔ وہ کلیہ یہ ہے کہ جس امر مباح کے ارتکاب سے دوسرا کوئی شخص کسی محذور شرعی میں مبتلا ہو جاتا ہو وہ مباح مباح نہیں رہتا۔ اب اگر کسی نے اپنی نیت درست بھی کر لی مگر دوسرے لوگ جن کی نیت درست نہیں ان کو تو اس شخص کے فعل سے قوت و تائید ہو گئی۔ اس لئے باوجود درستی نیت کے یہ افعال اس شخص کے لئے ناجائز ہو جاویں گے۔ اس کی مزید تفصیل آگے بھی آوے گی۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ایک کلیہ سے بچے تو دوسرا کلیہ موجود ہے۔

غرض خوب سمجھ لو کہ فہرست منکرات سے کوئی بچے گا نہیں۔ جو الزامات لگائے گئے ہیں ان سے

نکل کر جا کوئی نہیں سکتا۔ ایک الزام سے بچے گا تو دوسرا الزام عائد ہو جائے گا۔ غرض ان الزامات کی وہ حالت ہے جو اس شعر کی مصداق ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

ہر شخص پر ایک نہ ایک دفعہ قائم ہے۔ اگر کسی خاص شخص پر ان دفعات میں سے ایک دفعہ قائم نہ ہو سکتی ہو تو اس کے لئے دوسری دفعہ موجود ہے۔

تفاخر کی ممانعت

تفاخر کے متعلق ایک اور حدیث یاد آئی ہے۔ **نهىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم من دعوة المتبارئين**۔ ممانعت فرمائی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو شخصوں کی دعوت قبول کرنے سے جو ایک دوسرے سے بڑھنا چاہیں اور بخشا بخشی میں کھانا کھلا دیں۔

یہ بلا ہم نے قصبات میں بہت دیکھی ہے اور شہروں میں اور طرح کی بلائیں ہیں۔ قصبات میں تو یہ حالت ہے کہ اگر کسی نے ایک تقریب میں دو قسم کا کھانا دیا ہے تو دوسرا کہ گذشتہ فہرستیں کھانے کی نکال کر دیکھی جاتی ہیں کہ فلاں شخص کی تقریب میں کتنے کھانے تھے اگر چار تھے اور چار ہی ہماری تقریب میں دیئے گئے تو نام ہی کیا ہو گا اور تذکرہ ہی کیا ہو گا کیونکہ کوئی نئی بات تو نہ ہوئی۔ چار کی جگہ چھ ہونے چاہئیں۔ ورنہ پانچ تو ضرور ہوں۔ اب بھلا یہ تفاخر نہیں تو کیا ہے یہ اس سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اس سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا تو ان اہل رسم کو زبان سے اقرار ہے کہ ہم نمود کے لئے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک پردیسی صاحب نے ہمت کر کے اپنی بہن کو انہی کپڑوں میں رخصت کر دیا۔ اس کی والدہ کے پاس کل آٹھ سو روپیہ تھا۔ اسی میں ان کو حج بھی کرنا تھا۔ بڑی بی صاحبہ کی یہ تجویز تھی کہ لڑکی کو پانچ سو کا زیور دوں گی۔ جوڑے دوں گی پھر حج کروں گی۔ گویا آٹھ سو روپے کی رقم کیا تھا چھاپہ تھی کہ پانی ڈالتے جاؤ اور بڑھتی جائے۔ یا انہیں ضرب کا عمل آتا ہو گا کہ چار کو ضرب دیا چار سے سولہ کو ضرب دیا چار سے چونسٹھ ہو گئے۔ چونسٹھ کو ضرب دیا چار سے اور بڑھ گئے۔ اسی طرح ضرب پر ضرب دیتے چلے گئے اور رقم بڑھتی چلی گئی۔ مگر ضرب سے کاغذ ہی میں رقم بڑھتی ہے واقع میں نہیں بڑھتی۔

واقعیت کا تو یہ حال ہے کہ ایک بنئے کا منشی دکان پر بیٹھا حساب لگا رہا تھا۔ بنیوں کے منشی منیم کہلاتے ہیں۔ تو منیم جی حساب جوڑ رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ چونسٹھ کے چار ہاتھ لگے چھ ہاتھ لگے آٹھ ہاتھ لگے بارہ۔ تھوڑی دیر میں سینکڑوں کی نوبت پہنچ گئی۔ ایک فقیر بھی یہ سب کھڑا سن رہا تھا اور حاصلات کو جوڑ رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ جب حساب ختم ہو تو میں سوال کروں۔ چنانچہ جب منیم

جی حساب جوڑ چکے تو اس نے سوال کیا کہ کچھ مجھے بھی مل جائے۔ اس نے کہا میرے پاس اس وقت کچھ نہیں۔ فقیر نے کہا اجی مجھے کیوں بہکاتے ہو میں تو برابر کھڑا سن رہا تھا ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگے اتنے۔ سینکڑوں تو بھائی ہاتھ لگ چکے ہیں پھر کہتے ہو میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں۔ یہ کیا غضب ہے اس نے کہا ارے بھائی! وہ تو کاغذ ہی میں ہاتھ لگے تھے۔ واقع میں ہاتھ خالی ہیں۔ تو اگر کسی کے پاس ضرب کا عمل ہو بھی تو اس سے کوئی رقم واقع میں تھوڑا ہی بڑھ جاتی ہے۔

بہر حال بہت ہی طوفان برپا کرنے کے ارادے تھے بڑی بی کے۔ چنانچہ ہمارے گھر میں مشورہ کرنے کے لیئے رات کو آئیں۔ میدان ہوا خالی۔ صاحبزادہ نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ داماد کو بلا لائے اور لڑکی کو بہلی میں بٹھا کر حوالہ کر دیا کہ لو بھائی لے جاؤ۔ صاحب وہ کوسنے اور رونا پیٹنا مچایا کہ ایک آفت برپا کر دی۔ میں نے کہا خبردار! جو ہمارے گھر میں رونا پیٹنا مچایا جاوے۔ اپنے گھر میں جا کر روؤ پیٹو۔ اس کے بعد میں نے کہا (کیا کروں کم بخت رحم آ جاتا ہے میں نے کہا) خیر جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہو چکا۔ لڑکی تو اپنے گھر پہنچ چکی یوں کرو کہ جوڑا اب بنا دو۔ میں بھیج دوں وہ کہنے لگیں ہائے میں یوں دیتی یوں لیتی میں نے کہا خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے میں بزاز کو بلا دوں۔ خوب اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے بنا کر بھیج دو قبل اس کی واپسی کے سرخرو ہو جاؤ گی کیونکہ تم یہ کہہ سکو گی جب ہمیں خبر ہوئی تب ہم نے کپڑے بھیج دیئے۔ اس سے پہلے ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ یہ سن کر وہ کیا کہتی ہیں کہ واہ جی اب کیا ہوتا ہے اصلی موقع تو دینے کا نکل ہی گیا۔ اب کیا نام ہوگا وہ تو اب بات ہی جاتی رہی۔ اب تو میں کچھ بھی نہیں کروں گی۔

صاف کہتی ہے واہ جی! اب تو کچھ بھی نہیں کروں گی۔ آپ نے دیکھ لیا یہ تو زبان سے اقرار ہے۔ اچھا ہوا بے چاری کے روپے بچ گئے ورنہ حج ہی رہ جاتا کیونکہ آٹھ سو روپیہ سے کم میں تو آج کل حج بھی نہیں ہو سکتا بالخصوص عورتوں کا کیونکہ بدوں محرم کے عورت کو حج کے لئے جانا جائز ہی کہاں ہے اور اب تو ایک آدمی کے لئے پانچ سو روپے صرف حج ہی کو چاہئیں یعنی بلا حاضری مدینہ طیبہ کے اور اگر مدینہ طیبہ بھی جانا ہو تو تین سو روپیہ اور چاہئیں۔ غرض آٹھ سو سے کم میں تو فقط بڑی بی کا حج بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ خیر اس کا بھلا ہو گیا۔ رقم بچ گئی۔

غرض جو کچھ تقریبات میں کیا جا رہا ہے سب ناموری کے لئے کیا جا رہا ہے۔ تو اب بتلایئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے اور یہ سوال کہاں تک صحیح ہے کہ ان چیزوں میں ناجائز کی کیا بات ہے۔ یہ بالکل غلط ہے اگر گناہ کی حقیقت سے واقف ہوتے تو ہرگز ایسا نہ سمجھتے۔

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست
(خطا یہی ہے کہ دوست تم سخن شناس نہیں)

غیبت کی صورت

گناہ فقط یہی نہیں ہے کہ ڈومنیاں نچائی جائیں گناہ ڈومنی ہی میں منحصر نہیں۔ یہی تو غلطی ہے۔ آپ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گناہ فقط دو تین ہی ہیں۔ خصوص دل کے گناہ کو تو گناہ ہی نہیں سمجھتے حالانکہ یہ بات نہیں۔ گناہ بہت ہیں اور ان میں دل کے بھی بہت سے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ نماز پڑھنے مسجد میں آئے دیکھا کہ ایک سائل سوال کر رہا ہے دیکھنے میں بالکل تندرست خوب ہٹا کٹا موٹا تازہ بظاہر نہ کوئی معذوری نہ مجبوری انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ ایسے شخص کو تو سوال کرنا بالکل حرام ہے اور یہ ناجائز کام کر رہا ہے حالانکہ ممکن تھا کہ اس کو کوئی خاص عذر ہو جس کی وجہ سے وہ اکتساب کے قابل نہ ہو یا اکتساب کے قابل ہو لیکن اکتساب سے اس کی ضرورت پوری نہ ہو سکتی ہو۔

مثلاً فرض کیجئے کسی ظالم نے اس پر ایک ہزار کی ڈگری ناحق کر دی اور وہ مظلوم ہے۔ اس صورت میں گو وہ ہاتھ پاؤں سے درست ہے مگر ہزار روپیہ ایک دم وہ کہاں سے دے بلکہ اس صورت میں دو سو چار سو روپیہ اس کے پاس جمع بھی ہوں تب بھی وہ باقی روپیہ کا اکتساب ایک دو دن میں تو نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسے شخص کو اجازت ہے شریعت سے کہ بھیک مانگ کر ڈگری کا روپیہ ادا کر دے اور اپنی جان چھڑا لے۔

مگر ان کو اس کی ظاہری حالت سے شبہ پڑا اور اس کو دل میں برا کہا۔ رات کو جو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مردہ ہے اور اس کو کاٹ کاٹ کر کھانے کے لئے کوئی ان سے کہتا ہے یہ انکار کرتے ہیں تو ان کو جواب ملتا ہے کہ دن میں تو اس فقیر کی غیبت کر کے مردہ کا گوشت کھایا اور اب انکار ہے۔ انہوں نے کہا میں نے اس کو کچھ کہا نہیں۔ جواب ملا غیبت زبان ہی سے کہنے سے ہوتی ہے دل سے بھی تو ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ قلب کو دیکھتے ہیں بلکہ اصل غیبت دل ہی سے ہے۔

ان الکلام لفی الفوا دوا نما　　　جعل اللسان علی الفواد دلیلا

کلام تو در اصل قلب ہی میں ہوتا ہے زبان تو محض اس کی مترجم ہے جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہ صرف اس کو ظاہر کر دیتی ہے۔ باقی بات تو وہی ہوتی ہے جو دل میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اٹھے اور پہنچے اسی فقیر کے پاس دور سے دیکھ کر اس نے فوراً یہ آیت پڑھی۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ

جس کا مطلب یہ تھا کہ گھبراؤ نہیں توبہ کرنے سے خدا سب گناہ معاف کر دیتا ہے چونکہ اب توبہ کر چکے ہو لہٰذا سب معاف۔ تو دیکھئے غیبت دل سے بھی ہوتی ہے۔

قلبی معصیت

اسی طرح حدیثوں میں وعید آئی ہے حسد پر اور وعید آئی ہے کبر پر حب دنیا پر۔ اب بتلایئے یہ

سب گناہ قلب کے متعلق ہیں یا اعضاء ظاہری کے۔ ظاہر ہے کہ قلب ہی کے متعلق ہیں اور بھی گناہ قلب کے متعلق کیا ہوتے سارے ہی گناہوں کا تعلق اول قلب سے ہوتا ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم۔

الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسدالجسد کله الاوهی القلب. (اتحاف السادة المتقین ۳:۱۵۳، مسند الإمام أحمد ۴:۲۷۰.)

(یاد رکھو کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے گوشت کا۔ اگر وہ سنوارا ہوا ہوتا ہے تو سارا بدن سنور جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو کہ وہ قلب ہے۔)

واقعی قلب ہی کے اوپر دارومدار ہے اصلاح و فساد کا۔ صوفی تو اس کے قائل ہیں۔ سارے فقہاء بھی اس کے قائل ہیں۔ دیکھئے آخر بدوں نیت کے نماز ہی صحیح نہیں ہوتی اور نیت ہی سے ایک نماز سنت ہوتی ہے اور دوسری فرض مثلاً چار ہی رکعت سنت میں ہیں اور چار ہی فرض میں تو اگر سنت کی نیت کر لی سنت ہو گئی فرض کی نیت کر لی فرض ہو گئے برخلاف اس کے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ نیت تو کی جائے سنت کی اور ہو جائے فرض اور یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ اگر محض قلب میں نیت کر کے نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی زبان سے چاہے کچھ بھی نہ کہے۔ لیکن چونکہ ہمارا قلب پریشان رہتا ہے اور ہم کو قلب سے نیت کرنا دشوار ہے۔ اس لئے فقہاء نے احتیاطاً زبان سے بھی نیت کے الفاظ کہہ لینا تجویز کر دیا ہے ورنہ اگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہے مگر دل میں سمجھے کہ میں ظہر کی نماز ادا کرتا ہوں تو نیت متحقق ہو جاوے گی اور نیت وہ چیز ہے کہ خود حضور فرماتے ہیں۔

انما الاعمال بالنیات (الصحیح للبخاری ۲۰۱، ۸.۱۷۵، ۹:۲۹، سنن أبی داود: ۲۲۰۱، سنن الترمذی: ۱۶۴۷، سنن النسائی کتاب الطهارة باب: ۵۹، کتاب الایمان والنذور باب: ۱۹، سنن ابن ماجة: ۴۲۲۷، السنن الکبری للبیهقی ۱: ۴۱، ۲۱۵، الترغیب والترهیب ۱: ۵۶.) (سارے اعمال کا دارومدار نیت ہی پر ہے۔)

اب بتلایئے فقہا کے نزدیک بھی قلب ہی کے اوپر سارا دارومدار ہوا یا نہیں۔ نیت وہ چیز ہے کہ اگر ظہر کے وقت میں نیت فرض کر لی تب تو فرض ادا ہوں گے ورنہ اگر کسی نے ہزار نفلیں بھی ظہر کے وقت میں پڑھ ڈالیں مگر اس کے ساتھ نیت فرض نہ کی تو اس کے ذمہ فرض موجود اور عذاب تیار۔ اور حضرت قلب تو وہ چیز ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ جل وعلا شانہ کے ساتھ معاملہ کا سارا مدار اسی پر ہے۔ تو اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قلب کے متعلق کوئی عمل نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ گناہ صرف اعضاء ظاہری ہی کے متعلق نہیں ہیں بلکہ قلب کے متعلق بھی ہیں جیسا کہ بالتفصیل ثابت کر دیا گیا ہے۔ لیجئے اس جماعت کا تو فیصلہ ہوا۔

صورت اصلاح

یہ بیان ذرا طویل ہوگیا۔ لیکن یہ ضرورت تھی اس بیان کی کہ بعض لوگوں کی زبان پر یہ لفظ آتا ہے کہ شریعت کو ہماری شادی اور غمی سے کیا تعلق۔ اسی لئے میں نے یہ آیت پڑھی ہے۔ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی انکار فرماتے ہیں اور نکیر فرماتے ہیں اس خیال پر کہ انسان مہمل چھوڑا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ہر چیز کو شریعت سے پوچھو کہیں وہ جواز کا فتویٰ دے گی کہیں عدم جواز کا۔

بہت لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پھر کیا کیا رسمیں کریں اور کیا کیا نہ کریں میں کہتا ہوں کہ بجز ایجاب وقبول کے سب فضول ہے کچھ نہ کرو۔ اب چاہے مجھے کوئی دیہاتی کہے یا گنوار کہے جو چاہے کہے اور دیہاتی تو ہم ہیں ہی۔ ہمارے جواب تو دیہاتی ہی ہوں گے چاہے کوئی برا مانے چاہے بھلا مانے بس سونار کی ایک لوہار کی۔

اس جواب پر بعض نے مجھے رائے دی کہ ایسی سختی مناسب نہیں ایک دم سے ساری رسمیں نہ چھڑاؤ۔ آہستہ آہستہ چھڑانی چاہئیں۔ رفتہ رفتہ ہی اصلاح ہوتی ہے میں کہتا ہوں کہ مجھے کیوں مقید کرتے ہو مجھ سے یہ کیوں کہلواتے ہو۔ اگر ایک دم سے ساری رسمیں چھوڑنا تمہیں مشکل ہیں تو تمہیں اختیار ہے تم خود رفتہ رفتہ چھوڑ دو۔ باقی مجھے وہی کہنے دو جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں آخر تمہارا اس میں ضرر ہی کیا ہے۔ اور اگر میں ایک ایک کرکے منع کروں تو اس میں یہ خرابی ہے کہ فرض کرو آج دس چیزیں ہیں قابل منع کرنے کے اور ان میں سے صرف آٹھ کو منع کیا اب وہ سمجھیں گے کہ ہم مخاطب صرف انہی آٹھ کے چھوڑنے کے ہیں۔ خیر بے چاروں نے نفس کو مجبور کرکے ان آٹھ کو چھوڑا۔ کل کو دو کی اور ممانعت کی گئی۔ تو اب حجت ہوگی کہ لو آج یہ دو اور بڑھا دو تو کل تو اجازت دے دی تھی آج منع کرتے ہیں۔ ان کا کیا بھروسہ ہے خدا جانے کہاں تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ خرابی آہستہ آہستہ منع کرنے میں تو مجھے کیوں مقید کرتے ہو میں تو دس کی دس ہی کو منع کروں گا۔ تمہیں اگر ہمت نہ ہو تو تم ایک ایک دو دو کرکے چھوڑ دو۔ مجھے خواہ مخواہ کیوں مقید کرتے ہو۔

تو صاحب! میں تو یہی کہوں گا کہ صرف ایجاب قبول چاہئے باقی کھلانا پلانا دینا دلانا مجمع کرنا سب واہیات سب ہی میں خرابی ہے۔ کسی میں تھوڑی کسی میں بہت۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو اکثر تو یہی ہے کہ کھانا پلانا مجمع کرنا۔ دور دراز سے لوگوں کو بلانا جوڑے دینا لینا یہ سب صرف نام ونمود کے لئے ہوتا ہے نہ کسی کے ساتھ ہمدردی مقصود ہوتی ہے نہ کچھ ہر شخص اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھ لے اگر کوئی کہے کہ صاحب! ہم نے تو خوب غور کرکے دیکھ لیا۔ ہماری نیت تو بالکل ٹھیک ہے۔ ہم کو تو نام و نمود ہرگز مقصود نہیں ہمیں تو اس کا وسوسہ بھی نہیں تو میں اس کی تکذیب نہیں کرتا۔ واقعی بعضے خوش نیت بھی

ہوتے ہیں میں خواہ مخواہ ان کو کیوں الزام دوں اور جو مصالح وہ بیان کرتے ہیں وہ ایک حد تک ٹھیک بھی ہیں کہتے ہیں کہ اجی روز روز تو عزیزوں سے کہاں ملنا ہوتا ہے تقریبات میں سب سے ملاقات ہو جاتی ہے غریبوں کو کھانا پہنچ جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور نیک نیتی ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اول تو ایسے خالص نیک نیت ہیں کتنے پھر جو ہیں بھی انہوں نے بس ایک مصلحت کو تو دیکھا اور ہزاروں مفسدوں پر نظر نہ کی۔

حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء

ایک چیز پر تو نظر رہی اور دوسری بہت سی چیزیں نظر سے غائب کر دیں۔ سو حضرت سنئے! اس کے واسطے بھی شریعت نے ضوابط و قواعد مقرر کر دیئے ہیں۔ شریعت کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے نہایت منضبط اور مکمل قانون ہے۔

اکثر حضرات یہ مصلحتیں بیان کر کے مجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ میں ان تقریبات میں کچھ گنجائش نکال دوں۔ صاحب اگر شریعت میرے اختیار میں ہو تو مجھ سے تب درخواست رعایت کی کی بھی جائے لیکن شریعت میرے گھر کی چیز تو نہیں۔ اگر میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کر کے اپنی طرف سے رعایت بھی کر دوں تو اس سے ہوتا کیا ہے جو امر ناجائز ہے وہ میرے کہنے سے جائز تھوڑا ہی ہو جائے گا بلکہ الٹا مجھ ہی سے سوال ہوگا کہ تم کون تھے جائز کرنے والے تو میں کیوں مصیبت میں پڑوں۔

اب سنئے کہ شریعت نے ایسے موقعہ کے لئے کیا حدود اور قواعد مقرر کئے ہیں سو منجملہ ان کے ایک قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی چیز میں مصلحت اور مفسدہ دونوں جمع ہوں تو اعتبار مفسدہ کا ہوتا ہے یعنی اگر کسی چیز میں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے تو اس حالت میں مصلحت کو نہ دیکھا جائے گا بلکہ مفسدہ کا اعتبار کیا جائے گا پھر اس کی بھی ایک حد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصلحت دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ جس کا حاصل کرنا واجب ہو وہاں تو یہ حکم ہے کہ اس مصلحت کو حاصل کرو اور مفسدہ کو روکنے کی کوشش کرو۔

مثلاً جماعت میں آتے ہیں نماز کے لئے لیکن فرض کرو کہ امام ایسا ہے کہ قرآن غلط پڑھتا ہے یا اور کوئی ایسا ہی نقص ہے جس کی وجہ سے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے۔ تو ہم کوشش تو یہ کریں گے کہ وہ شخص امامت سے معزول کر دیا جائے لیکن جب تک ہم اس کوشش میں کامیاب نہ ہوں گے اس وقت تک اسی کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں گے یہ نہ کریں گے کہ جماعت چھوڑ دیں کیونکہ جماعت یا سنت موکدہ ہے یا واجب اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے علماء حنفیہ میں محققین کی یہی تحقیق ہے کہ واجب ہے جماعت۔ کیونکہ اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں وہ سنت موکدہ سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔

حضور فرماتے ہیں میرا جی یوں چاہتا ہے کہ لکڑیاں جمع کراؤں پھر اذان کہلاؤں اور جماعت کراؤں پھر دیکھوں کون کون جماعت میں نہیں آتا جو جو نہیں آیا ان کے گھر جا کر پھونک دوں۔ ایسی وعید سنت موکدہ پر نہیں ہوتی ہے۔ اسی واسطے ہمارے بہت سے علماء نے جماعت کو واجب کہا ہے۔

اس پر شبہ کیا ہے بعض ذہین لوگوں نے کہ یہ وعید منافقوں کے واسطے تھی نہ کہ اہل ایمان کے واسطے کیونکہ منافق ہی جماعت میں حاضر نہیں ہوتے تھے تو یہ وعید گھر پھونک دینے کی دراصل ان کے نفاق پر تھی نہ کہ ترک جماعت پر۔

میں کہتا ہوں فہم سے کام لینا چاہئے اول تو اس حدیث میں کوئی قرینہ اس تخصیص کا نہیں۔ دوسرے ایک اور بھی قاعدہ ہے کہ کفار صرف ایمان کے مکلف ہیں فروع کے مکلف نہیں اور اہل ایمان مکلف فروع کے بھی ہیں۔ مثلاً کفار جب تک کافر ہیں انہیں یہ حکم نہیں دیا جاتا کہ نماز پڑھو کیونکہ نماز بدوں ایمان کے صحیح نہیں ہو سکتی تو اگر ان کو حکم دیا بھی جائے کہ نماز پڑھو تو اس حکم سے فائدہ کیا ہوگا کیونکہ نماز صحیح تو ہونے کی نہیں۔ پھر یہ ایک فضول بات کا حکم ہوا۔ انہیں حکم دے دیا جائے گا کہ ایمان لاؤ بس ایمان لانا تھا کہ اب تمام خطاب ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور سارے فروع کے وہ مکلف بن گئے۔ اب ہر ہر حکم ان سے متعلق ہو گیا۔ اس کے پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی باغی ہو۔ اس کو یہ خطاب نہیں کیا جاوے گا کہ اگر اتنے دن تک کوئی شخص زمین پر قابض رہے تو وہ موروثی ہو جائے گا۔ سارے احکام کی تبلیغ اس کو نہیں کی جائے گی بلکہ اس کو سب سے پہلے حکم یہ ہوگا کہ بغاوت چھوڑ دو۔ اس سے پہلے دفعات فوجداری اور دیوانی کے متعلق اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا جب اس نے بغاوت چھوڑ دی تو اب اس پر سارے دفعات عائد ہو گئے۔ فوجداری کے دفعات بھی دیوانی کے دفعات بھی۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب دوسرا قاعدہ سنئے کہ منافق تھے کافر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے بتلا دیا گیا تھا کہ فلاں فلاں منافق ہیں تو ان کا کافر ہونا حضور کو معلوم تھا اور جب وہ کافر تھے تو ان کی طرف حسب قاعدہ مذکورہ جماعت کا امر متوجہ ہی نہ تھا لہٰذا وہ ترک جماعت پر کسی سزا کے مستحق ہی نہ تھے۔ پھر حضور ان کا گھر کیوں جلاتے تو وہ شبہ جاتا رہا اور ثابت ہو گیا کہ یہ وعید ترک جماعت ہی پر ہے اور ایسی سخت وعید سنت موکدہ کے ترک پر ہوا نہیں کرتی۔ اسی واسطے محققین حنفیہ قائل ہوئے ہیں جماعت کے واجب ہونے کے۔

بہر حال جماعت خواہ واجب ہو خواہ سنت موکدہ ہو ضروری چیز تو مسجد میں آنا جماعت کے لئے ایک ایسی مصلحت ہے جو ضروری ہے مگر اس کے ساتھ یہ مفسدہ مل گیا ہے کہ امام ایسا ہے جس کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے۔ اب یہاں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے مگر مصلحت ہے واجب التحصیل تو اس صورت میں حکم یہ ہوگا کہ جماعت کو نہ چھوڑو۔ اس مفسدہ کا علاج کرو یعنی امام کو الگ کرو۔ مگر الگ کرو خوش تدبیری سے فتنہ فساد کی اجازت نہیں۔ ایسی باتوں کے لئے لڑنا بھڑنا نہ چاہئے کیونکہ لڑنے بھڑنے کے مفاسد اس کراہت کے مفسدہ سے بھی زیادہ ہیں۔ اور اگر اس امام کے الگ کرنے پر قدرت نہ ہوگی تو اس پر عمل کریں گے کہ صلوا خلف کل بر وفاجر یعنی ہر شخص کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو خواہ وہ نیکوکار ہو یا بدکار یہ حکم تو مصلحت واجب التحصیل کا تھا۔

ایک مصلحت وہ ہے کہ وجوب کے درجہ میں نہیں ہے۔ جیسے تقریبات میں بہت سے بھائیوں کا آپس میں مل لینا یا غریبوں کو وقت خاص پر کھانا مل جانا۔ یہ مصلحت شرعاً واجب نہیں ہے اور اس کے ساتھ مفاسد بہت سے موجود۔ جیسے تفاخر اور ریا اور کیا اور کیا۔ جہاں ایسی مصلحت جو واجب نہ ہو کسی مفسدہ کے ساتھ مجتمع ہو جائے گی۔ وہاں اس مصلحت ہی کو چھوڑ دیں گے بلکہ ایسی ایسی ہزار ہا مصلحتیں بھی کسی ایک مفسدہ کے ساتھ جمع ہو جاویں ان کو بھی ترک کر دیا جائے گا۔ تو ہمارے قبضہ میں نہیں ہے قانون کہ تمہارے مصالح کی رعایت سے اس میں وسعت کر دی جائے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس قانون کی تصریح موجود ہے۔ ارشاد ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

یعنی پوچھتے ہیں آپ سے کہ خمر اور جوئے کا کیا حکم ہے کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور ان میں کچھ نفع بھی ہیں۔

دیکھئے خود آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ جوئے اور شراب میں مصالح موجود ہیں لیکن چونکہ گناہ بھی موجود ہے اس واسطے حکم ان کی حرمت ہی کا ہوا۔ تو یہ قاعدہ قرآن مجید سے ثابت ہو گیا کہ جہاں مفسدہ اور مصلحت غیر مطلوب فی الشرع جمع ہو وہاں ترجیح مفسدہ ہی کو ہوگی۔ لیجئے ان کو تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہی اس قانون کے انکار کی۔ لیجئے میرا مدعا آیت سے بھی ثابت ہو گیا۔

گو اس ثبوت کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ہم مقلدوں کو حق کیا ہے نصوص سے استدلال کرنے کا۔ ہم تو تابع ہیں اپنے ائمہ کے۔ جب ان کا مذہب مدون ہے تو ہمیں اسی کو لینا کافی ہے۔ یہ کام تو علماء مجتہدین کا ہے کہ نصوص سے استدلال کریں اور قانون مرتب کریں۔ ہم جیسوں کو تو یہی کافی ہے کہ جس امام سے عقیدت ہو اس کے قول پر عمل کر لیں مثلاً ہم اتباع کرتے ہیں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو ان کا قول ہمارے لئے کافی ہے ہم اسی پر عمل کریں گے۔ رہا نصوص سے استدلال سو یہ ان کا کام ہے۔ پس جب ہم مذہب حنفی میں یہ اصل لکھا ہوا مدون پاتے ہیں کہ اگر کسی کام میں مفسدہ اور مصلحۃ دونوں جمع ہوں تو ترجیح مفسدہ کو ہوگی۔ بشرطیکہ مصلحت واجب التحصیل نہ ہو۔ پس اس بناء پر ہم ان رسوم کو منع ہی کریں گے اب اس کا بھی جواب ہو گیا کہ اس میں مصلحتیں ہیں کیونکہ جہاں مصلحتیں ہیں وہاں مفاسد بھی تو موجود ہیں۔

ترجیح مفسدہ

اب ایک بات رہ گئی۔ یعنی بہت لوگ ایسے بھی تو ہیں جن کی نیت میں نہ تفاخر ہے نہ کبر نہ شہرت ہے نہ کوئی اور خرابی۔ بالکل پاک صاف ہیں وہ البتہ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب ہمارے فعل میں تو مصالح

ہیں۔ مفاسد ہیں ہی نہیں۔ سب مصلحت ہی مصلحت ہے مفسدہ کچھ بھی نہیں۔ اللہ گواہ ہے ہماری نیت نہ تفاخر کی ہے نہ ریا کی۔ ہماری نیت میں کوئی خرابی نہیں۔ ہماری نیت بالکل پاک صاف ہے۔ سو اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو ہم تکذیب نہیں کرتے ایک مسلمان کی۔ ممکن ہے کسی کی نیت ایسی ہی پاک صاف ہو اور اسراف کا جو مفسدہ تھا اس کی وہ یہ جواب دے سکتے ہیں کہ ہمیں ماشاءاللہ خدا نے اتنا دیا ہے کہ ایسے ایسے خرچوں سے ہمیں رائی برابر بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

اول تو اس کا تسلیم ہی کرنا مشکل ہے کہ نقصان نہیں پہنچتا۔ میں اگر آ جاؤں انکار پر تو کہہ سکتا ہوں کہ قرض ہو ہی جاتا ہے اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ واقعات سے بڑے بڑے لوگ بھی مقروض ہو جاتے ہیں ایسے موقع پر۔ کیونکہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر ہی ان تقریبات میں خرچ کیا کرتا ہے اور چاہے گراں نہ سمجھیں اس قرض کو۔ مگر خیر مجھے قیل و قال کرنا منظور نہیں۔ میں اس کو بھی مانتا ہوں کہ اسراف بھی نہیں ہوتا۔ بلا ضرورت میں اس بحث میں کیوں پڑوں۔ مگر ہاں جو بات کہنے کی ہے وہ تو ضرور کہی جاوے گی کیا میں حقائق کو بھی ظاہر نہ کروں۔

سو سنئے! میں نے یہ مانا کہ آپ اپنی نیک نیتی کی بناء پر اس کلیہ سے ایک درجہ میں بچ گئے کہ جہاں مفسدہ اور مصلحت دونوں جمع ہو جائیں وہاں ترجیح مفسدہ کو ہوتی ہے۔ خیر اس کلیہ سے تو آپ جیسے تیسے بچ گئے لیکن حضرت ابھی پیچھا نہیں چھوٹا۔ ابھی ایک اور کلیہ بھی موجود ہے وہی کلیہ جس کا وعدہ میں اوپر کر چکا ہوں۔ وہ بھی ہماری شریعت ہی کے اصول میں سے ہے اور قرآن و حدیث میں تائید کیا ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے جس عمل مباح سے کسی دوسرے مسلمان کو ضرر دین کا پہنچے ہمارے لئے بھی وہ عمل مباح نہیں رہے گا۔ حتیٰ کہ کسی فعل مندوب و مستحب سے بھی اگر کسی مسلمان کے اعتقاد یا عمل میں کوئی خرابی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو استحباب کو ترک کر دیا جائے گا۔ یہی راز ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بعض احادیث پر عمل کو ترک کرانے کا۔

مثلاً حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف تھی جمعہ کے دن صبح کی نماز میں الٓمٓ تنزیل اور سورۂ دہر پڑھنے کی۔ اکثر حضور کا یہی معمول تھا۔ چنانچہ شافعیہ اب بھی پڑھتے ہیں۔ اب تک ان کا یہی معمول ہے اور امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اس کا التزام مناسب نہیں۔ دیکھئے حدیث میں تو وارد مگر امام صاحب اس کو منع کرتے ہیں اصل میں امام صاحب کے اس قول کا حاصل یہ ہے کہ یہ عمل واجب تو ہے نہیں محض مستحب ہے اور اسم مستحب سے دوسروں کے واسطے ایک خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہاں پر اپنا اپنا تجربہ اور اپنا اپنا مشاہدہ ہے۔ نہ ایک کو دوسرے کا رد چاہئے نہ تنقیص۔ ممکن ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو تجربہ نہ ہوا ہو اس خرابی کا ان کو مشاہدہ ہوا ہو اور ان کو نہ ہوا ہو۔ اس میں ان سے منازعت نہیں ہو سکتی۔ غرض ان کو مشاہدہ ہوا ہو کی کیفیت کا کہ بعض مستحب افعال بھی ان لوگوں کو شبہ میں

ڈال دیتے ہیں چنانچہ معمول کے متعلق بھی امام صاحب نے سمجھا کہ کسی جمعہ میں بھی ناغہ نہ ہو اور کبھی اس کے خلاف کرتے نہ دیکھیں گے تو سمجھیں گے کہ یہ عمل لازم اور واجب ہے یہ تو اعتقادی خرابی ہوئی۔

دوسرے ممکن ہے کہ ایک اور خرابی کا مشاہدہ ہوا ہو اور وہ عملی خرابی ہے۔ وہ یہ کہ بعض دفعہ جو نماز میں مجمع ہو جاتا ہے بڑا تو دور والوں کو سنائی دیتا کہ امام کونسی صورت پڑھ رہا ہے تو اب تو خبر ہے نہیں کہ امام نے سجدہ کی آیت پڑھی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس نے تو کیا سجدہ۔ یہ گئے رکوع میں۔ وہ اٹھے سجدے سے اور کہا اللہ اکبر۔ انہوں نے سمجھا سمع اللہ لمن حمدہ۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

چنانچہ مکہ معظمہ میں ایک دفعہ یہی گڑبڑ ہوئی۔ وہاں یہ دستور ہے کہ سب اہل مذاہب جمع ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔ کسی مصلی پر نماز ہوتی ہے شافعی پر یا حنفی پر یا کسی پر۔ دوسرے اماموں کے مقلد بھی بلا تامل شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں کا قصہ نہیں ہے کہ کوئی شافعی امام ہو جائے تو اس کے پیچھے حنفی نماز نہ پڑھیں یہ واہیات بات ہے وہاں سب پڑھ لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے وہاں کوئی تخصیص نہیں کرتا۔

چنانچہ جمعہ کے دن ایک دفعہ یہ ہوا کہ صبح کی نماز شافعی مصلی پر ہو رہی تھی حج کا زمانہ مجمع تھا بہت اور وہ امام ٹھہرے شافعی انہوں نے حسب معمول الم تنزیل پڑھی اب انہوں نے سجدہ کی آیت پر پہنچ کر سجدہ تلاوت کیا اور اللہ اکبر کہہ کر ایک ساتھ سجدہ میں گئے۔ جنہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ سجدہ تلاوت کیا گیا ہے وہ سمجھے کہ امام نے رکوع کیا وہ گئے رکوع میں۔ امام اٹھے سجدہ سے کہا اللہ اکبر انہوں نے سمجھا سمع اللہ لمن حمدہ۔ اب امام تو قرأت میں ہے اور وہ منتظر ہیں کہ سجدے میں جاویں۔ اب امام سجدہ ہی میں نہیں جاتا۔ جب بہت دیر ہوگئی تو اب کوئی تو نیت توڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ کوئی سجدہ میں چلا گیا اس خیال سے کہ شاید تکبیر کی آواز نہ سنائی دی ہو۔ سجدہ سے اٹھ کر جو دیکھا تو لوگ کھڑے ہیں۔ خیر یہ بھی کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد امام نے پھر دو رکعت پڑھیں تو ان کے نزدیک گویا امام نے تین رکعتیں پڑھیں۔ غرض اسقدر گڑبڑ ہوئی کہ کوئی رکوع میں ہے کوئی سجدہ میں ہے کسی نے نیت توڑ دی کوئی سمجھا امام نے تین رکعتیں پڑھیں۔ چنانچہ ایک شخص بخارا کے بھی اس جماعت میں تھے وہ جب لوٹ کر گھر پہنچے تو کہنے لگارے میاں شافعیوں نے تو قرآن حدیث کے بالکل خلاف عمل اختیار کر لیا ہے مغرب کی طرح صبح کی بھی تین رکعت پڑھتے ہیں۔

تو آپ نے دیکھا کہاں تک نوبت پہنچی۔ پس امام صاحب نے ایسے ہی واقعات دیکھ کر فرمایا کہ جو عمل واجب بھی نہیں اور عوام میں اس کے کرنے سے پڑتی ہے گڑبڑ تو کیا ضرورت ہے کہ اس کو کیا جائے جیسے بعض لوگوں کو خواہ مخواہ شوق ہوتا ہے نئی بات کرنے کا۔

چنانچہ ایک قاری صاحب نے نماز پڑھی قرأت کے جوش میں آ کر آپ نے قل ھو اللہ احد پڑھنے میں احد پر وقف نہیں کیا' بلکہ اس کو اللہ الصمد سے ملا کر پڑھا تو چونکہ احد پر تنوین ہے اس لئے عربیت کے قاعدہ میں اس صورت میں اللہ الصمد کا ہمزہ حذف ہو جائے گا اور احد کی تنوین کا نون

مکسور ہو کر لام سے مل جاوے گا اور اس طرح پڑھا جاوے گا۔ احدن اللہ الصمد تو گویا انہوں نے صحیح پڑھا تھا مگر عوام تو نہیں سمجھتے۔ یہاں بھی بحث بڑھی کہ حضرت اس پر فوجداری ہو گئی کہ یہ اس قاری نے نیا قرآن شریف کہاں سے نکالا۔ اب بعضے جاہلوں نے کیا کیا۔

آنچہ مردم می کن بوزینہ ہم

جو انسان کرتا ہے وہی بندر بھی کرتا ہے۔

ان قاری صاحب کی نقل اتاری۔ جاہل کی نقل ہی کیا۔ انہوں نے یہ کیا کہ احد پر وقف بھی کیا اور نون مکسور بھی پڑھا یعنی ن اللہ الصمد پڑھا جو بالکل غلط ہے۔ خدا بچاوے جہل بھی کیا بری چیز ہے۔

اب فرمایئے اس موقعہ پر کیا کیا جاوے گا۔ یہی کیا جاوے گا کہ جہاں جہل ہو اس قاری کو حکم دیا جاوے گا شرعی قاعدہ سے کہ ایسا نہ کرے کیوں؟ اس واسطے کہ عوام اس سے گڑبڑ میں پڑ جاتی ہیں غرض ایسی بات کرنا جس سے عوام میں گڑبڑ پڑ جائے درست نہیں۔ تو قاعدہ یہ ٹھہرا کہ جس مباح سے اور جس مستحب سے عوام کسی دین کی خرابی میں پڑ جائیں وہ فعل خواص کے لئے بھی جائز نہیں رہتا۔ حالانکہ وہ خود اس خرابی سے بچے ہوئے ہیں ایسے موقع پر خواص کو لازم ہے کہ وہ خود بھی ایسے فعل مباح کو بلکہ ایسے فعل مستحب کو بھی چھوڑ دیں جس سے عوام کی خرابی کا اندیشہ ہو حقیقت میں یہ قاعدہ وہ پہلا ہی قاعدہ ہے مصلحت اور مفسدہ جب جمع ہوتے ہیں مفسدہ کو ترجیح ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسرے شخص کا خرابی میں پڑ جانا یہ بھی تو مفسدہ ہے۔ اگر لازم نہیں تو متعدی سہی۔

تقاضائے محبت و ہمدردی

اسی واسطے میں نے پہلے کلیہ سے بچنے کے مقام پر یہ کہا ہے کہ ایک درجہ میں جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا اب سمجھئے تو آپ کو وسعت ہے پانچ ہزار خرچ کرنے کی اور آپ کو خدا نے علم بھی دیا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کو نفس پر قدرت ہے اور آپ نے اپنے نفس کو ریا سے فخر سے کبر سے سب سے۔ بچا لیا۔ تقریب میں کوئی بے انتظامی بھی نہیں ہوئی کوئی نماز بھی قضا نہیں ہوئی بلکہ کوئی جماعت بھی فوت نہیں ہوئی حالانکہ ایسے موقعوں پر نمازیں تک قضا ہو جاتی ہیں۔ جماعت کا تو کیا ذکر۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی حج کو بھی جاوے اور وہ حج ہو نفل اور اس میں ایک بھی فرض نماز کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو حج کو جانے کی بھی اجازت نہیں۔

پھر اب دیکھ لیجئے ان تقریبات کی کیا حالت ہے۔ حالت یہ ہے کہ نہ عشاء کی نماز ہے نہ صبح کی نماز ہے۔ جماعت تو کوئی چیز نہیں مگر فرض کر لیجئے کہ آپ کے یہاں ایسا بھی نہیں ہوا۔ گو فرض کر لینا ہے بہت بعید اور ہے شاذ و نادر۔ ایسا کہ نمازوں کے فوت ہونے کی نوبت آتی نہ ہو۔ خیر اگر یہ نہیں تو گڑبڑ تو ضرور ہے کہ نمازیں ٹھیک وقت پر ادا نہیں ہوتیں۔ تاہم اگر کوئی کہے کہ ہم اس کا بھی خاص

اہتمام رکھیں گے کہ نہ نماز فوت ہونے دیں گے نہ جماعت' نہ تاخیر ہونے دیں گے تو بہت اچھا۔ ہم تکذیب نہیں کرتے آپ کی۔ ہم نے مانا کہ آپ نے اپنے آپ کو ہر طرح کی برائی سے بچالیا۔ مگر حضور یہ بھی تو دیکھئے کہ نتیجہ کیا ہوا آپ کے فعل کا۔ آپ کو دیکھ کر آپ کے وہ بھائی اور برادری کے لوگ جو آپ سے وسعت میں اور علم میں کم ہیں مگر برابری کے دعوئی میں بڑھے ہوئے ہیں وہ بھی تقریب کو اسی طرح کریں گے کہ ہم کیوں گھٹے رہیں۔ آپ نے تو گھر میں سے دو ہزار روپے نکال کر خرچ کر ڈالے۔ ان کے گھر میں روپیہ کہاں۔ انہوں نے جائیداد گروی کر کے صرف کیا۔ اب جائیداد گروی ہوئی۔ اس کی آمدنی گروی رکھنے والا کھا رہا ہے اور وہ سود ہے اور وہ سود لینے والا اور تم سود دینے والے ہو۔ اور حدیث میں دونوں پر لعنت آئی ہے۔

لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم اکل الربوا و موکله. (سنن ابی داود کتاب البیوع باب: ۴، سنن الترمذی: ۱۲۰۶، سنن ابن ماجة: ۲۲۷۷، سنن النسائی ۸:۱۴۷، مجمع الزوائد للهیثمی ۴:۱۱۸، مشکوة المصابیح: ۲۸۰۷.)

یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے اور کھلانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ بلاضرورت لعنت خریدی۔ یہ کاہے کی بدولت ہوا۔ آپ کے فعل کی بدولت۔ نہ آپ ایسا کرتے نہ وہ اس بلا میں پڑتے۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ روسا کو کیوں منع کیا جاتا ہے۔ ان کے پاس روپیہ وافر ہے ان پر کیا بار ہوتا ہے ان تقریبات پر خرچ کرنے سے۔ ہاں انہیں منع کرنا چاہیے جو غریب ہیں۔

میں نے کہا سبحان اللہ! معلوم ہوتا ہے کہ دل میں ذرا بھی ہمدردی نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ آپ کا بیٹا بیمار ہو اور حلوا کھانا اس کو مضر ہو تو اس وقت آپ کیا کریں گے۔ کیا یہ کریں گے کہ آپ تو حلوا بنا بنا کر کھایا کریں اور وہ دیکھا کرے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ کوئی باپ ایسا ہوگا کہ اس کے سامنے حلوا پکائے گا۔ حضرت اس وقت یہ حالت ہوگی کہ حلوا کھانا چاہیں گے بھی تو حلق سے نہ اترے گا۔ اگر ایسا ہی کوئی قصائی ہوگا تو خیر بازار میں جا کر حلوا کھا آئے گا۔ لیکن گھر میں تو حلوے کا نام بھی نہ آنے دے گا۔

آخر اس کی وجہ کیا؟ وجہ ظاہر ہے یہی کہ اگر گھر میں حلوا پکے گا یا گھر میں آئے گا تو یہ نہیں ہو سکے گا کہ صرف وہی لوگ کھائیں جن کو حلوا نقصان نہیں کرتا۔ بلکہ اوروں کو کھاتا دیکھ کر اس کو بھی حرص ہوگی۔ یہ بھی کھائے گا اور بدپرہیزی کرے گا۔ چونکہ اس سے محبت ہے اور اس کا نقصان ہرگز گوارا نہیں۔ اس کی خاطر سارے گھر پر حلوا حرام ہو جائے گا۔

لیجئے! اس کی بنا اسی قاعدہ شرعی پر تو ہوئی کہ جو فعل مباح ہے وہ ہمارے لئے بھی ناجائز ہو جاتا ہے جب کہ دوسروں پر اس کا اثر برا پڑتا ہو۔ پس اگر آپ کو محبت ہوتی اور ہمدردی ہوتی مسلمانوں

سے تو ایسا کبھی نہ کرتے بلکہ یہ سوچتے کہ میں تو کروں گا اس وجہ سے کہ مجھ کو وسعت ہے اور دوسرا بھائی کرے گا برابری کے دعویٰ کی وجہ سے اور وہ ہو جائے گا تباہ۔ لہٰذا میں ہی ہاتھ روک لوں۔ اگر محبت اور ہمدردی ہوتی تو اپنے بھائیوں کو ضرور تباہی سے بچایا جاتا۔

نکاح کی سہل صورت

ایک شخص بولے کہ جب سب باتیں منع ہیں تو پھر دل کا حوصلہ کیسے نکالیں اور خوشی کس طرح منائیں۔ میں نے کہا مجھے دو پانچ ہزار روپیہ میں غریبوں کو تقسیم کردوں۔ ایک ہزار آدمی کو پہنچ جاویں ایک ایک کو پانچ پانچ روپیہ۔ وہ تمہیں دعائیں دیں۔ نام بھی ہو دل بھی خوش ہو۔ مگر حضرت ان باتوں میں مزا کہاں۔ بس سن کر مرجھا گئے کیونکہ اس میں حظ نفس تو نہ ہوا۔ چہل چہل دھوم دھام۔ فوفیوں کا سا مزا۔ کوئی گرے' کوئی پڑے' کوئی غل مچا رہا ہے ایک ہنگامہ برپا ہے۔ بھلا وہاں یہ رونق کہاں۔ اللہ بھلا کرے تاشے ڈھول کا۔ یہ رونق تو ان ہی سے ہوتی ہے اور نفس خوش رونق ہی سے ہوتا ہے۔

اب فرمائیے! اب آگے کیا گنجائش ہے کچھ کہنے کی۔ اب تو ختم ہو گئی حجت اب تو ثابت ہو گیا کہ کسی کے لئے بھی اجازت نہیں۔ بس تو اب فقط ایک چیز رہ گئی تقریب نکاح کے اندر یعنی ایجاب و قبول بلکہ اگر کسی کی ہمت ہو تو اس میں بھی اختصار ممکن ہے وہ اس طرح کہ دولہا بھی مجلس نکاح میں نہ ہو وہ کسی کو اپنا وکیل کر دے۔ نکاح کے لئے کیونکہ یہ فرض نہیں ہے کہ دولہا خود موجود ہو جب ہی نکاح ہو سکے گا۔ مثلاً کوئی نوکر ہے اس کو رخصت نہیں ملتی یا ملنے میں دقت ہے یا مل بھی سکتی ہے مگر کیوں لیں۔ فرض کیجئے کسی کا جی ہی نہیں چاہتا تو بس کسی کو اپنا وکیل کر دے کہ وہ اس کی طرف سے قبول کر لے (ہنس کر فرمایا) مگر یہ سمجھا دیا جاوے کہ کہیں وہ اپنے واسطے قبول نہ کر لے۔ یوں کہہ دیا جائے کہ میری طرف سے قبول کر لینا۔ چونکہ وکیل بجائے موکل کے ہوتا ہے اس لئے نکاح صحیح ہو جائے گا۔ دیکھا آپ نے کس قدر سہولت ہے وہ نوکری پر موجود ہے اور یہاں نکاح ہو گیا۔ چنانچہ "مواہب لدنیہ" میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نکاح کی یہی صورت مروی ہے کہ جس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ان کا نکاح ہوا وہ خود موجود نہ تھے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ میں نے فاطمہ کا نکاح علی سے کر دیا۔ ان رضی علی بذالک۔ یعنی اگر علی منظور کریں اس کو۔ حضرت علی کو جب خبر پہنچی تب انہوں نے کہا کہ میں نے منظور کیا یوں ہوا تھا نکاح حضرت علیؓ کا۔ تو دیکھ لیا آپ نے کہ یوں بھی نکاح ہو سکتا ہے۔ برات تو برات دولہا کے ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔

غور کرنے کی بات ہے اے عقلاء کہ جتنی حاجات ہیں انسان کی کچھ نہ کچھ کی ضرورت سب میں ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ دو آنہ۔ مثلاً آدمی کسی کام کو کہیں جاوے تو کھانا تو ضرور ہی کھائے گا۔ اس میں کم از کم دو آنے تو خرچ ہوں گے ہی۔ اسے بھی جانے دیجئے پانی سب سے سستی چیز ہے حتیٰ کہ بکتا بھی نہیں مگر اس

میں بھی خرچ ہوتا ہے۔ خود پانی کی کوئی قیمت نہ سہی مگر لانے والے کو تو اجرت دینا ہی پڑتی ہے ایک روپیہ مہینہ آٹھ آنے دو آنے چار آنے کچھ تو لگتا ہی ہے۔ بہت ہی کم ہوا تو ایک پیسہ کا تو ضرور ہی پانی کا بھی خرچ پڑ جاتا ہوگا۔ تو کچھ کچھ قیمت پانی جیسی سستی چیز کی بھی ہوئی۔ غرض ہر چیز میں کچھ نہ کچھ خرچ کی ضرورت ہے۔ بجز نکاح کے کہ یہ اپنی حقیقت میں ایک پیسہ پر بھی موقوف نہیں کیونکہ اس کی حقیقت ایجاب اور قبول ہے اور محض دو بول ہیں زبان کے۔ ان میں کسی خرچ کی کیا ضرورت۔

رہے چھوارے سو وہ محض مستحب ہیں۔ نہ ہوں نہ سہی کچھ بھی حرج نہیں اور مہر ادھار ہے۔ اس وقت اس کا کوئی تقاضا نہیں اور ادھار بھی جب ہے جب دو۔ اور جو دینا لینا ہے ہی نہیں جیسا کہ آج کل عام طور پر سمجھا جاتا ہے تب تو ان کے زعم میں ادھار بھی نہیں۔ چنانچہ بعض وقت صاف کہتے ہیں کہ مہر تو محض ایک دباؤ کے لئے ہے دینا لینا تھوڑا ہی ہے کون لیتا ہے اور کون دیتا ہے۔ (حالانکہ یہ غلط ہے۔ مہر دین ہے جیسے اور دین دیتے ہوتے ہیں) خیر کم سے کم مہر ادھار تو ہے ہی۔ اس وقت اس کا مطالبہ نہیں۔ تو نفس نکاح میں تو یہ خرچ شامل نہ ہوا۔

اب فرمایئے سب سے زیادہ سستی چیز اگر کوئی تھی تو نکاح تھا مگر اللہ بھلا کرے ہمارے بھائیوں کا سب نے آپس میں کمیٹی کر کے اس کو مہنگا کر دیا ہے کہ غریب آدمی کی تو مصیبت ہے اور اس میں مزاحمت ہے عقل کی بھی اور مزاحمت ہے شریعت کی بھی۔ بھلا کونسی عقل کہہ سکتی ہے کہ جس چیز میں مطلق روپے کی ضرورت نہ ہو۔ اس میں فضول اس قدر روپیہ صرف کر ڈالو۔ ادھر شریعت کہتی ہے۔

اعظم النكاح بركة ايسره مونة (حلية الأولياء ۲: ۲۵۷، منحة المعبود للساعاتي: ۱۵۲۳.)

یعنی حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ نکاح سب سے زیادہ برکت والا ہے جس میں سب سے کم خرچ ہو۔ یہ ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اس میں نکاح کے سارے خرچ آگئے حتیٰ کہ مہر کی کمی بھی جس کی خصوصیت کے ساتھ بھی فضیلت وارد ہے۔

مقدار مہر

آج کل مہر کی زیادتی کو بھی بڑا فخر سمجھا جاتا ہے۔ میری بھتیجی کے نکاح میں پانچ ہزار کا مہر باندھا گیا۔ ایک رئیس تھے سندھ کے وہ بھی نکاح میں شریک تھے میرے یہاں آئے ہوئے تھے انہوں نے سن کر تعجب کیا کہ اجی پانچ ہزار اس قدر زیادہ۔ انہیں اتنے ہی پر تعجب ہوا۔ حالانکہ ہمارے پاس ایک قصبہ ہے جلال آباد۔ وہاں تو سوا لاکھ روپیہ کا مہر باندھا جاتا ہے۔ اس سے تو پانچ ہزار سستا ہی ہے مگر ان کے یہاں کے مقابلہ میں یہ بھی مہنگا تھا۔ کہنے لگے اجی ہمارے یہاں تو ایک بکری یا ایک گائے یا سات آٹھ روپیہ بہت سے بہت دس روپیہ بڑے بڑے رئیسوں کا بھی مہر ہوتا ہے۔ لیجئے ان کے یہاں مہر بس اتنا ہی ہے۔ واقعی صاحب! مہر تو بس کم ہی اچھا اور خاص کر جب لینا دینا ہی نہیں تو پھر زیادہ مقدار سے فائدہ

ہی کیا۔ اگر شان ہے تو دینے میں ہے محض نام لینے میں کیا شان اور اگر نام ہی لینے میں شان ہے تو پھر لاکھ ہی کے اوپر کیوں رہو ہفت اقلیم کا نام لے دیا کرو بلکہ دنیا و مافیہا بلکہ اخری و مافیہا بلکہ عرش اور کرسی اور جنت سب ہی کا نام کیوں نہ لے دیا کرو۔ جب لینا دینا ہی نہیں تو پھر کیوں کسر رکھے۔

چنانچہ ایک جگہ مہر عجیب طرح سننے میں آیا۔ دس مٹکے مچھروں کے دس مٹکے پسوؤں کے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا خرافات ہے۔ مطلب یہ کہ ساری عمر مردبار ہے اور دے ہی نہ سکے۔ اور ایک مقام پر سواسیر کو دونگا مہر ہوتا ہے۔ اس کو سن کر میں بڑا خوش ہوا کہ بہت ہی ستا مہر ہے مگر اس کی تفسیر کی گئی کہ ستا نہیں ہے سواسیر کودوں سے مراد سواسیر کودونگا اناج نہیں ہے بلکہ اتنے روپے جتنے سواسیر کودوں میں دانے ہوتے ہوں گے۔ جن کا گننا بھی مشکل ہے۔ تو سواسیر کودوں کے یہ معنی کہ لاکھوں روپیہ۔

اب آپ ہی فرمایئے کہ کیا ہے محض رسوم قبیحہ۔ اجی مہر نہ اتنا کم ہی ہو کہ لڑکی کی تحقیر ہی ہو نہ وسعت سے زیادہ ہو کہ دیا ہی نہ جاسکے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیوی کا مہر گیارہ سو بھی تھا۔ حساب سے صرف تین چار روپیہ کم ہوتے ہیں گیارہ سو سے۔ اگر بہت ہی بڑا فخر کرنا ہے تو گیارہ سو کا مہر باندھ دو۔ مگر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ گیارہ سو کا مہر زیادہ تھا۔ کیونکہ ایک بادشاہ تھے حبشہ کے حضرت نجاشی۔ یہ نکاح حضور کا انہوں نے کیا تھا اور یہ مہر بھی انہوں نے اپنے ہی ذمہ رکھا تھا۔ تو دیکھیے ایک بادشاہ نے اپنے ذمہ صرف گیارہ سو روپے رکھے۔ تو یہ بھی بڑی رقم نہ ہوئی۔ بادشاہ کے یہاں گیارہ لاکھ تو ہوتے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے تو زیادہ مہر باندھنے کا تو خیر یہ مقدار گیارہ سو کی بھی موجود ہے مگر اتنا تو نہ بڑھاؤ کہ دیا ہی نہ جاسکے۔ رہی شان تو شان کو رہنے دو۔

حقیقی عزت وعظمت

کیا نعوذ باللہ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے ہیں کہ ہماری شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ ہے۔ استغفر اللہ! خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر مہر کی زیادتی کوئی عزت کی بات ہوتی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مستحق تھے اس عزت کے۔ واقعی بھلا حضور سے زیادہ کون عزت والا ہوسکتا ہے اور حضور فقط دینی عزت ہی میں سب سے بڑھے ہوئے نہ تھے بلکہ دنیوی عزت میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے اور صرف مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ غیر مسلم قوموں میں اور ظاہری ساز وسامان بھی حضور کے پاس بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔

چنانچہ حج میں ایک دفعہ سو اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیلے قربانی کیے ہم نے تو کسی بادشاہ کو بھی نہیں سنا کہ اکیلے سو اونٹ کی قربانی کی ہو۔ اونٹ تو خود حضور نے دست مبارک سے ذبح فرمائے اس سے حضور کی قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ہمیں تو ایک چڑیا کا بھی ذبح کرنا مشکل ہوتا ہے

نہ کہ اونٹ اور ذبح کرنا بھی چھری پھیر کر نہیں بلکہ بھالے سے۔ اس زمانہ میں عرب کے اندر یہی رسم تھی کہ بھالا گلے میں مارا جاتا تھا اس کو نحر کہتے ہیں۔

اونٹ اس طرح ذبح کیا جاتا تھا۔ خیال کیجئے کہ بھالا کس قوت سے لگتا ہوگا۔

(۶۳) اونٹ اسی طرح ذبح کرنا سہل بات نہیں ہے۔ ۶۳ اونٹوں کو خود ذبح فرمایا بقیہ کو ذبح کرنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔ پورے ۱۰۰ اونٹ کی قربانی فرمائی۔

اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ روایت میں ہے کہ ان اونٹوں کی یہ حالت تھی کہ **کلھن یزدلفن الیہ**۔ جب وہ اونٹ ذبح کئے جانے کے لئے ایک قطار میں کھڑے کئے گئے کہ ہر اونٹ حضور کی طرف جھک جھک کر بڑھتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کریں۔ ہائے اس موقع پر مجھے وہ شعر یاد آتا ہے۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(تمام جنگل کے ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا اس امید میں کہ تو شکار کو آئے گا۔)

یہاں سے حضور کی شان محبوبیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ جانور بھی حضور پر فدا تھے اور اپنا ذبح ہونا حضور کے ہاتھ سے چاہتے تھے بلکہ جانور کیا سب مخلوق حضور کو پہچانتی تھی صحیح روایت میں ہے۔

انی لاعرف حجرا کان یصلی علی (۲-الصحیح لمسلم: ۱۷۸۲، مسند الإمام أحمد ۵:۸۹، ۹۵، سنن الدارمی ۱:۱۲، المعجم الکبیر للطبرانی ۲:۲۵۷، مشکوۃ المصابیح: ۵۸۵۳، کنز العمال: ۳۲۰۰۰)

یعنی فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پتھر بھی آپ کو پہچانتے تھے۔ پھر تعجب ہے کہ انسان نہ پہچانے بالخصوص جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اور یہ پہچاننا نہیں ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ زبان سے کہہ لیا۔ پہچاننا کہتے ہیں کسی کے حق پہچاننے کو۔

سونئے! حضور کے تین حق ہیں۔ ایک حق ہے محبت' دوسرا حق ہے عظمت' تیسرا حق ہے متابعت۔ اب لوگوں نے کیا کیا ہے کہ تجزیہ کیا ہے ان حقوق میں بعضوں نے تو محض محبت لے لی۔ عظمت اور متابعت کو نظر انداز کر دیا۔ بعضوں نے ظاہری عظمت کو کافی سمجھا محبت اور متابعت سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ بعضوں نے محض متابعت پر قناعت کر لی محبت اور عظمت کی تحصیل کے درپے نہ ہوئے حالانکہ حضور کے تینوں حقوق کا ادا کرنا یکساں طور پر ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حق کا ادا کرنا واجب ہے محبت کا بھی عظمت کا بھی اور متابعت یعنی اتباع کا بھی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یعنی اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ سے تو میرا اتباع کرو۔ معلوم ہوا کہ محبت کے ساتھ اتباع بھی ضروری ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ محبت تو وہی ہے جس کے ساتھ

اتباع بھی ورنہ محبت بلا اتباع تو وہی محبت ہے کہ گھر بار سب تمہارا مگر کوٹھی کھٹلے کو ہاتھ نہ لگانا۔ اور یہ تعلق بلا اتباع تو وہی تعلق ہے کہ۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   رزر طلبی سخن دریں است

(اگر جان مانگو مضائقہ نہیں اور مال مانگو اس میں کلام ہے۔)

نہ نماز نہ روزہ' نہ حج نہ زکوۃ کچھ بھی نہیں اور دم بھرتے ہیں حضور کی محبت کا۔ اے صاحب! خوب سمجھ لیجئے محبت وہی معتبر ہے جس کا اثر دونوں طرف پورا پورا ہو۔ ہم کو ایسی محبت ہے کر ایک طرف سے بھی پوری نہیں۔

بس ہم کو ایسی محبت ہے حضور سے جیسے کسی طالب علم کی حکایت ہے کہ کسی شہزادی کو کہیں اتفاق سے آپ نے دیکھ لیا تھا۔ بس عاشق ہو گئے۔ یہاں تک حوصلہ بڑھا کر اس کے ساتھ نکاح کی فکریں کرنے لگے۔ ایک روز اسی سوچ میں بیٹھے تھے کر ایک دوست ملنے آئے پوچھا کس حال میں ہو۔ کہا شہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہوں۔ کہا سبحان اللہ! آپ کی یہ حیثیت اور شہزادی سے نکاح کی فکریں۔ طالب علم نے کہا کہ میاں آدھا سامان تو ہو بھی چکا' صرف آدھا سامان ہونا اور باقی ہے۔ دوست کو بڑا تعجب ہوا۔ پوچھا' آخر کیوں کر؟ کہا نکاح کے لئے دولہا اور دلہن دونوں کی رضامندی شرط ہے سو میں تو بالکل راضی ہوں بس اس کے راضی ہونے کی دیر ہے۔ آدھا سامان تو ہو گیا آدھا باقی ہے۔

اگر اسے آدھا سامان کہہ سکتے ہیں تو واقعی اس محبت یکطرفہ میں آپ کے پاس بھی آدھا سامان موجود ہے۔ آپ بھی خوش رہیے غرض یہ نہیں ہے حضور کی محبت۔ محبت وہ ہے جس میں دوسری طرف سے بھی محبت ہو اور وہ موقوف ہے متابعت پر۔ جب یہ نہیں تو وہ محبت ہی نہیں۔

ایک ہندی شاعر' جو ہیں تو رند آدمی مگر فارسی کلام ان کا صوفیانہ ہے۔ لیکن کلام صوفیانہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ صوفی تھے بلکہ بات یہ ہے کہ شاعر ہوتے ہیں دو قسم کے۔ ایک تو بعضے روکھے ہوتے ہیں۔ ان کا کلام پھیکا پھیکا ہوتا ہے اور بعضے ہوتے ہیں صاحب درد ایسوں کے کلام میں تصوف کی چاشنی ہوتی ہے حالانکہ دراصل تصوف سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی قسم کے وہ شاعر تھے چونکہ صاحب درد تھے اس لئے ان کے کلام میں تصوف کا رنگ ہوتا تھا۔

ایک شخص نے ان کا کلام دیکھا تو سراسر تصوف اور معرفت میں ڈوبا ہوا پایا۔ بس ان کی بزرگی کے معتقد ہو گئے۔ سمجھے کہ یہ شخص کوئی زبردست صوفی اور اولیاء اللہ میں سے معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک اعتقاد بڑھا کہ ان کی زیارت کے لئے ایران سے سفر کر کے آئے۔ جب ان کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ بیٹھے حجام سے ڈاڑھی کی صفائی کرا رہے ہیں۔ اب یہ حیرت میں۔ آخر نہ رہا گیا اور کہا کہ آغا ریش می تراشی۔ (آغا ڈاڑھی ترشواتے ہو)۔ آپ بولے بلے ریش می تراشم ولے دل کسے نمے تراشم۔ (ہاں

میں ڈاڑھی ترشواتا ہوں کسی کا دل نہیں دکھاتا) کسی سے صوفیوں کا مقولہ سن لیا ہوگا کہ سارے گناہ کرو مگر کسی کا دل مت دکھاؤ۔ مگر انہوں نے بھی اس کا خوب جواب دیا کہا ارے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می تراشی۔ (ہاں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو دکھاتے ہو) تم اپنی اس حرکت سے حضور کا دل دکھا رہے ہو۔ حضور کی امت کے سارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ جب تمہارے اعمال پیش ہوتے ہوں گے تو تمہاری اس حرکت سے حضور کا کس قدر دل دکھتا ہوگا۔ یہ سنتے ہی بس آنکھیں کھل گئیں۔ صاحب درد تو تھے ہی۔ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور جوش میں آ کر یہ کہا۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کر دی　　　مرا با جان جاناں ہمراز کر دی

(اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے کہ تم نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے محبوب سے ملا دیا)

خدا تمہیں خوش رکھے۔ اتنے دن تک میں دھوکا ہی میں رہا۔ آج غلطی معلوم ہوئی ہے توبہ ہے جواب سے کبھی ایسا کروں۔ وہ اس گمان میں تھا کہ ان چیزوں کو حضور کی محبت سے کیا علاقہ۔ اس محقق کی تنبیہ سے معلوم ہوا کہ بہت بڑا علاقہ ہے عبد اللہ ابن مبارک کہتے ہیں۔

تعصی الالہ و انت تظہر حبہ　　　ھذا لعمری فی الفعال بدیع

تو نافرمانی کرتا ہے حق تعالیٰ کی اور دعویٰ کرتا ہے ان کی محبت کا۔ یہ عجیب بات ہے۔

لو کان حبک صادقا لا طعتہ　　　ان المحب لمن یحب مطیع

اگر تیری محبت سچی ہوتی تو اطاعت بھی کرتا کیونکہ عاشق معشوق کا مطیع ہوا کرتا ہے وہ کیسا عاشق ہے جو معشوق کی نافرمانی کرے۔ وہاں تو مال سے بھی جان سے بھی ہر طرح سے اطاعت کے لئے حاضر ہے اور یہاں محبت کے لئے اطاعت کی بھی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ یہ مضمون مجھے اس پر یاد آ گیا تھا کہ کلھن یزدلفن الیہ (ان میں سے ہر ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھکتا تھا) جانوروں کو بھی حضور سے محبت تھی۔ ہر اونٹ یہی چاہتا تھا کہ پہلے مجھ کو حضور ذبح کریں۔ اصل ذکر یہ تھا کہ حضور نے اکیلے ۱۰۰ اونٹ قربانی کیے۔ تو حضور ظاہراً بھی بادشاہ تھے اور بادشاہ بھی ایسے کہ کسی بادشاہ کی بھی اتنی عزت نہ تھی جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

چنانچہ ہرقل شاہ روم اپنے تخت شاہی پر بیٹھا ہوا کہتا ہے (صحیح بخاری روایت ہے) کہ اگر میں حضور تک پہنچتا تو حضور کے پاؤں دھوتا۔ اللہ اکبر! ایک بزرگ کے بارہ میں جو ٹوٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھنے والے ہیں۔ یہ الفاظ بادشاہ کے منہ سے کس قدر عظمت کی دلیل ہیں پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ الفاظ محض عظمت اور وقعت ہی کی وجہ سے کہے گئے ہیں نہ یہ کہ کسی مجبوری سے۔ دیکھئے! ایک زبردست خود مختار بادشاہ ہرقل حضور سے اس قدر فاصلہ پر بیٹھا ہوا اپنے ارکان دولت کے سامنے اتنے صریح لفظوں میں ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو بظاہر اس کی شان کو اس کی رعایت کی نظروں میں بہت ہی گھٹانے والی ہے۔ اگر عزت اس کا سبب نہیں تھی تو اور کیا چیز تھی اگر یہ عزت نہیں تو پھر اور عزت کسے کہتے ہیں۔ کیا عزت نام ہے کپڑوں کا۔

اگر کپڑوں میں عزت ہے تو وہ ایسی عزت ہے جیسے علی حزیں شاعر سے ملنے ایک شخص بڑے ٹھاٹھ سے آیا۔ کپڑے بہت بڑھیا نئے پہنے ہوئے کھڑ کھڑ بھڑ بھڑ بولتے ہوئے حضور کو اس شان سے آتا دیکھ کر پاؤں سمیٹ لئے اور بہت عزت کے ساتھ بٹھایا حالانکہ یہ بڑا دماغ دار شخص تھا پوچھا اسم شریف۔ یوسف نام تھا آپ فرماتے ہیں ایسف۔ علی حزیں نے یہ سنتے ہی سامنے کو پاؤں پھیلا دیئے۔ اور کہا بابا! اگر تو ایسف ہستی پس پرامن پائے خود را کشم۔ (اگر تو ایسف ہے تو پھر میں پاؤں کیوں سمیٹوں) پس ساری عزت میاں کی اتنی ہی دیر میں خاک میں مل گئی۔

غرض کپڑوں کی عزت بس اتنی ہی دیر کی ہوتی ہے۔ جہاں حقیقت کھلی بس پھر کچھ بھی نہیں تو حضور کی عزت ایسی نہ تھی۔ حقیقی عزت تھی ویسے تو حضور کی معاشرت بالکل سادہ تھی۔ لباس بالکل معمولی ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی اور حقیقی عزت حاصل تھی۔ دنیا کے بادشاہوں جیسی زبردستی کی عزت نہ تھی۔ اب اس سے زیادہ کیا دنیوی عزت ہوگی کہ ایک بادشاہ یوں کہتا ہے کہ اگر حضور تک پہنچ پاتا تو حضور کے پاؤں دھوتا اور اس کو اپنا فخر سمجھتا۔

غرض حضور کو دینی اور دنیوی ہر قسم کی عزت حاصل تھی۔ پھر بھی جب حضور نے اپنے ازواج وبنات کے مہر تھوڑے ہی تھوڑے مقرر فرمائے جس سے معلوم ہوا کہ مہر کا زیادہ ہونا کوئی عزت کی بات نہیں۔ اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر مہر کا بڑا ہونا کوئی عزت کی بات ہوتی تو حضور ہمارے سے زیادہ مستحق تھے اس عزت کے۔ اب تو معلوم ہوگیا کہ مہر تھوڑا ہی کافی ہے اور بہتر ہے۔

اب بتلایئے! نکاح میں خرچ ہی کون سا رہ گیا۔ ایک مہر تھا سو وہ بھی ادھار نقد تو ایک پیسہ کا بھی خرچ نہیں۔ آپ نے دیکھا نکاح ایسی سستی چیز ہے مگر ہمارے بھائیوں نے مل جل کر اس کو اس قدر گراں کر دیا ہے کہ الٰہی توبہ۔ بعض بعض قوموں میں تو عورت پر روپیہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اب فرمایئے کہ یہ سب مزاحمت ہے عقل کی اور نقل کی یا نہیں۔ غرض ان رسوم کی کسی پہلو سے بھی اجازت نہیں نکلتی۔

ہاں یوں کہے کہ صورت معصیت کی نہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے حکم تو حقیقت پر ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شریعت نے ان سے تعرض بھی کیا ہے۔ پس اگر اب بھی وہی خیال ہو کہ ان باتوں میں ہم کو آزادی ہے اعتقاداً یا عملاً تو کہا جائے گا اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی۔ یعنی کیا خیال کرتا ہے انسان کہ اس کو مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ خیال غلط ہے مہمل نہیں چھوڑا جائے گا۔ بلکہ اس کے ہر ہر فعل کی ہر ہر قول کی اور ہر ہر حال کی نگرانی ہوگی۔

رفع اشکالات

بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ چونکہ وقت تنگ تھا اس لئے میں بیان کر چکا۔ اب صرف چار منٹ

لینا چاہتا ہوں۔ اس مجمع میں کچھ اہل علم بھی ہیں۔ اس لئے ایک طالب علمانہ مضمون میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اصل مضمون تو بیان ہو چکا یا ایک زائد بحث ہے اگر سب کی سمجھ میں نہ آوے تو کچھ حرج نہیں۔

وہ بحث یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۔ یہاں صرف انسان کو خطاب کیا حالانکہ یہ ثابت ہے کہ جن وانس دونوں جزا وسزا پائیں گے اور جزا وسزا دونوں کو جب ہی ہو سکتی ہے جب دونوں مکلف ہوں۔ جب دونوں مکلف ہیں تو اس خطاب میں انسان کی تخصیص کیوں کی گئی۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۔

ہاں جنوں کے ثواب کے متعلق البتہ اختلاف ہے۔ چنانچہ امام صاحب کا قول مشہور اور کتب میں منقول ہے کہ وہ جنت میں نہ جائیں گے ان کی جزا یہی ہوگی کہ عذاب سے نجات ہو جائے گی۔ یہ امام صاحب کا مشہور مذہب ہے۔ باقی جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مومنین جن بھی جنت میں جائیں گے۔ دلیل امام صاحب کی یہ مشہور ہے۔

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ

اس آیت میں جنوں کا قول حق تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے کہ جنوں نے آپس میں کہا تھا کہ کہا مان لو خدا تعالیٰ کے داعی کا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو عذاب الیم سے نجات دے گا۔ یہاں عذاب سے نجات دینے کا وعدہ ہے۔ یہ وعدہ نہیں ہے کہ جنت میں بھی داخل کرے گا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ سکوت معرض بیان میں ہوتا ہے۔ یہاں جزا کا بیان ہے اگر جزا کچھ اور ہوتی تو اس کا بھی بیان ہوتا اور بیان ہے نہیں تو اور کچھ جزا بھی نہیں۔ تو جزا صرف یہ ہوئی کہ ان کو دوزخ سے نجات ہو جاوے گی۔ یہ ہے امام صاحب کا قول۔

جمہور کی دلیل یہ آیتیں ہیں۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ جنت کی نعمتیں یاد دلا کر فرماتے ہیں۔ کس کس نعمت کو تم دونوں جھٹلاؤ گے اے جن وانس اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعمتیں دونوں کے لئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تصریح اس آیت میں ہے کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۔ یہ آیت حوروں کے بارہ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حوریں جن وانس دونوں کے لئے ہوں گی اور حوریں جنت کے اندر ہیں تو جنت میں جانا جنوں کا ثابت ہوا۔ اور ہر مجتہد دوسرے مجتہد کے استدلال کا جواب دے سکتا ہے۔

احقر کا گمان یہ ہے کہ امام صاحب کا مقصود نفی نہیں دخول جنت کی مومنین جن کے لئے۔ بلکہ یہ مقصود ہے کہ ہم بوجہ نص صریح نہ ہونے کے ایسا حکم نہیں کر سکتے اور غالباً اطفال کے باب میں بھی امام صاحب کا یہی قول ہے۔ واللہ اعلم۔ لیکن ظاہراً جمہور کا قول زیادہ جی لگتا ہے اور اس کے اختیار کرنے سے ترک تقلید کا کسی کو شبہ نہ ہو کیونکہ یہ مسئلہ فقہ کا نہیں ہے جس میں امام صاحب کے قول کی تقلید واجب ہو۔ یہ

مسئلہ معاد کا ہے اور اس سے زیادہ اسلم یہ ہے کہ خدا کے سپرد کیا جائے۔ خدا جانے کیا ہوگا۔ جو ہوگا ہو رہے گا۔ بہر حال اس کا فیصلہ ہمارے اجلاس میں نہ آوے گا۔ ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں۔

باقی جنوں کے مکلف ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور وہ ان آیتوں سے ثابت ہے سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۔ (اے جن و انس ہم عنقریب حساب کے لئے خالی ہوئے جاتے ہیں یعنی حساب لینے والے ہیں) جن و انس دونوں کو ثقل فرمایا۔ ثقل کے معنی ہیں جس پر ثقل یعنی بوجھ ہو۔ بوجھ سے مراد وہی بار تکلیف ہے۔ معلوم ہوا دونوں مکلّف ہیں اور دوسری آیت میں فرماتے ہیں۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ

قیامت میں جواب طلب کیا جائے گا دونوں سے اور پوچھا جائے گا کہ اے جن و انس کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مکلّف ہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیت یعنی اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۔ میں صرف انسان کا ذکر کیا گیا؟

اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن کی تبلیغ اول انسانوں ہی کو ہوئی پھر ثانیاً جنوں کو۔ ایک تو یہ جواب ہے سیدھا سادہ۔ دوسرے یہ کہ ہر چند کہ مکلّف انسان اور جن دونوں ہیں ہی۔ لیکن غور سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی عنایت حق تعالیٰ کی انسان پر ہے اتنی جن پر نہیں ہے جن دوسرے درجہ پر ہے لہٰذا مخاطب ہونا بھی ان کا تبعاً للانسان ہے اور فضائل میں بھی وہ تابع ہیں انسان کے۔ چنانچہ جو لوگ قائل ہوئے ہیں اس بات کے کہ جن جنت میں جائیں گے وہ بھی کہتے ہیں کہ جنت کے گرد و پیش میں رہیں گے جیسے تابع لوگ ہوا کرتے ہیں۔ بہر حال وہ تابع ہیں۔ اس بنا پر خطاب میں ان کو شریک نہیں کیا گیا۔ لیکن اثر خطاب میں وہ داخل ہیں کیونکہ تابع متبوع کے اثر سے داخل خطاب میں ہوا کرتا ہے اور تابع ہونے کی دلیل یہ آیت ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۔ (اور ہم نے بنی آدم کو مکرم کیا) صوفیہ کرام سمجھے ہیں اس راز کو کہ انسان مکرم کیوں ہے وہ راز یہ ہے کہ انسان مظہر اتم ہے حق تعالیٰ کا۔ اسی واسطے آیا ہے۔

ان الله خلق ادم على صورته (الصحيح لمسلم كتاب البر والصلة: ۱۱۵، الجنة: ۲۸، مسند الإمام أحمد ۲: ۲۴۴، ۲۵۱، ۳۲۳ ۳۳۴، ۴۶۳، ۵۱۹، فتح الباری لابن حجر ۱۱: ۳.)

اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا لیکن یہ مسلم ہے کہ صورت کے معنی متبادر مراد نہیں کیونکہ اس سے تجسم لازم آتا ہے حق تعالیٰ کا۔ لامحالہ دوسرے معنی مراد ہوں گے جس کی حقیقت یہ ہے کہ صورت کے معنی ظہور ہیں۔ چنانچہ صورت متعارفہ کو جو صورت کہتے ہیں وہ بھی اس بنا پر کہ وہ ظہور ہے حقیقت ذی صورت کو۔ پس معنی یہ ہوئے کہ ایسی حالت پر پیدا کیا کہ خدا تعالیٰ کا اس حالت سے ظہور ہوا۔ تو علی صورتہ کے معنی ہوئے علی ظہورہ۔ یہی معنی ہیں صوفیہ کے اس قول کے کہ انسان مظہر اتم ہے حق سبحانہ تعالیٰ کا۔ مطلب یہ کہ حق سبحانہ تعالیٰ کا پورا پورا ظہور

انسان کے ذریعہ سے ہوا۔ اس ظہور سے مراد وہ ہی ظہور ہے جو **کنت کنزا مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق**۔ (میں مخفی خزانہ تھا بس میں نے پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پسند کیا) میں ہے کیونکہ لاعرف کے معنی کا حاصل یہی ہے لاظہر۔ یوں تو حق تعالیٰ کا مظہر ہر چیز ہے لیکن انسان خصوصیت کے ساتھ مظہر ہے۔ اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ انسان مظہر اتم ہے۔ ایک تو یہ وجہ ہے انسان کے سب سے زیادہ مکرم ہونے کی۔

دوسری ایک وجہ کا پتہ وہاں سے چلتا ہے جہاں مکلّف فرمانے کا قصہ بیان فرمایا ہے وہ یہ آیت ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ
اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ

(ہم نے امانت کو آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا سب نے انکار کیا اور ڈر گئے اس کے اٹھانے سے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔)

سب جانتے ہیں کہ مکلّف جن وانس دونوں ہیں مگر یہاں ذکر صرف انسان کا ہے کہ اسی نے ہماری امانت کو اٹھایا۔ یہاں امانت سے مراد تکلیف شرعی ہے یعنی احکام کی تعمیل۔ تو گویا کہا یوں گیا تھا کہ کون اختیار کرتا ہے اس تکلیف وہ احکام کو۔ اس شرط پر کہ جو اطاعت کرے گا مثاب ہوگا جو اطاعت نہ کرے گا معذب ہوگا۔ اس کو سن کر سب ڈر گئے۔ نہ آسمان کو ہمت ہوئی نہ زمین کو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شعور سب کے اندر ہے۔ چنانچہ اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زمین آسمان نے سنا اور سمجھا اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

آب و خاک و باد و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

(آب و خاک ہوا و آگ بندہ ہیں ہمارے اور تمہارے سامنے تو مردہ ہیں لیکن حق سبحانہ تعالیٰ کے سامنے زندہ ہیں۔)

ہمارے تمہارے سامنے یہ سب چیزیں مردہ اور بے جان معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن خدا کے سامنے یہ سب زندہ ہیں۔ چنانچہ بعضے حکماء یونان بھی قائل ہیں کہ بعض جمادات میں شعور ہے اور نئے حکماء بھی کہتے ہیں کہ درختوں میں روح ہے مگر خفیہ ہے۔ سبحان اللہ! عقلاء کو بھی وہی ماننا پڑا جو شریعت سے ثابت ہے۔ تو اگر جمادات وغیرہ میں بھی حس و شعور مان لیا جائے جیسا کہ بہت اہل کشف سے ثابت ہے تو کیا حرج ہے اور ظاہراً قرآن مجید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم جو اپنے نزدیک صاحب شعور ہیں اور یہ سب چیزیں ہمارے نزدیک بے شعور ہیں حقیقت میں یہ بھی ذی شعور ہیں لیکن ہمارا شعور ان کے شعور کے متعلق نہ ہوا ہو۔

غرض فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمانوں پر اور زمینوں پر اور پہاڑوں پر امانت کو پیش کیا کہ اس کو کون اٹھاتا ہے سب نے انکار کیا اور ڈر گئے۔ مگر حضرت انسان فوراً بول اٹھے کہ ہم ہیں اس کو اٹھانے والے کچھ

دیکھا نہ بھالا۔ بس بے تامل لے کر کھڑے ہو گئے اس کو۔ ہمت تو دیکھئے آپ کی۔ اور وجہ کیا ہے اس ہمت کی۔ اس کو صوفیہ نے بیان کیا ہے قرآن مجید اس سے ساکت ہے۔ اگر کوئی مسکوت عنہ فی القرآن کا صوفیہ کے ارشاد سے قائل ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے وہ فرماتے ہیں۔

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(امانت کے بوجھ کو آسمان نہ اٹھا سکا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام مارا۔)

اس میں اشارہ ہے اس وجہ کی طرف یعنی دیوانہ کے لفظ میں کہ اس کے اندر دیوانگی تھی۔ دوسروں میں یہ چیز نہ تھی۔ شرح اس کی یہ ہے کہ انسان میں شان عشق غالب تھی اوروں میں یہ مادہ اس درجہ کا نہ تھا۔ تو گویا سب میں شعور تھا۔ انسان ہی میں بے شعوری تھی یعنی عشق (یہ لطیفہ ہے) اس عشق سے ان حضرت کو لذت ہوئی خطاب میں تو اس سے اندازہ کیا کہ جب ایک خطاب میں یہ لذت ہے تو اگر مکلف ہونے کو مان لیں گے تو بار بار خطاب ہوا کرے گا اور خوب لطف آئے گا اور بڑا مزہ ہو گا۔ چاہے دوزخ میں بھی جلنا پڑے لیکن اس لذت کو کیوں چھوڑا جائے بس آؤ دیکھا نہ تاؤ عشق کے جوش میں اس امانت کو اٹھا ہی لیا تو اس کو فرماتے ہیں وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ (اور اسے انسان نے اٹھا لیا) اس میں اشارہ ہے انسان کے عارف ہونے کی طرف بھی کہ اس نے پہچان لیا اس کو جو اس تکلیف کے اندر پنہاں تھی۔

اب یہاں پر مسلم ہے یہ بات کہ اس امانت کو جن و انس دونوں نے اٹھایا کیونکہ دونوں مکلف ہیں تو یوں ہونا چاہیے تھا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ وَالْجِنُّ۔ لیکن صرف انسان کو ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مکلفیت کی صفت میں اصل ہے اور جن تابع ہیں۔ تو اصل کو ذکر کیا اور تابع کو چھوڑ دیا اور جب اس صفت میں اصل ہونے کی وجہ سے اسی کا نام لیا تو اس حمل کے حقوق کے اخلال پر جو اس آیت میں اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى نکیر کیا ہے اس میں بھی اسی کا خاص بیان کیا۔ سبحان اللہ! یہ تبرعاً بیان کر دیا۔

شریعت کا سلوک

اب میں اصل مضمون کو پھر اعادہ کرتا ہوں۔ یہ دیکھنا ہے کہ شریعت نے ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔ آیا ہمکو ہر ہر امر میں پابند کیا ہے یا آزاد چھوڑ دیا ہے اور ہمارے افعال کو ہماری رائے پر رکھا ہے۔ سمجھ لیجئے کہ یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہے کہ شریعت نے ہمارے افعال سے تعرض نہیں کیا۔ شریعت نے ہر ہر چیز سے تعرض کیا ہے۔ لیجئے قرآن مجید میں ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا
وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا

یعنی کسی کے گھر میں نہ جاؤ جب تک کہ ان سے میل نہ کر لو اور ان کو سلام نہ کر لو۔ یہ معاشرت کے احکام ہیں اور

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا
يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ

یعنی اے مسلمانو! جب تم سے کسی مجلس میں کہا جائے جگہ دو تو جگہ دے دو۔ مطلب یہ ہے کہ دب کر بیٹھ جاؤ اور جب کہا جاوے یہاں سے اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ۔ یہ امر ہے اور اس پر وعدہ ہے يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ مجلس کے آداب ہیں۔ علیٰ ہذا عادات کے متعلق بہت سی آیتیں ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا
عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ
اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ
خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۭ

یعنی اندھے پر تنگی نہیں، لنگڑے پر تنگی نہیں، اور مریض پر تنگی نہیں اور نہ تمہارے اوپر تنگی ہے اس بات میں کہ اپنے گھر کھاؤ یا اپنے باپ کے گھر یا ماں کے گھر اور عزیزوں کے گھر جو آیت میں مذکور ہیں یا اپنے دوست کے گھر اور اکٹھے ہو کر کھاؤ یا الگ الگ۔ یہ آیت عادات کے متعلق ہوئی اور۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ
اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ
فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ

یعنی اے مسلمانو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت خانہ میں مت جاؤ الا آنکہ تم کو اجازت دی جائے کھانا کھانے کی غرض سے مگر اس میں بھی یہ شرط ہے کہ کھانے کے پکنے کے انتظار میں پہلے سے جا کر نہ بیٹھو۔ بس یہ چاہئے کہ جب بلایا جائے جاؤ اور جب کھانا کھا چکو چلے آؤ اور نہ وہاں بیٹھ کر باتیں بگھارو۔ یہ دعوت میں جانے کا قانون ہے۔ غرض ہر کام کا قانون موجود ہے عادات کے متعلق اور لیجئے کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔ یعنی کھاؤ پیو اور فضول مت خرچ کرو اس کا بھی قانون ہے اور۔

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى
اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ

یعنی نہ مردوں کی جماعت دوسرے مردوں کی جماعت سے مسخراپن کریں اور نہ عورتیں دوسری

عورتوں سے مسخرا پن کریں اور نہ آپس میں طعنے دو نہ کسی کو برے نام سے پکارو۔ **ولا یغتب بعضکم بعضاً** آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ آپ نے دیکھا یہ سارے عادات اور معاشرت ہی تو ہیں۔ تو دیکھ لیجئے کہ ہر چیز کا مکمل قانون موجود ہے غرض کھانا' پینا' اٹھنا بیٹھنا' بولنا چالنا کھانا کمانا ہر ہر بات سے تعرض کیا۔ معاملات کو لیجئے وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی آپس میں ایک دوسرے کا مال بے جا طریق پر نہ کھاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ حلال طریق پر حاصل کر کے کھاؤ۔ ناجائز طریق سے کسی کا مال مت لو واحل اللہ البیع و حرام الربوا۔ یعنی جائز کیا حق تعالیٰ نے بیع کو اور حرام کیا سود کو۔ یہ معاملات ہی تو ہیں جن کے متعلق احکام ہیں تو دیکھ لیجئے ان آیتوں میں عادات کے متعلق بھی قانون ہے معاشرت کے متعلق بھی قانون ہے۔ معاملات کے متعلق بھی قانون ہے۔ غرض یہ ہے کہ تمام آیتیں بھری پڑی ہیں۔ دنیوی عادات اور معاشرت وغیرہ کی تعلیم سے سب کے لئے قانون مقرر ہے۔

اب اس کے بعد کیا گنجائش ہے یہ کہنے کی فلاں چیز سے کیا تعلق ہے شریعت کو۔ فلاں چیز کے متعلق کوئی قانون نہیں شریعت میں۔ اس کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے جب یہ ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب چیز کا قانون ہو اور شادی بیاہ کا کوئی قانون ہی نہ ہو۔ خوب سمجھ لیجئے کہ شادی بیاہ کا بھی شریعت میں قانون ہے جس کو میں بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم اور عمل کی ہمت اور توفیق عطا فرماویں۔

احمداللہ الذی بعزتہ و جلالہ تتم الصالحات و الصلوۃ و السلام علی رسولہ سیدالکائنات و اشرف المخلوقات صلوۃ تسبق الغایات.

اعتراف گورنر

خط خان صاحب خواجہ عزیز الرحمان صاحب گورنر پونچھ کشمیر رخصتی والد نوشہ حبیب الرحمان سلمہ بنام جناب مولوی حکیم محمد مصطفے صاحب دام امجد ہم از لکھنؤ ڈور والی گلی نزد پل فرنگی محل۔ ۱۴ جولائی ۱۹۲۴ء مخدومی و مطاعی حکیم صاحب زاد لطفکم۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

میں تہ دل سے آپ کی اس تکلیف کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپ نے براہ الطاف کریمانہ سفر کوتاہ ملقب بہ فیض کا لوٹا اور وعظ نقد اللبیب فی عقد الحبیب کی ترتیب و تکمیل میں اٹھائی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرماوے اب یہ دونوں رسالہ جات خدا کرے جلد طبع ہو جاویں تو ان سے امید کامل ہے کہ انشاء اللہ اصلاح رسوم شادی میں کافی طور سے ہووے گی۔

حضرت اقدس مولانا صاحب مدظلہم عالی کا ایک ایک لفظ پر معنی ہے اور بڑے تجربہ پر مبنی معلوم

ہوتا ہے چونکہ میرے لڑکے حبیب الرحمان سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی کے موقعہ پر وعظ نقد اللبیب ہوا تھا اس لئے میں نے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر اب یہ رائے قائم کی ہے کہ حقیقۃً شادی کے موقعہ پر ہجوم احباب و برادری مرد و عورت کا بے حد تکلیف دہ ہے اور بجائے جاہ و عزت کے ذلت و پریشانی ہوتی ہے میرے یہاں شادی کے موقع پر کوئی رسم ایسی نہیں ہوئی جیسے کہ اور جگہوں پر ایسے موقع پر ہوا کرتی ہیں۔ صرف خاص خاص اہل برادری و اعزہ مرد و عورت کو اطلاع دی گئی تھی۔ اس پر بھی بڑا ہجوم ہو گیا اور چار پانچ دن تک مہمانداری رہی جس میں صرف کھانے کے انتظامات میں وہ وہ پریشانیاں اٹھانی پڑی ہیں کہ میرا دل ہی جانتا ہے میں نے اپنے خیال میں کوئی رسم ادا نہیں کی مگر صرف دعوت ولیمہ اور اہل برادری کے جمع کرنے ہی میں مجھے تجربہ ہو گیا کہ حضرت اقدس مدظلہم العالی کا ایک ایک لفظ وعظ بالکل صحیح ہے اور ہرگز ہرگز کبھی اس اہتمام کے ساتھ شادی نہیں ہونا چاہئے۔

جو کچھ میں نے تخمینہ شادی کے اخراجات کا کیا تھا اس سے چہار چند خرچ ہو گیا اور اکثر اعزہ کو شکایت ہی رہی کہ ان کی خاطر وتواضع نہیں کی گئی۔ کھانے کیلئے ہوشیار سے ہوشیار باورچیوں کا انتظام کیا گیا لیکن اس پر بھی زردہ والا معاملہ آپ کو یاد ہو گا کہ نہ معلوم کس طرح سے اس میں مٹی کے تیل کی ناقابل برداشت بدبو ہو گئی جس کی وجہ سے عین کھانے کے وقت جس قدر ذلت و سبکی میری ہوئی ہے میرا ہی دل جانتا ہے اس قدر کثیر تعداد کے چاول و گھی و میوہ جات کی بوجہ مٹی کے تیل کی بدبو ہو جانے کے بھنگیوں و چماروں کو بٹوا دینا دل کو بڑا شاق ہوا بلکہ اس سے بھنگیوں اور چماروں میں بھی بدنامی ہوئی کہ گورنر صاحب کشمیر کے لڑکے کی شادی میں ایسا زردہ پکا۔ حالانکہ حتی الامکان بڑی احتیاط ہر بات میں کی گئی تھی۔ خاص خاص معتمد اعزہ کے سپرد کھانے کا تھا مگر وہ بیچارے کیا کریں جب کہ ان کے قابو سے باہر بات ہو۔ میرا تو ہزار ہا روپیہ خرچ ہو گیا اور ذلت و خواری ان کے عوض میں نصیب ہوئی۔ مجھے بڑا زعم اپنی انتظامی قابلیت پر تھا اس کا نتیجہ یہ ذلت و خواری ہوا۔ میں نے تو اسی وقت سے عہد مصمم کر لیا کہ آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ کسی بچہ کی تقریب اس طرح سے نہ کروں گا بلکہ حضرت اقدس مدظلہم العالی کے مواعظ اصلاح الرسوم کی بابت جس قدر ہوئے ہیں ان کو خوب غور سے پڑھ کر ان پر عمل کروں گا اور کبھی شادی کے موقعہ پر بھی اجتماع اہل برادری وغیرہ نہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ مجھے اس کی توفیق عنایت فرماویں۔ میں سچے دل سے اپنی اس غلطی کا اعتراف کرتا ہوں جو اس موقع پر مجھ سے ہوئی۔ حالانکہ میرے بھائی عزیزم حاجی خواجہ عزیز الحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت اصرار کے ساتھ اس تقریب پر اجتماع اہل برادری سے منع کیا تھا مگر میں نے یہ سمجھا کہ کوئی رسم خلاف شرع شریف تو میں کروں گا نہیں صرف احباب کو اور خاص خاص اہل برادری کو دعوت دوں گا ولیمہ کی مگر یہ نہ معلوم تھا کہ یہ بھی وبال جان ہو جاوے گا۔

علاوہ میری اس ذلت وخواری کے منتظمین کی اکثر نمازیں وقت پر نہ ہوئیں۔ جماعت تو نصیب نہ ہوئی ہے۔ اور بڑا قلق اس کا ہے کہ حضرت والا مدظلہم العالیٰ کے وعظ کے وقت اکثر منتظمین شرکت نہ کر سکے۔ پردہ کا اگرچہ بہترین انتظام کیا گیا تھا مگر میں نے خود دیکھا کہ خود میری ہی نظر اکثر غیر محرم مستورات پر پڑ گئی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ ایسے موقع پر پردہ کا انتظام کما حقہ کرنا ناممکن ہے۔ بہت سے برتن، بہت سے میرے کشمیری نمدے اور لوٹیاں جو بڑے قیمتی تھے گم ہو گئے جن کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ غرض کہ شادی سے فراغت پا کر جو میں نے غور کیا تو میرے گھر میں دلہن تو آئیں مگر مجھے ذلت ونقصان بہت برداشت کرنا پڑا۔ کاش میں اپنے بھائی عزیز حاجی خواجہ عزیز الحسن سلمہ اللہ تعالیٰ کے کہنے پر عمل کرتا تو دلہن آتی مگر یہ ذلت اور نقصان برداشت نہ کرنا پڑتا اور جو روپیہ کثیر میں نے صرف کر دیا وہ بچتا اور اس سے لڑکوں کی تعلیم میں سہولت مجھے ہوتی جس کی دقت مجھے اس وقت محسوس ہو رہی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے اس عریضہ کو پورا یا اس کا خلاصہ وعظ نقد اللبیب کا جزو کرایا جائے تاکہ جو صاحب پڑھیں وہ میرے اس ذاتی تجربہ پر بھروسہ کر کے آئندہ ایسی رسومات دعوت وغیرہ اجتماع اہل برادری وغیرہ سے احتراز کریں اور نقصان کثیر ذلت وخواری سے بچیں۔ ایسا ہی تلخ تجربہ میرے بھانجا اعجاز علی صاحب سلمہٗ ڈپٹی کلکٹر کو ہوا۔

امید ہے کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے اور میرے لئے دعائے خیر کرتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ توفیق اعمال صالحہ عطا فرما دیں اور خاتمہ بخیر کرے۔ میں ابھی تک رخصت پر ہوں۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۳ء تک میری رخصتی ہے۔

بچیوں کو دعائیں! دعا گو خادم عزیز الرحمان عفی عنہ

تصدیق جناب سید اعجاز علی صاحب

بی اے ایم بی آر اے ایس ڈپٹی کلکٹر بدایوں والد نوشہ کاظم علی سلمہٗ
تحریر بالا را

مجھے اپنے ماموں صاحب خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب کی تحریر سے بالکل اتفاق ہے۔ میں نے ابھی اسی زمانہ میں یعنی گذشتہ بڑے دن کی تعطیل میں اپنے بڑے لڑکے کاظم علی سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی کی تھی۔ میرے چھوٹے ماموں حاجی خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب کے مشورہ کے مطابق میرا ارادہ تھا کہ بدایوں ہی میں (یعنی جائے ملازمت پر) عقد ہو جاوے اور کسی قسم کا خاص اہتمام وغیرہ نہ کیا جاوے مگر میری والدہ صاحبہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئیں اور مجبوراً مجھے اپنے وطن قصبہ نذئی میں ہی جا کر شادی کرنی پڑی حالانکہ میرا سارا کنبہ میرے پاس بدایوں میں تھا۔ صرف اس تقریب کے ادا کرنے کے لئے وطن مع کل کنبہ و سامان کے محض ہفتہ عشرہ کے لئے جانا پڑا۔

گو بوجہ تشریف آوری حضرت مولانا صاحب مدظلہم خلاف شرع کوئی رسوم نہیں کی گئیں اور بہت اہتمام سے مستورات کی ہر امر میں روک ٹوک کرنی پڑی تاہم بے حد تکالیف اور کثیر مصارف برداشت کرنے پڑے۔ زیادتی اسباب کی وجہ سے ایک اسٹیشن پر میں خود ریل سے رہ گیا اور دسمبر کی شدید سردی میں شب بھر بغیر بستر کے گزارنی پڑی اور ہمراہیوں کو پریشانی میرے رہ جانے سے علیحدہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک مخلص عزیز چلتی ہوئی ریل سے کود پڑنے کے لئے آمادہ ہو گئے ان کو بڑی مشکل سے روکا گیا۔ غرض سفر میں بوجہ کثرت اسباب ہر موقع پر ایک مصیبت کا سامنا تھا۔ باوجود سخت کوشش کے انتظامات تقریب میں حسب معمول بڑی گڑبڑ رہی اور اعزہ و احباب سب کو بے حد تکلیف ہوئی اور کسی سے اطمینان کے ساتھ ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ اجتماع مستورات میں تجربہ سے ثابت ہوا کہ بہت بے پردگی ہوتی ہے اور اس تقریب میں نہ صرف میرا ہی کثیر روپیہ صرف ہوا بلکہ جملہ اعزہ و اہل برادری کو بھی اور اپنے متعلقین کو پر تکلف کپڑے بنانے میں بے حد خرچ کرنا پڑا خود تو یقیناً مقروض ہو گئے بے وقت کھانے اور سونے کی وجہ سے ایسی حالت خراب ہو گئی کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے فوراً مجھے وطن چھوڑ کر بدایوں بغرض علاج آنا پڑا۔

گو کوئی لاکھ انکار کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ دھوم کی شادی زیادہ تر تفاخر یا بدنامی سے بچنے کے لئے کی جاتی ہے مگر میں نے تو کبھی یہ نہیں سنا کہ شادی کے بعد کسی کی تعریف ہوئی ہو بلکہ ہمیشہ اس کے خلاف ہی سنا۔ واقعی کسی نے بالکل سچ کہا ہے۔

نہ کردن یک عیب و کردن صد عیب
(نہ کرنا ایک عیب اور کرنا سو عیب ہیں)

کیا ہی اچھا ہو اگر مسلمانوں میں یہ رواج ہو جاوے کہ بجائے ہزار ہا روپیہ ایسے موقعوں پر فضول صرف کرنے کے خود دلہا دلہن کے لئے کافی سرمایہ دے دیا جایا کرے تا کہ وہ ان کے کام بھی آوے۔ ایسا بے جا ذاتی تجربہ کے بعد میں نے تو مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ بچیوں کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ بالکل شرع شریف کے مطابق کروں گا اور ہر خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ کا مصداق نہ بنوں گا۔

پڑھے لکھے لوگ جتنے اس موقع پر موجود تھے سب پر یہی اثر تھا اور سب نے بالاتفاق یہ طے کر لیا تھا کہ آئندہ ہرگز اس قسم کی تقریبات اس طریقہ سے نہ کی جاویں۔ اس اثر کی وجہ زیادہ تر حضرت مولانا صاحب دام فیضہ کی تشریف آوری و برکت تھی۔ حضرت اقدس مولانا صاحب دام فیوضہ کے وعظ سے مسلمانوں کو بے حد فائدہ ہوگا اگر وہ اس کی پابندی کریں۔

۱۵ جولائی ۱۹۲۳ء اعجاز علی بی اے بی ای ایم آر اے ایس ڈپٹی کلکٹر بدایوں۔

تصدیق جناب سید صاحب علی صاحب

انسپکٹر آبکاری سندیلہ ضلع ہردوئی تحریر بالا را

مجھے اپنے ماموں خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب قبلہ و بڑے بھائی سید اعجاز علی صاحب قبلہ کی رائے سے پورا اتفاق ہے۔ واقعی تقریبات کے موقع پر ایسا اجتماع کرنا جس کے باعث اوقات میں فرق آئے اور جس کا انتظام بھی قابو سے باہر ہو محض تکلفات و تصنعات پر مبنی ہے اور بجز تکلیف و نقصان کے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ چونکہ میں بھی اپنے برادر زادہ سید کاظم علی سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی کی تقریب کے موقع پر موجود تھا اور میرے سپرد بھی کھانے کا انتظام کیا گیا تھا اس لئے مجھے بھی ذاتی تجربہ ہے کہ ایسے کثیر مجمع کی تقریب کے موقع پر نہ تو کھانا وقت پر ملتا ہے نہ سونا وقت پر ہوتا ہے اور نہ نماز وقت پر ہوتی ہے اور جماعت کے ساتھ نماز ملنا تو بہت ہی مشکل بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مجھے خود اس کا تلخ تجربہ ہوا ہے۔ یعنی ۲۹ دسمبر ۱۹۲۲ء یوم جمعہ کو جب کہ حضرت مولانا صاحب قبلہ دام فیوضہم کا وعظ بعد نماز جمعہ ہو رہا تھا اور مجھے عین اسی وقت وعظ چھوڑ کر اپنے فرض منصبی یعنی کھانے کے انتظام کی وجہ سے وہاں سے ہٹنا پڑا جو نہایت ہی شاق گزرا لیکن محض بدنامی کے ڈر سے ایسا کرنے پر مجبور ہوا اور پھر ایسا گرفتار ہوا کہ دوبارہ مسجد نہ جا سکا اور نہ وعظ سن سکا جس کا آج تک قلق ہے لہٰذا میری رائے ناقص میں ایسا اجتماع کرنا اور اس میں شرکت کرنا نہ صرف خلاف شریعت ہے بلکہ خلاف عقل بھی ہے اور اسی واسطے میں نے عہد کر لیا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ نہ تو میں آئندہ ایسے مجمعوں میں حتی المقدور شرکت کروں گا اور نہ خود اپنے بچوں کی تقریبات میں ایسے اجتماع کروں گا بلکہ نہایت ہی سادہ طور پر عقد شرعی کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ایسے عمل کی مجھے و نیز جملہ برادران اسلام کو توفیق دے آمین۔

۲۷ جولائی ۱۹۲۳ء احقر صاحب علی انسپکٹر آبکاری متعینہ سندیلہ ضلع ہردوئی۔

تصدیق جناب سید مبارک حسین صاحب

انسپکٹر آبکاری حلقہ اول لدھ تحریر بالا را

مخدومی و مکرمی جناب مولانا صاحب قبلہ! السلام علیکم!

آپ کا گرامی نامہ پہنچا جس میں دیگر گرامی نامہ جات عالی جناب بھائی صاحب سید اعجاز صاحب قبلہ و جناب ماموں خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب قبلہ ملفوف تھے۔ میں نے تینوں خطوط کو بغور پڑھا۔ پڑھ کر پچھلی شادیوں میں جو تکالیف برداشت کی تھیں تازہ ہو گئیں۔ مختصراً اپنے دلی خیالات کا اظہار کرتا ہوں اور بزرگان مندرجہ بالا کے خیالات سے بالکل متفق ہوں۔

مجھے اپنی لڑکی کی شادی کی فکر ایک عرصہ سے تھی اور مجھ پر فرض تھی جب میں یہ سوچتا ہوں کہ شادی کے وقت بہت ہی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے بے شمار اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور طرح طرح کی بے شمار مذموم رسومات ادا کی جاتی ہیں تو میں پریشان ہوتا تھا۔ اور اپنی زندگی میں اس قدر سادہ فرض کو ایک بڑی مہم سمجھتا تھا۔ غرض کہ اسی طرح شش و پنج میں چند سال گزرے۔ خدا خدا کر کے میرے لئے وہ پہلا مشکل اور مبارک وقت آیا کہ تعطیل یوم کلاں دسمبر ۱۹۲۲ء میں میری لڑکی کی شادی ہونا قرار پا گئی۔ مشکل وقت بوجہ وجوہ مندرجہ بالا اور مبارک وقت اس لئے کہ میری اکلوتی بیٹی کا جو مجھے بے حد عزیز ہے عقد ہوا۔ جس وقت تعین تاریخ کی اطلاع مجھے ملی میرے دل میں دو خیال پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ شکر ہے کہ میں اب اپنے فرض سے سبکدوش ہوں گا۔ دوسرا یہ کہ خدائے پاک میری آبرو رکھ لے۔

آبروریزی کا اندیشہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھا کہ بھائی صاحب قبلہ جدید رشتہ سے میرے سمدھی ایک ڈپٹی کلکٹر تھے۔ چنانچہ یہ اندیشہ صحیح نکلا کیونکہ اگرچہ بھائی صاحب قبلہ روشن خیال ہیں لیکن دیگر پرانے خیال کے اعزا اور بزرگوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ تمہارا مقابلہ ایک بہت بڑے آدمی سے ہوا ہے وہ صاحب جاہ ذی حشمت صاحب وقار اور ایک اعلیٰ حاکم ہیں۔ خدائے پاک ان کی روز افزوں ترقی فرمادے ان سب باتوں کا خیال رکھتے ہوئے مجھے شادی کی تیاریاں کرنی چاہئیں میں بے حد مایوس ہوا اور پریشان تھا کہ خدایا میری آبرو رکھنا۔

قصہ مختصر یہ کہ ان خیالات سے میں مجبور ہو گیا اور اپنی مقدورات سے زیادہ تیاریوں میں دو ہفتے پیشتر سے مشغول ہو گیا۔ اس دوران میں مجھے متعدد سفر ریلوے کرنے پڑے۔ شب و روز پریشان رہا۔ تاریخ معینہ پر عالی جناب مولانا اشرف علی صاحب قبلہ مدظلہ نے میری لڑکی کا عقد پڑھایا۔ عقد کے دوسرے دن میرا اعزیز بھتیجا اور جدید رشتہ سے میرا قابل فخر داماد عزیزی سید کاظم علی سلمہ سخت بیمار ہو گیا جس کا حوالہ عالی جناب بھائی صاحب قبلہ مدظلہ نے اپنے گرامی نامہ میں فرمایا ہے۔ صاحب ممدوح اپنے ہونہار، سعادتمند، تعلیم یافتہ بیٹے کو اس طرح سخت علیل دیکھ کر پریشان تھے اور بے حد مضطرب تھا۔ میں

اپنے عزیز داماد کو دیکھ کر بدحواس تھا۔ ایک نوشہ کا یکا یک بستر علالت پر دیکھنا ایک ایسا دردناک واقعہ ہے جو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ خدائے پاک اس کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔

بھائی صاحب قبلہ کو موسم سرما کے شدید ترین وقت میں شب کو ریل چھوٹ جانے سے اسٹیشن پر بوجہ نہ ہونے حفاظتی سامان پوشش کے جو تکلیف ہوئی قابل بیان نہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میری لڑکی خوش نصیب ہے کہ اس کو ایک لائق شوہر ملا۔ خدائے پاک میرے ان دونوں بچوں کی زندگی دے۔ مجھے یہ فخر اس وقت بھی حاصل ہوسکتا تھا کہ میری لڑکی کا عقد قطعی شرعی ہوتا اور دیگر مذموم مراسم سے مبرا ہوتا اور بلاوجہ زیر باری سے بچ جاتا۔ مجھے اس خرچ کا قطعی قلق نہیں ہے بلکہ خوشی ہے جو میں نے لڑکی پر جہیز وغیرہ میں کیا۔ البتہ مجھے ملال ہے دعوت اور دیگر بہت سی ایسی مدوں کا جن کا تفصیل وار لکھنا محال ہے اور ان پر مجھے خرچ کرنا پڑا اور مجھے اس سے تکلیف ہوئی۔

مجھے دیگر مقامات میں متعدد مرتبہ مسلمانوں کا شادیوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ہاں مقابلتاً بہت سی لغو رسوم معدوم ہیں۔ ایک واقعہ پر ایک لاکھ کا مہر باندھا گیا تھا اور یہ صاحب محرر چنگی تھے۔

غرض میں پہلے ہی خلاف تھا اور یہ شادی میرے لئے کافی سبق آموز ہوئی۔ آپ کی کوشش سے اور مولانا صاحب کی برکت سے پچھلی شادیوں میں بہت سی اصلاحیں ہوئیں۔ میں اب آئندہ اپنی اولاد کا عقد شرعی کروں گا اور میں نے طے کرلیا ہے کہ میں آئندہ ایسی تقریبات میں ہرگز شرکت نہ کروں گا جہاں فضول خرچیاں ہوں اور جاہلانہ رسوم ادا کی جاویں۔

میں آپ کا اور عالی جناب مولانا صاحب قبلہ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے یہ کار نیک اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس پر اگر کاربند ہوئے تو جملہ مسلمانان نہ صرف گناہوں ہی سے بچیں گے بلکہ بربادی اور زیر باری سے نجات پاجاویں گے۔ خدائے پاک مسلمانوں پر رحم فرماوے اور آپ دونوں صاحبان کی کوششیں بارآور ہوں آمین۔

آپ کا مبارک حسین انسپکٹر آبکاری حلقہ اول ایٹہ

مختصر کیفیت وعظ ہذا وقوعاً وعرضاً واثراً

یہ وعظ (نقد اللبیب) بتاریخ ۶ جمادی الاول ۱۳۳۱ھ بروز منگل بعد ظہر ہوا۔ یہ تمام سفر کوٹا کا گویا موضوع اصلی تھا۔ اس کی طرف تمام مہمانان اور میزبانان اور زائرین سب کے کان لگے ہوئے تھے۔ یہ وعظ پولیس لائن کے میدان میں ہوا۔ جہاں مہمانان کا قیام تھا۔ یہ جگہ شہر کوٹہ سے دو میل کے قریب فاصلہ پر ہے۔ اہل شہر کو بھی اطلاع ہوگئی تھی چونکہ حضرت والا کا ورود اس جگہ پہلی ہی مرتبہ تھا اور شہر کے لوگ حضرت سے بالکل ناآشنا تھے اس لئے مجمع اہل شہر کا کچھ زیادہ نہ ہوا اور ان میں سے بعض کے تیوروں سے معلوم ہوتا

تھا کہ چنداں اشتیاق سے نہیں آئے۔ اس مجمع کے خیالات معلوم کرنے کو یا محض دیکھا دیکھی چلے آئے ہیں بلکہ بعضوں کے چہروں سے رنگ مخالف بھی ظاہر تھا آئے تو اس طرح تھے کہ وعظ کے ختم پر سب کی بلا مبالغہ یہ حالت ہوئی کہ ہم کو تو کہتے تھے اب تم ہی کلیجہ تھام لو اور بقول حضرت مجذوب سلمہ

کب وہ وہیں گرا نہیں جس کو ذرا لگا نہیں   تیری نظر کا تیر بھی جس پہ پڑا بچا نہیں
بچنے کا تیرے ہم نشیں ماننا میں برا نہیں   ہوش ربا کے سامنے ہائے ابھی پڑا نہیں

یہ حالت تھی کہ کسی کی سیری نہ ہوتی تھی۔ وعظ کے شروع ہونے کے وقت ان کے چہروں پر اجنبیت کے اثر تھے اور ختم پر انہوں نے جو شہر میں وعظ ہونے کے لئے اصرار کیا اس سے عقیدت اور خلوص اور تڑپ کے آثار نمایاں تھے۔ حضرت والا کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور خوشامد کرتے تھے مگر حضرت والا بعض شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے عذر فرماتے تھے۔ وعظ کا ضبط کرنا احقر محمد مصطفیٰ اور خواجہ عزیز الحسن صاحب کے سپرد ہوا تھا اتنے میں معلوم ہوا کہ مرزا صاحب انور بیگ نامی منجانب ریاست کوٹا مختصر نویسی کا باقاعدہ امتحان پاس کرکے آئے ہیں۔ اور فی منٹ ۱۵۰ لفظ لکھ سکتے ہیں۔ وہ بھی لکھنے بیٹھ گئے اور انہوں نے بہت شوق سے لکھا ہم لوگوں کو جس قدر اس کی خوشی تھی بیان سے باہر ہے۔ جس اہتمام سے یہ وعظ لکھا گیا آج تک کوئی وعظ نہیں لکھا گیا اور الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ جیسا وعظ ہوا۔ ویسی ہی اس کی تحریر بھی ہوئی۔

امید تو یہ کی گئی تھی کہ یہ وعظ بالکل لفظ بلفظ ہوگا۔ تحریر و تقریر میں ایک لفظ کا بھی فرق نہ ہوگا اور اسی کی کوشش کی گئی لیکن اس میں کامیاب ہونے میں کسی قدر موانع پیش آگئے۔ وہ یہ کہ بعض الفاظ کا شارٹ اردو میں ہے ہی نہیں مثلاً تتبع کا لفظ کہ مختصر نویس صاحب سے اپنا لکھا ہوا پڑھا ہی نہیں گیا۔ دوسرے یہ کہ مختصر نویس صاحب کے مواجہ میں کل کی تبییض نہ ہو سکی کیونکہ بہت جلد وہاں سے کوچ ہو گیا اور خود وہ بلا ہم دونوں کے مسودوں کو صاف نہ کر سکے۔ کیونکہ بہت سے عربی لفظ ایسے تھے جو ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ تاہم یہ ضرور ہوا کہ ایک ثلث بظن غالب لفظ بلفظ صاف ہوا۔ کیونکہ حضرت کا ایماء ہوا کہ علیحدہ ایک خیمہ میں ہم تینوں بیٹھیں اور فوراً صاف کرنا شروع کر دیں اور کسی کام کے لئے سوائے ضروریات اور نماز کے وہاں سے نہ نکلیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مختصر نویس صاحب کا اندازہ یہ تھا کہ اس طرح اہتمام سے لکھنے سے کل تک پورے وعظ کی تبییض ہو جاوے گی لیکن یہ خیال ہی خیال نکلا اور تیسرے دن تک بھی صرف ایک تہائی کی تبییض ہونے پائی کیونکہ ایک ایک لفظ کو اس وقت تحریر کیا جاتا تھا جبکہ تینوں تحریروں کو غور سے ملا لیا جاتا تھا۔ تیسرے دن کوٹا سے مدھیٰ علاقہ بھرت پور کوچ ہو گیا۔ نہ ہم لوگ کوٹا میں رہ سکتے تھے اور نہ مختصر نویس ہمارے ساتھ مدھیٰ جا سکتے تھے۔ مدھیٰ میں اسی کو غنیمت سمجھا گیا کہ احقر اور خواجہ عزیز الحسن صاحب دونوں مل کر تبییض کریں تین دن تک وہاں بھی اسی طرح ہوا کہ سوا وعظ کی تبییض کے کچھ کام نہ تھا لیکن باوجود اس کے ان دونوں میں بھی ایک تہائی سے زیادہ صاف نہ ہو سکا۔

اب مدبئی سے بھی کوچ ہونے لگا اور احقر میں اور خواجہ صاحب میں بھی افتراق ہوا تو حضرت والا کی رائے یہ ہوئی کہ دونوں مسودے احقر کے ساتھ جاویں اور احقر دونوں مسودوں کی مدد سے صاف کرے بعدازاں اس صاف شدہ کو مع دونوں مسودوں کے خواجہ صاحب کو بھیج دے وہ اس پر نظر ثانی فرما لیں۔ اس کے بعد میں حسب معمول سب کو دیکھ لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حاصل یہ کہ وعظ ایک ثلث کے قریب تینوں کاتبوں کے مواجہ سے لکھا گیا اور ایک ثائی کے قریب دو کاتبوں نے مل کر لکھا اور ایک ثلث احقر نے دونوں مسودوں کی مدد سے لکھا۔ ظاہر ہے کہ جو بات تبیض میں تینوں کے مل کر لکھنے سے پیدا ہوئی تھی وہ دو کے مل کر لکھنے سے نہیں ہوئی اور جو بات دو کے مل کر لکھنے سے ہوئی تھی وہ فقط احقر کے لکھنے سے پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن یہ بھی ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میری تحریر میں کل الفاظ حسب منشاء محفوظ نہ سہی اکثر الفاظ ضرور محفوظ ہو گئے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بعض ہی الفاظ میں فرق رہ گیا ہو گا کیوں کہ دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر ایک ایک لفظ پر غور کر کے لکھا گیا اور جو کچھ اس میں کمی رہی وہ خواجہ صاحب کی نظر ثانی سے پوری ہو گئی اور حضرت واعظ صاحب مدظلہ کی نظر اصلاحی سے سب پر رجسٹری ہو گئی۔

غرض میزبان کوٹا کی نیک نیتی اور خلوص کی برکت ہے کہ یہ وعظ دیگر تمام وعظ سے اس بات میں ممتاز ہے کہ ایک تہائی سے کچھ زیادہ روایت باللفظ ہے۔ شائد ہی کچھ الفاظ بدلے گئے ہوں گے اور باقی ماندہ میں سے نصف جو شرکت احقر اور خواجہ صاحب کے لکھا گیا تھا اس کی نسبت بھی کہا جا سکتا ہے کہ قریب روایت باللفظ کے ہے کیونکہ خواجہ صاحب کو اس کا زیادہ اہتمام رہتا ہے کہ حتی الامکان الفاظ نہ بدلیں لیکن بلا مختصر نویسی کے اس میں حسب منشا کامیابی محال ہے تاہم دونوں مسودوں کو صاف کرنے سے بہت کم تغیر رہ گیا ہو گا اور کوئی مضمون چھوٹا یا بڑا ہرگز ترک نہیں ہوا۔ رہا باقی ماندہ ایک ثلث جو صرف احقر نے دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اس میں بھی حتی الامکان یہی کوشش کی گئی ہے کہ الفاظ محفوظ رہیں۔ تاہم اجتماعی اور انفرادی تحریر میں فرق ہونا ضرور ہے لیکن اس فرق کو خواجہ صاحب کی نظر ثانی سے نکال دیا۔ کیونکہ خواجہ صاحب نے بہت غور اور اہتمام سے دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر بندہ کی تحریر کو درست کیا ہے اور اسی وجہ سے اس میں زیادہ عرصہ لگا۔ غرض یہ ثلث اخیر بھی ثلث دوم کے حکم میں سمجھنا چاہئے۔ یہ اہتمام اس سے پہلے کسی وعظ کی تبیض میں نہیں ہوا۔

اس وعظ کے اثر کا بیان سنئے کہ مضمون وعظ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے کسی فعل میں خود مختار نہیں ہے اور یہ خیال غلط ہے کہ شریعت نے رسوم کے متعلق آزادی دی ہے یا یہ کہ ان باتوں کو شریعت سے کیا تعلق۔ یہ مضمون اس خوبی اور متانت اور تہذیب سے بیان ہوا کہ قلب بے ساختہ شہادت دیتا تھا کہ اس سے بہتر اس مضمون پر کوئی تقریر نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ انسپکٹر جنرل صاحب جو

مذہباً ہندو تھے کہنے لگے کہ ہم نے تو خلاصہ اس کا یہ سمجھا ہے کہ مولانا صاحب نے ریفارم اسکیم کو مذہب کے پیرایہ میں ثابت کیا ہے اور یہ سب سے بہتر اور موثر طریقہ ہے اور ان لوگوں کے دلوں پر بھی حضرت واعظ صاحب مدظلہ کی تقریر کا سکہ جم گیا جو شہر کوٹا سے اجنبیانہ آئے تھے اور مجمع کے وہ اشخاص جو رسوم کی ممانعت میں طرح طرح کے اشکال کیا کرتے تھے معترف تھے کہ اب کوئی اشکال نہیں رہا۔ حتیٰ کہ خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب بار بار ان کو چھیڑتے کہ اب بولو اگر کوئی اشکال باقی ہو تو حضرت کے پاس چلو اور وہ خاموش رہ جاتے۔ اس وعظ نے موافق و مخالف سب کو ایک خیال بنالیا۔ مجمع کی جو کیفیت بیان کے وقت تھی وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ جو لوگ صرف تماشائی بن کر آئے تھے بعد وعظ کے سب نے بالاتفاق اصرار کیا کہ شہر میں بھی وعظ ضرور ہونا چاہئے اور جب ان کو معلوم ہوا کہ شہر میں وعظ نہیں ہوگا تو ان کے چہروں پر ایسی حسرت و یاس برستی تھی جیسے ان کے کوئی قیمتی چیز فوت ہو گئی ہے۔ قاضی صاحب اور تمام شہر والوں نے بار بار عرض کیا کہ شہر میں بھی وعظ ضرور ہونا چاہئے۔ فرمایا میں نے کچھ شرائط پیش کی تھیں لیکن ان کے متعلق مجھے اطمینان نہیں ہوا اس واسطے میں معذور ہوں۔ زندگی باقی ہے تو پھر کبھی سہی پھر بھی اصرار کیا گیا تو فرمایا یوں کیجئے کہ آئندہ کسی موقع پر حکام کے ذریعہ سے اختلاف وغیرہ کے انسداد کا انتظام کرا کر بلا لیجئے میں حاضر ہوں اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ مجھ سے حق گوئی ترک نہیں ہو سکتی۔ میری عادت چھیڑ چھاڑ کی تو ہے نہیں جیسا کہ آپ نے اس وعظ میں سن کر اندازہ کر لیا ہوگا اپنے وعظ میں میں نے اختلافی مسائل تک سے کہیں تعرض نہیں کیا لیکن اگر کوئی بات زبان پر آجائے تو روکتا بھی نہیں ہوں۔ اس شرط کو بھی ملحوظ رکھے اور بلا لیجئے بشرط متوقع و فرصت انکار نہ کروں گا۔ اس وقت ان لوگوں کی حسرت و یاس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔

یہ وعظ اس قابل ہے کہ جب کہیں شادی بیاہ میں رسوم کے متعلق بیان کی ضرورت ہو اس کو سنا دیا جاوے۔ حضرات میزبانان میں سے کئی صاحبوں نے عہد کیا کہ ہم آئندہ جب کوئی تقریب کریں گے تو بالکل شرع شریف اور حضرت کے فرمودہ کے مطابق کریں گے۔ چنانچہ کئی صاحبوں کی تحریریں وعظ کے آخر میں درج ہیں تمہید ختم ہوئی۔ ناظرین اس وعظ کو بار بار مطالعہ کریں اور دعا کریں کہ حق تعالیٰ حضرت واعظ صاحب کو بایں فیوض و برکات دائم و قائم رکھیں اور حضرات میزبانان کوٹہ اور کاتبین وعظ کو اور جس جس کو اس سے تعلق ہو اپنی محبت اور توفیق خیر اور سعادت دارین نصیب فرمادیں۔ آمین۔

تمت بالخیر